سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

دسمبر 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

صفحات 290

☆ فریبی: ذہن و دل کو جھنجوڑ دینے والی سچ بیانی

☆ شمشال سے ٹورنٹو: دلچسپ سفرنامے کی آخری قسط

☆ باغی قلمکار: ایک معروف مصنف کی دکھ بھری داستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد 28 ❖ شمارہ 11 ❖ دسمبر 2018ء

ماہنامہ
کرن
کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر



منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789



سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269



قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1200 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: 63-C، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



قارئین کرام!
السلام علیکم!

ایک اندازے کے مطابق کرۂ ارض کی آبادی سات ارب ستر کروڑ سے تجاوز کر رہی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق ہر ایک گھنٹے میں چھ ہزار سے زائد افراد دنیا سے منہ موڑ رہے ہیں اور پندرہ ہزار بچے پیدا ہو رہے ہیں یعنی ہر گھنٹے میں نو ہزار افراد کا اضافہ ہو رہا ہے جب کہ زمین کیمیکل و دیگر آلودگی کی وجہ سے پیداوار کی صلاحیت کم کر رہی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ کرۂ ارض کا پھیپڑا یعنی جنگل کٹتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے آکسیجن کی پیداوار کم سے کم ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسا خطرہ ہے جس کا سدباب ضروری ہے۔ ان خطروں سے بچنے کے لیے کم سے کم ایک گملا تو ہم اپنے گھر کی گیلری یا کورٹ یارڈ میں رکھ سکتے ہیں تاکہ قلیل ہی صحیح آکسیجن پیدا تو ہو! کیا ہم انفرادی طور پر ہی سہی اس نکتے کو آزما نہیں سکتے؟

معراج رسول

آزاد خیال

عظیم آباد (پٹنہ، بہار) کے محلہ بیوا گنج میں نماز صبح کے وقت نظام السلسلہ حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد کے گھر نواب عفت آرا سے ایک بچے نے جنم لیا۔ نواب عفت آرا کی گود میں آئے ابھی تیسرا مہینا ہی گزرا تھا کہ دودھ خشک ہو گیا۔ بچہ بھوک سے بلبلاتا رہتا۔ اس پریشانی کے حل کی خاطر شہر بھر میں انا کی تلاش شروع ہو گئی۔ شرط یہ تھی کہ دودھ پلانے والی انا سیدانی ہو۔ کافی تلاش بسیار کے بعد ان کو ایک پٹھانی ملی جو انہی کی ریاست کے ایک سپاہی امیر خان کی بیوی تھی۔ نواب عفت آرا نے اس پر دودھ پلانے کی ذمے داری ڈال دی۔ جب یہ خبر سید شاہ الفت تک پہنچی تو وہ ناراض ہو گئے کہ میرے بیٹے کو غیر سید کا دودھ دیا جا رہا ہے۔ خاندان کے کئی بزرگوں نے مل کر انہیں سمجھایا کہ رضاعت کے لیے سیدانی ہونا ضروری نہیں۔ وہ بیوی کے دباؤ میں تھے اس لیے غصہ تھوک دیا۔ بچہ بڑا ہونے لگا، ابھی تین چار سال کا ہوا تھا تو لوگوں نے محسوس کر لیا کہ یہ بچہ مغلوب الطیش ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں آجاتا ہے۔ یہ بات جب شاہ الفت حسین تک پہنچی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ غصے کی وجہ پٹھانی دودھ ہے۔ شاہ الفت حسین کا مستقل قیام کلکتہ میں تھا۔ وہ بچے کی ولادت پر آئے تھے اور ڈھائی تین سال تک پٹنہ میں ہی رہے پھر جب واپس کلکتہ جانے لگے تو بیوی بچے کو بھی ساتھ لے لیا۔ سیکنڈ کلاس کا ایک پورا ڈبہ ریزرو کرایا تاکہ سفر میں دشواری نہ ہو۔ ساتھ جانے والے ملازمین کے لیے تھرڈ کلاس میں سیٹیں بک تھیں۔ ٹرین چلی تو شاہ صاحب دوڑ کر ڈبے میں سوار ہوئے۔ اندر آتے ہی بیوی کی گود خالی دیکھی تو بچے کے بارے میں پوچھا۔ بیوی نے جواب دیا کہ وہ تو انا کی گود میں تھا۔ شاہ صاحب نے چلتی گاڑی سے پلیٹ فارم پر چھلانگ لگا دی اور چاروں شانے چت گر گئے۔ انا جو کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی، شور کرنے لگی۔ ”سرکار گر گئے، سرکار گر گئے۔“ گارڈ نے گاڑی روک دی اور وہ بچے کو انا سے چھین کر واپس اپنے ڈبے میں لے آئے۔ بچے سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ گھڑی بھر کو اسے جدا نہیں کرتے۔ وہ عربی و فارسی کے عالم تھے اور مرشد آباد کے نواب و ناظم بنگالہ ہمایوں جاہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔ مرشد آباد کے قیام میں ہی ان کی شادی نواب عفت آرا سے ہوئی تھی۔ نواب عفت آرا نوابین بنگالہ کے گھرانے کی تھیں اس لیے وہ اپنے بچے کی تربیت خود کرتی تھیں۔ اصول دین، فروع دین، اسمائے دوازدہ امام یاد کراتیں۔ نشست و برخاست کا طریقہ بتاتیں۔

جب وہ بچہ ساتویں سال میں پہنچا تو اس کی رسم بسم اللہ ادا کی گئی۔ رسم کی ادائیگی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ پندرہ بیس دنوں تک مٹھائی تقسیم ہوئی، توڑے تقسیم ہوئے، مٹھائی تیار کرنے کے لیے ٹمیا برج سے لکھنوی حلوائی بلوائے گئے تھے۔ رسم بسم اللہ کے بعد گھر میں مولوی آکر پڑھانے لگے۔

جب وہ دس سال کا ہوا تو ماں نے قبر کی راہ لی۔ گھر بے سکون ہو گیا۔ والد نے بھی کلکتہ سے ناتا توڑنے کا فیصلہ کیا اور واپس پٹنہ آگئے۔ اسے ”سٹی اسکول“ پٹنہ میں داخل کرا دیا گیا۔ اس دوران والد پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بھی جنت مکانی ہو گئے۔ اب وہ نانی کی سرپرستی میں آگیا۔ گورنمنٹ سٹی اسکول سے سیکنڈ کلاس پاس کر کے وہ پٹنہ ٹریننگ اکادمی آگیا۔ یہاں سے انٹر پاس کیا۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد اس نے پٹنہ ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی جس کی شہرت پورے ہند میں پھیل گئی۔ اسی سال اس کے انگلینڈ جانے کا انتظام ہو گیا۔ اسکول برادر زاد سید علی احمد کے سپرد کیا اور وہ انگلینڈ چلا گیا۔ بیرسٹری کے لیے اس نے مڈل ٹمپل میں داخلہ لے لیا۔ 1888ء میں سر علی امام، میاں شاہ دین، سید کرامت حسین، احسن امام، سر محمد شفیع وغیرہ کے ساتھ مل کر انجمن اسلام لندن قائم کی۔ عید بقر عید پر نماز کا اہتمام کرتے وہ بھی اس طرح کہ ایک عید کی نماز کے لیے ترکی سفارت خانہ سے امام لاتے اور دوسری عید پر ایرانی سفارت خانہ سے۔ اس طرح دونوں مسلک کے امام کی اقتداء میں نماز ہوتی، وہ بھی اس طرح کہ کوئی ہاتھ باندھ کر اور کوئی ہاتھ کھول کر ایک ہی صف میں نماز ادا کرتا۔ انجمن نے ایک اور بڑا کام یہ کیا کہ لندن میں ایک ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی پر مبنی تھا، اسے رکوا دیا۔ 1894ء میں بیرسٹری پاس کر کے واپس آگئے اور کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ دوست احباب شادی پر زور دینے لگے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم یافتہ لڑکیاں بہت کم تھیں۔ ایک دوست نے حیدر آباد دکن کی ایک لڑکی کے بارے میں بتایا وہ اسی سلسلے میں حیدر آباد جا پہنچے اور نظام حکومت کی فوج کے ایک ڈاکٹر کی بیٹی صغریٰ سے شادی کر لی۔ صغریٰ بھی شوہر کی طرح فلاحی کاموں میں خصوصی دلچسپی لیتی تھی۔ آج بھی صغریٰ کے بنائے اسکول حیدر آباد دکن میں قائم ہیں۔ صغریٰ نے فلاحی کاموں میں بہت نام کمایا اور یہ سب ان کے شوہر سید ہمایوں مرزا کی حوصلہ افزائی پر ممکن ہوا ہے۔ سید ہمایوں مرزا کو حیدر آباد کا پہلا آزاد خیال مانا جاتا ہے۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیر اعلیٰ



☆ ندیم اقبال کا اظہار یہ شی گن امریکا سے۔ ’’دوستو! سفرنامہ لکھتے لکھتے خبر بھی نہ ہوئی اور تین سال بیت گئے۔ آرزو صرف یہی تھی کہ ’’نانگا پربت کا عقاب‘‘ (جواب کتابی شکل میں بھی موجود ہے) اس کی چار اقساط شائع ہو جائیں۔ اگست 2015ء کو محترم پرویز بلگرامی صاحب کو خط لکھ کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں نے سفرنامہ لکھا ہے اگر کہیں تو بھیج دوں۔ کچھ دن بعد شکاگو اپنے پاکستانی دوستوں کو گھمانے پھرانے لے گیا تھا۔ شب کے تین بجے میں ہوٹل کے کمرے میں سو رہا تھا کہ فون بجا، سنا تو آواز آئی۔ ’’میں پرویز بلگرامی سرگزشت سے بات کر رہا ہوں، آپ اپنا سفرنامہ بھیج دیں۔ معیار کے مطابق ہوا تو شائع کر دیں گے۔‘‘ دو دن بعد مشی گن پہنچ کر تنقیدی نظروں سے مسودے کو دوبارہ دیکھا اور سوچتا رہا کہ چھپنے کا معیار کیا ہو سکتا ہے۔ اپنا تنقیدی جائزہ لینا بہت مشکل کام ہے۔ پہلے لکھنے کا تجربہ نہ تھا تو شش و پنج میں پڑ گیا کہ بھیجوں کہ نہیں۔ مسودہ لیپ ٹاپ میں موجود تھا اور میں نے پہلے دو صفحات اپنے عزیز دوست اینکر جنید سلیم کو بھیجے کہ پڑھ کر رائے دے۔ دو دن بعد انہوں نے فون کر کے کہا۔ ’’ندیم بھائی بہت اچھا لکھا ہے، میری نصیحت ہے کہ لکھنا کبھی نہ چھوڑنا۔‘‘ جنید بھائی ایک ادبی انسان ہیں۔ ان کی زبان سے یہ سب سن کر حوصلہ بڑھا اور اسی دن مسودہ لنک کر کے ایڈیٹر صاحب کو بھیج دیا۔ چند دن بعد ان کا جواب آیا کہ سفرنامے کی پہلی قسط نومبر 2015ء کے شمارے میں چھپ جائے گی۔ پہلی قسط چھپنے کے بعد ایڈیٹر صاحب نے اصرار کیا کہ اب میں آگے بھی لکھوں۔ ان کا یہ اظہار بھی میرے لیے تقویت کا باعث تھا مگر میں قارئین کی رائے بھی جاننا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر رائے اچھی نہ ہوئی تو نہیں لکھوں گا۔ دسمبر کے شمارے میں آپ دوستوں نے میری حوصلہ افزائی کی تو میں نے سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے خیال تھا کہ چند اقساط سے زیادہ نہیں لکھ پاؤں گا۔ بنیادی طور پر میں لینڈ اسکیپ فوٹو گرافر ہوں، اسی شوق میں ملکوں ملکوں گھومتا رہتا ہوں۔ کیمرا لے کر شہروں، جنگلوں، بیابانوں کی خاک چھانتا رہتا ہوں۔ ’’نانگا پربت‘‘ کو قارئین نے بہت پسند کیا تو سوچا اپنی تصویروں کو تحریری شکل میں بھی لا سکتا ہوں تو پھر اسی سوچ نے ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ کی چند اقساط کو تینتیس (33) حصوں تک جا پہنچایا۔ آج حیران بیٹھا یہ لکھ رہا ہوں کہ چند دوستوں کے کرداروں کا سہارا لے کر اس سفرنامے کو اتنا طویل کر دیا؟ جو من میں آیا وہ لکھ ڈالا۔ زندگی کے وہ گوشے جو صیغہ راز میں تھے وہ عیاں کر دیئے۔ لکھنے کی رفتار یہ تھی کہ کبھی ایک ہفتے میں ایک قسط لکھ ڈالی اور کبھی دو دو ماہ خالی ذہن دو سطر بھی نہ لکھ سکا اگر ایڈیٹر صاحب حوصلہ افزائی کے ساتھ مفید مشورے نہ دیتے تو یہ کام بنتا نظر نہ آتا تھا۔ میں محترمہ عذرا رسول صاحبہ، محترم پرویز بلگرامی اور سرگزشت کی پوری ٹیم کا مشکور ہوں کہ میری پہچان پاکستان کے علاوہ باہر کے ملکوں میں بھی کرا دی۔ میرے لکھنے کا ایک بڑا مثبت پہلو یہ سامنے آیا کہ ’’شہرِ خیال‘‘ فیملی کا حصہ بن گیا۔ وہ لوگ دل سے قریب ہو گئے جن سے آج تک ملا بھی نہیں۔ ’’شہرِ خیال‘‘ دوستوں کی ایک محفل ہے جس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے علاوہ ادبی تبصرے ہوتے ہیں۔ مجھے خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب سعودی عرب میں مقیم ایک قاری نے پیش کش کی کہ دنیا کے جس ملک کی سیر کرنا چاہوں وہ سارا خرچ اٹھائے گا اور اس کی فرمائش صرف اتنی تھی کہ سفرنامے لکھنا نہ چھوڑوں۔ خوب اندازہ ہو گیا کہ الفاظ کس طرح سے ہم کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتے ہیں۔ کوشش کروں گا کہ آپ دوستوں کے لیے کچھ اور تحریر کروں مگر اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب میں خود ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ کے سحر سے باہر نکل آؤں۔ میں ان سب دوستوں کو دل سے سلام اور محبت پیش کرتا ہوں جو غلطی سے رہ گئے ہوں، ان سے معذرت خواہ میرے لیے سب محترم ہیں۔ حنیف ادیب (جن کا ذکر کرنا میں ہر بار بھول جاتا تھا) میرے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کے پڑوسی بھکر اور دریا خان کے رضا اعوان، قیصر خان اور ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، نزاہت افشاں (میں بھی آپ کو لڑکی سمجھتا تھا)، اعجاز احمد سفار، اعجاز حسین لدھیانہ آپ تینوں کا مطالعہ ماشاء اللہ بہت وسیع ہے۔ بشریٰ افضل، سدرہ بانو ناگوری (آپ نے تو مجھے ایک ٹی وی ڈرامے کا کردار بھی بنا ڈالا)، سید امتیاز حسین بخاری، آفتاب احمد نصیر اشرفی، دانش احمدانی، آرٹسٹ محمد عامر ساحل (جو خود محبت کرتا

جانتے ہیں)، کساز ہرا، رانا محمد شاہد (اللہ آپ کے والد کی مغفرت کرے، آمین)، اویس شیخ، منشی محمد عزیز، ناصر حسین رند، محمد ہمایوں تنولی، ظفر ندیم دہرہ، ساگر نکوکر، فائزہ افتخار، عبدالحکیم، زہرا فاطمہ اور کراچی کے دوست وکیل الرحمٰن صاحب سب کو سلام، اللہ نگہبان۔''

☆ رابعہ امجد کی آمد۔ ''میں نے سرگزشت کے لیے ایک سچ بیانی اور جاسوسی کے لیے ناولٹ بھیجا ہے۔ اب ایک اور ناول سرگزشت کے لیے بھیج رہی ہوں (آپ کی صرف ایک ساڑھے تین صفحے کی ''پراسرار قبرستان'' موصول ہوئی) ایک شکایت ہے کہ میں جب بھی فون کرتی ہوں کوئی ریسیو نہیں کرتا (بورڈ آٹومیٹک ہے جیسے ہی آواز آئے کہ کس سے بات کرنی ہے آپ اس شخص / شعبہ کا ایکسٹینشن دبا دیں یا کچھ دیر انتظار کریں، ریکارڈنگ ختم ہوتے ہی آپ کی کال ٹیلی فون آپریٹر کو منتقل ہو جائے گی پھر آپ آپریٹر کو بتا دیں کہ کس شعبے میں بات کرنی ہے)''

☆ محسن علی طاب کا تبصرہ۔ ''شمارہ نومبر 2018ء سرگزشت کا سرورق کہانیوں کی مناسبت سے ٹھیک تھا۔ خطوط سب کے اچھے تھے مجھے جن کی تحریریں اچھی لگی ان کے نام یہ ہیں۔ ''موت کا ہرکارہ'' از سید احتشام۔ سرزمین فرعون، یادوں کے دریچوں سے خوب صورت تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ''ناسور''، فائزہ کی ''کٹر وا سچ'' عمدہ تحریر، فضہ عادل کی سبق آموز تحریر ''نادان'' بھی خوب تھی۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ''جیسے کسی ڈرامے کے مختلف کردار اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں، ایسے ہی سرگزشت کا سرورق کہانیوں کے مختلف کرداروں کو نمایاں کر رہا تھا۔ سرورق کا یہ انداز بہت بھلا لگا۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ مسلمان ممالک کی عمومی صورتِ حال کا احاطہ کر رہا تھا۔ آج جتنے بھی اسلامی ممالک ہیں وہ کسی نہ کسی حوالے سے نفاق کی وجہ سے ٹکڑوں میں بٹے ہیں۔ پاکستان دنیا کی واحد اسلامی ایٹمی طاقت ہے اس لیے ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ تنازعات میں گھرے مسلمان ممالک کو قریب لانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں تاکہ مسلم امہ اتحاد کا بھرپور مظاہرہ کرے۔ آج پاکستان کی معاشی صورتِ حال عجیب ہے۔ مہنگائی کا ایک طوفان ہے جس میں عوام جکڑے جا رہے ہیں۔ ایک سے ایک بڑے معاشی ماہرین ہیں مگر ریلیف عوام سے دور ہے۔ ایسے میں آپ نے پاکستان کے پہلے معیشت دان کی زندگی کو یک طلعی سرگزشت کے طور پر پیش کیا۔ سر ویکٹر ٹرنر حقیقتاً ہمارے محسن تھے کہ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے انتظامی معاملات اور پاکستان کی معیشت کو جیسے سنبھالا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ''قشبر خیال'' میں کوثر اسلام نے صحیح لکھا سرگزشت ایک نشہ ہے۔ تحقیق کرنے اور مطالعہ کے رسیا افراد کے لیے سرگزشت واقعی ایک نشہ ہے۔ اعجاز حسین سٹھار، قیصر خان اور عبدالجبار رومی نے بھی اچھا لکھا۔ محمد مبارک خان نے جنگ تمبر کے حوالے سے اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی معلومات بھی فراہم کیں۔ سدرہ بانو ناگوری کی حکیم سید رضا کے حوالے سے تجویز اچھی لگی۔ سدرہ صاحبہ! سرگزشت کے لیے بھی کچھ لکھیں نا۔ زنیرہ شبیر کے خط سے اندازہ ہوا کہانی کن ہاتھوں سے گزر کر سرگزشت کے صفحات کی زینت بنتی ہے۔ کہانی کا معیار برقرار رکھنے کے لیے ایسا تو ہونا ہی چاہیے۔ جلیل احمد جعفری کے کہے سے اتفاق کرتا ہوں۔ علمی آزمائش یا اس جیسا کوئی سلسلہ ضرور ہونا چاہیے کیونکہ ایک معلوماتی جریدے کی پہچان معلوماتی سلسلہ بھی ہوتا ہے (آپ اور دیگر قارئین کی فرمائش پر ایک نہیں دو نئے سلسلے شروع کیے جا رہے ہیں)۔ اویس شیخ آپ کے تایا جان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ وہ حقیقتاً کتاب اور مطالعہ سے محبت رکھنے والے انسان تھے۔ فریدہ افتخار اور نزاہت افشاں آخر میں جگمگا رہے تھے۔ عاشقِ رسولؐ غازی علم دین شہید سے کون واقف نہیں۔ ایک عام انسان ہونے کے باوجود اس نے اپنے کام سے وہ مقام پایا کہ بلاشبہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کہہ اٹھے ''ایک ترکھان زادہ ہم سب پر بازی لے گیا'' جیل میں غازی علم دین کا چٹانی حوصلہ اور باوقار متبسم انداز پھر پھانسی کی کوٹھڑی میں صحت مند ہونا۔ یہ سب پڑھ کر یہی کہہ سکتے ہیں کہ بے شک عشقِ حقیقی کے سچے مسافر کے لیے ہر منزل آسان ہو جاتی ہے۔ زویا اعجاز کا اندازِ بیاں بہت اچھا لگا۔ زریں قمر نے معروف مصنفہ جے کے رولنگ کی زندگی پر زبردست تحریر لکھی۔ ہیری پورٹر سیریز کی تخلیق کار جن مشکل حالات سے گزر کر ایک عظیم مصنفہ بنی وہ ایک عزم، حوصلے اور مسلسل کوشش کا پتا دیتے ہیں۔ ''سنڈے ٹائمز'' کے مطابق جے کے رولنگ کی دولت کا تخمینہ 530 ملین پاؤنڈ لگایا گیا ہے جب کہ ہیری پورٹر سیریز کی عالمی برانڈ کی مالیت سات ارب پاؤنڈ لگائی گئی ہے۔ عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی نے انسانیت کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کرن صدیقی نے بلقیس ایدھی کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ بلقیس ایدھی کو مزید ہمت و حوصلہ دے کہ وہ یقیناً مصیبتوں و مشکلات میں گھرے انسانوں کے لیے ایک روشن ستارہ ہیں۔ وحید ریاست بھٹی ''قشبر خیال'' میں تو نظر نہیں آتے البتہ برصغیر پاک و ہند کے ایک بڑے مگر گمنام گلوکار کے بارے میں دلچسپ تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ سرگزشت کی یہ خاصیت ہمیشہ اسے ممتاز رکھتی ہے کہ یہ ان شخصیات کی زندگی پر تفصیلاً بتاتا ہے جنہیں نئی نسل تقریباً بھلا چکی ہے۔ انور فرہاد نے قارئین کی فرمائش پر شخصیات سے ہٹ کر ''قصہ پارینہ'' ہو جانے والی یادوں پر لکھا اور علی سفیان آفاقی کی یاد تازہ کر دی۔ انور فرہاد صاحب ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے کہ آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنے قارئین سے اتنی محبت رکھتے ہیں۔ شکاریات کے موضوع پر سید احتشام اپنی شاہکار تحریر کے ساتھ موجود تھے۔ ''قشبر خیال'' سے ہی اندازہ ہوا کہ ندیم اقبال صاحب کی ''شمشال سے ٹورنٹو'' اختتامی مراحل میں ہے۔ کہانی کے انداز میں سفرنامہ نگاری بہت کم کم ملتی ہے۔ یقیناً اس کے لیے سرگزشت اور ندیم اقبال مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سلمیٰ اعوان اردو ادب کا ایک معروف نام ہیں۔ دنیا کے معروف شاعروں پر ان کی تحقیق بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ اس دفعہ بھی وہ منفرد انداز کے ساتھ ایک

عرب شاعر ابو نواس کے ساتھ موجود تھیں۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا کراچی سے تجزیہ۔ "ایمانی جذبے سے سرشار کرتی "جوش ایمانی" پڑھتے ہوئے آنکھیں یہ سوچ کر ہی بار بار بھیگتی رہیں کہ مجھ ناچیز کو اس شخصیت پر پڑھنے کا موقع ملا جس نے عملی تفسیر بن کر دکھایا، ہمارے لیے تو پڑھنا ہی باعث تسکین تھا لیکن علم دین کے والدین، اقارب، علامہ اقبال اور قائداعظم کی خوش بختی کے کیا ہی کہنے کہ جنہوں نے علم دین کو قریب سے دیکھا، پرکھا۔ زویا اعجاز صاحبہ جیتی رہیے۔ بلقیس ایدھی کی سنجیدگی، متانت اور پروقار شخصیت کو دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ وہ بھی نٹ کھٹ، شوخ و شرارتی بھی رہی ہوں گی، "روشن ستارہ" میں ان کی زندگی کا یہ دلچسپ پہلو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ بچپن میں سارے بچے ایک سے ہی ہوتے ہیں لیکن آج بلقیس صاحبہ جس مقام پر ہیں وہ مقام بھی ہر ایک کو نہیں ملا کرتا۔ ایدھی صاحب تو چلے گئے لیکن ہم دعا گو ہیں کہ مسز ایدھی کا سایہ تا دیر ان کے ان اپنوں پر قائم رہے جن کا کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ جے کے رولنگ پر متعدد بار پڑھا مگر جو لطف لفظوں کی ساحرہ کے عنوان سے سرگزشت میں پڑھتے ہوئے ملا اس پر جے کے رولنگ کا یہ جملہ ہی تبصرے کے لیے کافی ہے کہ "کبھی ناکامیوں سے مایوس مت ہونا اپنی ناکامیوں سے سبق لینا سیکھیں، انہی سے آپ کو کامیابیوں کے راستے ملیں گے" ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی "ناسور" خاصی سنسنی خیز اور سسپنس سے بھرپور رہی، جرائم کی دنیا کے تین بڑے ناسور ہمارے ہیرو کے شکنجے میں بالآخر آ ہی پھنسے۔ را کا تو خیر انجام کو پہنچ گیا لیکن باقی دشمنوں کو بھی کسی طور معافی نہیں ملنی چاہیے۔ "شمشال سے ٹورنٹو" جوں جوں اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے دل بھی کچھ اداس اداس سا ہے کیونکہ ہم پورا مہینا اسی انتظار میں گزارا کرتے تھے کہ کب سرگزشت آئے اور کب ہم سفرنامہ پڑھیں۔ ندیم بھائی ہم آپ کو، سرجی، مفتی، مطیع، شہباز، نسرین اور ٹورنٹو کی فضاؤں کو بہت مس کریں گے اور آپ یہ وعدہ کریں کہ جلد ہی آپ کوئی نیا سفرنامہ شروع کریں گے اور جب تک سفرنامہ شروع نہیں ہو جاتا آپ "معبر خیال" میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہیں گے۔ جہاں تک بات نسرین اور آپ کے تعلق کی ہے مجھے نہیں لگتا کہ آپ نے نسرین سے شادی کی ہو گی۔ پہلی سچ بیانی سرگزشت کے مزاج کی ہرگز نہیں تھی۔ البتہ "کام کا بندہ" کچھ کام کی تحریر تھی۔ محترمہ فضہ عادل آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں لیکن میری آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اپنے انداز تحریر کو بدلیے جن موضوعات پر آپ کھلے کھلے لفظوں میں لکھ رہی ہیں وہ کسی طور درست نہیں۔ اُمید ہے میری رائے پر غور کریں گی۔ قابل احترام جناب انور فرہاد صاحب اتنی ضعیفی میں ڈھیروں ڈھیر معلومات اکٹھی کرنا اور انہیں قارئین تک پہنچانا یقیناً آسان نہیں ہو گا لیکن اس کے باوجود آپ ناغہ کیے بغیر مسلسل لکھ رہے ہیں ہم آپ کی اس کاوش پر آپ کے شکر گزار ہیں۔ "معبر خیال" کے ساتھیوں کا شکریہ کہ میرے تبصرے کو پسند کرتے ہوئے اپنی رائے سے نوازا لیکن رانا شاہد کی کھچڑی والی بات کچھ عجیب سی لگی۔ شاہد بھائی آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ ہمارے ہاں کھچڑی عموماً بچے، بوڑھے یا پھر بیمار کھاتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ وہ مجبور ہوتے ہیں ٹھوس یا پھر دیگر غذائیں ان کے لیے مناسب نہیں ہوتیں۔ یہی حال سرگزشت کا ہوا پچھلے دنوں ہمارا عزیز ترین سرگزشت کاغذ کے بحران کا شکار تھا۔ اس دوران اگر لکھائی باریک کرنے کا مشورہ دیا گیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس تجویز پر اگر عمل کرلیا جاتا تو ہم ادارے کی مجبوری سمجھ کر اس پر بھی گزارہ کر لیتے۔ محترم اقلیم علیم آپ کا نام پہلی بار نگاہوں سے گزرا، جناب آپ نے بتایا کہ آپ 2006ء میں لکھا کرتے تھے، اس وقت تو خیر سے میں سرگزشت کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی۔ میں نے 2010ء میں باقاعدگی سے سرگزشت پڑھنا شروع کیا تھا اس لیے آپ جلد لکھنا شروع کریں تاکہ ہمیں بھی اندازہ ہو کہ آپ کا ذوقِ تحریر کس طرح کا ہے۔ (اقلیم علیم کا نام محتاج تعارف نہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوں یا طویل سلسلے قارئین کو اس طرح سے جکڑ لیتے تھے کہ قاری ایک ایک دن گن کر انتظار کیا کرتا تھا)"

☆ رازق بخش ذکی اہیر جلال پور پیروالا ضلع ملتان سے لکھتے ہیں۔ "ایک دوست کے مشورہ پر پہلی بار اکتوبر کا ماہنامہ سرگزشت خریدا۔ اتنا پسند آیا کہ اگلے شمارے کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ نومبر کے سرگزشت میں پہلے "جوش ایمانی" پڑھی۔ زویا اعجاز کی محنت کا بے حد شکریہ۔ "شمشال سے ٹورنٹو" کی اس قسط میں بھی ندیم اقبال اور نسرین کی محبت کا کوئی انجام نہیں نکلا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت جیت جاتی ہے یا ندیم کی بیوی کا ردعمل آڑے آجاتا ہے؟ یہ سفر کی کہانی جو محبت کی کہانی بھی ہے خوب صورت جارہی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے اور پڑھنے والا بھی اپنے آپ کو مسافر سمجھتا ہے اور سفر کا لطف حاصل کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر "ناسور" کئی کرداروں اور کہانی در کہانی کے باوجود اچھی تحریر ہے۔ اب تو یہ حیرت انگیز موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ پہلی آپ بیتی "کڑوا سچ" بہترین ہے۔ پلان کے ساتھ یا جیسے بھی تلخ حقیقت کی طرف اشارہ وہ عورت نہ کرتی تو فائزہ اور جنید کی شادی ہونا شاید مشکل تھی۔ "ہمدرد دشمن" میں ہمدردی تو حد سے زیادہ کی گئی تھی، نقصان کے خدشات عین ممکن تھے لیکن جب شاہد نے احسان کا بدلہ اتارا تو واقعی یہ ظاہر ہے کہ کسی انسان کو سمجھنا مشکل ہے۔ نیلم تو "نادان" لڑکی تھی جس نے اپنے والدین کی عزت کی لاج نہ رکھی، اپنے آپ کو بے رحم جنید کے حوالے کر دیا ہے۔ نیلم تو اندھی تھی اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن جنید ایک مجرم اور ظالم انسان نکلا جس کی بے وفائی سے نیلم اب اک زندہ لاش کی طرح جی رہی ہے۔ بہرکیف سرگزشت میں جگ بیتیاں آپ بیتیاں سفرنامے دیگر مضامین، معلومات سبھی بہترین پُرلطف اور دل پسند ہوتے ہیں۔ ٹائٹل دلکش اور اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔"

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا پیام بورے والا سے۔ تمام رسالوں سے منفرد رسالہ سرگزشت ہے اس کے جیسا تو واقعی کوئی نہیں ہے۔ ایسی دنیا جہاں کی معلومات اور خوب صورت تحریریں قاری کا دل موہ لیتی ہیں۔ "گاڑی کسی اسٹیشن پر بھی رکے تو لوگوں کو

روتے مت دینا، ورنہ میری روح کو تکلیف ہوگی۔" شاتم رسولؐ راجپال کو جہنم رسید کرنے والے غازی علم دین شہید اطمینان و سکون ا
خوشی خوشی مقتل کو روانہ ہوئے۔ یہ انہی کا جوش ایمانی تھا کہ علامہ اقبال نے بھی فرمادیا کہ ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا تے اسی گلاں ا
کردے رہ گئے۔ زویا اعجاز کی تحریر زبردست رہی۔ بچپن کی شوخ و شنگ اور آج کی عہد ساز شخصیت بلقیس ایدھی پر ہم جتنا بھی فخر کریں
ہے۔ یقیناً وہ پاکستان کا روشن ستارہ ہیں جو ایدھی کے جانے کے بعد بھی عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار اپنے مشن کو کامیابی سے ج
رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے "کہ اب مطرب کے تاروں کو بڑی تکلیف ہوتی" دلوں کو جھنجوڑنے والے تار جب بھی کبھ
سننے کو مل جائیں تو یاد دگیری میں تکلیف تو ہوگی۔ پنج ملک کی تحریر عمدہ رہی۔ موت کے ہرکارے ہاتھی نے بھی خوب تباہی مچائی۔ جونی ا
دوست کو کھو بیٹھا اور پھر ہاتھی کے بارے میں اس کی چالاکیاں مکاریاں اور وحشیانہ انداز کے ساتھ دوسری معلومات بھی ملیں۔ اس
جنونی انداز سے حملہ کرنا ہی انسان کے سٹی گم کردینے والی بات ہے یہ شکاریات کی تحریر نے سمجھادیا۔ "شمشال سے ٹورنٹو" اختتام پر بھ
آگئی۔ حیرت ہے اور دوسری حیرت نسرین کی شرط پہ ہوئی کہ ندیم انکل کے بیوی بچے آنے کے بعد ہی شادی کریں گے۔ واہ زبردست
شرط ہے۔ اب یہی سسپنس رہ گیا ہے کہ آیا اب شادی بھی ہو پائے گی یا نہیں، بس یہی سوچ کر سفرنامے کا اختتام کچھ اچھا نہیں لگ رہا
سرزمین فرعون کی سیر کا حال بہت دلچسپ تھا۔ فراعنہ کے مقبروں کے عجیب و غریب احوال اور مصر میں سیر و تفریح کی دلکش رعنائیاں
سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہیں بہت اچھا لگا۔ کاش ایسا پاکستان میں بھی سیاحت کا شعور اجاگر ہوجائے۔ ہمارا وطن بھی سیاحت کے اعتبا
سے کسی ملک سے کم نہیں۔ ایسی ہی باتیں سوچ کر ملکی قیادت سے شکوہ رہتا ہے کہ خوب صورت وطن کو مزید خوب صورت کیوں نہیں
بناتے۔ مچھلیوں اور مینڈکوں کا تو سنا تھا کہ ان کی بھی برسات ہوتی تھی کہیں نہ کہیں اور باران عجب کے واقعات کو بھی نہیں جھٹلایا جاسکتا
قدرت کے اسرار ہیں کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ پہلی سچ بیانی میں جہاندیدہ فائزہ رشتے داروں کی چالاکیاں تو خوب سمجھ رہی تھی لیکن بولنا
رائے دینا مناسب نہ سمجھتی۔ مباداہ کچھ اچھا ہی ہوجاتا، اس نے خود تو اپنے والدین کے لیے بیٹا بن کر دکھا دیا لیکن جو بیٹے تھے و
والدین سے منہ موڑ گئے۔ باقی فائزہ کی شادی میں کڑوے سچ نے خوب کردار ادا کیا ورنہ امی نے تو اسے ابھی بٹھائے ہی رکھنا تھا
عمدہ کہانی ہے۔ "وچولن" بہت اچھی لگی۔ خالہ زینب کو اس کی خدمت کا بہت اچھا صلہ ملا اور پھر اس کے کردار سے متاثر ہوکر ثمینہ بھی
جذبہ خدمت خلق اور ثواب کی نیت سے وچولن بن گئی کیونکہ ایک وچولن ہی کے توسط سے اسے بھی بہت اچھا بر اور گھر مل گیا تھا۔ عمد
کہانی، بہت اچھی لگی۔ "نادان" نے افسردہ کردیا بےچاری نیلم کے ساتھ بہت برا ہوا۔ ظاہر اس کا ذمہ دار جنید ہی ٹھہرے گا جو وعد
وفا کرکے بھی اسے نہ اپنا سکا۔ وفا کی دیوی کیسر نے سجاول کے لیے گھر بار بچے چھوڑے اور اپنا مذہب بھی لیکن آخر میں کیسر سے سکین
بننے والی کو سوتن کا دکھ برداشت کرنا پڑا اور سجاول کی بے رخی بھی، یوں صوم صلوٰۃ کی پابند سکینہ نے ظلم برداشت کرتے جان دے دی
ہاں اپنی عاقبت ضرور سنوار گئی۔ "بےنشان" اچھی تحریر تھی۔ شاہ میر کتنے ہی شیطانی گل کھلانے کے بعد اب نومی کے ہاتھ آیا تو اب و
اسے گلے کی چھچھوندر لگنے لگا ہے جو نومی کو پھر سے فہیم اور فوزیہ کی خیر منانے سے ڈرا رہا ہے۔ "ناسور" زبردست جاری ہے۔
سرگزشت کی باقی تحریریں بھی بہت عمدہ رہیں۔ "شہر خیال" سے کوثر اسلام کو بھرپور تبصرے پر مبارک باد۔ رضا احمد خان نے بھی عم
تبصرہ کیا۔ محمد مبارک خان، رانا محمد شاہد، اعجاز حسین سٹھار، اظہر اسلام خان، سدرہ بانو ناگوری اور نزاہت افشاں کے بھرپور تبصرے
ایک سے بڑھ کر ایک رہے۔ اس کے علاوہ فریدہ افتخار، اویس شیخ اور صوبی شاہ کے تبصرے بھی اچھے رہے۔"

☆ عبدالحکیم ثمر کراچی سے رقمطراز ہیں۔ "سرگزشت اپنے قارئین کی ذوق مطالعہ کو جہاں تسکین دیتا ہے وہیں مجھ سمیت اپنے انگنت
شیدائیوں کے بے قرار دلوں کو قرار بھی بخشتا ہے۔ مایوسیوں اور ناکامیوں کے آگے سرنگوں ہونے کی بجائے انہیں سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ بھی د
ہے۔ اس کا ہر نیا شمارہ میرے لیے تازہ ہوا کا ایک جھونکا کی مانند ہے جو میرے اندر کا گھٹن اور بے قراری کو اپنے ساتھ اڑا لے جاتا ہے، پھر می
ہوتا ہوں اور میری تڑپتی سسکتی تنہائی۔ سرگزشت کی تمام تحریریں ہر مضامین ایک سے بڑھ کے ایک ہوتے ہیں۔ زویا اعجاز صاحبہ کی "جوش
ایمانی" بے شک ہر صاحب ایمان کے جذبہ ایمانی میں طلاطم پیدا کرنے والی تحریر ہے۔ یہ نئی نسلوں کے لیے تحفہ خاص ہے۔ زریں قمر صاحب
"لفظوں کی ساحرہ" نے اپنے آپ کو واقعی ساحرہ ثابت کردیا۔ انتھک محنت، کوشش اور جدوجہد کی۔ خدمت ایثار اور انسانیت کا روشن ستارہ،
کبھی ٹوٹنے والا نہ بادلوں میں چھپنے والا۔ کرن صدیقی کا ایدھی صاحب کو خراج عقیدت۔ وحید ریاست بھٹی کا "مطرب" بے زبان فلموں سے
بازبان فلموں تک کا سفر، فلم اور فنکاروں کے شائقین کے لیے معلومات کا ذخیرہ ہے۔ جناب انور فرہاد کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس پیرانہ سا
میں بھی قلم کا ساتھ نبھائے جارہے ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم آپ کے ساتھ ہے۔ اللہ آپ کو صحت اور پُرسکون زندگی عطا کرے
آمین۔ ایک زمانہ ہوا عظیم پورہ کے گورنمنٹ نیو مارکیٹ میں آپ سے اکثر ملاقات ہوجاتی تھی۔ شروع سے ہی میں آپ کا قدردان رہا ہوں
وہاں ہفت روزہ "چترالی" ہو یا یہاں ہفت روزہ "نگار" اور اب سرگزشت آپ کا بیش بہا معلوماتی سلسلہ "فلم نگری" تجدید یادِ رفتہ ہے۔ بیت
دنوں کی کہی ان کہی کہانیاں بھولے بسرے نغمات، وقت کی گود میں آئے ہوئے چیدہ چیدہ معلومات میرے جیسے نہ جانے کتنے، بوڑھوں
لڑکپن اور جوانی کے بیتے ہوئے دن جگمگا اٹھتے ہوں گے۔ "قصہ پارینہ" متحدہ پاکستان سے موجودہ پاکستان کی پہلی فلموں کی انسائیکلوپیڈیا ہے
"شمشال سے ٹورنٹو" کی لوفلائٹ بس اب لینڈ کرنے ہی والی ہے۔ ندیم صاحب اپنا سفر تیزی سے اختتام کررہے ہیں قارئین کا تجسس ا

کہیں تیز قلانچیں بھر رہا ہے'ان کے لبوں پر ایک ہی سوال ہے'اب کیا ہوگا؟ کیونکہ حالات اب مزاحمتی رخ اختیار کررہے ہیں۔ وہ اس طرح دوستی کو بڑے قرینے سے پیار میں ڈھالنے والا وسوسوں میں گھر گیا ہے ''شادی کردگی نا؟'' جواب مشروط آمادگی جب کہ بیوی کی چیتاؤنی یں آکر سب ٹھیک کردوں گی'' شوہر کا معنی خیز مشورہ ''یہ مت کہو کہ صرف تمہارا رہوں گا۔'' اس تناظر میں انجام کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ''یہی تک'' یا پھر کچھ بھی'' نہ ملا حسرت کے سوا'' مگر حتمی فیصلہ تو مقدر کے ہاتھوں میں ہے وہ کسے کیا دیتا ہے یہ تو نصیب کی بات ہے۔ صدر مشہر یں کوثر اسلام اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ نمایاں رہے۔ محمد مبارک خان کا معلوماتی تبصرہ خوب تھا۔ عبدالجبار روی انصاری، قیصر خان، اظہر م خان بھی کسی سے کم نہیں رہے۔ تبصرے ان کے بھی قابل ستائش تھے۔ رانا محمد شاہد صاحب تو سینئر قلم کار ہیں ان کا کیا کہنا۔ انہیں بھی دلچسپی پڑھتا ہوں۔ نزابت افشاں، اعجاز حسین سٹھار، محترمہ سدرہ بانو ناگوری، سید امتیاز بخاری ان سبھوں کی کیا تعریف کروں یہ سب تو ''مشہر ں'' کے ہیرے ہیں۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ''چیف صاحب چینی جنرل سن زو کا یہ کہنا کہ دشمن سے لڑے بغیر اس کی ت مدافعت ختم کردی جائے یہ بہترین فتح ہے۔ آج کا عالم اسلام اپنی مدافعت میں کمزور ہوچکا ہے اگر ہم اپنی حالت ہی دیکھ لیں تو اس کی عملی بر نظر آتے ہیں۔ کہنے کو ہم ایٹمی قوت ہیں، ہماری فوج دنیا کی بہترین فوج ہے لیکن ہمارے سیاسی رہبر و رہنما ایسے ہیں کہ ذاتی مفادات کا طوق کی گردنیں اغیار کے سامنے اس طرح سرنگوں رکھتا ہے کہ جیسے ہم مفتوح ہیں۔ ہماری معیشت کو اس وقت سر وکٹر ٹرنر جیسے محسن کی ضرورت ہے یں قائداعظم نے پاکستان کا پہلا فنانس سیکریٹری مقرر کیا تھا۔ نومبر کا شمارہ معتبر ہوگیا۔ غازی علم دین شہید کے جوش ایمانی کی وجہ سے ہماری ں بختی کہہ لیں کہ ان کے مزار پر حاضری کی سعادتیں ہمارا مقدر بنیں۔ زویا اعجاز کو سلام عقیدت۔ ''لفظوں کی ساحرہ'' جے کے رولنگ کو ہیری رسیریز نے عالمی مصنفوں کی فہرست میں لاکھڑا کیا۔ زرین قمر کی کھوج کو سراہے بغیر گزارہ ہی نہیں ہے۔ کرن صدیقی ''روشن ستارے'' لے کر یں۔ ہر چند کہ بلقیس ایدھی ان کروڑوں خواتین میں سے ایک ہیں جنہیں عبدالستار ایدھی جیسا ہمسفر ملتا ہے اور یہ عبدالستار ایدھی کی خوش قسمتی تھی انہیں بلقیس ایدھی ملیں اور وہ ایدھی نام کو رہتی دنیا تک کے لیے امر کر گئے۔ کبریٰ اور فیصل کی خوش بختی میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے کہ وہ بلقیس و ی کی اولادیں اور اپنے والد کے مشن کی تکمیل میں انسانیت کی اوج ثریا کو چھو رہے ہیں۔ وحید ریاست بھٹی بھی خیر سے برصغیر کے فلمی سمندر پنج ملک جیسے گوہر نایاب موتی نکال لائے ہیں۔ ''مطرب'' ان کی عرق ریزی کی دلیل ہے۔ انور فرہاد بھی ''قصۂ پارینہ'' سنا رہے تھے۔ برصغیر و ہند کا فلمی سفر آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ کا خاصا رہا ہے لیکن انور فرہاد نے واقعی یادوں کے در کھول دیے۔ ندیم اقبال کا شمشال سے وع کیا گیا سفر ٹورنٹو میں اختتام پذیر ہونے کو ہے پڑھ کر جدائی کے خیال نے افسردہ کردیا۔ ندیم اقبال سے ہماری محبت شدید تر ہوگئی ہے۔ ں کسی نہ کسی صورت میں ہم سے وابستہ رہنا ہوگا۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ انگلینڈ کا بانی ولیم غیر انگریز شخص تھا۔ سرزمین فرعون اور یاران عجب کی ح فاتح بھی بہت معلوماتی تحریر تھی۔ اس مرتبہ بھی سلمیٰ اعوان کا ابونواس سے رومانس بہت بھایا جداگانہ اور بالکل ہی منفرد انداز تحریر ہے۔ سلمیٰ ان کے قلم کو سلام۔ ''ناسور'' نے اب اپنی گرفت میں لینا شروع کردیا ہے۔ کڑوا سچ، بے نشان اور انجام اچھی سچ بیانیاں تھیں۔ اب آتے ہیں ہر خیال'' کی طرف جناب اقلیم علیم کی طرح جناب محمود احمد مودی بھی ہمیں عزت بخش دیں تو نوازش ہوگی۔ کوثر اسلام کو خوب صورت تبصرے ساتھ اولیت حاصل تھی۔ ہم اس ماہ اپنے نہ ہونے کا رونا رو کر رہ گئے۔ ہمارا تبصرہ تقریباً سبھی ساتھیوں کو ہمارا دل رکھنے پر مجبور کردیتا ہے۔ خدا پ سب کو خوش رکھے۔ ہماری تجاویز بھی سب کو پسند آتی ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ جب بھی ''مشہر خیال'' کے ساتھیوں کے تعارف والا سلسلہ وع ہو تو سب سے پہلا تعارف جناب رانا محمد شاہد کا شائع ہو اور خواتین میں یہ اعزاز محترمہ بشریٰ افضل کے حصے میں آئے وجہ قابلیت' جے رانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

☆ ارشد ابرار کا مختصر نامہ۔ ''میں آپ کے میگزین کے لیے اپنا افسانہ بھیجنا چاہتا ہوں جو کہ ایک معمر ادیب کی زندگی پر لکھا گیا ہے۔ کیا پ کا ادارہ مرد لکھاریوں کی تحاریر شائع کرتا ہے؟ (شوق سے بھیجیں۔ پڑھ کر بتا دیا جائے گا کہ تحریر شائع ہوگی یا نہیں)۔''

☆ نامعلوم مقام سے نامعلوم قاری کا خط (بھائی خط میں نام تو لکھ دیتے)۔ ''اداریہ میں انکل معراج نے جو نفاق کی صورت کو وکرنے کی بات کی اس کی امت مسلمہ کو بہت ضرورت ہے اور پاکستان کو تو زیادہ ضرورت ہے جہاں پر ہر سطح پر نفاق کا بول بالا ہے۔ یک ں میں پاکستان کے محسن معاشیات کے بارے میں پڑھا۔ اس کی خدمات پر ستارہ امتیاز ملا، خوشی ہوئی۔ ''مشہر خیال'' میں پیارے دوست م کی طرح بیٹھے ہیں جی ہاں کوثر اسلام صاحب۔ ان کا اعلیٰ پایا کا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ بہت مبارک ہو کرسی صدارت کی۔ ان کے علاوہ دیگر ستوں کے تبصرے بھی پسند آئے۔ نئے لوگوں میں بہترین تبصرے میں میرے پڑوسی ضلع لیہ کے محمد مبارک خان، اظہر اسلام خان، فریدہ ر صاحبہ نے بھی اچھا لکھا۔ ان کے علاوہ نزابت افشاں، سدرہ بانو، حاجی اعجاز، رانا شاہد، پروفیسر صاحب کے تبصرے بھی پسند آئے۔ ی علم دین شہید کے بارے میں بہت خوب صورت مضمون پڑھنے کو ملا۔ ہیری پورٹر کی مصنفہ کے بارے میں بھی جاننے کو ملا۔ جے کے لنگ نے کمال کے ناول لکھے ہیں۔ ''روشن ستارہ'' پاکستان کی بہت بڑی سماجی شخصیت اور روحانی شخصیت کے بارے میں معلومات صل ہوئیں۔ باران عجب نے کافی دیر حیرت میں رکھا کہ ایسا ہوا تھا۔ وحید ریاست بھٹی نے بھی کافی اچھا مضمون لکھا بہت اعلیٰ تھا۔ اس بار

انور فرہاد کے مضمون میں دلچسپی کے تمام عنصر شامل تھے۔ سید احتشام نے اس بار شکار کی کہانی اور وہ بھی ہاتھی کے بارے میں خوب لکھ... انکل ندیم اقبال کے سفرنامہ نے اس بار بھی اپنا سحر برقرار رکھا، کار بھی خرید لی۔ شمیم الدین غوری، سلمٰی اعوان طارق عزیز خان، ڈا... عبدالرب بھٹی بہت اعلیٰ تحریر لائے۔''

☆ طاہر کریم نے خان گڑھ مظفر گڑھ سے لکھا ہے۔ ''ادبی منبع سرگزشت سے استفادہ کرتے ہوئے پورے دس سال بیت ... ہیں مگر پہلی مرتبہ دماغی ہلچل کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا خیال آیا ہے۔ امید ہے قارئین و معاونین ''دیر آید درست آید'' کے مصداق و... ضرور کریں گے۔ سرگزشت علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ شمارہ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ گزشتہ چند شماروں می... پرچے کی قیمت بڑھانے کا بتایا گیا۔ ہم نے خوشی سے اس آفر کو قبول کیا۔ موجودہ قیمت بھی اس جوہر نایاب کی شان کے خلاف ہے... بہرحال جو ہوا اچھا ہوا۔ جناب ذاکر حسین کی رحلت افسوس ناک واقعہ ہے، بہرحال موت تو اٹل حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے اہل خا... کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ نومبر کے شمارے کا ٹائٹل آنکھوں کو بہت بھایا۔ سفرنامہ بقلم ندیم اقبال خوب ہے۔ جناب کی بدولت ٹور... اور گرد و نواح سے خوب واقفیت ہو رہی ہے۔ قدرت کے رنگوں کو الفاظ میں پرونا ان کا ناقابل مثال کارنامہ ہے۔ دیکھیے نسرین اور ند... صاحب کا ملاپ ہوتا ہے کہ نہیں۔ ''جوش ایمانی'' تحریر کردہ زویا اعجاز، ایک دلربا تحریر تھی۔ زویا اعجاز کا منفرد اور اچھوتا انداز تحریر لفظوں می... گم کر دیتا ہے۔ غازی علم دین پر مفصل تحریر ان کا نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ظاہر کرتا ہے۔ ناموس رسالت پر جان ... نذرانہ پیش کرنا مسلمانوں کا وتیرہ رہا ہے۔ جناب عاقب اشعر نے اپنی کاوش ''باران عجب'' میں دنیا کے اسرار و رموز سے روشناس کرایا... شکاریات میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ سید احتشام نے بہت ہی خوب صورت انداز میں ہاتھی کی سفاکی سے آشکار کرایا۔ ہاتھی کے بار... میں پہلی مرتبہ خونچکاں تحریر پڑھنے کو ملی وہ بھی اپنے پسندیدہ رسالہ یعنی سرگزشت میں۔ پلیز اس موضوع پر ہر ماہ ایک تحریر شائع کیا کریں... ''سرزمین فرعون'' جناب شمیم الدین غوری کی معلومات سے لبریز تحریر تھی۔ دنیا کے اس عجوبے کو دیکھنا ہر اہل ذوق کی خواہش ہوتی ہے... بہرحال بہت کچھ اس تحریر سے معلوم ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے نکلی ہوئی دلکش تحریر ''ناسور'' ہر موڑ پر رنگ بدلتے ہوئے نظر آ رہ... ہے۔ سچ بیانیاں اپنے اندر سبق سموئے ہوئے ہیں۔''

☆ اویس شیخ کا خلوص نامہ۔ ''اس مرتبہ اداریہ میں آپ نے جس مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے کہ کسی بھی قوم کو نفسیاتی طور پر ختم کرنا، اس ک... سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کرنا ہے۔ ''مقدمہ ابن خلدون'' میں ایک جگہ لکھا ہے جب اللہ کسی قوم سے ملک چھیننا چاہتا ہے تو اس قوم میں بر... اخلاق اور گندی عادتیں پیدا فرما دیتا ہے، اس لیے وہ لوگ خوبیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے ''جب ہم کسی قوم کو ہلاک کر... چاہتے ہیں تو اس میں مالداروں کی کثرت کر دیتے ہیں پھر وہ اس میں بداعملیاں کرتے ہیں اور ان پر عذاب واجب ہو جاتا ہے، پھر ہم اسے پوری طر... تباہ کر ڈالتے ہیں۔ بحیثیتِ پاکستانی قوم اس وقت ہمیں اتحاد کی ضرورت ہے۔ دشمن ہم سے کہیں زیادہ چوکنا ہے، ہماری معمولی سی لغزش ہمیں تباہی ک... دہانے پر پہنچا سکتی ہے۔ ''محسن معیشت'' سے تعارف پہلی بار ہوا۔ عہدہ چھوڑ دینے کے بعد بھی ان کی ملک سے محبت پر رشک آتا ہے۔ ان کا نام... زندگی ہر آنے والے وزیر خزانہ کو پڑھنا چاہیے کہ پاکستان کا ماضی اسحاق ڈار نہیں بلکہ سرو یکسٹر ٹرنر تھے۔ ''جوش ایمانی'' پڑھتے ہوئے آنکھیں کئی بار نم... ہوئیں۔ یہ ایک یادگار دستاویزی مضمون تھا۔ سچ پوچھیں تو عشاء کی نماز مس ہو رہی تھی، مضمون ادھورا چھوڑنے کو دل ہی نہیں کیا۔ ''لفظوں کی ساحرہ'' ... تعارف بہت خوب تھا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے سبق تھا جو اپنی تحریریں شائع نہ ہونے پر ایڈیٹر صاحبان کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ جے کے رولنگ... نے جس قدر محنت و مشقت اور مشکلات کے ساتھ کامیابیوں کا سفر طے کیا، حیرت انگیز کتھا تھی۔ اس سے میں نے سبق سیکھا کہ کامیابی آسانی سے نہیں... ملتی۔ بقول شخصے کہ اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو کام کرنا پڑے گا پھر ہی آپ کامیاب ہو سکیں گے۔ ''روشن ستارہ'' بھی زبردست... اسٹوری تھی۔ ''باران عجب'' بھی منفرد تحریر تھی۔ سب سے زیادہ خوفناک بات آسمان سے خون برسنا تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ ''قصہ پارینہ'' کا ابتدائی... پیراگراف نظروں سے گزرا۔ انکل ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، مجھے اس بات کا اندازہ ضرور ہے کہ قارئین تک... معلومات فراہم کرنا بہت وقت طلب کام ہے۔ مالک آپ کے علم، قلم، ہاتھوں اور دماغ کو توانا رکھے۔ (آمین)۔ ''ابونواس'' بھی بے حد خوبصورت... سفر کہانی تھی۔ سلمٰی اعوان کا خود کلامی کا انداز پسند آیا۔ ''فاتح'' بھی معلوماتی مضمون تھا۔ سچ بیانیوں میں ''کڑوا سچ'' میں ایک مکمل معاشرتی منظرنامہ کی... جھلک دیکھنے کو ملی کہ کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ تنہائی کے عذاب سے بچنے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اولاد کی... خوشیاں کو پس پشت ڈالنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ خدا کرے ایسا وقت کبھی بھی کسی پر نہ آئے۔ رؤف اسلم کی ''دو کوڑی کے لوگ'' پڑھی، دردناک کہانی تھی... آخری صفحہ نے تو رلا ہی دیا تھا۔ ''ہمدرد دشمن'' پڑھی۔ وکیل صاحب اس بات کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے شاہد کی موت سے پہلے اس سے کوئی تلخ... بات نہیں کی، ورنہ انہیں اس بات کا بھی عمر بھر پچھتاوا رہتا۔ ''بے نشان'' متاثر نہیں کر سکی، اوپر سے ہی گزر گئی۔ ''نادان'' پڑھی۔ یہ صرف چھ سال پہلے کا... واقعہ ہے۔ لڑکی کا تعلق ماڈرن فیملی سے تھا، پھر ظاہری طور والدین بھی پڑھے لکھے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں اس بچی کے ساتھ جو ظلم اور سلوک درندے... جنید نے تو کیا، سو کیا، اس میں والدین بھی قصوروار ہیں۔ کیا یہ والدین کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زمانے کی خرابیوں سے آگاہ کریں؟ قابل... رحم ہے وہ لڑکی جو شادی کے جھانسے میں آ کر اپنے آپ کو کسی دوسرے کو سونپ دیتی ہے۔ ''کام کا بندہ'' میں خورشید صاحب کی سادگی پر لطف اندوز ہوا... ''انجام'' پڑھی۔ کافی عرصے بعد اپنے ہم نام کردار کی کہانی پڑھی، ہماری فیلنگ بہت عجیب سی تھی۔ ''عظمت کے نشان'' پیچیدہ، گنجلک اور بور کر دیے

ں کہانی تھی۔ ''وچولن'' پڑھی۔ انکل سب سے پہلے تو مجھے وچولن لفظ کا مطلب بتائیں۔ میں نے اردو لغت میں بھی دیکھا تھا لیکن وہاں ملا نہیں ہے۔ اس
ستان میں خالہ زینب کا کردار بہت متاثر کن، دلفریب تھا۔ مجھے یہ کہانی تین عورتیں، تین کہانیاں کے مصداق نظر آئی اور نورین نے جس کام کا بیڑا
یا قابل ستائش ہے۔ (وچولن رشتہ کرانے والی کو کہتے ہیں۔ یہ فصیح لفظ نہیں بول چال کا لفظ ہے) آخر میں تھوڑا سا تبصرہ پچھلے ماہ کی ٹائٹل اسٹوری
غ ندامت'' پر کرنا چاہتا ہوں۔ میں دل سے یہ بات سمجھتا ہوں کہ اس واقعہ میں قصوروار ڈاکٹر صاحب ہیں اور نہ ہی پشمینے ہے۔ دونوں حالات اور
ت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے، دونوں کی محبت، لگن اور تڑپ سچی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی تقدیر کا حصہ تھا۔ پارچہ
ت میں محمد شہزاد اور عبدالخالق بھٹی کی کاوش پسند آئی۔''

☆ رضا احمد اعوان کا اظہار خیال دریا خان بھکر سے۔ ''16 دسمبر 2014ء آرمی اسکول کے سانحے کو 4 برس بیت گئے۔ آج بھی
ں دکھ بھرے دن کی یادیں دل میں ایک طوفان سا برپا کر دیتی ہیں۔ آج ہم سب پاکستانی اس دن کی مناسبت سے شہداء کی ماؤں کے حوصلوں
سلام پیش کر رہے ہیں لیکن دامنِ تحریر والفاظ میں وہ گنجائش نہیں کہ ننھے شہداء کے والدین پر گزری قیامت کو رقم کر سکیں۔ بلاشبہ ان ننھے شہداء
ے عالی کردار کو کوئی قلم کار الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا ان شہیدوں کا لہو ایک امانت بھی ہے جو اگلی نسلوں کو منتقل کرنا امر لازم ہے۔ یہ قاتلوں کے
وف استغاثہ بھی ہے جسے بلند کرنا ہر ذی روح پر فرض ہے۔ یہ وہ نوحہ ہے جو مظلوم کے حق کی آواز ہے جسے ابد تک ہر ساعت تک پہنچانا ہماری
ے داری ہے۔ اس جاں سوز سانحے نے جہاں پورے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لیا، وہیں دنیا بھر کا ہر فرد معصوم جانوں پر اس بربریت کو دیکھ کر
پ اٹھا۔ قلم و کتاب سے دشمنی کا یہ پہلا قصہ نہیں۔ دنیا بھر نے دیکھا کہ کیسے اسکولز کو دھماکوں سے اڑا دیا گیا۔ علم جسے دین اسلام نے ہر مرد و
ن کے لیے لازمی قرار دیا، اسے محدود کرنے کا کوئی حربہ چھوڑا نہیں گیا۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے آقائے دو جہاں رحمت اللعالمینؐ سے کیا درس
؟ وہ جو محسن انسانیتؐ ہیں ہم نے ان کے اسوۂ حسنہ سے کیا سیکھا؟ ہم تو رحمت اللعالمین کی امت ہیں جنہوں نے اسلام کو تلوار سے نہیں بھائی
رے، نرمی و اخوت سے پھیلایا تھا۔ یہ کون لوگ ہیں جو اسلام کا لبادہ اوڑھے خون بہا رہے ہیں؟ حقیقتاً یہ حق و باطل کا معرکہ ہے جہاں مظلوم
سینؓ ہے اور ظالم یزید ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آرمی پبلک اسکول سانحہ اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے۔ اس موقع پر انسان سازی کرنے
لے ان بلند کردار اساتذہ کا بھی ذکر ضروری ہے جو اپنے طلبہ کو بچاتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان شہیدوں کو سلام کہ جنہوں نے موت کو آگے
ھ کر گلے لگا لیا۔ یہ راہِ حق کے ننھے مجاہد ہیں اور اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ان ننھے شہیدوں کے نظریے کو آگے بڑھائیں۔ وہ نظریہ جو علم کی
معیں روشن کرتا ہے۔ یہ ننھے شہید اپنے اپنے حصے کی شمع جلا کر جانب بہشت عازم سفر ہوئے لیکن اپنے نظریے کی ترویج کا اگلا مرحلہ ہمارے
ے کر گئے۔ اب آتے ہیں نومبر کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے ''معبرِ خیال'' کی کھڑکی سے جھانکا تو سب بہن بھائی گزشتہ شمارے پر
عریف و تنقید اور گپ شپ میں مصروف نظر آئے۔ آگے چلے تو زویا اعجاز کی ایمان افروز تحریر ''جوش ایمانی'' پڑھی۔ بہترین تحریر تھی جس کا ہمیں
سوں سے انتظار تھا۔ زریں قمر کی تحریر ''لفظوں کی ساحرہ'' میں مشہور زمانہ ہیری پورٹر سیریز کی مصنفہ نے خوب کہا کہ میں نے اپنی زندگی کی
کامیوں سے سیکھا ہے۔ ناکامیوں سے سبق لینا سیکھیں، یہیں سے آپ کو کامیابیوں کے راستے ملیں گے۔ بیگم بلقیس ایدھی پر کرن صدیقی کی
حریر ''روشن ستارہ'' لاجواب کاوش تھی۔ خدمتِ خلق ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس کام کے لیے کچھ خاص لوگ ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی
صوصی مہربانی ہوتی ہے اور پھر جو حادثہ ان کے نواسے بلال کے ساتھ پیش آیا، ایسے سنگین جرم کی مرتکب عورتوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا کر
ر انہیں معاف کر کے صبر و ضبط اور اعلیٰ ظرفی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ قلم نگری میں ''قصہ پارینہ'' کے عنوان سے اس بار انور فرہاد بے حد معلوماتی
حریر لے کر آئے۔ شکاریات پر سید احتشام کی تحریر ''موت کا ہرکارہ'' خاصے کی چیز تھی۔ شمشال سے ٹورنٹو، سرزمین فرعون، ابو نواس، فاتح اور
سور کے علاوہ سچ بیانیوں میں کام کا بندہ، انجام اور وچولن پسندیدہ تحریریں تھیں۔ مجموعی طور پر نومبر کا شمارہ خوب صورت اور رنگ برنگی تحریروں
ے مزین خوب صورت پھولوں کا گلدستہ ثابت ہوا۔''

☆ اعجاز حسین لدھیانہ کی کچا کھوخانیوال سے تشریف آوری۔ ''سب سے پہلے محترم معراج رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
آپ کی باتیں دل و دماغ میں اترنے والی ہوتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ عالم اسلام پر غیر اعلانیہ جنگ مسلط کر دی گئی ہے جس میں ہر قسم کے
مکر و فریب اور ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہیں جس میں فرقہ واریت مسلکی اور دوسرے اختلافات کو کھڑا کر کے مسلم امہ کا اتحاد پارہ پارہ کر دیا
گیا ہے اور پاکستان کو بھی گھسیٹنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ ہمارے ملک کو امن کا گہوارہ بنا دے۔
(آمین)۔ یک ملکی سرگزشت میں پاکستان کے محسنِ معیشت سرویکٹر ٹرنز کے بارے میں پڑھا۔ ایسے ہی لوگ ہمارے محسن اور داد و تحسین کے
مستحق ہوتے ہیں۔ اب آتے ہیں ''معبرِ خیال'' کی طرف۔ کوثر اسلام صوابی کی صدارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ آپ
کی بات درست ہے بس خاص نمبر کے بعد ''معبرِ خیال'' کی محفل میں آیا تھا۔ بس جناب غم روزگار چین نہیں لینے دیتا جس کی وجہ سے غیر
حاضریاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اگر یہ غمِ روزگار نہ ہوتا تو کیا کہنے تھے۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی شاندار ہیں۔ کسی ایک کی تعریف کرنا
دوسروں کے ساتھ زیادتی ہے۔ الف افتخار، رضا احمد اعوان، صوبی شاہ، پروفیسر کیو اے قاسمی، قیصر خان، عبدالجبار رومی انصاری، صمد مبارک
خان، رانا محمد شاہد اور محترم اعجاز حسین، سِشعار، اظہر اسلام، سدرہ بانو ناگوری اور باقی دوست زنسیرہ شبیر، نذیر احمد راجپوت، جلیل احمد جعفری،

اویس شیخ، فریدہ افتخار اور نزابت افشال کے تبصرے بہت اچھے اور معیاری ہیں۔ اللہ کرے آپ سب اسی طرح آتے رہیں۔ ''جوش ایمانی'' انتہائی شاندار اور منفرد تحریر ہے۔ لفظوں کی ساحرہ جے کے رولنگ کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا اعتماد کی دولت سے ہر کام ہوسکتا ہے۔ ''روشن ستارا'' ایک بہترین تحریر ہے۔ بلقیس ایدھی ہمارے لیے واقعی ایک تابندہ اور روشن ستارہ ہیں دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں عمر خضر عطا فرمائے، (آمین)۔ باران عجب، عجیب و غریب واقعات کے بارے میں عمدہ تحریر ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ''مضطرب'' بہترین تحریر ہے۔ ''قصہ پارینہ'' بھی انور فرہاد صاحب کی شاندار تحریر ہے۔ ندیم اقبال ''شمشال سے ٹورنٹو'' انتہائی شاندار تحریر ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ اس کے بعد ہمیں بھول مت جانا اپنی خوب صورت تحریروں سے حاضری لگواتے رہنا، نوازش ہوگی۔ ''ابونواس'' اپنے انداز کی منفرد اور شاندار تحریر ہے۔ ''فاتح'' بھی عمدہ تحریر ہے۔ ''ناسور'' اپنے مخصوص انداز میں رواں دواں ہے۔ سرورق کہانی ''کڑواسچ'' اور ''ہمدرد دشمن'' اچھی تحریر ہے۔ انسانی رویوں کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ ''بے نشاں'' ایک سبق آموز تحریر ہے۔ ''عظمت کے نشان'' انتہائی زبردست اور معاشرے کے لیے ایک آئینہ ہے۔''

☆ نزابت افشال گاؤں مہوہ تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک سے لکھتی ہیں۔ ''ماہ نومبر کا شمارہ اپنی تمام تر چمک دمک اور رعنائی کے ساتھ 27 اکتوبر کو مل گیا۔ معراج رسول صاحب نے بہت المناک حقیقت بتائی۔ معراج رسول صاحب کے الفاظ کسی تازیانے سے کم نہیں۔ ''محسن معیشت'' کے متعلق پہلی بار پڑھا اور اچھا لگا۔ ''جوش ایمانی'' غازی علم دین شہید کے متعلق اچھی تحریر تھی مگر اسے مزید پُر اثر بنایا جاسکتا تھا۔ جے کے رولنگ کے متعلق بھی آگہی ملی۔ کرن صدیقی نے بلقیس ایدھی کو بہت ہی زبردست انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ وحید ریاست بھٹی کافی عرصے بعد آئے اور درست آئے۔ انور فرہاد نے فلمی دنیا کے بہت سے حیران کن واقعات لکھے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' زبردست سے زبردست اور خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہے۔ عہد بنو عباسیہ کے نامور شاعر ابونواس کا تذکرہ اچھا رہا۔ ''فاتح'' معلوماتی مگر مختصر تحریر تھی۔ ''کڑواسچ'' سبق آموز سچ بیانی تھی۔ فائزہ کی امی کو بہت پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ بیٹیاں ماں باپ کے پاس بطور امانت ہوتی ہیں۔ دوکوڑی کے لوگ، ہمدرد دشمن اور بے نشاں اچھی تحریریں تھیں۔ ''ناداں'' اس بات کو عیاں کر رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں بھیڑیئے کس طرح ناموس زن لوٹ رہے ہیں۔ ''کام کا بندہ'' مزاحیہ مگر سبق آموز تحریر تھی۔ ''انجام'' کالے علم کے شیدائیوں اور راہ حق سے ہٹ جانے والوں کو انجام سے ڈرا رہی تھی۔ ''عظمت کے نشان'' بھی زبردست کہانی تھی۔ ''دچلن'' میں نورین کے جذبہ خدمتِ خلق نے متاثر کیا۔ خالہ زینب کے احسان کا بدلہ اس نے اچھے انداز میں چکایا یہ پڑھ کر اچھا لگا۔ ''شہر خیال'' میں کوثر اسلام کی خوشہ چینی صدارت کی مستحق ٹھہری۔ ہری پور ہزارہ سے میری پیاری سسٹر صوبی شاہ بھی مختصر سے تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ اعجاز حسین ستار، قیصر خان، عبدالجبار رومی اور رانا محمد شاہد بھی زبردست انداز میں حاضر تھے۔ اظہر اسلام تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ کراچی سے سسٹر سدرہ بانو ناگوری بہت جاندار اور شاندار تبصرہ لیے موجود تھیں۔ جلیل احمد جعفری کی تجویز سے متفق ہیں۔ اویس شیخ صاحب کے تایا جان کو اللہ پاک اپنا قرب نصیب فرمائے، (آمین)۔''

☆ اعجاز حسین ستار کا نامہ نور پور تھل سے۔ ''پرچہ بروقت مل گیا۔ جن دوستوں نے یاد کیا، سراپا شکریہ قبول کریں۔ ''شہر خیال'' کے ساتھیوں کے انٹرویو بمعہ تصویر کو قابل عمل بنایئے، یوں کچھ نیا اور روایت سے ہٹ کر ہوگا تو سرپرائز کے ساتھ مزہ آئے گا۔ ''جوش ایمانی'' میں واقعی علم دین نے کوئی مقام حاصل کرنے، واہ واہ سمیٹنے اور معاوضہ کے لیے یہ قدم نہ اٹھایا تھا اس کے دل میں محبت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تارہ چمکا جو تمام روشنیوں کو ماند کر گیا۔ ''قصہ پارینہ'' میں حسب روایت انور فرہاد نے یادداشت کے سہارے دلچسپ انداز میں ہماری دل بستگی کا سامان کیا۔ میرے بھائی فکر زیادہ عمر کی نہ کریں۔ قویٰ مضبوط، لگن اور جذبے جواں رکھیں، ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم اقبال نے داستان گوئی کو معراج پر پہنچا دیا ہے۔ اختتام قریب ہے ہمارے اندازے کہاں تک فتح یاب ٹھہرے ہیں حقیقی تصویر سامنے آجائے گی۔ ''ناسور'' کے واقعات تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نعمان ایک نفیس، بے ضرر اور اپنی دنیا میں مگن رہنے والا جوان تھا۔ حالات نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ سچ بیانیوں میں ''کڑواسچ'' میں فائزہ کے حالات، بھائیوں کی غیر ذمہ داری اور ماں کے رویے سے پورے معاشرے کا تجزیہ مناسب نہیں ہے۔ ''دوکوڑی کے لوگ'' دراصل مجبوری، ضرورت اور ذمہ داریوں کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ آزادی کا راستہ لیکن مسائل کا اژدھا سامنے منہ کھولے نگلنے کو تیار بیٹھا ہے۔ ''ہمدرد دشمن'' میں شاہد نے حیران کر دیا وہ بڑی آسانی سے اپنا دامن بچا سکتا تھا یا صاحب کو خبردار کر کے پولیس کی مدد لی جاسکتی تھی۔ اس نے سب کو دور رکھ کر سارے خطرات اپنے سر لے لیے۔ ''بے نشاں'' کی خالہ سکینہ نے بغیر سوچے، پرکھے قدم اٹھالیا کیونکہ سجاول روزی روٹی کا ذریعہ رکھتا تھا نہ مستقل ٹھکانا تھا۔ عمر کا فرق الگ تلخ حقیقت تھی۔ ''ناداں'' میں کیسا بے حیائی اور خودغرضی کا کھیل کھیلا گیا۔ قصوروار تو نیلم بھی ہے جس نے آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا اور سزا کے طور پر عزت، جوانی اور سنہرا مستقبل برباد کیا۔''

تاخیر سے موصول مخطوط:

صغیر عثمانی، ثانیہ اسلم، مسعود احمد (کراچی)۔ فیصل ندیم (میر پورا ے کے) سید اسد کاظمی (فیصل آباد) صوفی ممتاز (پنڈی کھیب) اقبال حسن (چنیوٹ) ناصر اسلم (لاہور) عبدالوہاب (صادق آباد) بابر رضا (خوشاب) لیاقت علی خان (رحیم یار خان)

باغی قلمکار

زویا اعجاز

حالات کی تیز دھوپ نے اسے کملانا چاہا۔ سفرِ زندگی کے ہر گام پر اسے ٹھوکر لگی۔ زندگی وبال ثابت ہورہی تھی لیکن وہ شکست ماننے پر تیار نہ ہوا۔ حالات کے جبر کو پچھاڑتا، تلخی ایام کو بادہ گلرنگ میں گھول کر اپنا ہی سینہ جلاتا رہا۔ ارد گرد پھیلے گند کو الفاظ کا پیرہن دے کر معاشرے کے منہ پر تھپڑ مارتا رہا۔ مصلحت بین اور فریب کے گماشتوں کے راج میں حق گوئی و بے باکی سے کام لے کر معاشرے کے ٹھیکے داروں کو، مفاد پرستوں کو دندان شکن جواب دیتا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ قوم پر چھائے جمود کو توڑ دے۔ غلغلہ مچا دے لیکن مقابل بھی کمزور نہ تھے۔ وہ اسے عدالت میں کھینچتے رہے پھر بھی وہ نہ جُھکا، نہ گرا۔ قوتِ قلم سے خزینۂ ادب کو بھرتا رہا۔

اردو کے ایک باکمال قلمکار کا زندگی نامہ

اس کا خیال تھا کہ وہ ایک جہنم کا باسی ہے۔

اس جہنم میں وارد ہوئے اسے دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ تپش، کھولن، اذیت، کرب، تڑپ سمیت وہ کون سی سزا تھی جو یہاں نہ ملی ہو۔ اس نے بارہا کتابوں میں پڑھا تھا کہ ہر انسان اپنے نامۂ اعمال کے موجب جنت اور دوزخ کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔ نیک اعمال کے حامل افراد دل پسند عیش میں ہوں گے جبکہ نافرمان دوزخ کا حصہ بنیں گے۔

''کیا اس سے بڑی دوزخ بھی ہوگی کوئی؟ دنیا میں کیے جانے والے اعمال کے صلے میں بہشت و دوزخ کا فیصلہ ہوتا ہے لیکن جسے دنیا میں ہی یہ لامتناہی عذاب نصیب ہو اس کی کیا کوتاہیاں ہوتی ہیں؟'' وہ اکثر حیران ہوکر خود ہی سے سوال کرتا۔ سوچوں کے یہ نوکیلے کانٹے اس کے ذہن میں پیوست ہونے لگتے لیکن جواب کہیں بھی مل کے ہی نہ دیتا تھا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو سعادت؟'' ایک غصیلی اور کرخت آواز سماعت میں پڑی۔

''لو بھئی! آگیا داروغہ جہنم۔'' سعادت کے اندر ایک طاقتور صدا ابھری۔

''ڈھیٹ لڑکے! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔''

''بیرا کی کررہا ہوں ابا جان!'' اس نے ادب سے جواب دیا۔

''نالائق! ناہنجار! بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔'' مقابل نے حسبِ معمول طیش میں آتے ہوئے کہا۔ سعادت اس ردِعمل پر مسکرا اٹھا۔ اس مسکراہٹ میں فخر، خوشی، اطمینان، سکون قلب، کیا کچھ نہ تھا۔

''کیا ہوا غلام حسن؟ کیوں اتنا غصہ کررہے ہو؟'' ایک اور شفیق آواز اس کی سماعت میں پڑی لیکن اپنی کم عمری کے باوجود سعادت کو یہ بات واضح محسوس ہورہی تھی کہ آواز کے زیر و بم اور آنکھوں و چہرے کے تاثرات میں بالکل مطابقت نہیں ہے۔ ان نظروں میں خشونت، سردمہری اور بیزاری کے رنگ نمایاں تھے۔

''اس ناہنجار سے نمٹ رہا ہوں۔ بہت جواب دینے آگئے ہیں اسے۔'' غلام حسن نے اسے گھورتے ہوئے اپنے عزیز کو بتایا۔

''یہ سب تو ماؤں کی ہی تربیت کا اثر ہوتا ہے برخوردار! لیکن معاف کرنا میاں! یہیں تو تم دغا کھا گئے۔ اچھی بھلی خاندانی بیوی کو چھوڑ کر جانے کہاں سے دوسری بیوی اٹھا لائے۔ تم ان عورتوں کے تریا چلتر کیا جانو؟ جب وہ خاندان اور شوہر کی نظروں میں



اقدار اور روایات سے جگہ نہ بنا پائیں تو اولاد خود سر بنا کے ان کے سامنے کھڑی کر دیتی ہیں۔'' اس 'عالمانہ' گفتگو سے سعادت کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی لہریں ہلکورے لینے لگیں۔

اس کے سامنے ہونے والا یہ مناظرہ ہرگز نیا نہیں تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی زندگی نے اسے رویوں کے چابک سے خوب مصروف عمل رکھا تھا۔ طنزیہ انداز' توہین آمیز گفتگو' اندازے' تجزیے ایک عام بات تھی۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ مذکورہ جہنم اس کا 'گھر' کہلاتا تھا۔ گھر جو کسی بھی انسان کے لیے امن' سکون' محبت' تحفظ' تحریک اور چاشنی کا گہوارہ ہوا کرتا ہے' سعادت کے لیے بدترین دوزخ تھا جہاں ایک پل قیام بھی دوبھر تھا۔

☆......☆

گھر میں رویوں کی تپش سے دن رات سلگنے والے غلام حسن کی معاشرہ میں بے پناہ عزت تھی۔

تعلیم' معاش اور رتبہ کے اعتبار سے اس خاندان کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ ان کا تعلق جنت نظیر وادی کشمیر سے تھا جہاں مقامی زبان میں 'ٹٹ' تولنے والے بٹے کو کہا جاتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد اتنے امیر تھے کہ اپنا سونا چاندی بٹوں میں تول تول کر رکھتے تھے۔ یہ اسلاف درحقیقت کشمیری پنڈت تھے۔ جد امجد 'خواجہ رحمت اللہ' اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں آباد ہوئے۔ بلحاظ پیشہ وہ سوداگر تھے اور پشمینے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے سپوت 'خواجہ عبدالغفور' تھے جن کے بیٹے 'خواجہ جمال الدین' سعادت حسن کے دادا تھے۔ انہوں نے لاہور کی بجائے امرتسر منتقلی کو ترجیح دی۔ اولاد کے معاملہ میں وہ بہت خوش قسمت ثابت ہوئے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے جن میں سب سے چھوٹے 'غلام حسن' تھے۔ غلام حسن اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ سمرالہ میں سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔ جلد ہی انہوں نے اپنا تبادلہ امرتسر میں کروالیا اور 'کوچہ وکیلاں' میں رہائش اختیار کر لی۔ اپنی تعلیمی اور پیشہ وارانہ زندگی میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے والے غلام حسن سے ایک ایسی خطا ہوئی جس نے ان سے وابستہ کئی افراد کی کایا ہی پلٹ دی۔ ان کی شادی خاندان میں ہوئی تھی۔ چھ بیٹوں کی پیدائش نے معاشرتی رتبہ مزید بلند کر دیا۔ اس پُرسکون اور ہموار زندگی میں پہلا بھنور اس وقت پیدا ہوا جب انہوں نے خاندان سے باہر ایک عورت سے بیاہ رچا لیا۔ اہلیہ اوّل یہ سانحہ کبھی قبول نہ کر سکیں۔ غلام حسن کے دیگر بہن بھائی اور عزیز و اقارب بھی اس عمل سے ناخوش تھے۔ اخلاقی محاذ پر ان سب کے سامنے غلام حسن زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکے اور نئی شریک حیات کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ بیٹی 'اقبال بیگم' اور بیٹے 'سعادت حسن' کی پیدائش بھی اس مظلوم عورت کو اپنا اصل مقام نہ دلوا سکی۔ رویوں کی اسی کڑکتی دھوپ میں

پرورش پاتا سعادت یہ تپش اپنے وجود میں جذب کرتا رہا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے گرد تنہائی کو رقصاں دیکھا۔ والدہ اور بہن عزت کے دو بول پانے کے لیے دن رات کولہو کے بیل کی طرح محنت کرتیں اور ننھا سعادت اپنے اردگرد بسنے والے ان افراد کے رویے پرکھتا۔ اسے انسانی مطالعہ کی لت لگ گئی۔ اس چھوٹی سی عمر میں وہ اپنے اندر ایک ایسا زہر اندر پلنے لگا جس کی تاثیر کسی بھی ذی ہوش فرد کو اپنے حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اسے ہر سمت نقاب میں لپٹے چہرے نظر آتے۔ آنکھوں' لہجوں اور چہروں کا یہ تضاد اس کے ذہن میں ان گنت سوال پیدا کرنے لگا۔ غلام حسن نے اپنی زندگی میں ہر نعمت کے باوجود دوسری شادی کا قدم کیوں اٹھایا؟ ان کے شادی شدہ اور صاحب اولاد ہونے کے بعد بی بی جی نے اپنے لیے مستقل اذیت کی خریداری کو کیوں ترجیح دی؟ دیگر اہلخانہ اپنے دلوں میں کہیں نہ کہیں بی بی جی کے لیے ہمدردی رکھنے کے باوجود انہیں ٹھوکروں کی زد میں کیوں رکھتے تھے؟ غلام حسن دونوں بیویوں میں انصاف کیوں نہیں کر پاتے؟ وہ اکثر وقت کے کچھ لمحات میں بی بی جی سے نرم دل ہو جاتے ہیں لیکن ایسا رات کے اندھیروں میں ہی کیوں ہوتا ہے؟ سعادت اور اقبال بیگم کو نظراندازی کی سزا کس لیے دی جاتی ہے؟ والد کی دوسری شادی اور اپنی پیدائش میں ان کا اپنا عمل دخل یا خواہش تو کہیں بھی نہ تھی۔

ان تند و تیز اور نوکیلے سوالات کے کانٹے قلب و روح میں پیوست کیے سعادت کی زندگی میں مزید اذیت ناک موڑ اس وقت آیا جب والد نے سب جج کے عہدہ سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس فیصلہ کے بعد گھر میں غربت کھڑکیوں سے دبے پاؤں اندر چلی آئی۔ اس عفریت کو دیکھتے ہی رہی سہی خوش اخلاقی' نرمی' زندہ دلی اور شفقت

نے خوف کے مارے خودکشی کرلی۔ سفاکی و بے مروتی نے ہرسو اپنے قدم جما لیے تھے۔ باطن میں تلخی کی چنگاریاں لیے سعادت حسن ایک دھیمی دھیمی سی آگ میں سلگتا رہا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے اردگرد بسے ان لوگوں کے چہروں سے نقاب کھینچ کر زمین پر پٹخ دے اور ان کا اصل روپ کسی آئینے کی طرح سامنے لاکھڑا کرے۔ منافقت، دروغ گوئی اور سفاکی کے رقص میں پرورش پانے والے سعادت حسن منٹو کے وجود میں ایک 'باغی' جنم لے چکا تھا جس کی قلقاریاں گھر میں کوئی بھی فرد سننے اور محسوس کرنے سے قاصر تھا۔

☆......☆

سعادت کے بچپن اور لڑکپن میں ہر آرزو تشنہ رہی۔ وہ عزت' محبت 'مان اور اعتبار کے لحاظ سے قلاش کردیا گیا۔ اب ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ اس کی تمنائیں اور حسرتیں بالکل بھی پوری نہ ہوئی ہوں۔ البتہ یہ تھا کہ کسی بھی خواہش کی تکمیل اس کے آنسوؤں اور ہچکیوں کے لبادے میں ہوتی۔ وہ فطری طور پر جلد باز، جذباتی اور تنک مزاج واقع ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ اگر کسی مٹھائی' کھلونے یا کپڑے لیے پیدا ہونے والی چاہت وقت پر پوری نہ ہوسکی تو اس کا دل تمنا کو ازخود ہی ختم کردیتا۔ ان محرومیوں کی وجہ سے اسے حلق میں ہمہ وقت ایک کڑواہٹ محسوس ہوا کرتی جس کی شدت اسے کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کیا کرتی۔ گھر میں اطمینان اور سکون تو ویسے ہی ناپید تھا۔ اس نے امرتسر کی گلی' محلوں میں اپنے لیے خوشی کا سامان ڈھونڈ لیا۔ وہ قدرتی طور پر ہی ذہانت سے مالا مال تھا لیکن حالات نے اس خداداد صلاحیت کو کبھی مثبت طور پر پنپنے ہی نہ دیا۔ پیدائش کے بعد رگوں میں قطرہ قطرہ انڈیلے جانے والے زہر نے اسے خطرناک حد تک ضدی اور خودسر بنادیا تھا۔ غلام حسن کے دیگر بچے پڑھائی میں بہت ہوشیار تھے۔ اب اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سعادت بھی والد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسکول میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرتا لیکن اسے خیرات یا جدوجہد کے نتیجہ میں حاصل کی گئی محبت درکار ہی نہ تھی۔ اس کے دل میں غیر مشروط اور بے ریا محبت پانے کی تمنا مچلتی تھی جس کا حصول والد سے تو کسی صورت ممکن ہی نہ تھا۔ نظرانداز کیے جانے کا کرب اور تذلیل کے کوڑے سہتے ہوئے سعادت کو ڈائیں ڈائیں پھرنے میں ہی عافیت نظر آتی۔

ان حالات میں پرورش پاتے ہوئے غربت، تنگدستی، کم خوراکی اور ہمہ وقت ذہنی تناؤ کے باعث وہ منحنی دکھائی دینے لگا۔ علاقہ کے لوفر اور شرارتی لڑکوں کے لیے اس کا وجود 'وجہ تفریح' بن گیا تھا۔ وہ اس کا رستہ روک لیتے' آوازے کستے اور مذاق اڑانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہ دیتے۔ سعادت کے لیے یہ صورت حال مزید تکلیف دہ تھی۔ گھریلو ماحول میں ہی گھٹن کیا کم تھی جو بیرونی دنیا میں بھی اذیت ملنے لگی تھی۔ اس مسئلے کا حل اسے

زید شہید کے ہمراہ قتل ہوکر جو حضرات مصلوب ہوئے ان میں ایک مجاہد زید سندھی بھی تھے جن کا تعلق سرزمین سندھ سے تھا۔ اسی عہد میں حضرت عبداللہ الاشتر بن محمد بن عبداللہ بن الحسن المثنیٰ بن حضرت امام حسنؓ اپنے پدر بزرگوار جناب محمد نفس الزکیہ کی شہادت (145ھ) کے بعد عیسیٰ بن عبداللہ بن مسعدہ شیعی کے ہمراہ سندھ تشریف لائے تھے۔ دریائے سندھ کے کنارے خلیفہ عباسی منصور دوانیقی کے حکم سے اولادِ رسول کا سب سے پہلا خون جو ظلم و ستم بہایا گیا وہ عبداللہ اشتر ہی کا ہے جن کی مقدس لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا گیا۔ انہیں عبداللہ کے کم سن فرزند محمد جن کی ولادت سندھ کے علاقے میں ہوئی تھی اپنے باپ کی شہادت کے بعد ہندو راجا کی حمایت و حفاظت میں آگئے۔ یہ ہندو راجا سادات کی بڑی عزت و توقیر کرتا تھا۔ جب اس ہندو راجا نے یتیم سید کو اپنی سرپرستی و حفاظت میں لیا تو اس کی پاداش میں خلیفہ منصور عباسی نے والی سندھ ہشام بن عمر تغلبی کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ مامور کرلیا کہ ہندو راجا اسے یتیم سید کا مطالبہ کرے کہ وہ ان کو سادات کے دشمنوں کے سپرد کرے اور اگر راجا اس پر راضی نہ ہو تو اس کی راجدھانی پر حملہ کرکے اس کو قتل کردیا جائے راجا کسی طرح بھی سید کو دشمنوں کے ہاتھ میں دینے پر آمادہ نہ ہوا بلکہ اولادِ رسول کی حفاظت میں وہ خود قتل ہوگیا اور اس کی ریاست کو عباسی حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ (تاریخ طبری ص 238 طبع مصر۔ تاریخ الکامل ابن اثیر جلد 5 ص 220 طبع مصر)

مرسلہ: قرۃ العین، اقراشی

بہر صورت تلاش کرنا تھا۔ سوچ بچار کے بعد اس نے آغا حشر کاشمیری کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ آغا صاحب ایک دبنگ انسان اور اپنے حواریوں کے قائد سمجھے جاتے تھے۔ سعادت نے ایک روز انہیں کوچہ سلطان میر چوک میں خوش گپیاں کرتے ہوئے پایا تو اپنا مدعا لیے پاس چلا گیا۔

''کون ہو برخوردار؟ مجھ سے کیا کام ہے؟'' انہوں نے چودہ پندرہ سالہ اس معصوم صورت لڑکے کو دیکھ کر کہا۔

''میرا نام سعادت حسن ہے۔ اسکول آتے جاتے آوارہ لڑکے بہت تنگ کرتے ہیں۔ انہی سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپ کی مدد لینے آیا ہوں۔'' اس نے سلیقہ سے جواب دیا۔

''بے فکر ہوکر اسکول جایا کرو۔ میرے دوست خبردار رہیں گے۔'' وہ اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولے۔ اس کے بعد آغا صاحب کے حواریوں نے لوفر لڑکوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے سعادت کو اس آفت سے نجات دلوادی۔ وہ اپنی کامیابی پر خوش اور اب ایک نئی نہج پر سوچنے لگا تھا۔ وہ خاموش اور بے ضرر تھا اس لیے خوب ستایا گیا لیکن جونہی ان لڑکوں کو خود سے زبردست اور طاقتور افراد نظر آئے 'انہوں نے فوراً ہی اپنی روش ترک کردی۔ زندگی سہولت سے گذارنے کے لیے شرافت' کمزوری اور خاموشی کا اضافی بوجھ ختم کرنا ہی کامیابی اور بقاء کی ضمانت ہوتا ہے۔ اپنے مسائل کو زور بازو سے حل کرنے کی تلاش نے اسے امرتسر کے گلی کوچوں میں پھرتے لونڈوں سے دوستیاں گانٹھنے کی طرف راغب کیا۔ اپنی مخصوص نفسیات سے مغلوب ہوکر وہ ایسے لڑکوں سے ازخود کھنچا رہنے لگا جو دل میں آزادی اور بے فکری کی خواہش ہونے کے باوجود چہرے پر متانت' وقار اور پڑھائی کے لیے سنجیدگی کا نقاب چڑھائے خود فریبی میں مبتلا رہتے۔ سعادت کی ایسے لڑکوں سے گاڑھی چھنتی جو اپنی بے راہ رو سوچیں 'لڑائی جھگڑے کی خواہشات کو منفرد نظر آنے کے خبط سے مغلوب نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کے احباب میں وہ عام افراد شامل ہوتے گئے جو اپنی اخلاقی علتوں کو منافقت کے پردے میں پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں کسی دوست نے اس کی طرف سگریٹ بڑھایا تو اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میں نے آج تک اس کا ذائقہ نہیں چکھا۔''

''ایک کش لے کر تو دیکھو! اس دھوئیں کی تلخی انسان کو اپنے غم بھلانے پر مجبور کردیتی ہے۔'' دوست نے ترغیب دی۔ مہم جو سعادت کے اندر زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ پہلے ہی کش میں دھواں کسی کٹار کی طرح اس کے حلق اور سینے میں اترا لیکن وہاں سالہا سال کی مکین دبیز تلخی نے اس کی تاثیر چند لمحوں میں تحلیل کردی۔

''واہ رے ٹامی! تو نے تو ہم سب کو حیران کردیا۔'' ایک اور دوست نے اسے مخصوص عرفیت سے پکارا۔

''اچھی چیز ہے۔ مجھے اس وقت کا انتظار رہے گا جب اس کی تلخی مجھ پر حاوی ہوجائے۔'' اس نے اپنی منطق دی۔ سگریٹ نوشی کے آغاز سے سعادت کی طبیعت میں ایک عجیب سی ترنگ پیدا ہونے لگی۔ بے چینی تو پہلے ہی کم نہ تھی اب بے خوفی اور بے باکی بھی اس کی ہمراہی بن گئیں۔

وقت کچھ مزید آگے سرکا تو سعادت حسن کے مزاج میں تغیرات نمایاں تر ہونے لگے۔ سگریٹ نوشی کے ساتھ پتنگ بازی بھی اس کے معمولات میں شامل ہوگئے۔ والد کی سختی اور دیگر اہلخانہ کی لعن طعن سے اس کے ارادے مزید پختہ ہوتے گئے۔ وہ فطری طور پر ہی ایسے مزاج کا حامل تھا سخت گیری سے طبیعت وہی کام کرتے رہنے کی طرف مائل ہوتی۔ پتنگ بازی میں اسے بہت سرور ملتا۔ ڈور کے سہارے ہواؤں کی لہروں پر پتنگ کا رقص اسے سنسنی میں مبتلا کرویتا۔

''سعادت! میرے بچے!! تجھے اس کام میں آخر ملتا کیا ہے؟ کیوں ہم سب کو اتنا ستاتا ہے؟'' بی بی جان نے ایک روز عاجز آکر کہا۔

''مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔ آسمان کی جانب لپکتی پتنگ اپنے جیسی محسوس ہوتی ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ اپنے اندر کوئی قوت پرواز پیدا کروں' آفاق کی وسعتوں میں کھوجاؤں۔ ہر شخص کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوں۔''

اس کی منطق پر والدہ گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔ وہ خاندان کے دیگر لڑکوں کی طرح سعادت کو بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین عہدہ پر فائز دیکھنا چاہتی تھیں لیکن وہ اپنے نفع ونقصان سے مکمل طور پر بے نیاز ہوچکا تھا۔

☆......☆

وقت کا سفر سعادت حسن کی سوچ اور کردار میں کوئی بھی تبدیلی پیدا کیے بغیر جاری رہا۔ پڑھائی کی جانب بے رغبتی جوں کی توں برقرار تھی۔ غیر نصابی کتابوں سے البتہ خوب دوستی تھی۔ کچھ عرصہ سے الفاظ کی انگلی تھامے وہ نت نئے

سوانحی خاکہ

نام: سعادت حسن منٹو
تاریخ پیدائش: 11 مئی 1912
جائے پیدائش: سمرالہ۔ ہندوستان
تاریخ وفات: 18 جنوری 1955، لاہور، پاکستان
وجۂ شہرت: افسانہ نگار، مضمون نویس، ڈراما نویس
اعزازات: نشانِ امتیاز (2012)

کتابیں

آتش پارے، چغد۔ منٹو کے افسانے۔ دھواں۔ افسانے اور ڈرامے۔ کھول دو۔ لذت سنگ۔ سیاہ حاشیہ۔ بادشاہت کا خاتمہ۔ خالی بوتلیں۔ لاؤڈ اسپیکر۔ گنجے فرشتے۔ منٹو کے مضامین۔ نمرود کی خدائی۔ ٹھنڈا گوشت۔ یزید۔ پردے کے پیچھے۔ سڑک کے کنارے۔ بغیر عنوان کے۔ بغیر اجازت۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ برقعے۔ پھندنے۔ سرکنڈوں کے پیچھے۔ شیطان۔ شکاری عورتیں۔ رتی ماشہ تولہ۔ کالی شلوار۔ منٹو کی بہترین کہانیاں۔ طاہرہ سے طاہر۔ اوپر نیچے اور درمیان۔

منٹو کے چند دلچسپ انتسابات

☆ ''اخبار دین و دنیا دہلی کے نام جس میں میرے خلاف سب سے زیادہ گالیاں چھپیں۔'' (منٹو کے افسانے)

☆ ''اپنی تمام بری عادتوں کے نام۔'' (کروٹ)

☆ ''محمد حسین چودھری کے نام۔ مرد ناداں پہ ہے کلام نرم و نازک بے اثر۔''

☆ ''ایک خالی بوتل کے نام۔'' (خالی بوتلیں، خالی ڈبے)

جہانوں کی سیاحت سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ انسانی مطالعہ بھی زور شور سے جاری تھا۔ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے اس کا مشاہدہ اور انسان شناسی اس قدر مربوط ہو چکی تھی کہ نظریں کسی برمے کی مانند مقابل کی روح تک پوشیدہ راز باآسانی کھنگال لیا کرتیں۔ سطحی اور باطنی لحاظ سے رویوں، اقدار اور لہجوں کی پرکھ اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکی تھی۔ الفاظ کے ساتھ وقت گزاری کرتے اس کے لاشعور میں ایک انوکھی خواہش کلبلانے لگی۔ وہ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دینے کے لیے بے تاب ہونے لگا تھا۔ یہ تمنا اس کے لیے قابل عمل ہرگز نہیں تھی کیونکہ وہ اپنی بساط اور استعداد سے بھی خوب واقف تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ مزاحمت کی صورت میں رگیں اینٹھن کا شکار ہونے لگتیں، ذہن پر دھندی طاری ہو جاتی جو مزید مطالعہ کو بھی سہل نہ رہنے دیتیں۔ اس کیفیت سے خلاصی کے لیے سعادت نے کچھ سوچ بچار کیا اور بالآخر ایک نتیجہ پر پہنچ کر عمل کا آغاز کر دیا۔ دن رات اس نئے مشغلہ میں جتے رہنے کے بعد وہ محلہ بالا گلی میں آغا خلش کاشمیری کے پاس جا پہنچا جو اپنے چند دوستوں کے ساتھ خدمتوں میں مگن تھے۔ وہ بغل میں کاغذوں کا پلندا دابے اس سادہ و معصوم صورت لڑکے کو دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر چونک گئے۔

''کیسے ہو سعادت میاں؟ آج راہ کیسے بھول آئے؟ کہیں پھر سے لونڈوں نے دق کرنا شروع تو نہیں کر دیا؟''

''اب میں کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ میں نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ لیا ہے۔'' اس کے تیور بااعتماد اور متاثر کن تھے۔

''یہ بغل میں کیا داب رکھا ہے؟''

''ڈکشنری کی مدد سے ایک روسی ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ آپ ذرا دیکھیں تو سہی اسے۔''

آغا نے چند ایک صفحات پر نظر دوڑائی اور بے زاری سے کہنے لگے۔ ''کیا بکواس بھر دی ہے؟ محض ڈکشنری سے معنی و مطالب دیکھ کر ترجمہ لکھ دینا تو ادب نہیں ہوا کرتا۔ لکھاری کو اس ماحول میں ڈوب جانا پڑتا ہے۔ لو! سنبھالو ان کاغذات کو۔ سرما میں آتشدان میں آگ تاپنے کے کام آئیں گے۔'' ان کی صاف گوئی پر سعادت بلا چوں و چرا لوٹ گیا۔

''آپ نے بہت سخت الفاظ میں اسے ڈانٹ دیا آغا صاحب!'' ایک حواری نے دبے لفظوں میں کہا۔

''میں نے ڈانٹا نہیں، اس کی دل شکنی کی ہے۔ آیندہ بھی کرتا رہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس کم عمری میں ہی اس دشت کا مسافر بن جائے جہاں پہلے سے اپنی کمین گاہوں میں چھپے بھیڑیے نما لوگ اسے کوئی بھی رعایت

دیئے بغیر چیر پھاڑ کر کھائیں گے۔ ابھی آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے وہ۔ بہتر ہے کہ پہلے تعلیم مکمل کرے۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دلبرداشتہ ہو کر قلم سے ناتہ ہی توڑ لے۔" دوسرے حواری نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ تم سب دیکھ لینا، مستقبل میں اس لڑکے کی شناخت محض اس کا قلم ہوگا۔" وہ پُریقین تھے۔

☆......☆

زمانے کی ٹھوکروں سے الجھتا سعادت میٹرک میں فیل ہوا تو خاندان میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔

اس کے دیگر بھائی ولایت میں پڑھتے تھے لیکن اس کے لیے یہ ہی جماعت کٹھن ثابت ہو رہی تھی۔ پڑھائی میں دل لگانے کا ہنر وہ سیکھ ہی نہ پایا تھا۔ غلام حسن اس کے اساتذہ سے بھی ملے جن کی شکایات لامتناہی تھیں۔ وہ بھی تو اس شرارتی لڑکے کے ہاتھوں زچ تھے جو کمرۂ جماعت کو سبزی منڈی بنائے رکھتا۔ گھریلو ماحول سے تنگ آکر وہ بمبئی چلا گیا جہاں سے مشکلات کے بعد اسے واپس لایا گیا تو قلم بینی کی لت بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ وہ چھت پر پتنگ بازی میں مصروف ہوتا اور غلام حسن اسے دبوچنے کے لیے اچانک چلے آتے۔ سعادت کی نظریں والد کے آتش فشانی مزاج کو فوراً بھانپ لیا کرتیں اور وہ برق رفتاری سے برابر کے کوٹھے پر کود جاتا۔ گھٹنوں اور ہاتھوں پر زبردست خراشیں بھی آتیں لیکن وہ تکلیف کے معمولی سے اظہار کو بھی ضبط کی توہین سمجھتا تھا۔ رحم کی التجا کرنا بھی اس کی خودداری کو گوارا نہ تھا۔ غلام حسن غصہ سے کف اڑاتے اسے اپنا نطفہ تسلیم کرنے سے انکار کرنے لگتے۔ بی بی جان دہری اذیت میں مبتلا تھیں۔ شام ڈھلے والد سے چھپتا وہ گھر آتا تو بی بی جان اس کی خراشیں اور خستہ حالت دیکھ کر سسک جاتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بمبئی جاکر سعادت نے اپنے ناکردہ گناہوں میں مزید اضافہ کرلیا ہے۔ غلام حسن اپنی آمرانہ روش ترک کرتے تھے نہ ہی بیٹا اپنے اطوار سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار ہوتا۔

"تم کیوں اپنے باپ کے غضب کو للکارتے ہو سعادت؟ وہ تمہاری بھلائی ہی چاہتے ہیں۔"

"لیکن میں زندگی اپنی شرائط پر جینا چاہتا ہوں۔" اس نے ماں کے آنسوؤں سے نظریں چرائیں۔

"بوڑھی والدہ کو کیوں خوار کرتے ہو؟"

"آپ ہی کا احساس زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ میں اس ذلت کی زندگی پر تھوک کر موت کو گلے لگانے کے آخری لمحات میں کمزور نہ پڑتا۔" وہ تلخی سے کہتا، گھٹنوں پر لگی خراشوں پر سرسوں کا تیل لگانے لگا۔ درسی کتابوں میں لگا بندھا نصاب اسے حقیقتاً آزار میں مبتلا کیا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک اور پریشانی کا بھی شکار تھا۔ والد کی جانب سے دانستہ طور پر جیب خرچ میں ناقابل یقین حد تک کمی کے باعث وہ کتب بینی اور سگریٹ نوشی کے مشاغل پورا کرنے سے عاجز تھا۔ پہلے پہل تو وہ خوب تلملاتا رہا لیکن پھر جلد ہی اس نے اپنے لیے ایک راہ تلاش کرلی۔ وہ ریلوے بک اسٹال پر جاتا اور اسکول ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد عمر خاں کے سپوت کی حیثیت سے کتابیں مستعار لے آتا۔ اطمینان و سکون سے مطالعہ کے بعد وہ ان کتابوں کو سیکنڈ ہینڈ بک سیلر کے پاس فروخت کر کے اچھی قسم کے سگریٹ خرید لیتا۔ زندگی اسی جوڑ توڑ اور بقاء کی راہیں تلاش کرتی گذرتی رہی اور ایک روز غلام حسن کی خشمگیں نگاہیں، طنز کے تیر برساتی زبان فرشتہ اجل کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔

والد کی وفات پر سعادت کے لیے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے جذبات ناقابل فہم تھے۔ اداسی اور احساس زیاں اسے بے کل رکھتے۔ لیکن کیوں؟ وہ تو ان سے بالکل محبت نہیں کرتا تھا۔ اسے بچپن سے ہی ہزاروں گلے شکوے تھے پھر بھی وہ کیوں افسردہ تھا؟ اپنی ان کیفیات سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ گھنٹوں دوستوں کی محفل میں بیٹھا رہتا۔ ہری سنگھ نامی ایک دوست اس کا ذہنی انتشار بھانپ چکا تھا۔ اس نے جیب سے ایک چپٹی بوتل نکالی اور سعادت کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ لے ٹامی! تیرے ہر درد کا علاج اس میں ہے۔ یہ پرستان سے آئی پری ہے۔ اپنے عاشقوں کو نرم پروں پر بٹھائے نئے جہانوں کی سیر کرواتی ہے۔" سعادت بے یقینی سے شراب کی اس بوتل کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ گھریلو اور معاشرتی تلخیوں سے دلبرداشتہ سعادت حسن منٹو نے جھجکتے ہوئے بوتل تھامی اور ایک تلخ مشروب حلق میں انڈیل لیا۔ اس کے وجود میں یکدم کوئی آگ سی بھر گئی۔ ابتداء میں تلخی ناقابل برداشت محسوس ہوئی لیکن چند ہی لمحوں میں کسی جادو کے زیر اثر اس کی دنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ دل و دماغ میں بے شکوے، محرومیاں اور دکھ گو اپنی جگہ اب بھی موجود تھے لیکن ان کی شدت اتنی تیزی سے زائل ہوئی کہ وہ خود بھی حیران

رہ گیا۔ اسے اپنا وجود تتلی سے بھی ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔

''واہ ہری سنگھ!! یہ تو واقعی پرستان کی کوئی پری ہے۔'' اس نے چند مزید گھونٹ بھرے۔ ''آج سے اس کی اور میری یاری پکی۔'' وہ سرور میں بولا۔

''ارے جاؤ تامی!! اس نیلم پری سے دوستی کے دعوے سبھی کرتے ہیں لیکن کبھی گھربار، کبھی سماج اور کبھی ریتی رواج جدائی پیدا کرہی دیا کرتے ہیں۔'' ہری نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

''نہیں!! تم لوگ دیکھ لینا۔ سعادت حسن منٹو مرتے دم تک یہ رشتہ نبھائے گا، دیکھ لینا بس تم لوگ!'' اس کا لہجہ وانداز اٹل تھا لیکن احباب نے اس کا یہ دعویٰ ہنسی میں اڑا دیا۔

☆......☆

کوچہ وکیلاں کا سعادت حسن 1931 میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے بالآخر کالج داخلہ میں کامیاب ہوگیا۔

اس کے سابقہ اطوار میں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پڑھائی کے معاملہ میں نہایت سنجیدگی سے غیر سنجیدہ رہا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امتحانی بورڈ بھی عزت واحترام سے 'فیل' قرار دے کر ایک بار پھر اسی دشت کی خاک چھاننے کا پروانہ تھما دیتا۔ اردو کا مضمون پاس کرنا تو اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف بن چکا تھا۔ یہ ستم ظریفی ہی تو تھی کہ غیر ملکی ادب کو اردو تراجم کے قالب میں ڈھالنے کا شائق سعادت اردو ہی کے مضمون میں نااہل قرار دیا جاتا۔

اس صورتِ حال سے وہ اوبنے لگا تھا۔ کئی کوششوں کے بعد تھرڈ ڈویژن میں انٹر پاس کیا تو عبدالباری علیگ سے ملاقات زندگی کو ایک نئے موڑ پر لے آئی۔

ان دنوں احباب اسے قمار بازی کی محفلوں میں لے جانے لگے۔ کٹڑا جمیل سنگھ میں نفضلو کمہار کی دکان کے اوپر دن رات جوا ہوتا اور فلش کھیلی جاتی تھی۔ آغاز میں تو یہ کھیل اسے سمجھ نہ آیا لیکن پھر تو وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ رات کو چند گھڑیاں سونے کی فرصت میں بھی راؤنڈوں اور ٹریلوں کے خواب آیا کرتے تھے۔ بہت جلد اس کی تلون مزاجی ان سرگرمیوں سے بھی اوب گئی۔ اب اسے کسی نئے جہان کی تلاش تھی۔

اسی دوران اس کی ملاقات باری علیگ اور حاجی لق لق سے ہوئی۔ وہ روزنامہ 'مساوات' کے ایڈیٹر مقرر ہو کر امرتسر آئے تھے اور اکثر ہوٹل شیراز میں چائے پینے آیا کرتے۔ پہلی اتفاقی ملاقات کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ باری علیگ کی سنجیدگی اور متانت بھری ظرافت اسے بہت بھائی۔ باری صاحب نے بھی اس کا ذہنی انتشار بھانپ لیا اور دھیرے دھیرے صحافت کی طرف مائل کرنے لگے۔ سعادت کی بے چینی کو قدرے سکون میسر آیا۔ ان ملاقاتوں میں بعد ازاں معروف شاعر اخترشیرانی بھی شامل ہوگئے۔ سعادت کی بے راہ رو مصروفیات تیزی سے سمٹ کر مساوات کے دفتر تک محدود ہوگئیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ باری صاحب ایک آدھ خبر اسے ترجمہ کے لیے تھما دیتے۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو کا سہارا لیے وہ بخوشی یہ ذمہ داری پوری کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ فلمی خبروں کا کالم اس نے سنبھال لیا۔ احباب میں سے کسی ایک نے اسے ان مشاغل میں الجھنے سے روکا لیکن باری علیگ اس نوجوان میں پوشیدہ لکھاری بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے سعادت سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ آغاز سعادت میں یہ مشکلات نہ آئیں تو سفر کا مزہ ہی کہاں رہتا ہے۔ انہی کی ہدایات پر منٹو نے طبع زاد مضامین لکھنے کی کوشش کی جس میں کامیابی نصیب نہ ہوسکی۔ اس کے بعد باری صاحب نے اسے وکٹر ہیوگو کی ایک کتاب 'دی لاسٹ ڈیز آف آ کنڈمنڈ مین' کا ترجمہ کرنے پر راضی کر لیا۔ سعادت نے انگریزی لغت سامنے رکھ کر 'دس' پندرہ دن میں ہی ساری کتاب کو اردو قالب میں منتقل کر دیا۔ باری علیگ نے ترجمہ کی اصلاح کی اور اردو بک اسٹال کے مالک یعسوب حسن کے پاس 'تیس' روپے کے عوض فروخت کر دیا۔ یعسوب نے بھی کمال چابکدستی دکھاتے ہوئے مسودہ نہایت قلیل عرصہ میں چھاپ کر شائع کر دیا۔ امرتسر کی گلیوں میں آوارہ گردی کی مثالیں قائم کرنے اور والد کی جانب سے گمنام رہنے کی پیشگوئیوں کا مرکز سعادت حسن منٹو اب صاحب کتاب ہو چکا تھا۔

کتاب کی اشاعت کے بعد مساوات بند ہوگیا اور باری علیگ لاہور چلے گئے۔ سعادت کی زندگی پر ایک بار پھر جمود طاری ہونے لگا۔ اس کے لیے وقت گزاری کا اب اور کوئی طریقہ نہ رہا تھا۔ باری علیگ ہی کی تحریک پر پہلی کہانی 'تماشا' ایک فرضی نام سے ہفت روزہ خلق میں شائع ہو چکی تھی۔ کامیابی سے ملنے والے اعتماد ہی کے باعث اس نے گریجویشن کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کار خیر کے لیے سعادت نے فروری 1934 میں علی گڑھ یونیورسٹی میں شمولیت

تیار کرلی۔'انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن' سے
سلک ہونے کے بعد اس نے مارچ 1935 میں یونیورسٹی
گزین کے لیے 'انقلاب پسند' لکھ کر سب ہی کو چونکا دیا۔
امیابی کا یہ سفر تپ دق کے باعث مزید جاری نہ رہ
کا۔اس زمانے میں ایک متعدی مرض کی حیثیت سے دق
ن دہشت مسلّمہ تھی۔انتظامیہ کو ناگزیر وجوہات کی بناء
اسے یونیورسٹی سے بے دخل کرنا پڑا۔سعادت بحالی صحت
کے لیے اپنی بہن سے پیسے لے کر کشمیر کے ایک علاقہ
بٹوت' روانہ ہوگیا۔جنت نظیر خوبصورتی اور جادوئی کشش
کے حامل کشمیر میں سعادت کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔
سے ایک مقامی چرواہی کی محبت نے گرفتار کرلیا۔

اس سرخ وسپید اور مثالی حسن کی حامل دوشیزہ کا نام
بیگو' تھا۔کسی پہاڑی چشمے کی طرح صاف وشفاف' بلند وبالا
وٹیوں کی طرح پروقار اور صبح کی پہلی کرن جیسی......ان
نوں بیماری کے باعث سعادت ایک کمبل لیے پہاڑی
ر جا کر لیٹ جاتا تھا۔سگریٹ کے دھوئیں اور شراب سے
آلودہ ہو چکے پھیپھڑوں میں ٹھنڈی' تازہ اور خالص ہوا بے
حد فرحت دیتی۔ایسے ہی ایک روز ڈھیلے ڈھالے کپڑوں
میں ملبوس بیگو وہاں آنکلی۔سعادت نے ایسی خالص' شفاف
اور مسحور کن خوبصورتی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔اس کے سرخ
سیب جیسے رخساروں پر ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر مزید گلال
بکھر گیا تاہم وہ بے نیازی سے مویشی ہانکتی رہی۔اسی
دوران بیگو نے ہانکنے والی چھڑی اوپر اٹھائی اور سفید کہنی کی
جھلک سے سعادت کی نظروں میں برق کوند گئی۔وہ ایک
جادوئی لمحہ تھا جس کے بعد وہ مکمل طور پر اسی ایک
منظر کا اسیر ہو کر رہ گیا۔وہ ہر روز پہاڑی پر جاتا اور سانس
روکے اس لمحہ کا انتظار کرتا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین
سرکنے سے بیگو کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔ڈھیلے
ڈھالے کپڑوں میں اس کے جسم کا کوئی بھی خط دکھائی نہیں
دیتا تھا۔سعادت کو اس سے کوئی غرض بھی نہ تھی۔اسے
تو محض کہنی کی جھلک ہی گھنٹوں سرشاری میں مبتلا رکھتی۔ایسا
منفرد اور عجیب وغریب عشق صرف سعادت ہی کرسکتا تھا اور
وہ بڑے اہتمام سے کرتا بھی رہا۔

بیگو بھی اس شہری بابو کی دلچسپی بھانپ گئی تھی۔دن
گذرتے رہے اور اس بے نام رشتہ میں کہنی ونظر کا جمود ہی
طاری رہا پھر ایک روز بیگو اس سے تھوڑی دور آ بیٹھی۔اس
نے ہاتھ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی جسے وہ گریبان میں
چھپانا چاہتی تھی۔سعادت سے مزید ضبط نہ ہوسکا اور وہ لمبے
لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''مجھے دکھاؤ تو ذرا!''اس نے ہتھیلی بڑھائی۔بیگو کے
چہرے پر شفق کی لالی بکھر گئی لیکن وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہہ
سکی۔

''جب تک تم مجھے نہیں دکھاؤ گی میں یہاں سے ہلوں
گا نہیں نہ ہی تمہیں جانے دوں گا۔''سعادت میں ازلی
ضد عود آئی۔بیگو روہانسی ہوگئی۔بڑی ردوکد کے بعد مٹھی
کھول کر اس کے سامنے کی اور شرم سے گھٹنوں میں منہ دے
لیا۔سعادت نے اشتیاق سے گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے
کی طرح جھلملاتی مصری کی ڈلی کو دیکھا اور الجھ کر کسی گہری
سوچ میں ڈوب گیا۔بیگو قلانچیں بھرتی بھاگ کھڑی
ہوئی۔تھوڑی دور سے پلٹ کر آئی اور مصری اس کی گود
میں پھینک کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔اس کی یہ حرکات
سعادت کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔مصری کی ڈلی کئی روز تک
اس کی قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔۔پھر سعادت نے اسے
کسی دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد اسے چیونٹیاں چٹ
کر گئیں۔بیگو کا یہ ناقابل فہم رویہ ہی کم الجھن آمیز نہ تھا کہ
اس کا غیاب ایک اور پریشانی ثابت ہوا۔ہزاروں وسوسے
اور اندیشے ذہن میں کلبلاتے لیکن کہیں بھی جواب مل کے ہی
نہ دیتا۔دن پر لگائے گذرتے رہے۔بیگو کی یاد کسی خلش کی
طرح دل میں حشر برپا کیے رکھتی مگر جانے اسے زمین کھا گئی
کہ آسمان نگل گیا۔

سعادت حسن بالآخر تین ماہ بعد عشق ناتمام کا دائمی
روگ دل پر سجائے واپس امرتسر چلا آیا۔

☆......☆

امرتسر میں معمولات جوں کے توں تھے۔
گلی کوچے' احباب کی محفل' گھریلو حالات کہیں بھی تو
کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔کسک اور احساس محرومی دل کے
نہاں خانوں میں سجائے سعادت نے خود کو ایک بار پھر کتب
بینی میں غرق کردیا۔عشق ناتمام کا درد بھی چین نہ لینے
دیتا۔لکھنے کی چاٹ لگ گئی تھی لیکن حلقہ احباب ہی ایسا نہ تھا
کہ کوئی بہتر رہنمائی میسر ہوسکے۔اس کے ذہن میں مچلتے
الفاظ اور لکھنے کے ہنر کو اخراج کا رستہ درکار تھا۔دل ودماغ
پر حبس کی سی کیفیت طاری رہنے لگی تو قدم دوبارہ فضلو کمہار کی
بیٹھک کی جانب مڑ گئے۔قمار بازی اب اسے بے کیف
محسوس ہونے لگی تھی۔چندروز بعد بیٹھک میں ابراہیم نامی

امرتسر میونسپلٹی میں تانگوں کے داروغہ نے یونہی باتوں باتوں میں آغا حشر کی آمد کا ذکر کر کے اسے سنسنی میں مبتلا کر دیا۔

آغا حشر سے وہ اسکول کے زمانے سے ہی بہت متاثر تھا۔ وہ بھی کوچہ وکیلاں ہی کے رہائشی رہے تھے۔ اس پہ مستزاد کشمیری بھی تھے۔ ان عوامل نے سعادت کو ایک بے عنوان سحر میں گرفتار کر رکھا تھا۔ اس نے چند دوستوں کے ساتھ ایک ڈرامیٹک کلب کھول کر آغا صاحب کا ایک ڈراما اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ کلب صرف دو تین ہفتے ہی قائم رہ سکا۔

امرتسر میں آغا حشر کی موجودگی سعادت کے لیے اُمید کی ایک نئی کرن تھی۔ وہ ان سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اپنے جمود سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری تجاویز حاصل کر سکتا تھا۔ وہ کئی روز تک ابراہیم سے ان کا پتا ٹھکانا دریافت کی کوشش کرتا رہا لیکن ابراہیم بھی چکنا گھڑا ثابت ہوا۔ وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ منٹو کی انا پسند طبیعت کے لیے یہ رویہ نا قابل برداشت تھا۔ اس نے خود ہی مختلف ذرائع سے آغا صاحب تک رسائی کے وسیلے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ اس تلاش کا اختتام ہری سنگھ کے ہاتھوں ہی ہوا۔ ہری فراڈ رستوں سے یورپ کی کئی بار سیاحت کر چکا تھا۔ اس کا حلقہ احباب قابل رشک حد تک وسیع تھا لہٰذا سعادت کی مراد بر آئی۔

سعادت حسن کا جوش و ولولہ پہلی ملاقات میں ہی سرد پڑ گیا۔ وہ آغا حشر کے ظاہری حلیہ' زبان و بیان اور انداز و اطوار دیکھ کر بے حد مایوس ہوا تھا۔ انہوں نے چیختے ہوئے لال رنگ کی چمکدار ساٹن کا لاچا' دو گھوڑے کی بوسکی کی کالر والی سفید قمیص' کمر پر گہرے نیلے رنگ کا پھندنوں والا آزار بند پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کے غائبانہ تاثر سے بالکل متضاد ثابت ہوئے۔ وہ سعادت کی بات توجہ سے سننے کی بجائے اپنے معاملات میں ہی الجھے رہے۔ سعادت کو ان کی جانب سے کسی رہنمائی کی اُمید نہ رہی تو مایوسی مزید بڑھتی چلی گئی۔ بیٹھک جانا بھی آہستہ آہستہ موقوف ہو گیا۔ اس نے اپنے زور بازو سے کوئی رستہ تلاش کرنے کا ارادہ کیا اور مختلف اخباروں میں لکھنا شروع کر دیا۔ چند ماہ مزید گذرے تو علم ہوا کہ آغا حشر لاہور میں 'رستم و سہراب' نامی فلم بنانے کے لیے روپیا پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ سعادت فلم بینی کا شوقین تھا اور آغا صاحب کی فنی صلاحیتوں کا قائل بھی۔ اس کا دل لاہور جانے کے لیے

منٹو نے بحیثیت صحافی و مدیر روزنامہ 'مساوات' امرتسر؛ ہفت روزہ 'مصور' بمبئی، ہفت روزہ 'پارس' لاہور؛ ماہنامہ 'ہمایوں' لاہور؛ ماہنامہ 'عالمگیر' لاہور ہفت روزہ 'کارواں' بمبئی؛ ہفت روزہ 'کہکشاں' بمبئی؛ سہ ماہی 'اردو ادب' لاہور؛ روزنامہ 'احسان' لاہور؛ روزنامہ 'منشور' لاہور اور روزنامہ 'مغربی پاکستان' لاہور میں کام کیا۔ اس نے رسالہ 'ہمایوں' اور 'عالمگیر' کے روسی اور فرانسیسی نمبر مرتب کیے جو بہت مقبول بھی ہوئے۔

☆☆☆

منٹو کے متعلق مختلف ادیبوں کے تاثرات

☆ ''منٹو کو خود منٹو زندہ رکھے گا۔'' (ڈاکٹر کیول دھیر)

☆ ''منٹو نے زندگی کے مطالعے میں اپنے آپ کو ایک مومی شمع کی طرح پگھلایا ہے۔ وہ اردو ادب کا اکیلا شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس کے مزے اور رنگ کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ لوگ بدکتے ہیں' ڈرتے ہیں پر اس کے مطالعے کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہ زہر منٹو ہی پی سکتا تھا اور کوئی ہوتا تو اس کا دماغ چل جاتا لیکن منٹو کے دماغ نے اس زہر کو بھی بچا لیا۔'' (کرشن چندر)

☆ ''منٹو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے اور اسے یورپ کے اعلیٰ پایہ کے افسانہ نگاروں میں رکھا جا سکتا ہے۔ اگر منٹو موپاساں کے برابر نہیں پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور منٹو کا نہیں تھا جتنا کہ اس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔'' (دیویندر اِسر)

☆ ''منٹو سماج کے سینے پر نشتر بن کر چبھا ہے۔'' (پرکاش پنڈت)

☆ ''منٹو نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔'' (مہندر ناتھ)

س اٹھا۔ کچھ روز بعد باری صاحب نے اسے لاہور مدعو کر
۔ امرتسر سے لاہور صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔
نکھوں میں نئے خواب سجائے سعادت وہاں پہنچتے ہی
ری علیگ کے ساتھ مختلف امور میں مشغول ہوگیا۔ وہ اپنی
نگی دور ہونے کی راہ پا کر بہت خوش تھا۔ اس شام پیشہ
رانہ ذمہ داریوں سے فراغت پا کر اردو بک اسٹال جانے
فیصلہ ہوا تو اسے خبر ہی کہاں تھی کہ مہربان تقدیر اپنی پٹاری
س ایک اعزاز چھپائے بیٹھی ہے۔

بک اسٹال پر آغا حشر پہلے ہی سے موجود کتابوں کی
یداری میں مصروف تھے۔ انہیں دیکھتے ہی سعادت کی
ظروں میں چمک پیدا ہوگئی۔

''کیا بات ہے میاں؟ ان حضرت کو جانتے ہو
لیا؟ بہت بے چین معلوم ہونے لگے ہو۔'' باری علیگ نے
س کی کیفیت بھانپ لی۔

''جی ہاں! وہ آغا حشر کاشمیری ہیں۔ میں ان سے
مرتسر میں ایک بار مل چکا ہوں۔''

''یقین نہیں ہوتا۔'' باری صاحب بھی ان کی ظاہری
شخصیت کو دیکھ کر خاصے حیران ہوئے۔

''مجھے بھی نہیں ہوا تھا۔'' سعادت ہنسا۔ ''لیکن میں ان
کے ہاتھ میں موجود کتاب کو دیکھ کر چونکا ہوں۔''

''ارے! یہ تو تمہاری ہی 'سرگذشت اسیر' ہے۔'' وہ
مسکرائے۔ سعادت بھی کافی پُرجوش تھا۔ باری علیگ اور آغا
صاحب گرمجوشی سے متعارف ہوئے۔

''آپ جانتے ہیں یہ کتاب کس کی تصنیف
ہے؟'' باری صاحب نے معنی خیزی سے پوچھا۔

''نہیں بھئی!! مجھے تو ترجمہ کا انداز اچھا لگا تو نظریں ہٹا
ہی نہ سکا۔'' آغا نے کہا۔

''سن رہے ہو سعادت میاں!! آغا صاحب کے یہ
الفاظ تمہارے لیے کسی سند سے کم نہیں ہیں۔'' انہوں نے
کھنکارتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے واہ! بہت خوب!! امرتسر میں اس لونڈے کی
بے چینی دیکھ کر میں بھانپ تو گیا تھا کہ یہ ضرور کوئی نہ کوئی گل
کھلائے گا۔'' وہ خوش ہوئے اور دکاندار سے مخاطب
ہو کر بولے۔ ''یہ کتاب بھی میری خریداری میں شامل
کردو۔''

خوشی سے بے حال ہوتے سعادت نے ان سے
آٹوگراف بک پر دستخط کروائے۔ پہلی کتاب کا یہ نشہ اس
کے حواس پر غالب آنے لگا تھا۔ منزل کی مسافت اب واضح
تھی اور قوت بازو آزمانے کی ہمت بھی کم نہ تھی۔ اس نے
اپنے دوست 'حسن عباس' کے ساتھ مل کر 'آسکر وائلڈ' کے
ایک اشتراکی ڈراما 'ویرا' کا ترجمہ کیا اور بغرض اصلاح باری
صاحب کو تھما دیا۔ انہوں نے سطحی نظر ڈال کر مسودہ واپس
کردیا۔ سعادت کو تشفی نہ ہوئی تو اختر شیرانی سے ملاقات
کے بعد زبان وبیان کی اغلاط میں اصلاح کروا کر ہی دم
لیا۔ وہ اپنی منزل تک جلد رسائی کے لیے لمحہ بھر کی بھی
تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بے چین روح اپنے ممکنہ مدار
میں پہنچ کر بہت سرشار تھی۔

☆......☆

کسی بھی ادیب کے لیے اپنے سفر کا کامیاب آغاز اور
اپنی تخلیق کی انفرادیت قائم کرنا ہی جوکھم کا کام ہوتا ہے لیکن
سعادت حسن نے یہ خوش اسلوبی سے طے کرلیا تھا۔ ان
کامیابیوں سے تحریک حاصل کرتے ہوئے اس نے روسی
افسانوں کے تراجم کرنے شروع کردیے۔ وہ اشتراکی
ادب سے بے حد متاثر تھا۔ اس کے کمرے میں غلام حسن منٹو
کے علاوہ بھگت سنگھ' جان کرفارڈ ومارن' ٹیبیر رخ کی تصاویر
بھی آویزاں نظر آتیں۔ باری علیگ کے ساتھ طویل ادبی
نشستیں جمتیں۔ والٹیئر' روسو' مارکس' لینن' ٹراٹسکی' اسٹالن اور
گورکی کے بارے میں بحث ومباحثہ ہوتا۔ مطالعہ وسیع ہوا
تو حوصلہ بھی مہمیز ہونے لگا۔ وہ ستائش 'عوامی حیرت'
مسابقت کے نت نئے تجربات سے لطف اندوز ہوتا امرتسر
لوٹا تو ایک ہولناک معاشی تنگی اس کی منتظر تھی۔

والد کی وفات کے بعد اب وہ مکمل طور پر سوتیلے
بھائیوں کے زیر کفالت تھے۔ والدہ کی سادہ لوحی اور
دریا دلی کی انتہا یہ تھی کہ انہوں نے تمام ترجمع پونجی بیٹی کی
شادی کے بعد داماد کے حوالے کردی تھی۔ دونوں بڑے
بھائی انہیں 'چالیس' روپے ماہوار دے دیا کرتے جس کے
بعد سوتیلی والدہ کی لعن طعن سنتے رہنا حقیقتاً دل گردے کا کام
تھا۔ اس صورتِ حال سے سعادت کی روح میں شرارے
دوڑنے لگتے تھے لیکن مضبوط قوت ارادی اسے ہر موقع پر
کوئی بھی منفی فیصلہ کرنے سے روک لیا کرتی۔ شومئی قسمت
بمبئی سے ہفتہ وار 'مصور' کے مالک 'نذیر لدھیانوی' نے
اسے پرچے کی ادارت سنبھالنے کے لیے مدعو
کرلیا۔ سعادت کے لیے تو گویا بلی کے بھاگوں
چھینکا ٹوٹا۔ وہ پہلی فرصت میں بمبئی پہنچا اور 'چالیس' روپے

ماہوار پر ادارت سنبھال لی۔ رہائش کی عدم دستیابی کے باعث اس نے دفتر میں ہی سونا شروع کر دیا۔

''تم رات کو گھر نہیں جاتے ہو؟'' نذیر نے کچھ روز بعد استفسار کیا۔

''میں تو ایک بنجارا ہوں۔ فی الحال تو کوئی گھر ایسا نہیں بن سکا جو مجھے اپنی چار دیواری میں برداشت کر سکے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''یہیں دفتر میں چند گھڑی سو لیا کرتا ہوں۔''

''تو مجھے کرایہ بھی ادا کر دیا کرو۔ اب دیکھو ناں! اگر تم باہر کوئی کمرا کرائے پر لو تو وہاں بھی پیسا دو گے کہ نہیں۔'' انہوں نے فوراً اپنی کاروباری ذہنیت جتائی۔

''پیسے کی حقیقت اور طاقت سے کون انکار کر سکتا ہے بھلا؟ آپ بتایئے کتنی رقم کاٹیں گے میری تنخواہ سے۔''

''دو روپے لیا کروں گا۔'' سعادت ان کی پیشکش پر راضی ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد نذیر نے اس کے سامنے ایک نئی پیشکش رکھ دی۔

''تمہارا ہنر واقعی باکمال ہے منٹو! میں تمہیں ادارت کے علاوہ 'امپیریل فلم کمپنی' میں منشی کی نوکری بھی دلوا سکتا ہوں۔ کہو کیا خیال ہے؟''

بچپن ہی سے فلم بینی کے شائق سعادت کے لیے اس تجویز سے انکار ناممکن تھا۔ اس نے نذیر کا اصل مقصد بھانپ کر فوری رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''تنخواہ کتنی ملے گی؟ اور آپ اپنا کتنا کمیشن رکھیں گے؟''

''چالیس روپے ہی ملیں گے اور میں تمہیں بیس روپے دیا کروں گا۔ کرایہ کی کٹوتی اسی حساب سے ہوتی رہا کرے گی۔''

سعادت نے ہامی بھر لی اور بصد شوق امپیریل فلم کمپنی میں شمولیت اختیار کر لی جو حسن اتفاق سے ان دنوں ایسی تنزلی کا شکار تھی کہ ملازمین کی تنخواہیں بھی بڑی مشکل سے ادا کی جاتیں۔ کمپنی کے مالک سیٹھ اردیشر ایرانی کے دل میں جانے کیا سودا سمایا کہ انہوں نے اچھے وقتوں میں ہندوستان کی پہلی ناطق فلم 'عالم آرا' بنانے کا فخر حاصل کرنے کے بعد اس برے وقت میں پہلی رنگین فلم بنانے کا اعزاز لینے کے لیے بیرون ملک سے 'سنے کلر پروسس' کی مشینیں منگوا لیں۔ کمپنی کا ڈوبتا جہاز یہ بوجھ برداشت نہ کر پا رہا تھا۔ ملازمین کو تھوڑی بہت رقم پیشگی دے کر باقی ماندہ ادھار میں لکھ دی جاتی۔ اس فلم کی ڈائریکشن 'موتی بی گڈوانی' کے سپرد تھی۔ انہوں نے ایک روز سعادت کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

''میں تمہاری صلاحیتوں کا بہت مداح ہوں! اس پہلی رنگین فلم کی کہانی اگر تم لکھو تو اتہاس میں امر ہو سکتے ہو۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں گڈوانی صاحب!! لیکن آپ کی کمپنی کے مالک یہ بات برداشت کر لیں گے کہ ایک معمولی منشی ان کی فلم کا مصنف ہو۔'' اس نے ازلی صاف گوئی سے کہا۔

''یہ واقعی ایک سمسیا ہے۔ کیا تم کسی ایسے پُرش کا نام نہیں بتا سکتے جو اپنا نام استعمال کرنے کی آگیا دے۔ میں تمہیں فلم لکھنے کا اچھا پیسا دوں گا۔'' سعادت نے اس پیشکش کے جواب میں ٹیگور کی یونیورسٹی میں ایک شناسا پروفیسر ضیاء الدین کو اس راز میں شریک کر لیا۔ فلم نہایت جوش و خروش سے مکمل ہوئی اور شاندار طریقہ سے ناکام ہو کر کمپنی کی حالت مزید ابتر کر گئی۔ سعادت ڈوبتے ہوئے جہاز میں سوار رہنے کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس موقع پر بھی نذیر نے اس کی مدد کی اور اسے 'فلم سٹی' میں سو روپیا ماہوار پر نئی ملازمت دلوا دی۔ اچھی تنخواہ ملتے ہی سعادت نے دفتر میں رہائش چھوڑ کر قریبی چالی (عمارت) میں ایک کھولی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

''اکیلے رہو گے یا جورو بھی ساتھ آئے گی۔'' مالک مکان نے پوچھا۔

''میں کنوارا ہوں بھائی! اکیلا ہی رہوں گا۔''

''کرتے کیا ہو؟''

''فلم کمپنی میں ملازم ہوں۔''

''شکل و صورت سے تو اچھے خاندان کے لگتے ہو پھر یہ ملازمت کیوں؟ فلم والوں کے چھن تو بڑے ہی خراب ہوا کرتے ہیں۔ میں اپنی چالی میں کسی مہیلا کا لفڑا برداشت نہیں کروں گا۔ بتائے دیتا ہوں۔''

''میری مہیلاؤں سے کبھی بنتی بھی نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''ان کا بس چلے تو میرے افسانوں میں چھپے سچ پر میرا کئی بار قتل کر چکی ہوتیں۔''

''نو روپے کرایہ لوں گا۔ منظور ہے تو بولو۔'' مالک نے بے رخی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن خیال رکھنا یہاں کوئی بھی میری ذاتی زندگی میں دخل اندازی نہ کرے۔'' اس نے بھی سرد مہری سے کہا اور اپنی نئی دنیا میں مگن ہو گیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی

جس میں چالیس کھولیاں تھیں۔ حوائج ضرورت کے لیے دو غسل خانے تھے جن کے دروازے ندارد تھے۔ کھولی کی چھت سے کھٹمل بارش کی طرح برسا کرتے تھے۔ وہ رات کو مٹی کے تیل کا لیمپ جلا کر کام کیا کرتا اور کھانا قریبی ہوٹل سے لے آتا۔ اس پُرسکون زندگی میں ہلچل مچانے کے لیے ایک روز بی بی جان چلی آئیں۔

"سعادت! تو اس غلیظ جگہ پر رہتا ہے؟" وہ صدمے سے رونے لگیں۔

"یہ بدبودار جگہ ان اونچے گھروں سے بہت اچھی ہے جہاں تعفن زدہ مکین رہتے ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تو اتنے مہینوں سے بمبئی میں رہ رہا ہے۔ ایک بار بھی بہن سے ملنے نہیں گیا۔ اتنا سفید خون ہوگیا ہے کیا تیرا؟" وہ ہچکیوں میں گویا ہوئیں۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے اس کے شوہر کی حرکات ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اس میں دنیا جہان کے عیب ہیں لیکن کسی دوسرے کو وہ انسان ہی نہیں سمجھتا۔"

"یہ جھگڑا اب ختم کردو! تمہیں خیال کرنا چاہیے تھا کہ بہنوئی کو اسی کے منہ پر بدکردار کہہ دیا۔"

"تو غلط کہا کیا؟ میں آئندہ بھی اسے ہر غلطی پر ٹوکتا رہوں گا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"تمہاری کمائی اس قدر کم کیوں ہے سعادت؟" انہوں نے نیا سوال داغا۔

"میں اس کمائی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔"

"مجبوری کا نام شکریہ بیٹے! اگر تم اپنے بھائیوں کی طرح تعلیم یافتہ ہوتے تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔"

"زیادہ کمائی کوئی مشکل کام نہیں لیکن میری کون سی بیوی بچے ہیں جن کے لیے اتنا جھنجٹ پالوں۔" اس نے والدہ کا دھیان بٹانے کے لیے مذاقاً کہا۔

"میں تو کب سے دل میں تمہاری شادی کے ارمان دبائے بیٹھی ہوں۔ اس اتوار میرے ساتھ چلنا۔ میں تمہارے رشتہ کے لیے ایک جگہ بات چلاتی ہوں۔" انہوں نے کچھ سوچ بچار کے بعد کہا۔

سعادت نے بھی غیر سنجیدگی سے ہامی بھرلی۔ وہ بی بی جان کو افسردگی کے مدار سے نکالنا چاہتا تھا اس لیے اتوار کو اپنا حلیہ قدرے شریفانہ بنا کر 'ایننگ لیڈمینشنز' کے پاس ایک فٹ پاتھ پر جا کھڑا ہوا۔ والدہ وہیں ایک عمارت کی تیسری منزل کے فلیٹ میں رہ رہی تھیں۔ وہ بالکنی میں کھڑی اسی کی منتظر تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ بیس' پچیس گز دور ایک عمارت 'جعفر ہاؤس' کی دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں موجود تھے۔ یہاں کشمیری ذات سے تعلق رکھنے والے ملک حسن اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ وہ محکمہ پولیس میں 'فنگر پرنٹ اسپیشلسٹ' تھے۔ وہ فلش کے رسیا اور کثیرالاولاد تھے۔ تنخواہ واجبی تھی۔ سعادت کے سوتیلے بھائیوں سے مشرقی افریقا میں دوران ملازمت مل چکے تھے اور آج کل اپنی بیٹی صفیہ کے لیے اچھے رشتے کی تلاش میں تھے۔ بی بی جان اندر زنانے میں چلی گئیں اور سعادت ملک صاحب سے گفتگو میں مشغول ہوگیا۔

"کہاں کام کرتے ہو برخوردار؟" انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

"فلم کمپنی میں۔ ان دنوں بہت مندا چل رہا ہے۔ کمپنی گھاٹے میں ہے۔ کبھی کبھی ایڈوانس کے طور پر تھوڑی بہت تنخواہ دے دیا کرتے ہیں۔" سعادت اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیل رہا تھا۔

"رہتے کہاں ہو؟" اگلا سوال حسب توقع تھا۔

"یہیں قریب ہی ایک کھولی میں۔ کھانا ہوٹل سے ادھار پہ مل جاتا ہے۔ کبھی نہیں بھی ملتا لیکن چھ بجے کے بعد بیئر کی بوتل سے ناغہ نہیں کیا کرتا۔" وہ ملک صاحب کو مکمل صاف گوئی سے تمام حقائق بتاتا چلا گیا۔ مطمع نظر یہی تھا کہ وہ اس رشتے سے خود ہی انکار کردیں۔ واپسی میں اسے علم ہوا کہ بی بی جان نے بھی ان سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ ملک صاحب اگلی دو' تین اتواریں انہیں کھانے پر مدعو کرتے رہے۔ کشمیری روایات کے عین مطابق کھانا بہت لذیذ ہوتا تھا اور پھر ایک روز بی بی جان نے انکشاف کیا کہ انہوں نے سعادت حسن کو اپنی فرزندگی میں قبول کرکے نکاح کی تاریخ مقرر کردی ہے۔ یہ انکشاف اس کے لیے ہولناک تھا۔ وہ اپنے کردار کی تمام تر خامیاں ان کے گوش گزار کرکے مطمئن تھا کہ یہ رشتہ کسی صورت طے نہیں پائے گا لیکن اس موڑ پر وہ تقدیر کی کارستانیاں فراموش کربیٹھا تھا۔ سعادت کی خامیوں سے قطع نظر ملک صاحب کو اس کی سچائی اور صاف گوئی نے ہی متاثر کیا تھا۔ سگریٹ' شراب کی لت تو اکثر مردوں میں پائی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے متوقع سسرال کے سامنے 'فرشتہ صفت' بن کر پیش ہوا کرتے ہیں۔ سعادت واحد انسان تھا جس نے انہیں دھوکے میں نہیں رکھا تھا۔ دو' تین ملاقاتوں میں وہ اس کے وجود میں سلامت

خاندانی اطوار بخوبی بھانپ گئے تھے لہٰذا شادی کے لیے ہامی بھرلی۔

دوسری جانب سعادت ایک نئے آزار میں مبتلا ہوچکا تھا۔ وہ بھاگ کر کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا لیکن کوئی غیر مرئی قوت ایسا کرنے ہی نہ دیتی۔ نکاح کی رسم کے لیے پیسوں کا انتظام اس کے ہوش اڑائے ہوئے تھا۔ وہ سیٹھ اردیشر کے پاس پہنچا اور اپنا مدعا بیان کیا۔

''میرے نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے سیٹھ صاحب! آپ کی طرف میرے ڈیڑھ ہزار روپے نکلتے ہیں۔ کب ادا کررہے ہیں؟''

''کمپنی کی حالت تمہارے سامنے ہی تو ہے! اگر مندا نہ ہوتا تو میں خود تمہاری شادی کرواتا۔ خوشحالی کے دنوں میں ملازمین کی مدد سے میں نے کبھی انکار کیا تھا کیا؟'' وہ بیزاری سے بولے۔ سعادت قدرے مایوس ہوکر جانے کے لیے پرتولنے لگا۔

''اچھا رکو!! میں اتنا کرسکتا ہوں کہ حافظ جی کو تمہارے ساتھ کیے دیتا ہوں۔ میرے کھاتے سے ضروری سامان کی خریداری کرلینا۔'' ان کی پیشکش غنیمت تھی۔ وہ دونوں بزاز کی دکان پر پہنچے اور دو ساڑیاں خرید لیں۔ اگلے مرحلہ میں اسے جوہری کے پاس لے جایا گیا۔

''بھئی مجھے تو زیورات کی پہچان نہیں۔ ایک آدمی ساتھ بھیج دیجیے۔ لڑکی خود ہی زیور پسند کرلے تو بہتر ہے۔'' اس نے رائے دی جو فوراً تسلیم بھی ہوگئی۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ 'جعفر ہاؤس' پہنچ گیا۔

''خالہ جان! یہ کچھ زیورات ہیں۔ آپ بلا تامل اپنی پسند سے خرید لیجیے۔'' اس نے خورشید امن صاحبہ سے کہا۔ انہوں نے ہیرے کی انگوٹھی' موتیوں کی بوٹیاں (کانوں میں پہنے جانے والے زیور)' ایک پنڈنٹ اور دو طلائی چوڑیاں پسند کرلیں۔ سعادت انہیں بہتیرا قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ مزید زیور بھی خرید لیے جائیں لیکن وہ داماد پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ ڈیڑھ ہزار کی رقم میں سے محض پانچ سو ہی وصول ہوسکا تھا۔

نکاح کے دن قریب آنے سے سعادت کی پریشانی اور بے چینی میں اضافہ ہی ہورہا تھا۔ اپنی آزاد زندگی میں ایک نئے رشتے کی زنجیر کا تصور اسے بہت ہولناک محسوس ہوتا۔ اس پہ مستزاد بمبئی میں کوئی رشتہ دار بھی موجود نہیں تھا جو تیاریوں میں ہاتھ بٹا دیتا۔ بہن کی موجودگی تو یوں بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہنوئی اسے طلاق کی صورت میں ہی بھائی سے ملنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ اپنے احباب کو خود ہی نکاح میں مدعو کرتا رہا۔ شاہ جہاں ہوٹل کے مالک سید فضل شاہ کو شرکت کی دعوت دے کر لوٹا تو سنگی فرش پر پاؤں پھسلا اور وہ اس زور سے گرا کہ ہوش وحواس ہی سے بیگانہ ہوگیا۔ ہوش میں آیا تو مضروب ٹانگ اور دکھتا وجود لیے مارکیٹ پہنچا اور نکاح کے لیے الائچی وچھوارے خرید کر پندرہ بیس افراد کی معیت میں درد کی ٹیسوں پر قابو پاتے ہوئے صفیہ کو اپنی زوجیت میں قبول کرلیا۔ رخصتی کچھ عرصہ بعد ہونا طے پائی تھی۔

اس رات وہ اپنی کھولی میں سونے کے لیے لیٹا تو نہ چاہتے ہوئے بھی بیوی کا خیال کسی بھی لحہ ذہن سے محو ہونے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ متوقع ذمہ داریوں کا احساس اس کی نیند اڑانے کے لیے کافی تھا۔

☆......☆

سعادت حسن کی دانست میں صفیہ بیگم سے نکاح بہت مہلک ثابت ہوا۔

اس روز چوٹیں ہی کیا کم تھیں کہ کچھ دن بعد کمپنی کا بھی مکمل دیوالیہ نکل گیا۔ اس کے ایک ہزار روپے بھی کمپنی کے ساتھ ہی ڈوب گئے۔ سعادت کو اگلی ملازمت 'سروج مووی ٹون' نامی کمپنی میں ملی۔ تنخواہ ایک سو روپیا ماہوار قرار پائی لیکن مذکورہ کمپنی کی زندگی صرف دو ماہ تک ہی سلامت رہ سکی۔ سروج مووی ٹون کے ایک چلتے پرزے شخص سیٹھ نانو بھائی ڈسائی نے ایک مالدار مارواڑی کو شیشے میں اتارا اور 'ہندوستان سنے ٹون' کے نام سے امید کی صورت کسی نہ کسی طور برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ سعادت کی دوسری فلمی کہانی 'مڈ' (کیچڑ) کے عنوان سے تکمیل کے مراحل تک پہنچ گئی تھی۔ یہ فلم نصف پڑاؤ تک ہی رسائی حاصل کرپائی تھی کہ مارواڑی سیٹھ سٹے میں اپنی ساری دولت اور گاڑی تک لٹا بیٹھا۔ اب تو سعادت کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ نکاح اس کے لیے بالکل بھی مبارک ثابت نہیں ہوا۔

بہرطور نانو بھائی ڈیسائی نے کسی بھی طرح قرض اٹھا کر فلم مکمل کرہی لی۔ ان دنوں سعادت حسن کی دوستی رفیق نامی ایک شخص سے تھی۔ رفیق نے ایک روز کسی لڑکی سے ملاقات کے لیے جانا تھا۔ شوخی وشرارت میں وہ بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ وہاں کسی بدزبانی کے باعث رفیق مکینوں سے الجھ گیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان دونوں کو پولیس کے

حوالے کردیا گیا۔ اس حادثہ کا تعلق بھی نکاح سے جوڑتے ہوئے سعادت سنجیدگی سے ملک حسن کی شرافت اور رواداری کی بابت سوچ سوچ کر شرمندہ ہو رہا تھا۔

''میں آپ کی بیٹی کے لیے مناسب جوڑ نہیں ہوں خالہ جان!! آپ چاہیں تو اس کی شادی کسی بھی شریف اور باکردار شخص سے کردیں۔'' وہ ذہنی طور پر صفیہ کو طلاق دینے کے لیے بھی آمادہ تھا۔

''یہ کیا اول فول کہہ رہے ہو؟ ہمیں تمہاری بے گناہی کا مکمل یقین ہے۔'' ان کے الفاظ پر وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ نکاح کی رسم کو دس ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ملک حسن نے بی بی جان پر رخصتی کا دباؤ ڈال کر شادی کی تاریخ مقرر کردی۔ ان دنوں وہ 'مصور' ہی میں چالیس روپے ماہوار پر فرائض سرانجام دیتا، دفتر میں ہی رہائش پذیر تھا۔ شادی میں دس دن باقی رہے تو اس نے دفتر کے پاس ہی ایک عمارت میں پینتیس روپے ماہوار پر فلیٹ حاصل کرلیا۔ کسی کی مدد نہ ہونے کے باعث فلیٹ کے دروازے اور فرش خود ہی سوڈا کاسٹک سے رگڑ کر دھوئے۔ وہ ذہنی طور پر شدید جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ماہانہ پانچ روپے سے گھر چلانا کسی صورت ممکن نہ تھا۔ نانو بھائی ڈیسائی کی جانب اٹھارہ سو روپے واجب الادا تھے جس کی ادائیگی کے لیے وہ تیار ہی نہ تھا۔ سعادت نے ڈیسائی کو بھوک ہڑتال اور پریس میں جانے کی دھمکی دے کر بمشکل پانچ سو روپے حاصل کیے جو دلہن کی ساڑیاں خریدنے میں ہی صرف ہوگئے۔ فرنیچر کا حصول اب بھی باقی تھا۔ گھر میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی تک موجود نہ تھی۔ اس موقع پر حکیم محمد ابوطالب اشک عظیم آبادی نے اس کی مدد کی اور آسان اقساط پر سیکنڈ ہینڈ فرنیچر دلوادیا۔ لوہے کے اسپرنگوں والی دو چارپائیاں' ایک سنگار میز' برتن وغیرہ رکھنے کی الماری' لکھنے والی میز اور ایک کرسی کے بعد وہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے بھی خرید لایا۔ بی بی جان بھی اس کے یہاں منتقل ہو چکی تھیں۔ اسی افراتفری کی سی کیفیت میں بالآخر شادی کا دن بھی آپہنچا۔

نذیر نے فلمی صنعت سے وابستہ کچھ افراد کو دعوتی رقعے ارسال کردیئے تھے۔ تمام احباب دلی طور پر اس خوشی میں شریک تھے۔ بابوراؤ پٹیل نے بی بی جان کی مدد کے لیے پدما دیوی کو (پہلی رنگین فلم کی ہیروئن) فلیٹ میں بھیج دیا۔ منٹو جلے پاؤں کی بلی بنا دفتر میں ہی موجود تھا۔ اسی دوران اقبال بیگم نے اس سے ٹیلی فون پر رابطہ کرلیا۔

''آج میرے پیارے بھائی کے سر پر سہرا سجے گا۔ کتنا مبارک دن ہے۔ کاش میں بھی خوشی کی ان گھڑیوں میں تم سب کے ساتھ شریک ہوسکتی۔''

''اپنے شوہر نامدار سے اجازت لے کر آجاؤ۔ بی بی جان اور میں تمہیں واقعی بہت یاد کررہے ہیں۔''

''وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ میں کئی بار کوشش کرکے دیکھ چکی ہوں۔'' اقبال افسردگی سے بولی۔ ''اچھا یہ بتاؤ شادی کی تیاریاں مکمل ہوگئیں؟''

''خاک مکمل ہوئیں!'' وہ کلس کر کہنے لگا۔ ''میری جیب میں صرف ساڑھے چار آنے موجود ہیں۔ چار آنے میں سگریٹ کی ڈبیا اور دو آنے کی ماچس مل جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا مجھے علم نہیں۔''

''اللہ بہتر کرے گا پیارے بھائی!! تم میری خاطر ایک کام کردینا۔ جب 'جعفر ہاؤس' جانے لگو تو رستے میں کچھ دیر ہماری بلڈنگ کے باہر ضرور رکنا۔ میں ایک بار جی بھر کر دلہا بنے بھائی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کی جذباتی کیفیت نے سعادت کی طبیعت مزید بوجھل کردی۔ اس نے رابطہ منقطع کرنے میں ہی عافیت جانی۔ شام تک اس کے ذہنی انتشار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ دفتر سے قریب ایک سیلون میں کٹنگ اور حمام میں غسل ادھار پر ہوا۔ اس منتشر کیفیت میں اس نے سگریٹ کی ساری ڈبیا پھونک ڈالی۔ سسرال سے آیا سوٹ اور ٹائی پہنے وہ بالآخر برأت لیے روانہ ہوا تو ڈرائیور کو اقبال کے فلیٹ کی بابت بتانا نہ بھولا تھا۔ اقبال بیگم آنکھوں میں آنسو لیے فٹ پاتھ پر ہی موجود تھی۔ سعادت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ڈھیروں دعاؤں میں بھائی کو رخصت کیا۔

ملک حسن اور اہلخانہ نے نہایت محبت سے سب کا استقبال کیا۔ کھانا بھی کشمیری روایات کے مطابق شاندار تھا۔ ہاروں سے لدی پھندی صفیہ جب گاڑی میں بیٹھی تو سعادت کے جذبات میں یکدم ہی تغیر پیدا ہو گیا۔ گذشتہ دس' گیارہ ماہ سے طاری کوفت' بیزاری' اخراجات کی فکر' نقصانات ہونے پر نحوست کے فتوے ہوا میں کہیں تحلیل ہوگئے۔ ایک خوبصورت سا احساسِ ملکیت روح وقلب میں میٹھی میٹھی سی سرشاری پیدا کرنے لگا۔ عجیب تربات تو یہ تھی کہ صفیہ کا نازک وجود اسے اپنی تکمیل کا احساس دلانے لگا تھا۔ دل میں بے اختیار اس سے مخاطب ہونے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن بی بی جان کے احترام میں اس نے

خاموشی میں ہی بہتری بھی۔ ابن آدم بالآخر بنت حوا کے لیے جبلی کشش سے مغلوب ہو کر سرنگوں ہو گیا تھا۔

☆......☆

صفیہ ایک مثالی بیوی ثابت ہوئی۔

وہ متحمل مزاج، نرم خو اور وفا شعار عورت تھی جس نے سعادت کی زندگی میں ایک نئی روشنی بھر دی۔ وہ جان گئی تھی کہ شوہر سگریٹ نوشی کی عادت میں مبتلا ہونے کے علاوہ بلا کا مے نوش بھی ہے۔ اس نے روایتی بیویوں کی طرح رونا دھونا مچا کر خاوند پر اخلاقی دباؤ ڈالنے سے گریز ہی کیا۔ اس کی بصیرت یہ بھی بھانپ گئی تھی کہ سعادت کا خمیر بے چینی اور بغاوت سے گندھا ہے۔ کسی بھی قسم کی سختی اسے رشتوں سے بدکنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ نہایت صبر و سکون سے وقت گذارنے لگی۔ گھریلو سکون میسر آتے ہی سعادت کا قلم مہمیز ہوتا گیا۔ اس کی تخلیقات میں بے باکی اور قلم میں گہری کاٹ تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی انسانی مطالعہ کی لت پڑنے سے کیے جانے والے مشاہدات اب نشتر بن کر تحریروں میں سمانے لگے۔ وہ زندگی کو اصل شکل میں پیش کرنے کا قائل تھا۔ ماضی میں کھو کر آہیں بھرتی ہوئی یا مستقبل کی تخیلاتی تحریروں سے اسے کوفت تھی۔ افسانہ نگاری میں اب سعادت حسن منٹو کی شناخت مسلمہ تھی لیکن کوئی بھی ادیب محض ستائش کے سہارے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ پیسا سب سے بڑی حقیقت ہے۔ دولت اور تقدیر اس پر کبھی مہربان نہیں رہیں۔ افسانوں سے حاصل ہونے والی رقم گھریلو ضروریات کے علاوہ شراب نوشی پر بھی صرف ہوتی تھی۔ وہ حتی الامکان اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے سرگرم عمل تھا کہ اسی دوران بی بی جان کی ناگہانی وفات نے اس کی کمر ہی توڑ دی۔ وہ صدمہ سے اپنے اعصاب سے قابو کھو کر کئی گھنٹے بے ہوش رہا۔ کوئی بھی حیلہ، تڑپ، دعا اور جتن عزیز از جان ماں کو واپس نہ لا سکے۔ سعادت کے وجود پر اجنبیت کی کہر چھا گئی۔ اسے مناظر، رشتے، ذمہ داریوں، فرائض گویا ہر ایک شے سے بیزاری محسوس ہوا کرتی۔ سینے پر رکھی غم کی چٹان اس قدر بھاری تھی کہ سانس لینا بھی کسی اذیت سے کم نہ تھا۔ اگلے کئی ماہ اسی ذہنی کشمکش میں گذر گئے۔ بالآخر قدرت نے اس کے لیے کچھ آسانیاں پیدا فرمائیں۔ 'آل انڈیا ریڈیو دہلی' سے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر نوکری کی پیشکش تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ 1941 میں سعادت حسن دنیائے ریڈیو میں تہلکہ مچانے دہلی روانہ ہو گیا۔

☆......☆

دہلی منتقل ہونے کے بعد سعادت حسن کو نئے چیلنجز کا سامنا تھا۔

ادبی حلقوں میں بحیثیت مصنف اس کی ایک واضح پہچان تھی جس کی بقاء کے لیے وہ کمر کسے میدان میں آ گیا۔ محنت سے جی نہیں چراتا تھا لہٰذا دن رات مشین کی طرح کام کرنے لگا۔ منٹو نے فیچر یا ڈرامے کبھی قلم سے نہیں لکھے۔ ایک دفعہ ٹائپ رائٹر سنبھال کر بیٹھ جاتا تو دماغ برق رفتار گھوڑا بن جاتا۔ انگلیاں کھٹا کھٹ چلتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے فیچر یا ڈراما تیار ہو جاتا۔ اس وقت ادب کے میدان میں منٹو، اوپندر ناتھ اشک، رتن چندر، راجا مہدی علی خاں اور راجندر سنگھ بیدی کا ڈنکا بجتا تھا۔ یہ سبھی افراد ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر اس مخمس نے اردو ادب کے لیے بہت ہی اچھی تخلیقات فراہم کیں۔ بیدی کی 'گرہن' اور منٹو کی 'ہتک' اسی زمانہ میں لکھی گئیں۔ سعادت حسن تیزی سے کامیابی کے زینے چڑھ رہا تھا۔ شہرت کی دیوی اس پر بہت مہربان تھی۔ اسی ناموری کے باعث وہ حادثہ ہوا جس نے آل انڈیا ریڈیو میں اس کے نام کا باب یکدم بند کر دیا۔

کسی بھی میدان میں شہرت، کامیابی اور ہر دلعزیزی ازل ہی سے سب سے پہلے قریبی احباب کو متاثر کیا کرتی ہے۔ ناموری کی چکاچوند جب متعلقہ فرد کو اپنے حصار میں لے تو نزدیک ترین افراد قدرے تاریکی میں چلے جاتے ہیں جس کے باعث ان کے دل و دماغ میں برپا ہونے والی مدوجزرانہ کیفیات جلد محسوس ہی نہیں ہو پاتیں۔ سعادت حسن بھی اپنے تمام تر تجربہ اور مردم شناسی کے باوجود یہ جان ہی نہ پایا کہ اس کا ساتھی 'اوپندر ناتھ اشک' حاسدانہ و معاندانہ جذبات میں گرفتار ہو کر اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو گیا ہے۔

منٹو اپنی ہر تخلیق کے معاملہ میں حد درجہ حساس تھا۔ اس کا لکھا ہوا ہر ایک لفظ حتمی تصور ہوتا۔ اس کی رضامندی کے بغیر تحریر میں ذرا سا تغیر کرنا ایک ناممکن امر تھا۔ منٹو کی یہی کمزوری اشک کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ خودساختہ مسابقت بازی اور منٹو کی بڑھتی مقبولیت سے خائف اشک ہندی سیکشن میں تھا۔ ڈراما پروڈیوسر کرشن چندر ان دنوں طویل رخصت پر تھا۔ سعادت کا ڈراما پروڈیوس ہونے کے لیے تیار تھا۔ کرشن کے غیاب پر اشک کی بن آئی۔ کرشن

چندر کی جگہ ایک نیا معاون لکھنؤ سے دہلی منتقل ہوا تھا اور مکمل طور پر اشک ہی کے زیر اثر تھا۔ منٹو کا ڈراما جونہی اس کی میز پر آیا اس نے اشک کی رضامندی سے اسکرپٹ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ اشک کو علم تھا کہ منٹو کی خود پسندی اس چھیڑ چھاڑ کو کبھی بھی برداشت نہیں کرے گی۔ اس کا تیر بالکل نشانے پر بیٹھا۔ سعادت نے ایک طوفان برپا کردیا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ وہ کانٹ چھانٹ کیا گیا ڈراما کسی بھی قیمت پر پروڈیوس نہیں ہونے دے گا۔ یہ قضیہ اسٹیشن ڈائریکٹر تک پہنچا جس نے منٹو کے خلاف فیصلہ کیا۔ یہ دھچکا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ سعادت حسن نے اپنا اسکرپٹ واپس لیا اور ریڈیو کی نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ (اس قضیہ کا احوال سرگزشت شمارہ نومبر 2016ء میں تفصیل سے چھپ چکا ہے)۔

☆......☆

سعادت کی زندگی روز پیدائش سے ہی تند بگولوں کی زد میں رہی تھی۔ کوئی بھی آزمائش اس سے ملاقات کے لیے تنہا نہیں آتی تھی بلکہ اپنی معیت میں کسی نہ کسی ہمجولی کو بھی لے آیا کرتی۔ نشانہ ستم ہر دفعہ اس کی کسی نہ کسی محبوب شے یا رشتہ ہوتا تھا لیکن اس بار تو گویا حد ہی ہوئی کہ ایک سالہ بیٹے عارف نے عدم کی راہ لے لی۔

اس ناگہانی موت سے سعادت کے وجود کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ بیٹے کے لیے اس کے جذبات بے حد شدید رہے تھے۔ اس نے ہمیشہ عارف کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ چھ سات دن کا تھا تو وہ اسے اپنے پاس سلانے لگا۔ اسے خود تیل کی مالش کرکے نہلاتا۔ صفیہ کی غیر موجودگی یا مصروفیت میں عارف کو دودھ پلانے سے بڑی خوشی اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے بیٹے سے عشق تھا۔ وہ اسے دنیا جہان کی نعمتوں اور اپنی بھرپور محبتوں سے سرفراز کرنا چاہتا تھا۔ تقدیر کے اس وار پر وہ اپنے ہوش وحواس سلامت نہ رکھ پایا اور خود کو شراب کے نشے میں غرق کرلیا۔ دھیرے دھیرے 'منٹونیت' اس پر غالب آتی گئی۔ وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر کاغذ قلم سنبھال لیتا۔ پہلے صفحہ کی پیشانی پر 786 لکھتا اور پھر بڑے اہتمام سے سماج کے گلے سڑے رسم و رواج کے چیتھڑے اتار کر انہیں اپنے اصل اور کریہہ روپ سے آشنا کرواتا۔ طوائفوں کے کردار کو اس قدر نزاکت اور خوبصورتی سے بیان کرتا کہ قاری اس کی روح کے آرپار دیکھنے کے قابل ہوجاتا۔ (انہی بے باک افسانوں میں 'دھواں' 'بو'

اور 'کالی شلوار' کی وجہ سے اسے مقدمات کا سامنا بھی کرنا پڑا) دن بھر ملاقاتیوں سے نمٹتا اور شام ڈھلے جم کر مے نوشی کرتا۔ وہ بیٹے کی موت کا زخم ہر ممکن طور پر نہاں رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو چلا تھا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات عصمت چغتائی اور شاہد لطیف سے ہوئی جو صفیہ اور اس کی جامد زندگی میں خوشگوار تازگی لے آئے۔

''عصمت بہن! آپ سے ملنے کی بہت تمنا تھی مجھے۔''

''تمنا تو خیر مجھے بھی بہت تھی لیکن آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''معلوم نہیں... میں خواتین کو کبھی بہن نہیں کہا کرتا۔ وہ اسے اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ آپ کو کیوں کہہ رہا ہوں یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔''

''کمال ہے!! یہ منٹو کہہ رہا ہے۔ وہ منٹو جو اپنے افسانوں میں دلائل اور منطق سے ہر ایک کی بولتی بند کراویتا ہے۔'' عصمت ہنسی۔

''ویسے آپ کو علم ہے کہ میں آپ کو خواتین کا منٹو کہا کرتا ہوں۔'' وہ شرارت پر آمادہ تھا۔

''پھر تو آپ مردوں کی عصمت چغتائی ہوئے۔'' اس نے بھی برجستگی سے جواب دیا۔ ذرا سی دیر میں ہی محفل کشت زعفران بن گئی۔ وہ بے تکلفی سے دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔

''میں نے 'لحاف' کے بعد آپ کا ایک شخصی خاکہ تراشا تھا لیکن آپ بالکل متضاد ثابت ہوئیں۔'' عصمت لحاف کے ذکر پر جزبز ہوگئی۔ اس افسانے پر بے تحاشا تنقید اور مقدمہ بھگت کر وہ دانستہ طور پر اس ذکر سے گریز ہی کرتی تھی۔

''میں سمجھتا تھا کہ آپ نہایت سیاہ رو، دبلی، سوکھی اور مریل سی ہوں گی۔'' اس انداز بیان پر عصمت کو طیش آنے کی بجائے سعادت کی معقولیت اور بھولپن دیکھ کر خاصی حیرانی ہوئی۔

''میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ آپ دبنگ قسم کے، گلیسرے، چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔'' اس نے بھی بے ساختہ کہا۔ یہ پہلی ملاقات آئندہ بہت سی محفلوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اسی سال منٹو کو 'فلمستان' میں نوکری مل گئی۔ اس نے نہ صرف راجا مہدی علی کو بمبئی بلوا کر اپنے ساتھ اچھی نوکری دلوائی بلکہ اشک کو بھی پانچ سو روپے ماہوار پر ملازمت دلوا

کرادی۔ بمبئی فلم نگری میں وہ بہت شاد اور مطمئن تھا۔ صبح ساڑھے دس بجے سے رات گیارہ بجے تک خوب کام کرتا۔ راجا مہدی کے ساتھ فلمستان جاتے ہوئے وہ گاڑی سے اترتا اور وکٹوریہ میں سوار ہو جاتا۔ وکٹوریہ والے کو دو سے تین گنا زائد مزدوری دینا اس کا معمول بن چکا تھا۔

''یہ کیا حماقت کرتے ہو؟ خواہ مخواہ اتنے پیسے کیوں لٹا دیتے ہو؟'' راجا مہدی ٹوک دیتا۔

''جانے دو یار! غریب آدمی ہے۔ خوش ہو جائے گا۔'' وہ بے نیازی سے کہہ دیتا۔

''پیسے سنبھال کر رکھا کرو۔ کیوں ضائع کرتے ہو؟''

''میں نے کون سا قبر میں ساتھ لے جانے ہیں۔ سب کچھ یہیں تو رہ جانا ہے لیکن چھوڑو! تم نہیں سمجھو گے۔''

''تمہاری سوچ بھی عجیب ہے۔ ایک طرف افسانوں میں انسانیت سے اتنی نفرت جتاتے ہو اور دوسری طرف ناشناسا مریضوں کا مفت علاج کرادیا کرتے ہو۔ منٹو رے منٹو! تیری کون سی کل سیدھی؟'' وہ حیرت زدہ تھا۔

''میں انسانیت سے نفرت نہیں کرتا راجا! مجھے انسانوں کی گھن زدہ روح میں موجود بیماریوں اور منافقت سے ہمدردی ہے۔ میں انہیں طبیب کی طرح مسیحائی کا نسخہ تھماتا ہوں۔ رہی بات غربت کی! تو اس سے بوجھ کر آزار ہی کوئی نہیں۔ یہی تو تمام مسائل، بکھیوں اور جرائم کی جڑ ہے لیکن چھوڑو بس۔'' اس نے بات کے اختتام پر اپنا مخصوص تکیہ کلام دہرایا۔

فلمستان میں اشوک کمار کے ساتھ اس کی خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ فلم کے لیے کہانیاں سوچنا، محفل جما کر مے نوشی سے لطف اندوز ہونا، اشوک کے مداحوں سے شناخت چھپاتے ہوئے بمبئی کی سڑکوں پر گھومنا انہیں خوب بھاتا۔ ساحل سمندر پر ننگے پیر ریت پر گھوم کر چاند کو تکتے اس کا دل ہی نہ بھرتا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس کو بمبئی سے عشق ہو چلا تھا۔

☆......☆

سعادت حسن اپنی زندگی کا بھرپور اور یادگار وقت گزار رہا تھا۔

اشوک کمار سے مراسم اتنے گہرے ہو گئے کہ منٹو اسے 'دادامنی' کہہ کر پکارتا۔ اب وہ بے تکلفی سے ایک دوسرے کے گھر بھی آنے جانے لگے تھے۔ صفیہ اشوک کمار کی بہت مداح تھی۔ وہ اس کے لیے ہمیشہ بہترین کھانے کا انتظام کیا کرتی۔ دوسری جانب شوبھا بھی صفیہ کے ہمراہ شاپنگ کے لیے بازار جانے میں بہت سہولت و فرحت محسوس کرتی۔ یہ وہ وقت تھا جب 'آٹھ دن' کی شوٹنگ میں بھرپور محنت ہو رہی تھی۔ اشوک نہایت عرق ریزی سے فلم کے ہر منظر پر محنت کر رہا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ بہترین فلم بنانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اسی دوران 'مکرجی' نے کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اشوک پہلے پہل تو اسے قائل کرنے کے لیے کوششیں کرتا رہا لیکن جب بات نہ بنی تو ذہن میں آنے والے فوری خیال کے تحت اس کے پاس چلا آیا جو اس وقت چند مناظر کو دوبارہ لکھنے میں مصروف تھا۔

''ذرا میرے ساتھ چلو ابھی۔'' اس نے میز پر رکھے کاغذ سمیٹ کر ایک طرف ڈالے۔ سعادت کو گمان ہوا کہ دادامنی اسے کسی نئے گیت کی دھن سنوانے کے لیے بے تاب ہے۔ سیٹ پر پہنچ کر اشوک نے اطمینان سے دھماکا کرتے ہوئے کہا۔ ''پاگل کا کردار تم کرو گے۔''

''پاگل ہو گئے ہو دادامنی!'' وہ بدک اٹھا۔ ''یہ اداکاری میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

''نہیں! میں اس وقت بہت سنجیدہ ہوں۔ تمہیں یہ کردار کرنا ہی پڑے گا۔''

''ارے! کیوں بھاؤ کھا رہا ہے؟'' راجا مہدی نے شرارت سے کہا۔ ''تم نے مجھے ایک کردار میں اشوک کا بہنوئی بنا دیا۔ میں نے مروت اور ان کی عزت میں انکار نہیں کیا۔ تو ایک پاگل نہیں بن سکتا؟ پاگل کہیں کے!''

''ہاں بھئی!!! اس رول میں تمہیں زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تم برصغیر میں اسی وجہ سے تو مقبول ہو۔'' اشوک نے بھی ہنس کر کہا۔ یوں مذاق مذاق میں سعادت حسن منٹو پاگل 'فلائٹ لیفٹیننٹ کرپا رام' بن کر کیمرے کے سامنے آیا تو اس کی گھبراہٹ دیدنی تھی۔ خدا خدا کر کے شوٹنگ مکمل ہونے کے بعد فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو شائقین نے پسندیدگی کی سند عطا کردی۔ ناقدین کی جانب سے بھی اسے اچھی کامیڈی قرار دیا گیا۔ اشوک اور منٹو کے حوصلے مزید بلند ہو گئے۔ وہ کسی اچھوتے پلاٹ پر ایک اور فلم بنانے کے لیے پُرجوش تھے لیکن چند وجوہات کی بناء پر اشوک نے فلمستان چھوڑ کر 'بمبئی ٹاکیز' میں شمولیت اختیار کرلی اور اس کو بھی اپنے ساتھ ہی ایک نئے دشت کی سیاحی کے لیے لے گیا۔

بمبئی ٹاکیز میں سعادت نے عصمت چغتائی کو بھی سنسر

یوڈ۔پارٹمنٹ میں ایک سال کے لیے ملازمت دلوادی۔وہ عصمت کے ساتھ کام کے تصور سے ہی بہت پُرجوش تھا۔

’’اب ہم دونوں مل کر کوئی تہلکہ خیز کہانی لکھیں گے۔اشوک کمار ہیرو ہوگا۔پھر تو چراغوں میں روشنی ہی نہ رہے گی۔‘‘

’’آپ کی ایک کہانی پہلے بھی تو زیرِغور تھی۔اس کا کیا بنا؟‘‘عصمت نے پوچھا۔

’’اشوک کو پسند تو آگئی ہے۔اُمید ہے جلد ہی کوئی کام شروع ہوجائے گا۔‘‘وہ پُریقین تھا لیکن اشوک کمار اس مرحلہ میں متلون مزاج ثابت ہوا۔پہلے اسے ’مجبور‘ کی کہانی پسند تھی۔وہ دل سے اتری تو منٹو کی کہانی پسند آگئی۔عصمت نے ’ضدی‘ پیش کی تو اسے فلمانے کے درپے ہوگیا۔خلاف توقع یہ بات سعادت نے خاموشی سے برداشت کرلی۔

’’میں ایک نیا تجربہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں اگر تم ساتھ دو تو ہم ایک ہنگامہ خیز فلم بنا سکتے ہیں۔‘‘اشوک نے کہا۔

’’کیسا تجربہ دادامنی؟‘‘سعادت متجسس ہوا۔

’’تم عصمت کی کہانی پر کام کرو۔اس کی نئی شکل سامنے لاؤ۔‘‘اس تجویز پر وہ حیرت میں مبتلا ہوگیا۔کچھ روز بعد علم ہوا کہ عصمت بھی منٹو کی کہانی پر کام کررہی ہے۔دونوں مصنفین کے ذہن میں ابتدائی طور پر ایک دوسرے کے لیے رنج و شکوے کی کیفیت پیدا ہوگئی۔حیران کن بات یہ تھی کہ اس وقت کوئی بھی یہ بات سمجھ ہی نہ پارہا تھا کہ اشوک کمار کے سونپے گئے اس کام کا اصل مقصد کیا تھا؟ انہی دنوں کمال امروہی ’محل‘ کی کہانی لیے چلا آیا۔اشوک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔عصمت کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔اس نے سعادت سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

’’یہ سب کیا ہورہا ہے سعادت بھائی؟ اب ہم کسی شمار و قطار میں ہی نہیں۔اشوک صاحب ہمیں بالواسطہ طور پر یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ چونکہ کانٹریکٹ ہو چکا ہے لہٰذا خاموشی سے بیٹھے تنخواہ وصول کرتے رہو۔ہماری کہانیوں کو مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے۔‘‘

’’ارے آپ یونہی گھبرا رہی ہیں۔گنگولی (اشوک) ضرور ہماری فلم بنائے گا۔‘‘اس نے یقین دلایا۔

’’میرا اور شاہد کا فیصلہ ہے کہ ہم اشوک کے بغیر دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ’ضدی‘ مکمل کروائیں گے۔‘‘

’’جلد بازی نہ کیجیے۔تھوڑا دھیرج رکھیے۔میں بھی اپنی کہانی پر مسلسل کام کررہا ہوں۔جلد ہی اسے مزید نکھار کر گنگولی کے حوالے کردوں گا۔‘‘

’’آپ جیسے مردم شناس شخص سے مجھے یہ توقع نہ تھی کہ وہ حقائق سے نظریں چرانے لگے گا۔‘‘عصمت طنزیہ بولی۔

’’آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں عصمت بہن!! میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔وہ میری کہانی کو ضرور فلمائے گا۔‘‘سعادت اپنے مؤقف پر قائم تھا۔

’’میں اسے جتنا جان پائی ہوں اس بنیاد پر دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ رومینٹک سے کم کوئی کردار ہرگز نہیں نبھائے گا۔آپ اسے ایک باپ کا کیریکٹر رول تھمارہے ہیں۔وہ اتنی جلد اپنی ذات پر کیریکٹر رولز کا ٹھپا نہیں لگوائے گا۔‘‘عصمت کی دلیل منطقی تھی لیکن سعادت یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا اور پھر وہی ہوا جس کی پیشگوئی وہ کرچکی تھی۔ضدی اور محل تکمیل کے مراحل طے کر گئیں۔نذیر اجمیری نے ’مجبور‘ کے لیے بمبئی ٹاکیز والوں کو شیشے میں اتار لیا اور منٹو کی کہانی وہیں کی وہیں دھری رہی۔یہ لم ڈھیش وہی صورتِ حال تھی جو آل انڈیا ریڈیو پر اسے درپیش آئی تھی۔منٹو کی انا ہمیشہ ہی سے اس کے قد سے بھی بڑی تھی۔اس معاملہ پر کوئی ردِعمل دینے سے قبل پے درپے ایسے واقعات ہوئے جن کے بعد وہ انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔

☆......☆

ملک میں فسادات زوروں پر تھے۔

منٹو شیام سندر کے ساتھ ایک سکھ خاندان میں موجود تھا۔شیام اس زمانے کا معروف اداکار اور سعادت کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ان دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔سکھ خاندان کا سربراہ انہیں دلدوزی سے ان ظلم و ستم کی داستان سنا رہا تھا جو مسلمانوں کی وجہ سے ان سب نے برداشت کیے تھے۔

’’ان مسلوں کو یہاں سے نکال ہی دینا چاہیے شیام صاحب! جو نہ نکلیں انہیں جان سے ماردیں بس۔‘‘سردار بے قابو ہورہا تھا۔

سعادت یہ سب غیر جذباتیت سے سنتا رہا لیکن شیام کا چہرہ تغیرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔اس نے ان واقعات کا

بہت گہرا اثر لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں وہاں سے رخصت ہوئے تو شیام کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''میں بھی تو ایک مسلمان ہوں۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ میرا قتل کردو؟''

''ابھی تو ایسا دل نہیں چاہ رہا لیکن جس وقت سردار مسلمانوں کے ظلم کی کہانی سنا رہا تھا' میں تمہیں قتل کرسکتا تھا۔'' شیام کی سنجیدگی سے منٹو کے دل پہ گہرا چرکا لگا۔ برسہا برس کی دوستی' مروت اور خلوص کا بھرم اس ایک فقرے کے بعد بری طرح متاثر ہوا۔ سعادت کے دل ودماغ میں ان گنت نوکیلے سوالوں کے کانٹے چبھنے لگے۔

بمبئی میں بھی قتل وغارت اور آتش زنی کے واقعات بڑھتے ہی جارہے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ گذرتا جب گلی محلوں میں عزت وآبرو پر حملے کے ساتھ خون کی ہولی نہ کھیلی جاتی۔ بمبئی ٹاکیز بھی اس غدر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ساوک واچا نے جب اس کمپنی کا انتظام سنبھالا تو اسے مشکلات کا ایک پہاڑ سر کرنا تھا۔ اس نے کمپنی سے غیر ضروری عناصر کی چھانٹی کا آغاز کردیا۔ اب حسن اتفاق یہ تھا کہ ان آسامیوں سے فراغت پانے والے ہندو جبکہ نو بھرتی شدہ افراد مسلمان تھے۔ منٹو' عصمت چغتائی' شاہد لطیف' کمال امروہی' نذیر اجمیری' حسرت لکھنوی' ناظم پانی پتی اور میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر کی آمد نے ہندوؤں کے جذبات مزید مشتعل کردیئے۔ واچا کو دھمکی آمیز خطوط موصول ہونے لگے۔

''اپنے اسٹوڈیو سے ان مُسلوں کو نکال دو واچا! تم ان سے دوستیاں گانٹھ کر بہت بڑی غلطی کررہے ہو۔ اگر تم نے بمبئی ٹاکیز' شدھ نہ کیا تو ہم اسٹوڈیو کو آگ لگادیں گے۔''

''مجھے دھمکی دیتے ہیں یہ! واچا کو دھمکی دے رہے ہیں یہ......'' اس نے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا اسٹوڈیو ہے...... میری محنت ہے...... اب یہ لوگ مجھے بتائیں گے کہ میں کہاں غلطی کررہا ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آجائیں آگ لگانے...... میں اسی آگ میں ان کی چتا جلادوں گا۔''

''یہ سب وقتی دیوانگی ہے یارو! آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' اشوک نے بھی بے نیازی سے کہا۔ سعادت کے ان ساتھیوں نے کسی بھی تعصب کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ حالات مزید ابتری کی جانب گامزن ہوتے جائیں گے۔ منٹو کو محسوس ہونے لگا کہ بمبئی ٹاکیز کا وجود اس کی وجہ سے شدید خطرے میں ہے۔ یہ احساس اس جیسے انسان کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔

''دادامنی! اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے ہٹاؤ بھی! کچھ ماہ گذرنے کی دیر ہے۔ حالات پھر پہلے جیسے ہوجائیں گے۔''

''وہ ہر خط میں یہ کہتے ہیں کہ بمبئی ٹاکیز میں میری وجہ سے مسلمان بھرتی کیے جارہے ہیں۔ آپ لوگوں نے اس اسٹوڈیو پر ان تھک محنت کی ہے۔ کہیں میری وجہ سے خوامخواہ کوئی نقصان نہ ہوجائے۔''

''مسلمان صرف اپنے ہنر کی وجہ سے اس کمپنی کا حصہ بنے ہیں۔ تم اس معاملہ کو خوامخواہ سر پر سوار نہ کرو۔'' اشوک نے ڈانٹ پلائی۔ ''یہ بتاؤ کہ صفیہ بھابی اور بچیاں شادی سے کب واپس آرہی ہیں۔ بڑے دن ہوئے ان کے ہاتھ سے بنے قیمے کے پراٹھے نہیں کھائے۔''

''آجائے گی جلد ہی۔'' بیٹیوں کا ذکر ہوتے ہی اس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔ وہ اشوک کو بتا ہی نہ سکا کہ لاہور میں موجود صفیہ بمبئی واپس آنے سے گریزاں تھی۔ ہندوستان بالآخر دو ٹکڑے ہوگیا۔ قتل وغارت اور خون کی ندیاں فرقہ وارانہ تعصب کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ اس مذہبی جنون' وحشت وحیوانیت نے اس کو شدید بے چینی میں مبتلا کردیا۔ اس نے بمبئی ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واچا کے بلاوے نظر انداز کرتا وہ ہلکان ہونے لگا تھا۔ مے نوشی میں پناہ لینے کی کوشش بھی بے سود ثابت ہورہی تھی۔ ان دنوں وہ ہر ایک فرد کے رویے پر گہرائی سے غور وفکر کرتا۔ شیام سے ملاقاتیں جوں کی توں جاری تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں مگن اور خوش تھا۔ اس خونریزی کو اس نے رتی بھر بھی ذہن پر سوار نہیں کیا تھا۔ اسی کشمکش سے گزرتے ہوئے اس نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ صفیہ اور بچیوں سے دور رہ سکتا تھا' نہ ہی انہیں اس وحشت زدہ ماحول میں واپسی کے لیے قائل کرسکتا تھا۔ اس روز شیام نائٹ شوٹنگ کے لیے اسٹوڈیو میں موجود تھا۔ سعادت نے اپنا اسباب باندھنا شروع کردیا۔ اگلی صبح شیام واپس آیا تو اس نئی صورتِ حال کو دیکھ کر گنگ رہ گیا۔

''چلے؟'' وہ بدقت تمام اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں!'' منٹو نے بھی مختصراً کہا۔ اس کے بعد بندرگاہ تک جاکر جہاز میں سوار ہونے تک وہ دنیا جہان کے

موضوعات پر گفتگو کرتے رہے لیکن اس 'ہجرت' کے عوامل و اثرات پر ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔

جہاز نے وسل دی اور سعادت حسن منٹو اپنے محبوب ترین شہر بمبئی کو الوداع کیے پاکستان چلا آیا جہاں مصائب' مشکلات' توہین اور ذلت کا ایک لامتناہی سلسلہ اس کا منتظر تھا۔

☆......☆

امرتسر کی گلیوں میں کھیلتے کودتے ہر گلی محلہ میں اپنی شرارتوں کے نقوش چھوڑ کر' آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تاریخ ساز وقت گذارنے اور بمبئی کی فلم نگری میں 'نوکر' 'مڈ' 'آٹھ دن' 'چل چل رے نوجوان' 'آغوش' جیسی فلمی کہانیوں کے باعث شہرت کی بلندیاں چھونے والا سعادت روانگی سے قبل بھی ایک لازوال تحفہ تھما آیا۔ 'غالب' نے کامیابی کے نئے ریکارڈ پیدا کر کے نیشنل فلم ایوارڈ حاصل کیا لیکن اس فلم کا مصنف کسی سے کچھ بھی کہے سنا بناء لاہور منتقل ہو چکا تھا۔ یہاں آمد کے ساتھ ہی اس کا حساس ذہن تلخ اور بھیانک حقائق دیکھ کر بے حد منتشر تھا۔ بمبئی میں خونریز واقعات اور انسانی درندگی کے مناظر ہی کم نہ تھے کہ مملکت خداداد پاکستان میں بھی مختلف عوامل نے اس کے دل ودماغ میں نوکیلے پنجے گاڑ لیے۔ مادہ پرستی زوروں پر تھی۔ اقدار سسک سسک کر دم توڑ رہی تھیں۔ بے حسی' خودغرضی' نفسانفسی کامیاب انفرادی زندگی کی ضمانت بننے لگیں۔ منٹو کی بے چین اور باغی روح نے بے اختیار صدائے بغاوت بلند کی اور اپنے قلم کو تلوار بنائے افسانوں میں ہر طبقے پر بے دھڑک وار کرنے لگا۔ اس کے قلم کی کاٹ نے ہر ایک کو بلبلانے پر مجبور کر دیا۔ سعادت حسن کی حیرت ومایوسی کی انتہا نہ رہی جب ادباء بھی اس کے خلاف محاذ بنا کر یکجا ہو گئے۔ اس وقت اسے اندازہ ہوا کہ یہ سب عناصر عام فرد کی زندگی تک ہی محدود نہ تھے۔ لمحہ فکریہ تو یہ تھا کہ ادیب بھی اس باد سموم کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ انہیں ادب پر ملمع کاری اور محض اپنی اجارہ داری درکار تھی۔ 'حلقہ ارباب ذوق' اور 'پاک ٹی ہاؤس' میں کھلم کھلا اس پر تنقید ہونے لگی۔ اگر وہ تنقید جائز یا تنقیدی دبستان کے دائرے میں رہتی تو قابل قبول بھی ہوتی لیکن وہ تو براہ راست ذاتیات پر حملے تھے۔ 'چودھری محمد حسین' اور کئی بارسوخ افراد نے اس کی ذات کے بخیے ادھیڑنے شروع کر دیئے۔

''سعادت حسن منٹو فحش نگار ہے۔ اسے افسانہ نگار کہنا کسی طور بھی درست نہیں۔ ایسے بے ادب شخص کو ادب میں شامل ہی نہیں کیا جاسکتا۔'' وہ متکبرانہ انداز میں اعلان کرتے۔

''میں برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نویس ہوں۔ یہ اعزاز راتوں رات حاصل نہیں ہوا مجھے۔ سالہا سال محنت کی ہے۔ اردو ادب کو شاہکار افسانے دیئے ہیں۔ مجھے دودھ سے مکھی کی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا۔'' وہ بھی خاموش رہنے کا کب قائل تھا۔

''منٹو کے نظریات اشتراکی ہیں۔ وہ کیمونزم اور بھگت سنگھ کا پیروکار رہا ہے۔ اس کی ہر تحریر عریانی کا پلندہ ہے۔ یہ فحاشی ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

''میری تحریریں اس معاشرے کا آئینہ ہیں جس میں آپ سب سانس لیتے ہیں۔ اگر میری تخلیقات ناقابل برداشت ہیں تو یہ معاشرہ کیوں کر قابل قبول ہوسکتا ہے۔ میں تختہ سیاہ پر سفید چاک سے لکھتا ہوں تاکہ اس کی سیاہی مزید واضح ہوسکے۔ زندگی کے کریہہ حقائق کو سامنے لانے اور عوام کو ان کے زخم انہی کی زبان میں دکھانے سے ہی یہ معاشرہ اصلاح حاصل کرے گا۔ انسانی جبلت اور کمزوریوں کا علاج وعظ سے نہیں' طنز سے ممکن ہے۔ برہنہ معاشرے کو برہنہ گوئی سے ہی زچ کیا جاسکتا ہے۔'' اس کے دلائل اور منطق کی دل کھول کر تذلیل کی جاتی۔ ادب کے ان ٹھیکیداروں کے تعصب' کم فہمی اور تنگ نظری پر سعادت حسن کی روح پر ہر بار ایک نیا زخم لگتا۔ رگ و پے میں شرارے دوڑتے۔ امرتسر' دہلی اور بمبئی میں اپنی الگ شان سے زندگی جینے والا منٹو اس صورت حال کے بعد مے نوشی میں غرق ہو کر رہ گیا۔ اس مشکل ترین وقت میں صفیہ نہایت خلوص سے شوہر کو جذباتی سہارا فراہم کرتی رہی۔

''سعادت صاحب! ایسا کب تک چلے گا؟''

''وہی تو میں بھی سوچتا ہوں صفیہ!! کہ ایسا کب تک چلے گا؟ پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اچھالتے تھے اور فخر کیا کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب کہنے لگے ہیں کہ نہ بھئی! یہ منٹو بھلا ہم میں سے کیسے ہوسکتا ہے؟ مجھے تو خیر ان کی بات پر پہلے یقین تھا' نہ اب ہے۔ ابھی مجھے حلقہ احباب ذوق والوں نے اپنا ممبر بنا لیا ہے۔ یہ بھی بہت جلد مجھے کسی کوڑھی کی طرح اپنے 'مقدس شہر' کی فصیل سے باہر اٹھا پھینکیں گے۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم کس جماعت میں ہو؟ تو میں کہوں گا کہ میں اکیلا ہوں...... شروع ہی سے

ہر معاملہ میں اکیلا رہا ہوں۔'' وہ نشے میں یونہی بے تکان گفتگو کیے چلا جاتا تھا۔

''آپ یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' صفیہ نے پہلو بدلا، وہ بات کو اپنی نہج پر لانا چاہ رہی تھی لیکن نشے میں دھت منٹو کسی اور ہی لے میں تھا۔

''جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔

''سعادت صاحب!! خدارا ہوش میں آیئے۔ میں آپ سے یہ کہہ رہی ہوں کہ اس شراب نوشی کا پیچھا چھوڑ دیجیے۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔ تین بچیوں کی پیدائش اور ذمہ داریوں میں اضافہ سے وہ ہمہ وقت ہزار ہا سوچوں میں گھری رہتی۔ ''بچیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ ان کے لیے ہی کچھ سوچ لیجیے۔''

اس مطالبہ کی تلخی وہ مدہوشی کے باوجود محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ صفیہ بلا مبالغہ ایک بے مثال شریکِ حیات ثابت ہوئی تھی۔ معاشی تنگی کے باوجود نہایت صابر و شاکر رہتی۔ ایک سفید شلوار اور دوپٹے کے ساتھ مختلف رنگوں کی قمیصیں بدل بدل کر پہن لیتی لیکن کبھی شوہر کو ناجائز فرمائشوں سے دق نہ کرتی۔ بچیوں کا ذکر آتے ہی سعادت کا دل گویا کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ اپنی اولاد کے لیے اب تک بے مثال باپ ثابت ہوا تھا۔ نگہت ٗنزہت اور نصرت میں اس کی جان بستی تھی۔ ان کی ذہنی تربیت میں اپنی وجہ سے کسی کجی کا تصور ہی اس کے لیے موت کے مترادف تھا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو صفیہ! یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ اولاد قلاش باپ کے ساتھ غربت میں تو ہنسی خوشی گزارا کر لیتی ہے لیکن اس کے کردار میں کمزوری ساری زندگی کے لیے اولاد کا روگ بن جاتی ہے۔'' اس کے ذہن میں آنجہانی غلام حسن منٹو کا تصور لہرایا۔ ''کمال ہے! میں نے پہلے کیوں نہ سوچا ایسا؟'' وہ سخت آزردہ دکھائی دینے لگا۔

''تو اب سوچ لیجیے ناں! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔''

''ہاں! ٹھیک کہتی ہو۔ تم ایسا کرو کہ حامد کے ساتھ مشورہ کرو اور مجھے کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کروا دو۔ وہاں ایسی عادات کا علاج بھی تو کیا جاتا ہے۔'' اس نے بے چینی سے کہا۔ حامد جلال اس کا بھانجا تھا جس کی شادی صفیہ کی بہن سے ہوئی تھی۔ وہ 'لکشمی مینشن' میں ان کے ساتھ ہی بالائی منزل پر رہائش پذیر تھا۔ صفیہ نے ایسا ہی کیا اور سعادت کو ایک اسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہ پُرامید تھی کہ مضبوط قوت ارادی کا مالک سعادت حسن اپنی اس کمزوری پر بہت جلد قابو پالے گا۔

☆......☆

پاگل خانے کا ماحول منٹو کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔

وہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں برہمن و شودر جیسی روایات تھیں۔ اپنی دکھی زندگی کے ظلم و ستم سے عاجز ان مریضوں سے اسپتال کے نچلے درجے کا عملہ بھی شودروں کی طرح برتاؤ کرتا تھا۔ ان سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوتا۔ نیند کے انجیکشن اور بجلی کے جھٹکے تو ایک معمول تھا۔ سعادت کا حساس دل یہ صورتِ حال دیکھ کر تڑپ اٹھتا۔ اس کے وجود میں مقید باغی سعادت ان قابلِ رحم انسانوں کی کہانیاں تحریروں کے قالب میں ڈھالنے لگا۔ وہاں موجود ہر ایک مخبوط الحواس شخص مکمل داستان تھا۔ وہ کبھی افراد بھی سعادت کے ساتھ بہت خوش رہتے۔ عزت و احترام اور محبت کے بھوکے وہ مریض اس کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ منٹو انہیں بمبئی کی فلم نگری میں گزرے ایام کے قصے سناتا ٗ ان کی مسیحائی کرتا ٗ ان کے دکھ درد سنتا اور انہی کے ایماء پر افسانوی قالب میں ڈھال کر اشاعت کے لیے بھیج دیتا۔ بیرونی دنیا میں ان تحریروں سے تہلکہ مچا اسپتال انتظامیہ کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ ان کے کاروباری ذہنوں نے فوراً اس مسئلہ کا حل بھی تلاش کر لیا اور سعادت حسن کے اہلخانہ کو نوید دی کہ برصغیر میں بیسویں صدی کے عظیم ترین افسانہ نگار نے شراب کی علت سے رہائی حاصل کر لی ہے۔ مستند ڈاکٹری رپورٹ بنا دینے کے بعد اسے واپس اسی دنیا میں بھیج دیا گیا جہاں رویے کسی خنجر کی طرح رگیں کاٹتے تھے۔ یہ وہی دنیا تو تھی جہاں انسانی فرعونیت نے ہی اس کے ذہن میں دائمی کانٹے پیوست کیے تھے۔ یہ خاراب اتھاہ گہرائی میں اپنا سراغ کھو بیٹھے تھے، خود سعادت کو بھی علم نہ تھا۔ ہاں البتہ ہمہ وقت برقرار رہنے والی اذیت اور کرب ان کی موجودگی کا پتا ضرور دیتے تھے۔ اس کے نئے ساتھی ڈسچارج کی خبر سن کر بہت افسردہ تھے۔ وہ ان کے لیے تاسف و ہمدردی محسوس کرتا ٗ ملاقات کے لیے آتے رہنے کی یقین دہانی کراتا صفیہ اور حامد کے ساتھ لکشمی مینشن چلا آیا جہاں تینوں بچیاں اپنے جان چھڑکنے والے باپ کی شدت سے منتظر تھیں۔ وہ سعادت سے اس قدر ٹوٹ کر ملیں کہ اس کی روح سیراب

اور آنکھیں نم ہوگئیں۔
''مجھے خوشی ہے سعادت صاحب کہ آپ نے کمال قوت ارادی سے صحت یابی حاصل کرلی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص متحمل انداز میں بولی۔ سعادت تلخی سے ہنکارہ بھر کررہ گیا۔ ایک زمانے کو اپنی تحریروں کی کاٹ سے بلبلانے پر مجبور کردینے والا سعادت حسن منٹو سادہ مزاج اور وفا شعار بیوی کو بتا ہی نہ سکا کہ اسے اسپتال سے کن حالات اور وجوہات کی بناء پر خارج کیا گیا ہے۔
''اب آپ کو روزگار کے معاملہ میں بھی سنجیدگی سے کچھ سوچنا چاہیے۔''
''یعنی تم چاہتی ہو کہ سعادت حسین منٹو، بلاک بسٹر کتابوں کا مصنف، کسی منیاری کی دکان کھول لے یا ریڑھی لگا کر سبزی فروشی کے لیے صدائیں لگایا کرے۔''
''میں ایسا کب کہہ رہی ہوں سعادت صاحب!! لیکن آپ خود سوچیے یہاں آپ کے افسانے کوڑیوں کے بھاؤ احسانات جتا کر شائع کیے جاتے ہیں۔''
''تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ غالب کو اس قدر پذیرائی ملی ہے کہ اسے نیشنل فلم ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔'' سعادت کے قلب میں موجود نازک مزاج فنکار کو شدید ٹھیس پہنچی۔
''وہ ماضی تھا۔ آج ہم بمبئی میں نہیں لاہور میں ہیں۔ آپ جسمانی طور پر تو یہاں آچکے ہیں لیکن اپنے وجود کا کوئی حصہ شاید وہیں چھوڑ آئے ہیں۔''
''اس ادلا بدلی نے بہت عجیب کھیل کھیلا ہے صفیہ! کنگلے لکھ پتی اور عرش پر بیٹھے خاک میں لوٹنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔'' وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔
''حامد نے قدرت اللہ شہاب سے بات کی تھی۔ آپ ان سے مل لیجیے۔ وہ کسی نوکری کا بندوبست کردیں گے۔ لوگ دھڑا دھڑ کلیم داخل کررہے ہیں۔ ہمیں بھی بہتر حالات کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔''
''یعنی تم چاہتی ہو کہ سعادت حسن منٹو بھی گدھ بن کر ہندوؤں کا چھوڑا گیا مردار کھانے لگے۔'' وہ بھڑک گیا۔
''ہرگز نہیں!! لیکن بچیوں کے اسکول کے اخراجات، گھریلو خرچے کیسے پورا ہوا کریں گے؟'' اس نے تحمل سے سمجھایا۔
وہ بے دلی سے شہاب سے ملا۔ اسے ایک برف خانہ میں حصہ دیا گیا۔ برف خانہ گھر سے خاصا دور تھا۔ دیگر دو حصہ دار جہالت، خود غرضی اور بے حسی میں اعلیٰ ڈگری یافتہ تھے۔ سعادت کوشش کے باوجود ان سے ذہنی مطابقت پیدا نہ کرسکا۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے اسے زچ کرتے اور بطور دیہاڑی پانچ، دس روپے بھی یوں تھماتے جیسے خیرات دے رہے ہوں۔ اس کی خودداری اور عزت نفس کرچی کرچی ہوجاتی۔ وہ وقت نہایت کٹھن تھا۔ استحصال کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں ناشر اس کی کتابوں کے مجموعے چھاپ کر اپنی تجوریاں دولت سے بھر رہے تھے اور اپنا خون جگر جلانے والا مصنف سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا مختلف رسائل کے دفاتر میں پہنچتا، وہاں رکھی کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر افسانہ لکھ کر تھماتا اور بیس پچیس روپے لیے لکشمی مینشن لوٹ آتا جہاں بچیوں کی جھنکاریں اسے زندگی کا واحد سے روشناس کراتی محسوس ہوتی تھیں۔ بقاء کی یہ جنگ بہت خطرناک صورتِ حال اختیار کرنے لگی تھی۔

☆......☆

تقسیم ہند کو ایک انوکھے زاویے سے دیکھنے، مصائب کی اصل روح محسوس کرنے اور کرب و جبر کی بھٹی سے گذرنے والے عوام کی اذیت الفاظ کے قالب میں ڈھالنا منٹو کے لیے بہت آزار ثابت ہوا۔ ناقدین نے 'کھول دو' کے بعد 'ٹھنڈا گوشت' پر تنقید کے نشتر چلاتے ہوئے اسے مقدمات میں گھسیٹ لیا۔ معاشی لحاظ سے تنگدستی کے علاوہ ذہنی اذیت بھی اپنے عروج پر تھی۔ مقدمہ کی پیروی کے لیے وسائل ناپید تھے۔ وکیل ڈھنگ سے دلائل دینے سے قاصر تھا۔ قسمت نے یاوری کی اور مسائل کا حل خود اس کے در پر چلا آیا۔ اس روز وہ عدالت کے قریب ایک پارک میں قریبی احباب کے ساتھ بیٹھا اسی مقدمہ پر سوچ بچار اور مے نوشی میں مصروف تھا کہ سیاہ کوٹ پہنے ایک باوقار شخص دو افراد کے ساتھ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
''کیا آپ کا نام سعادت حسن منٹو ہے؟'' اس نے شائستگی سے دریافت کیا۔
''جی ہاں!'' اس نے مختصراً جواب دیا۔
''میرا نام ضیاء الدین قادری ہے۔ یہیں پریکٹس کرتا ہوں۔ ابھی ایک مؤکل نے آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا تو مجھے اس طرف متوجہ کردیا۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔
''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' وہ گرمجوشی سے معانقہ کرتے ہوئے بولا۔
''منٹو صاحب! میں نے آپ پر دائر مقدمہ کی بابت سنا ہے۔ آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ اپنے افسانہ

کی کوئی کاپی بھی ساتھ لائے گا۔ میں تکنیکی امور پر بہتر رہنمائی کرسکوں گا۔'' ضیاء الدین نے اسے اپنے گھر کا پتا سمجھاتے ہوئے کہا۔ اسی رات سعادت رسالہ کی کاپی لیے وکیل کے ہاں جا پہنچا اور افسانہ زبانی پڑھ کر سنانے لگا۔

''مجھے پاکستان سرکار پر شدید حیرت ہے کہ آخر کس بنیاد پر مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ افسانے میں ہماری جنسی زندگی کے ایک نازک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس میں فکشن کا بھی کوئی عمل دخل نہیں۔ ہاں البتہ چند الفاظ ایسے ضرور ہیں جن پر مہذب شخص وقتی طور پر معترض ہوسکتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ اعتراض بھی جائز نہیں۔ افسانے کا پس منظر کردار وں ... کا رہن سہن اور عادات کے مطابق کوئی بھی شخص ایسے ہی الفاظ میں ان کی بابت سوچ سکتا ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال کہانی میں حقیقت کا تاثر دیتے ہیں۔'' منٹو نے وضاحت کی۔

''اس مقدمہ کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں خوشی سے پیروی کے لیے تیار ہوں۔''

''مقدمہ کی بنیاد تعصب اور تنقید برائے تذلیل ہے۔ ٹھنڈا گوشت کی پیروی ایک وکیل صاحب کررہے ہیں لیکن وہ ان معاملات کو آپ کی طرح گہرائی میں نہیں سمجھ سکے۔'' اس کے انکشاف پر ضیاء الدین اگلے روز اس وکیل سے ملا اور تکنیکی امور پر صائب مشورے دیئے۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں بالآخر منٹو مقدمہ سے بری کردیا گیا۔

☆......☆

سعادت حسن منٹو کے مخالفین اسے مقدمات میں گھسیٹنے کے بعد بہت خوش تھے۔ وہ کسی بھی طرح اسے ذہنی طور پر منتشر کرنا چاہتے تھے لیکن اس بات سے لاعلم تھے کہ قدرت نے منٹو کو چٹانی ضد سے نواز رکھا ہے۔ اپنی اسی عادت کے پیشِ نظر وہ ہر اس کام کو مستقل مزاجی سے کرنے کے درپے ہوجاتا تھا جس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جاتیں۔ ان مقدمات کے بعد اس نے مزید بے باکی سے لکھا۔ سماج پر دل کھول کر نشتر زنی کی۔ وہ سماجی نقوش کو مسلسل کچوکے دیتا رہا۔ منٹو اور حکومتی بے حسی و منافقانہ رویے کی ایک نئی نسل کا آغاز ہوگیا۔ اخبار 'مغربی پاکستان' میں اس کا کالم 'روزن' بند کروادیا گیا۔ روزنامہ 'آفاق' میں شائع ہونے والے شخصی خاکے مشاہیر کی طبع نازک پر ناگوار گذرے لہٰذا ان پر بھی پابندی عائد ہوگئی۔ سعادت نے قلم کی دھار مزید تیز کردی۔

''میری سمجھ سے بہت سی باتیں بالاتر ہیں۔ میں امریکی زر پرستانہ ملک گیری کی ہوس سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے روس کے ہتھوڑے اور اس کی درانتی کے نشان کا اصل مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے لیکن یہاں میرے ملک پاکستان میں جو کچھ ہورہا ہے میرے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ ہوسکتا ہے جو کچھ آج میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے بہت اونچا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہت نیچا ہو۔ امریکا سے جو فوجی امداد لینے کا معاہدہ ہورہا ہے اس کو ایک افسانہ نگار کیا سمجھے گا؟ ترکی سے پاکستان کا جو معاہدہ ہوا ہے اس پر ایک کہانی لکھنے والا کیا تبصرہ کرسکتا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ لیاقت علی کے قتل کی تفتیش کا کیا حشر ہوا؟ اس کو یہ سوال کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوسکتی کہ لیاقت علی خاں کے قاتلوں کو کیا سزا ہوئی؟ کہ آخر وہ بھی انسان تھا جو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا؟''

منٹو کی یہ دلیری حکومت وقت اور مشاہیر کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس کی بین الاقوامی سیاست پر بھی گہری نظر تھی۔ باغیانہ روش سے مغلوب ہوکر 'چچا سام' کے نام لکھے گئے خط کی بے باکی نے سب ہی کو انگشت بدنداں کردیا۔ چند سطور ملاحظہ ہوں۔

''یہ خط آپ کے پاکستانی بھتیجے کی طرف سے ہے جسے آپ نہیں جانتے۔ جسے آپ کی سات آزادیوں کی مملکت میں شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ میرا ملک ہندوستان سے کٹ کر کیوں بنا' کیسے آزاد ہوا' یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خط لکھنے کی جسارت کررہا ہوں کیونکہ جس طرح میرا ملک کٹ کر آزاد ہوا' اسی طرح میں کٹ کر آزاد ہوا ہوں اور چچا جان یہ بات تو آپ جیسے عالم سے چھپی ہوئی نہیں چاہیے کہ جس پرندے کو پر کاٹ کر آزاد کیا جائے گا اس کی آزادی کیسی ہوگی...... خیر اس قصے کو چھوڑیئے۔

میرا نام سعادت حسن منٹو ہے۔ میرے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت بھی مجھے فحش نگار سمجھتی تھی۔ میری اپنی حکومت کا بھی میرے متعلق یہی خیال ہے۔ انگریزوں کی حکومت نے مجھے چھوڑ دیا تھا لیکن میری اپنی حکومت مجھے چھوڑتی نظر نہیں آتی۔

میرا ملک آپ کا نہیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اگر عدالت عالیہ مجھے سزا دے تو میرے ملک میں

ایسا کوئی پرچہ نہیں جو میری تصویر چھاپ سکے۔ میرے تمام مقدموں کی روداد کی تفصیل چھاپ سکے۔

میرا ملک بہت غریب ہے۔ اس کے پاس آرٹ پیپر نہیں ہے۔ اس کے پاس اچھے چھاپے خانے نہیں ہیں۔ اس کی غربت کا سب سے بڑا ثبوت میں ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا چچا جان! بیس بائیس کتابوں کا مصنف ہونے کے باوجود بھی میرے پاس رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں اور یہ سن کر تو آپ حیرت میں غرق ہو جائیں گے کہ میرے پاس سواری کے لیے کوئی پیکارڈ ہے‘ نہ ڈوج۔ سیکنڈ ہینڈ موٹر کار بھی نہیں۔

میں کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ اصل میں مجھے بھائی جان ارسکائن کولڈول کو آپ کے ذریعہ سلام بھیجنا تھا۔ ان کو تو خیر آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ان کے ایک ناول ’گوڈز لٹل ایکٹر‘ پر آپ مقدمہ چلا چکے ہیں۔ جرم وہی تھا جو یہاں میرا ہے۔ یعنی فحاشی۔

یقین جانیے چچا جان مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی جب میں نے سنا تھا کہ ان کے ناول پر سات آزادیوں کے ملک میں مقدمہ چلا ہے۔ آپ تو ننگ کے بادشاہ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی مملکت میں طہارت کا نام فحاشی ہوگا مگر چچا جان یہ آپ نے کیا ظلم کیا؟ بھائی جان ارسکائن کولڈول پر مقدمہ چلا دیا۔ میں اس صدمہ سے متاثر ہو کر اپنے ملک کی کشید کردہ شراب زیادہ مقدار میں پی کر یقیناً مر گیا ہوتا اگر میں نے فوراً ہی مقدمہ کا فیصلہ نہ پڑھ لیا ہوتا۔ وہ جج جس نے بھائی جان ارسکارٹن کو فحاشی کے جرم میں بری کیا‘ اس کے دماغ پر یقیناً ملمع کا جھول نہیں تھا۔ ان کے فیصلے کی آخری سطور دماغ کی وسعت کا پتا دیتی ہیں۔ ’میری رائے میں سچائی کو ادب کے لیے ہمیشہ جائز قرار دینا چاہیے۔‘

میں نے عدالت ماتحت سے بھی یہی کہا تھا لیکن اس نے مجھے تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے کی سزا دے دی۔ اس کی رائے تھی کہ سچائی کو ہمیشہ ادب سے دور رہنا چاہیے۔ خیر رائے اپنی اپنی۔ میں تین ماہ قید بامشقت کاٹنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ تین سو روپے کا جرمانہ مجھ سے ادا نہیں ہوگا۔ چچا جان آپ نہیں جانتے کہ میں بہت غریب ہوں۔

میں غریب ہوں اس لیے کہ میرا ملک غریب ہے۔ مجھے تو پھر دو وقت کی روٹی کسی نہ کسی حیلے مل جاتی ہے مگر میرے بھائی کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں یہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔

میرا ملک غریب ہے۔ جاہل ہے‘ کیوں؟ یہ تو آپ کو بخوبی معلوم ہے چچا جان۔ جسے میں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ آپ کی سماعت پر گراں گذرے گا۔

ہم سے تو آپ کے ملک کے کتے ہی اچھے۔ یہاں آج مرے کل دوسرا دن۔ سچ تو یہ ہے چچا جان ہمیں مرنے کا سلیقہ ہے نہ جینے کا۔

یہاں آپ کے ملک کا ایک سیاح آیا تھا۔ میں نے ان سے ان کے ملک کی تعریف کی۔ حق تو یہ ہے کہ اس دنیا کے تخت پر ایک صرف آپ ہی کی قوم کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ بخدا باقی سب جھک مار رہے ہیں۔

تازہ ’لائف‘ (مورخہ 5 نومبر 1951 انٹرنیشنل ایڈیشن) دیکھا۔ واللہ آپ لوگوں کی زندگی کا ایک اور زندگی آموز پہلو آنکھوں کے سامنے روشن ہوا۔ دو پورے صفحوں پر تصویروں کے ساتھ آپ کے ملک کے مشہور و معروف ’گینگسٹر‘ کے جنازے کی پوری روداد مرقوم تھی۔ اس کا وہ عالیشان گھر جو اس نے حال ہی میں پچپن ہزار ڈالر میں فروخت کیا تھا۔ اس کی وہ پانچ ایکڑ کی اسٹیٹ بھی دیکھی جہاں وہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ ہو کر آرام اور چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ اس کا پانچ ہزار ڈالر کا تابوت اور اس کے جنازے کا جلوس جو پھولوں سے لدی پھندی گیارہ بڑی بڑی لموزینوں اور پچھتر کاروں پر مشتمل ہے۔ اللہ واحد شاہد ہے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“

ان کاٹ دار جملوں اور حرف در حرف بغاوت نے ارباب اقتدار میں تشویش کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ امریکی پالیسیوں پر کڑی تنقید سے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پاکستان میں امریکی ہائی کمشنر نے منٹو کے پاس ایک ایلچی روانہ کر دیا۔

”مسٹر منٹو! ہم نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔“ ایلچی نے شاہانہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”یقیناً سنی ہوگی۔ میں اس تعریف کا حقدار بھی ہوں۔“ اسے بھی بخوبی علم تھا کہ فرعون صفت امریکی نمائندوں کو مرعوبیت کا رتی بھر تاثر نہ دینا ہی اس کی اصل فتح ہوگی۔

”آپ پاکستان کے بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔“ وہ اپنے پتے آہستہ آہستہ سامنے لا رہا تھا۔

”آپ کی معلومات ادھوری ہیں مسٹر!! میں صرف پاکستان نہیں بلکہ برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوں۔“

''یقیناً......یقیناً ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے اخبار کے لیے بھی لکھنے کا معاہدہ کرلیں۔''

''مجھے انگریزی زبان میں لکھنے سے کوئی رغبت نہیں۔ میرا جینا مرنا اردو ہی کے ساتھ ہے۔''

''ارے نہیں مسٹر منٹو! ہم ایک اردو اخبار ہی کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو معقول معاوضہ بھی فراہم کیا جائے گا۔'' اس نے دزدیدہ نظروں سے گھر کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ منٹو کو ذاتی رائے میں قلاش مصنف کی سند عطا کر چکا تھا۔

''ٹھیک ہے مسٹر!! میں دو سو روپیا معاوضہ لیا کروں گا۔'' سعادت نے لمحاتی توقف کے بعد جواب دیا۔

''آپ اس وقت غیر سنجیدہ محسوس ہو رہے ہیں۔ صرف دو سو روپے۔ ناقابل یقین۔'' ایلچی کی حیرانی پر وہ تلخی سے مسکرا اٹھا۔

''ہم آپ کو پانچ سو روپے دیا کریں گے۔ بس آپ جلد از جلد ہمارے لیے لکھنے کا آغاز کیجیے۔'' اس نے ایک اور پتا پھینکا۔

''میں اپنے مزاج اور خواہش کے مطابق لکھا کرتا ہوں۔ میری مہاریں صرف میرے اپنے ہاتھوں میں ہیں۔ کوئی فرد مجھے اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور نہیں ہو سکتا۔'' منٹو کی رکھائی پر ایلچی کو دانتوں پسینا آنے لگا۔

''ہمیں آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے مسٹر منٹو!! لیکن آپ کو بھی ہمارے منشور کا احترام رکھتے ہوئے قلم اٹھانا ہوگا۔''

''منٹو برائے فروخت نہیں ہے۔ کیا آپ یہ سوچ کر یہاں آئے ہیں کہ میرے الفاظ کا اونچا دام لگا کر مجھے اپنی ڈگڈگی پر رقص کروانے لگیں گے؟ برائے مہربانی اپنا رستہ ناپیے۔'' اپنی خودداری کا علم تھامے زندگی بسر کرنے والا سعادت بے لحاظی سے گویا ہوا اور دولت و اختیارات کے نشے میں چور ان افراد کو رخصت کر دیا۔

☆......☆

قسمت کی دیوی سعادت حسن منٹو سے بے طرح روٹھ چکی تھی۔

معاشی تنگی، ایڈیٹرز کے منافقانہ رویے اور حکومتی عتاب سے نبرد آزما ہوتے اس نے 'اوپر، نیچے اور درمیان' تخلیق کی تو مخالفت و لغو گوئی کا ایک نیا بازار گرم ہو گیا۔ اس کتاب میں منٹو نے جانے کیا سوچ کر ایک بارسوخ شخص کی نجی زندگی پر تحریر لکھ دی۔ مذکورہ فرد طاقت و دولت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ ایک معمولی افسانہ نگار کی اس جسارت پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور وکلاء کی ایک فوج منٹو کے سامنے کھڑی کر دی۔

''میں کسی بھی قیمت پر اس شخص کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتا ہوں۔ اسے مقدمات میں اس قدر الجھا دو کہ وہ میرے سامنے ناک رگڑتا معافی مانگنے پر مجبور ہو جائے۔''

''ایسا ہی ہوگا میاں صاحب!! ہم اسے بھرپور قانونی داؤ پیچ سے چاروں شانے چت کر دیں گے۔ پچھلی دفعہ تو یہ کسی سرکاری افسر کی مداخلت کے بعد تین مہینے کی جیل سے بچ گیا تھا۔ اس بار ہم اسے کراچی کی عدالتوں میں گھسیٹیں گے۔ آمد و رفت کے کرائے اور پیشیاں بھگتتے اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔'' میاں صاحب کو بھرپور یقین دلایا گیا۔

سعادت حسن کو عدالت کی جانب سے سمن موصول ہوا اور وہ اطلاع نامہ کو دگرگوں حالت میں حامد کے سپرد کیے قریبی دوست انور کے ہمراہ کراچی روانہ ہو گیا۔ کراچی اس کے محبوب شہر بمبئی کا جڑواں بھائی۔ وہ بمبئی جہاں گزرے شب و روز آج بھی دل میں کسک پیدا کر دیتے تھے۔

مقدمہ کا آغاز خاصا حیران کن تھا۔ اب اسے اتفاق کہیں یا تقدیر کی مہربانی۔ جج ذاتی طور پر منٹو کی تحریروں کا بہت مداح تھا۔ اسے مخصوص طبقے کی جانب سے سعادت کی راہ میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ استغاثہ کے دلائل سننے کے بعد وہ منٹو سے مخاطب ہو کر گویا ہوا۔ ''آپ اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہیں گے منٹو صاحب؟''

''میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے جرمانہ اور سزا بتا کر ممنون کیجیے۔'' اس نے ایک ہی فقرے میں استغاثہ کی تمام تر تیاریاں اور منصوبہ بندی تلپٹ کر دی۔ وہ اسے پیشی در پیشی گھسیٹنے کی توقعات لیے بیٹھے تھے۔ ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ سعادت پہلی ہی پیشی پر اقبال جرم کر لے گا۔

''آپ کا یہ عمل بہت احسن ہے۔ معزز عدالت کا وقت بھی بہت قیمتی ہے۔ ہم جرمانہ کا تعین کیے لیتے ہیں۔ آج کیا تاریخ ہے بھلا؟''

''پچیس......'' منٹو حیرانی سے جج کی نظروں میں پوشیدہ ہلکی سی شرارت کی جھلک بھانپتے الجھ سا گیا۔

''آپ 'پچیس روپے' جرمانہ ادا کر دیجیے۔ عدالت اس

مقدمہ کو خارج کرنے کا حکم دیتی ہے۔''جج کا فیصلہ ناقابل یقین تھا۔ استغاثہ کے وکیل اس نئی صورتِ حال پر صدمہ سے گنگ تھے۔ میاں صاحب حقیقی معنوں میں بال نوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اعلیٰ عہدیداران بھی منٹو کو پڑھتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی اس 'منٹوئیت' پر وہ تلملانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے۔

☆......☆

مملکت خداداد پاکستان کی ادبی تنظیموں نے سعادت حسن منٹو کا ناطقہ مکمل طور پر بند کر دیا۔

روز پیدائش ہی سے روتیوں کا زہر نوش کرتے منٹو کی روح اب تھکاوٹ سے چور ہونے لگی تھی۔ اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور افسانوں پر جنسی غلاظت کا دائمی ٹھپا لگا کر دیگر موضوعات پر لکھے شہ پاروں کو قرار واقعی مقام سے محروم کر دیا گیا۔ استحصال اور تذلیل ناقابل برداشت حدوں تک جا پہنچی تھی۔ اخراجات میں اضافہ کے تناسب سے آمدن اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف تھی۔ افسانوی مجموعے شائع کرنے والے نئی کوٹھیاں اور پلاٹ خرید کر رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے جبکہ سعادت حسن منٹو کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ بچیوں کی سالگرہ پر تحفہ دینے کی رقم بھی ناپید ہوتی۔ صفیہ ان حالات میں اسے ہر طرح سے سنبھالے ہوئے تھی لیکن اس کی حساس سوچیں بری طرح لہولہان ہو چکی تھیں۔ وہ خود فراموشی کے لیے مے نوشی میں غرق ہوتا چلا گیا۔ نتیجتاً سے جگر کا عارضہ لاحق ہوا اور خون آلود کھانسی ایک معمول بننے لگی۔ صفیہ اور حامد نے ترجیحی بنیادوں پر اسے اسپتال منتقل کر دیا۔ جگر کی رپورٹس بہت تشویشناک تھیں۔ گزشتہ تئیس سال سے مسلسل شراب نوشی نے اسے کئی ایک مسائل سے دوچار کر دیا تھا۔ ڈاکٹرز نے بھی کسی لگی لپٹی کے بغیر انہیں بتا دیا کہ سعادت حسن منٹو نے بنت انگور سے علیحدگی اختیار نہ کی تو اس کی زندگی کا چراغ مہلک ہواؤں کی زد میں آ جائے گا۔

اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد منٹو کے وجود پر جامد خاموشی چھانے لگی۔ موت کو اس قدر قریب سے دیکھ لینے کے بعد اسے صفیہ اور بچیوں کے مستقبل کی پریشانی نے گھیر لیا۔

''میں تم لوگوں کے لیے کبھی سکھ کا باعث نہیں رہا صفیہ! میری بے چین روح 'بگولوں کے سنگ اڑنے کی خواہش اور اس بے رہ روی نے ہمیشہ تمہیں اذیت میں مبتلا رکھا۔'' وہ بے حد آزردہ تھا۔

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں سعادت صاحب؟ آپ ایک بہترین شوہر اور مثالی والد ہیں۔'' صفیہ نے صدق دل سے کہا۔

''تم میرا دل رکھنے کے لیے کہہ رہی ہو ایسا۔ سچ پوچھو تو اب مجھے حامد سے بھی شرمندگی ہونے لگی ہے۔ اس نے میری خاطر بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم سب آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی شدید ضرورت ہے سعادت صاحب! میں آپ کے بغیر بالکل صفر ہوں۔ میرے وجود کی تکمیل بچیوں کی زندگی کی ہر ایک خوشی آپ ہی سے تو وابستہ ہے۔'' اس کے لہجہ میں سچائی کی مہک تھی۔

''کاش...... کاش صفیہ! یہ محبت اعتماد اور خلوص مجھے امرتسر میں نصیب ہوتا تو آج میں کسی بھی علت کے بغیر نہایت پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہوتا۔'' سعادت کی روح اس کی پر ہمیشہ ہی سے کسک میں مبتلا رہی تھی۔

''اگر ایسا ہوتا تو آج اردو ادب کو سعادت حسن منٹو کیسے مل پاتا؟'' صفیہ نے دانستہ طور پر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''آپ بے فکر ہو کر لکھنے کا آغاز کیجیے۔ ابھی تو آپ نے 'نقوش' کے لیے 'منٹو نمبر' پر بھی کام کرنا ہے۔''

''میرے دماغ میں ہر وقت کہانیاں کلبلاتی ہیں۔ مجھے بے چین رکھتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ادب کے ٹھیکیدار میری ہر تحریر کا استقبال سنگ زنی سے ہی کریں گے۔''

''آپ کی تحریریں اپنا مقام ضرور حاصل کریں گی۔ مجھے یقین ہے۔''

''لیکن اس وقت تک میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے صفیہ! میں اپنی سب تحریروں کے جملہ حقوق تمہارے نام منتقل کر رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چل کر رقم وصول کیا کرو گی۔'' وہ اپنی ہی رو میں تھا۔ ''میری جیب میں پیسے نہیں ہوں گے تو میں شراب سے بھی دور رہوں گا۔''

''مجھے خوشی ہوگی سعادت صاحب اگر آپ اس 'توبہ' پر قائم رہ سکیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔

☆......☆

لاہور کی جھلساتی ہوئی گرمی حسب سابق شہریوں کے لیے بہت صبر آزما تھی۔ ہر جاندار اس حدت سے بے حال نظر آتا تھا لیکن لکشمی مینشن میں ایک وجود ایسا بھی تھا جس کے لیے ہر موسم کی شدت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ آزمائشوں کی

بھٹی میں دن رات سلگنے والی صفیہ کے لیے کچھ عرصہ سے ایک ہی موسم دائمی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ مصائب ومشکلات کا موسم۔

صفیہ گھٹنوں پر سر ٹکائے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ تینوں بچیاں بالائی منزل پر حامد کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن تھیں۔ فضا میں طاری خاموشی کو ٹائپ رائٹر کی کھٹا کھٹ مرتعش کر رہی تھی۔ اس نے خالی الذہنی کے عالم میں دروازے کی سمت دیکھا جس کے عقب میں سعادت اپنے کاغذات بکھرائے بیٹھا تھا۔ اس کا ذہن خودکار طریقہ سے شوہر کی جانب مبذول ہو گیا۔ گذشتہ برس اسپتال سے فراغت کے بعد شراب نوشی سے قطع تعلق کی کوشش میں سعادت کی طبیعت مزید بگاڑ کا شکار ہو گئی تھی۔ حامد کے مشورے اور کوششوں سے اسے ایک بار پھر نفسیاتی امراض کے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔

اسپتال انتظامیہ پہلے ہی اس کی صاف گوئی، منہ پھٹ اطوار اور افسانہ نویسی سے بہت زچ تھی۔ انہوں نے نیند کے انجکشن اور بجلی کے جھٹکے دے کر سعادت حسن منٹو کی رہی سہی ذہنی توانائی اور قوت ارادی کو ڈسچارج کر دیا۔ اس پر توڑے گئے یہ ظلم صفیہ کے وجود کی بھی بنیادیں ہلا گئے۔ سعادت نے واپسی کے بعد اپنی تحریروں کے تمام تر حقوق اہلیہ کے حوالے کر دیئے۔ اس کی وحشت اور بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شوہر کی یہ حالت دیکھ کر وہ ہر پل ایک نئی موت مرتی۔ اس کے دل میں بھی ایک پُرسکون اور ہموار زندگی گذارنے کی خواہش تھی۔ ان ناآسودہ خواہشات نے اس کے مزاج میں خاموشی پیدا کر دی۔ وہ اپنے خیالات سے الجھتی کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ چند لمحوں بعد دستک نے اسے چونکا دیا۔ دروازے پر دو افراد موجود تھے جو اپنے انداز و اطوار سے شاعر معلوم ہو رہے تھے۔

”کیا منٹو صاحب گھر پر ہیں؟“ ایک شخص کے شائستہ سوال پر اس نے اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

”ان سے کہیے کہ دہلی سے ایک دوست ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ اجنبی کا تعارف سن کر وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ سعادت کے وجود کا ایک حصہ آج بھی دہلی و بمبئی میں سانس لیا کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر گئی اور شوہر کو مطلع کر دیا۔

”ارے نریش تم!“ سعادت انہیں دیکھ کر خوش ہوا۔ ”نثار نجیب آبادی بھی آج میرے گھر کا رستہ بھول آئے۔“ وہ ان کے ہمراہ کمرے میں چلا آیا جہاں میز پ کاغذات بکھرے تھے۔

”لگتا ہے کوئی نیا شاہکار لکھنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ نثار نے کہا۔

”میں گذشتہ تین دن سے کمرا نشین ہی ہو کر رہ گی ہوں۔ 'چچا سام' کے نام دو خط لکھے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتون کے کردار پر ایک خاکہ لکھا ہے۔ ابھی ایک ڈراما ٹائپ کر ر تھا۔“ اس نے کاغذات سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی حرکات میں بے ربطگی اور شدید بے چینی تھی۔

”ارے نریش! تم نے بتایا نہیں کہ دہلی والے آج کل کیسے ہیں؟ ترقی پسندوں کا کیا حال ہے؟ بہت اچھے دن گذرے وہاں۔ کرشن چندر، سردار بہادر علی جعفری کی سنا بھئی!“ اس نے دہلی کے اس اردو شاعر سے دریافت کیا۔

”سب ٹھیک ہیں منٹو صاحب! لیکن آپ کو اب تک یاد کرتے ہیں۔“

”یاد تو میں بھی انہیں بہت کرتا ہوں۔ میرا بمبئی کیس ہے نریش! تم کبھی گئے ہو ادھر؟ سنا ہے میرے افسانوں کے غیر قانونی مجموعے دھڑا دھڑ چھپ رہے ہیں۔ ان کی کاروباری ذہنیت کے بھی کیا کہنے۔ ایک طرف منٹو پر فحش نویسی کا ٹھپا لگا دیا، دوسری جانب میرے ہی افسانوں سے کمائی کرتے ہیں۔ میں کچھ دن پہلے اسپتال سے لو ہوں۔ طبیعت ذرا سنبھل جائے تو ایک ایک کو عدالتوں میں نہ گھسیٹا تو میرا نام نہیں۔“ اس کی بے ربطگی مخمور ہونے کا واضح ثبوت تھی۔

”ضرور گھسیٹیے گا۔ اسی بہانے آپ وہاں آئیں گے تو سہی۔ آپ نے تو دہلی اور بمبئی کو بھلا ہی دیا منٹو صاحب! کبھی دل نہیں چاہا واپس آنے کا؟“ نریش نے پوچھا۔

”دل کی کیا بتاؤں بھئی! دل تو اور بھی بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ اپنے اشوک کمار اور شیام نے تو خط بھی لکھے تھے کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ لیکن خیر چھوڑو!“ وہ کھانسنے لگا۔

”آپ کی طبیعت بہت خراب معلوم ہو رہی ہے منٹو صاحب!“ نثار تشویش سے بولا۔

”ارے یہ تو معمول کی کھانسی ہے۔ ایسی کئی چھوٹی موٹی بیماریاں آئیں اور ایمپائر سے مجھے آؤٹ دے دی

اپیل کرتی رہیں۔ ہر بار ان کی اپیل مسترد ہوئی۔'' وہ
...رت سے کہنے لگا۔ مہمانوں سے گفتگو اور انہیں لاہور کے
...اہم مقامات کی سیر کرواتے سعادت نے وقت رخصت
...ں بھرپور یقین دہانی کروائی کہ وہ مقدمات کی پیروی کے
...ے جلد ہی بمبئی آئے گا۔

☆......☆

حلقہ ارباب ذوق میں اس وقت معمول کی سرگرمیاں
...ی تھیں۔ محمد طفیل، مجید امجد، شوکت تھانوی کے علاوہ کئی
...م افراد کا موضوع گفتگو سعادت حسن منٹو تھا۔

''سنا ہے منٹو ایک بار پھر موت کے منہ سے واپس آیا
...ے۔'' ایک تاسف آمیز صدا ابھری۔

''منٹو کی ضد اور سوچ ہی اس کی سب سے بڑی دشمن
...ں ہے۔ انسان کو وقت اور حالات کے مطابق ڈھل جانا
...ہیے۔'' شوکت تھانوی نے اعتراض کیا۔

''معاف کیجیے گا شوکت صاحب!!! ایک ادیب کی سوچ
...تو اسے ہمیشہ دوسروں سے منفرد بنایا کرتی ہے۔ اس نے
...قت میں ٹھٹھرتے انسانوں کو درست سمت دکھانے کی غلطی
...تو کی تھی۔ ہمیں یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہم سب کا رویہ بھی
...ے موجودہ مقام تک لانے کا باعث بنا ہے۔ ہم نے اس
...ے ساتھ ہر موڑ پر زیادتی ہی کی ہے۔'' محمد طفیل نے صاف
...ئی سے کہا۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں طفیل صاحب! میں بھی کئی
...ز سے اسی نہج پر سوچ سوچ کر پریشان ہوں۔ ایک ادیب
...ی ایسی بے قدری ہم سبھی کے لیے لمحۂ فکریہ
...ے۔'' مجید امجد بھی قدرے افسردہ تھے۔

''ناقدین نے اس پر تنقید نہیں، تذلیل کے نشتر چلائے
...ں۔'' طفیل نے سر جھٹکا۔

''میں نے اسی موضوع پر ایک نظم تخلیق کی
...ے۔ احباب اسے توجہ سے سنیں تو مجھے خوشی ہوگی۔'' مجید نے
...ب سے ایک کاغذ نکالا اور گھمبیر لہجہ میں گویا ہوا۔

''میں نے اس کو دیکھا ہے
اجلی اجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں
پھیلتی بھیڑ کے اوندھے اوندھے کٹوروں کی طغیانی میں
جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے
'دنیا! تیرا حسن یہی بدصورتی ہے'
دنیا اس کو گھورتی ہے
شور سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے
انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بام زماں پر پھینکا ہے
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پُرپیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلوں میں
لے آیا ہے یوں بن پوچھے اپنے آپ
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ
کون ہے یہ گستاخ
تاخ تڑاخ!''

مجید امجد کے الفاظ وہاں بیٹھے ہر ادیب اور شاعر کی روح پر کوڑوں کی طرح برس رہے تھے...... تاخ...... تڑاخ......

☆......☆

1955 کا آغاز ہوئے سترہ روز بیت چکے تھے۔

سعادت اپنے کمرے میں کاغذ کی پیشانی پر 786 کا جھومر سجائے ایک دلگداز خبر کو افسانہ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کررہا تھا لیکن الفاظ اور ربط پر اس کی گرفت مضبوط ہوکے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے صبح اخبار میں گجرات سے تعلق رکھنے والی ایک عورت کے ساتھ وحشیانہ سلوک کی خبر دیکھی تھی۔ اسے بس اسٹاپ سے شیرخوار بچے کے ساتھ اغوا کے بعد زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ کسی طرح ان نصف درجن افراد کے چنگل سے فرار حاصل کرنے میں تو کامیاب ہوگئی تھی لیکن کڑاکے کی سردی نے نہایت اطمینان سے دونوں کا شکار کرکے موت کی آغوش میں پھینک دیا۔ منٹو اس سانحہ کو اپنے مخصوص نشترانہ انداز میں قلمبند کرنا چاہتا تھا لیکن سوکھی لکڑی کی طرح چٹختی رگیں ارتکاز کی راہ میں خلل بن رہی تھیں۔ یہ کیفیت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ اسے علم تھا کہ جسم و جان شدت سے بنت انگور کے طالب تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کاغذات ایک جانب رکھ کر اٹھا اور دبے قدموں اِدھر اُدھر دیکھتا الماری کھنگالنے لگا۔ پیسے کہیں بھی نہ تھے۔

''عجیب عورت ہے یہ صفیہ بھی!! پہلے تو بےفکری سے پیسے اِدھر اُدھر رکھ دیا کرتی تھی لیکن اب اس پر ضرورت سے زیادہ ہی احساس ذمہ داری حاوی ہوگیا ہے۔'' وہ جھنجھلایا۔ اسے علم ہی نہ تھا کہ صفیہ نے شوہر کی اسی عادت کے باعث حفظ ماتقدم کے طور پر رقم احتیاط سے اپنے پاس رکھنا شروع کردی ہے۔ وہ طلب سے مغلوب ہوکر مختلف

احباب کے پاس پیسے ادھار لینے بھی گیا۔ تلاش بسیار کے بعد 'اثر' نامی دوست سے کچھ رقم ملی تو اپنی بے چینی کا سامان حاصل کیے وہ گھر چلا آیا اور آتشیں گھونٹ اپنے حلق میں انڈیلنے شروع کر دیے۔

اسے علم تھا کہ ڈاکٹرز نے مزید مے نوشی مہلک قرار دے رکھی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صفیہ اس کے علاج پر بہت پیسا خرچ کر چکی ہے۔ اسے احساس تھا کہ بچیوں کے لیے اس کا وجود کس قدر اہم ہے۔ ان سب حقائق سے آشنائی مزاحمت کی ایک طاقتور تحریک بن کر اعصاب پر چھائی لیکن طلب کی عفریت نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ خطرناک حد تک تلخ سیال اپنے جسم میں انڈیل چکا تھا۔ اذیت کی ایک تیز لہر بدن میں اٹھی۔ وہ درد کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ اسی لمحہ متلی ہوئی اور فرش پر لہو کسی دھار کی طرح بہنے لگا۔

''ماموں جان!! یہ کیا ہے؟ کیا آپ کو کہیں چوٹ لگی ہے؟'' اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ حامد کا چھ سالہ بیٹا کس وقت کمرے میں چلا آیا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا! یہ تو پان کی پیک ہے۔'' اس نے بچے کو ٹالا اور ایک پرانے کپڑے سے فرش صاف کر کے اہلخانہ کے ساتھ معمول کے مطابق کھانا کھا کر سو گیا۔ رات کے آخری پہر درد مزید شدت اختیار کر چکا تھا۔ لہو کا اخراج بھی بدستور جاری تھا۔ اس نے صفیہ کو اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

''یہ کیا ہو گیا سعادت صاحب؟ آپ نے پھر کوئی بدپرہیزی کی ہے کیا؟'' وہ دکھ سے بولی۔ ان دنوں حامد بہاولپور میں تھا۔ سکینہ (مسز حامد) نے اپنے ملازم کو فوری طور پر ڈاکٹر کے ہاں روانہ کر دیا۔ صبح ہونے تک ڈاکٹر نے انجیکشن دے کر ہر ممکن کوشش کی کہ اس کی طبیعت سنبھل جائے لیکن نبض ڈوبتی ہی جا رہی تھی۔ درد میں اضافہ اور خون کی قے بھی جوں کی توں برقرار رہیں۔

''انہیں فوراً اسپتال لے جائیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ جگر پھٹ گیا ہے۔'' وہ دھیمے سے لہجہ میں صفیہ سے بولا۔

''بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے اسپتال نہیں جانا۔ یہیں سکون سے پڑا رہنے دو بس۔'' اس نے ڈاکٹر کے الفاظ سن لیے تھے۔ خواتین کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''خبردار جو کوئی رویا!'' وہ مشتعل ہوا اور اپنا منہ رضائی میں دے لیا۔

''اپنا نہیں تو کچھ ہمارا ہی خیال کر لیجیے سعادت صاحب!'' صفیہ چلا اٹھی اور ایمبولنس بلوانے کا بندوبست کرنے نکل کھڑی ہوئی۔

''میرے اوپر اور رضائیاں ڈال دو۔ بہت سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی تو شاید قبر میں بھی نہ لگے۔'' اس نے بدقت چہرے سے رضائی ہٹائی۔ کچھ دیر مزید گزری تو اسے تشنجی جھٹکے لگنے لگے۔ درد کسی تیز دھار آلے کی طرح ہر ایک نس کو چیرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میری جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو....'' اس کی آنکھوں میں موت کو سامنے پا کر بھی رحم یا التجا کی کوئی کیفیت نہ تھی۔ وہ ہنوز غیر جذباتی انداز میں سب کو خاموش کر دار ہا تھا۔ ایمبولنس دروازے پر آئی تو وہ صفیہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''اس گھر سے دائمی عذاب ہمیشہ کے لیے ٹلنے والا ہے۔'' اس کے انداز پر صفیہ بلک اٹھی۔ منٹو ایک بار پھر تشنجی کیفیت میں وہسکی کا مطالبہ کرنے لگا۔ اسے پُرسکون رکھنے کے لیے ایک چمچہ شراب اس کے منہ میں انڈیلنے کی کوشش کی گئی لیکن بمشکل ایک قطرہ حلق سے اترنے کے بعد وہ مہلک سیال وہیں بہہ گیا۔ سعادت حسن منٹو پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ ایمبولنس اسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لیے اندر گئے۔ صفیہ کی رنگت خوف سے زرد پڑنے لگی تھی۔

''آئی ایم سوری ...... ہی از نو مور۔'' چند لمحوں بعد ڈاکٹر کی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

سعادت حسن منٹو کا 'گوشت' ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

داستان ادھوری رہ گئی۔

حقیقت نگاری کا ایک اسکول ختم ہو گیا۔

اب کسی کو تختہ سیاہ کی سیاہی واضح کرنے کے لیے سفید چاک استعمال نہیں کرنا تھا۔

اب ادب میں سچائی کی ملاوٹ کا خدشہ ٹل گیا۔

ادب ہمیشہ کے لیے پاک صاف ہو گیا تھا۔

ماخذات:۔

منٹو میرا دوست۔ (ڈاکٹر کیول دھیر)

گنجے فرشتے۔ (سعادت حسن منٹو)

سعادت حسن منٹو۔ زندگی، فن اور شخصیت کا جائزہ۔

رکشے والا

تنویر ریاض

غربت معاشرے کو بگاڑتی ہے۔ اس بگاڑ کا واحد علاج تعلیم ہے لیکن جب بھر پیٹ کھانا نہ ملے تو تعلیم کی فکر کون کرے؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوئی معیشت داں، ماہر تعلیم، مفکر آگے نہ بڑھا، آگے بڑھا کون؟ایک نرا جاہل، سائیکل رکشا کھینچنے والا۔ غربت جس کے پیروں کی بیڑیاں تھیں، جس نے کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا، عالم پیری میں بھی رکشا کھینچ کر پیٹ کی آگ بجھایا کرتا تھا۔ اس نے غربت کے دو پاٹوں کے بیچ پستے ہوئے بھی کمال کر دکھایا۔ کثیر تعداد میں بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرایا۔

نوے سالہ ایک حوصلہ مند بوڑھے کی روداد

بائی فینگ لی ایک رکشا ڈرائیور تھا۔ اس نے اپنی ندگی کا ایک بڑا حصہ ان لوگوں کی خدمت کرتے گزار دیا جو عمولی کرایہ دے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہتے تھے۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا اور دوسرے رکشا ڈرائیوروں کے مقابلے میں بہت کمزور نظر آتا تھا تاہم وہ بہت مستعد اور جوش تھا اور کام کے دوران کبھی اپنے اوپر تھکن کو حاوی نہ ونے دیتا۔ وہ صبح چھ بجے اٹھ کر کام شروع کر دیتا اور دن بھر ہر کی سڑکوں پر رکشا چلانے کے بعد رات آٹھ بجے گھر اپس آجاتا۔

تمام گاہک اسے پسند کرتے تھے کیونکہ اس کا مزاج بت دوستانہ تھا اور اس کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ تی تھی۔ وہ اتنا قناعت پسند تھا کہ اس نے کبھی کسی سواری ے کرایہ طے نہیں کیا اور مسافر اپنی خوشی سے جو دیتے وہ سکرا کر قبول کر لیتا۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے کئی سافر اسے دوسرے رکشا ڈرائیوروں پر ترجیح دیتے اور ظہار ہمدردی کے طور پر اسے مقررہ کرایہ سے زیادہ ادا کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اس کے کمزور جسم، بہتے وئے پسینے اور رکشا چلانے کی مشقت سے متاثر ہو جاتے تھے۔

بائی فینگ لی شہر کی ایک پس ماندہ بستی میں ایک پرانی اور چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ اس بستی میں کئی رکشا ڈرائیور اور کچرا اٹھانے والے بھی رہائش پذیر تھے۔ گویا سب کا اسٹینڈرڈ آف لیونگ ایک جیسا تھا اسی لیے اپنی جھونپڑی میں آسائش کی کمی دیکھ کر بھی وہ پریشان نہ تھا۔

اس کی جھونپڑی میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سوائے ایک پرانی دری کے جس پر وہ دن بھر کی مشقت کے بعد آرام کرتا تھا۔ اس ایک کمرے میں کئی اور لوگ بھی رہتے تھے اور یہیں وہ اپنے مہمانوں کو بھی بٹھاتا جو اس سے مختلف کاموں کے سلسلے میں مدد لینے آتے تھے۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں گتے کا ایک پرانا ڈبہ بھی تھا جس میں اس نے ایک پھٹا پرانا کمبل رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کھانے کے لیے ایک پلیٹ اور پانی پینے کے لیے ایک ٹین کا گلاس بھی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں روشنی کے لیے مٹی کے تیل کا ایک لیمپ ٹمٹماتا رہتا تھا۔

اس شہر میں اس کا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں تھا اور لوگوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم اسے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ وہ ہر وقت لوگوں میں گھرا رہتا تھا جو اس کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ وہ اس کے مثبت رویے اور فیاضی کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ ہر ضرورت مند کی کھلے دل سے



مدد کرتا اور اس کے عوض اس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔

اس کے بچے جوان ہو چکے تھے اور سب اپنی زندگی میں مگن تھے لیکن وہ جب کبھی ان سے ملنے گاؤں جاتا تو وہ سب اسے گھیر لیتے اور اصرار کرتے کہ وہ رکشا چلانا چھوڑ دے اور واپس گاؤں آجائے۔ پہلے تو وہ انہیں ٹالتا رہا لیکن جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو اس نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک سہانی صبح جب وہ اپنے گاؤں پہنچا تو اس نے کچھ بچوں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ اس نے ایک بچے کو بلا کر پوچھا۔ ''کیا تم اسکول نہیں جاتے؟''

''نہیں۔'' اس بچے نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

اس کیوں کا اس بچے کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ اس بارے میں سوچتا ہوا گھر پہنچا تو اہل خانہ اس کے منتظر تھے۔ اس کے بیٹے، بیٹیاں، بہوئیں، داماد، ان کے بچے سب نے اسے گھیر لیا۔ وہ بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوا لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ ''آج میں نے گھر آتے ہوئے کچھ بچوں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے ایک بچے سے پوچھا کہ تم اسکول کیوں نہیں جاتے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ کیا تم اس کی وجہ جانتی ہو؟''

اس کی بیٹی نے افسردہ لہجہ میں کہا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بچوں کے والدین بہت غریب ہیں اور وہ اسکول کی فیس ادا نہیں کرسکتے۔''

یہ سن کر بائی فینگ اداس ہوگیا۔ اس نے بیٹی سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اگلے روز وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا اور اس کی میز پر اپنی کل جمع پونجی پانچ ہزار یوآن رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری طرف سے عطیہ ہے۔ اس وقت میرے پاس یہی کچھ ہے۔ گاؤں کے تمام بچوں کو اسکول میں داخلہ دے دو۔ ان کی فیس میں ادا کروں گا۔''

اس نے گھر آکر اعلان کردیا کہ وہ واپس تیان جن جا رہا ہے تاکہ رکشا چلا کر اسکول کی فیس ادا کرسکے۔ اس کے بیٹوں اور بیٹیوں نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور واپس شہر چلا گیا۔ یہ 1987ء کی بات ہے۔ اس وقت اس کی عمر 74 برس تھی۔

بائی فینگ کو ہمیشہ یہ پچھتاوا رہا کہ وہ پڑھ لکھ نہیں سکا لیکن وہ چاہتا تھا کہ نئی نسل تعلیم حاصل کرکے اپنی قسمت بدل لے اسی لیے اس نے گاؤں کے بچوں کو تعلیم دلانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے اپنے اخراجات میں کمی کردی اور ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا کمرا لے کر اس میں رہنے لگا۔ وہ چوبیس گھنٹے سواریوں کا انتظار کرتا، سادہ خوراک لیتا اور پرانے کپڑوں میں گزارہ کرتا۔

انھی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی بدل دی۔ ایک دن وہ ایک مسافر کو اتارنے کے بعد سستا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا چھ سالہ لڑکا ایک بوڑھی عورت کا سامان اٹھانے کے لیے اس کی خوشامد کررہا ہے جو اس نے قریبی مارکیٹ سے خریدا تھا۔ وہ سامان بہت وزنی تھا اور لڑکے کو اسے اٹھانے میں بہت مشکل پیش آرہی تھی لیکن وہ بڑی ہمت سے کام لے رہا تھا۔ اس وقت اس لڑکے کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی جب اس نے خوش اسلوبی سے اپنا فرض ادا کیا اور اس عورت نے معاوضہ کے طور پر اسے چند سکے پکڑا دیئے۔ اس لڑکے نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جیسے خدا کا شکر ادا کررہا ہو۔ اس نے لڑکے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بعد بھی وہ مارکیٹ سے خریداری کرنے والی عورتوں کا سامان اٹھاتا رہا اور جب بھی اسے معاوضہ کے پیسے ملتے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ کہتا۔

پھر اس نے لڑکے کو کچرے کے ڈھیر کی طرف جاتے اور وہاں سے کچھ چنتے ہوئے دیکھا۔ جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو اور جب اسے روٹی کا ایک ٹکڑا مل گیا تو وہ بہت خوش ہوا، اس نے اسے اچھی طرح صاف کیا اور مزے لے کر کھانے لگا جیسے وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی نعمت ہو۔

بائی سے یہ سب کچھ نہیں دیکھا گیا۔ وہ اس لڑکے کے پاس گیا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس لڑکے نے اپنے لیے کھانا کیوں نہیں خریدا جب کہ اسے مزدوری میں اچھے خاصے پیسے ملے تھے۔ اس نے یہی بات لڑکے سے پوچھی تو اس نے کہا۔ ''میں ان پیسوں سے اپنی بہنوں کے لیے کھانا خریدوں گا۔''

''تمہارے والدین کہاں ہیں؟'' بائی نے پوچھا۔

''میرے والدین روزانہ کچرے میں کام کی چیزیں تلاش کیا کرتے تھے لیکن ایک مہینے سے وہ غائب ہیں۔ اس کے بعد میں نے انہیں نہیں دیکھا اس لیے مجھے اپنا اور بہنوں کا پیٹ پالنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔''

بائی فینگ لی نے اس لڑکے سے کہا کہ وہ اسے اس کے گھر لے چلے۔ لڑکا اسے لے کر اپنے گھر پہنچا۔ بائی نے اس کی بہنوں کو دیکھا تو رنجیدہ ہو گیا۔ ان میں سے ایک پانچ اور دوسری چار سال کی تھی۔ وہ بہت دبلی پتلی اور کمزور دکھائی دے رہی تھیں اور ان کے کپڑے بھی گندے ہو رہے تھے۔ بائی نے اس لڑکے سے پوچھا۔ ''تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟''

اس لڑکے نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے یہاں کسی کو آتے نہیں دیکھا۔''

''اور پڑوسی؟''

''ہمارے پڑوس میں ایک عورت رہتی ہے۔ اس نے ایک دو دن تو ہمیں کھانا دیا پھر چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ یہاں سب لوگ بہت غریب ہیں۔ ان کا اپنا گزارہ ہی مشکل سے ہوتا ہے۔ ہماری دیکھ بھال کون کرے گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بائی نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ ''کل مالک مکان کرایہ مانگنے آیا تھا اور وہ کہہ گیا ہے کہ اگر تین دن میں کرایہ نہ دیا تو وہ ہمیں گھر سے نکال دے گا۔''

''تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔''

مالک مکان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ بائی نے اسے ایک ماہ کا کرایہ دیا اور کہا کہ وہ بچوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے پھر وہ ان تینوں بچوں کو تیان جن کے ایک یتیم خانے میں لے گیا اور مینیجر کو ان کے حالات بتا کر کہا کہ وہ ان بچوں کو یتیم خانے میں داخل کرے وہ ان کی خوراک اور تعلیم کے اخراجات برداشت کرے گا۔ اس کے علاوہ یتیم خانے میں رہنے والے دوسرے بچوں کی تعلیم میں بھی مدد دے گا۔

اس کے بعد بائی لی فینگ نے مزید محنت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یتیموں کی مدد کرنے کے لیے دن رات رکشا چلانے لگا۔ وہ علی الصبح رکشا چلانا شروع کرتا اور رات دیر تک سواریوں کو ان کی منزل تک پہنچاتا رہتا۔ اپنی روزانہ کی کمائی میں سے وہ کچھ رقم جھونپڑی کا کرایہ دینے کے لیے پس انداز کرتا اور اپنے لیے دو وقت کے کھانے کا انتظام کرتا اور باقی تمام رقم یتیم خانے کو عطیہ میں دے دیتا تاکہ وہ بچوں کی خوراک اور تعلیم کا بندوبست کریں۔

اس نے اپنے لیے کپڑے بنانا چھوڑ دیئے۔ ان بیس سالوں میں اس نے شاید ہی کوئی کپڑا یا جوتا خریدا ہو۔ اس بارے میں اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں کہ اس عرصے میں، میں نے اپنے لیے کوئی کپڑا خریدا ہو۔ اگر آپ میرے کپڑے دیکھیں تو فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ وہ کپڑے ہیں جو لوگ ناقابلِ استعمال سمجھ کر پھینک دیتے ہیں اور میں ان کی مرمت کر کے پہننے کے قابل بنا لیتا ہوں۔ میرے جوتے بھی ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں جو میں کچرے کے ڈھیر سے اٹھاتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں

نے جو موزے پہن رکھے ہیں وہ بھی ایک جیسے نہیں ہیں۔ مجھے رکشا چلاتے ہوئے دھوپ سے بچنے کے لیے ہیٹ پہننا پڑتا ہے وہ بھی میں کچرے کے ڈھیر سے اٹھاتا ہوں۔

یہی بات اس کی بیٹی نے ذرا مختلف انداز میں بتائی۔ ''بابا نے ساری عمر محنت کی اور زیادہ سے زیادہ بچت کر کے بچوں کی اسکول فیس ادا کرتے رہے۔ وہ روکھی سوکھی کھاتے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے اور اگر کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو اس میں پیوند لگا لیتے اور جب تک وہ پوری طرح پھٹ نہیں جاتا۔ وہ اسے پہنتے رہتے اور اگر کوئی ان کے پرانے کپڑے پھینک کر ان کے لیے نئے کپڑے خریدتا تو وہ اس پر ناراض ہو جاتے کہ ان کے لیے چیزیں خریدنے پر پیسے کیوں ضائع کیے۔''

''ایک دفعہ میں ان کے لیے نئی پتلون خرید کر لائی تو بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ اگر تمہارے پاس فالتو پیسے ہیں تو میرے ایجوکیشن فنڈ میں دے دو۔''

جب اس نے محسوس کیا کہ صرف رکشا چلا کر وہ بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تو اس نے ایک ایجوکیشن سپورٹ فنڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اس کی عمر 82 سال تھی۔ اس فیصلے کی سب سے زیادہ مخالفت اس کے بچوں نے کی۔ وہ تو پہلے ہی اس کے رکشا چلانے کے خلاف تھے۔ اس کا بڑا بیٹا بولا۔ ''لوگ چندہ مانگنے والوں کی نیت پر ہمیشہ شک کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس عمر میں یہ بدنامی مول لو۔''

بڑی بہو بولی۔ ''ویسے ہی لوگ آپ کے رکشا چلانے پر باتیں بناتے ہیں۔ اس کا الزام بھی ہم پر ہی ہے کہ ہم آپ کا خیال نہیں رکھتے اور اس بڑھاپے میں اپنی گزر اوقات کے لیے آپ کو رکشا چلانا پڑ رہا ہے۔''

بیٹی نے مشورہ دیا۔ ''اگر آپ کو کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے اور تم کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تو یہیں گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان کھول لیں۔ آرام سے ایک جگہ بیٹھ کر بسکٹ اور ٹافیاں بیچیں۔ کم از کم رکشا چلانے کی مشقت سے تو نجات مل جائے گی۔''

بائی فینگ لی کو غصہ آ گیا اور وہ بولا۔ ''میں نے تم لوگوں سے مشورہ نہیں مانگا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اپنی ذات کے لیے رکشا نہیں چلاتا... بلکہ مجھے اسکول کے بچوں کی فیس ادا کرنا ہوتی ہے کیونکہ رکشا چلانے سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی اس لیے میں یہ فنڈ قائم کر رہا ہوں۔''

''آپ نے کیا ان بچوں کو پڑھانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ یہ ان کے ماں باپ کی ذمے داری ہے۔'' بڑے بیٹے نے کہا۔

''گاؤں کی حد تک تو یہ بات صحیح ہے اگر بچوں کے ماں باپ کو دلچسپی ہو گی تو وہ خود کسی نہ کسی طرح فیس کا بندوبست کر لیں گے لیکن مجھ پر ان یتیم بچوں کی ذمے داری ہے۔ ان کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر ان کی فیس کا انتظام نہ ہوا تو وہ اسکول نہیں جا سکیں گے۔''

بائی فینگ لی نے کسی کی ایک نہیں سنی اور شہر واپس آ کر دوستوں کی مدد سے فنڈ قائم کر دیا۔ اس کا حلقہ احباب صرف رکشا ڈرائیوروں تک محدود تھا اور وہ دن بھر کی محنت کے بعد بمشکل اتنا کماتے تھے کہ اپنے گھر کا خرچ چلا سکیں۔ ان کے لیے اس آمدنی میں سے کچھ پس انداز کرنا مشکل تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اس کا ساتھ دیا اور اپنی آمدنی میں سے تھوڑا بہت اس کے فنڈ میں دینا شروع کر دیا لیکن یہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر تھا۔

بائی فینگ نے دوسرے لوگوں کو بھی اس فنڈ میں حصہ ڈالنے کی ترغیب دی۔ ان میں اس کے پڑوسی، نائی، دھوبی اور درزی وغیرہ شامل تھے۔ یہاں تک کہ اس نے رکشا میں بیٹھنے والے مسافروں سے بھی اس فنڈ کے لیے عطیات جمع کرنا شروع کر دیے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے رکشا پر ایک بینر لگایا جس پر لکھا تھا۔ ''قوم کے بچوں کا مستقبل سنوارو'' جو مسافر اسے جانتے تھے وہ کرایہ کے علاوہ چند اضافی سکے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے جیسے خیرات دے رہے ہوں لیکن بائی فینگ لی کے ماتھے پر شکن نہ آتی اور وہ خوش دلی سے عطیہ قبول کر لیتا۔

ایک دن اس کے جاننے والے پولیس کے سپاہی نے اسے روک کر کہا کہ اس طرح عطیات جمع کرنا غیر قانونی ہے۔ اس کے لیے سرکار سے اجازت لینا ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ رکشے پر سے بینر اتار دے اور زبانی کلامی لوگوں سے عطیات وصول کرے۔

بائی فینگ نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بینر اتار دیا لیکن وہ کوئی غیر قانونی کام نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے متعلقہ دفتر میں جا کر فنڈ کو رجسٹر کروا لیا لیکن کوشش کے باوجود اس میں رقم جمع نہیں ہو رہی تھی کہ سب بچوں کی فیس ادا ہو سکے، اس لیے وہ اپنے معمول کے مطابق رکشا چلاتا رہا۔

ایجوکیشن سپورٹ فنڈ کے ایک کارکن زوزی ینگ

نے بتایا۔ ''اسے ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ اسکول کی فیس کب ادا کرنی ہے اور اس کی خواہش ہوتی تھی کہ فیس وقت پر جمع کروائی جائے۔ ہر بار جب وہ ہمیں رقم دیتا تو اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ جاتی اور کہتا کہ ایک بار پھر اس نے اپنا مشن پورا کرلیا ہے۔''

وہ سال کے 365 دن رکشا چلاتا۔ اس کے ذہن میں چھٹی یا آرام کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسے نہ موسم کی پروا تھی اور نہ ہی اپنے آرام کا خیال ہے۔ برف باری ہو رہی ہو یا سورج آگ برسا رہا ہو۔ وہ اپنی دھن میں مگن رکشا چلاتا رہتا۔ جب لوگ اس سے پوچھتے کہ وہ ان بچوں کی خاطر اتنی قربانی کیوں دے رہا ہے تو وہ ہمیشہ کہا کرتا۔ ''میں یہ سب اس لیے کرتا ہوں کہ ان یتیم بچوں کو مناسب خوراک اور تعلیم مل سکے اور مجھے ان کی مدد کرکے دلی خوشی ہوتی ہے۔''

بائی فینگ لی نے 1987ء میں یتیم خانہ کو عطیہ دینا شروع کیا اور اس نے اس کے عوض یتیم خانے سے کچھ نہیں مانگا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے عطیات سے کون کون بچہ مستفید ہو رہا ہے۔ اس نے بیس سال تک صرف ایک ہی مقصد کو ذہن میں رکھ کر رکشا چلایا کہ اسے یتیم بچوں کے لیے عطیہ دینا ہے اس دوران وہ کئی بار بیمار بھی ہوا لیکن اس نے کبھی اپنی بیماری کو اہمیت نہیں دی۔ معمولی نزلہ بخار یا کھانسی کی تو وہ پروا بھی نہیں کرتا تھا اور اگر طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے اپنے ہی ٹوٹکوں سے اس کا علاج کرتا۔

وہ دن رات آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتا، جب اسے فنڈ کے لیے خاطر خواہ عطیات نہیں ملے تو اس نے 1995ء میں تیان جن ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا اسٹور کھول لیا اور فارغ وقت میں وہاں بیٹھنے لگا۔ جب کوئی سواری مل جاتی تو وہ اپنی جگہ ایک لڑکے کو بٹھا دیتا۔ اس کے اس اقدام کی بھی گھر والوں نے مخالفت کی۔ اس کی بیٹی بائی جن فینگ نے ایک مقامی روزنامہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم شروع سے ہی اس کے خلاف تھے کہ وہ دوبارہ شہر جاکر رکشا چلائیں۔ وہ 74 سال کے ہو چکے تھے اور اس عمر میں آدمی کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے بھی انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی... کیونکہ ان پر کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ سب بچے بڑے ہو چکے تھے اور گاؤں میں تھوڑی سی زمین بھی تھی جس کی آمدنی سے ان کے اوپر کے اخراجات پورے ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے غریب بچوں کی تعلیم کو اپنا مشن بنالیا تھا اور وہ اسی کی تکمیل کی خاطر نوّے برس کی عمر میں بھی رکشا چلاتے رہے۔ انہیں دوسروں کی مدد کرکے خوشی ہوتی تھی۔''

ننکائی یونیورسٹی کے ایک ملازم نے بائی فینگ لی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ پہلی بار 1996ء میں کچھ رقم عطیہ کرنے یونیورسٹی آئے۔ ہم جانتے تھے کہ یہ ان کے خون پسینا کی کمائی ہے۔ درحقیقت ہم ایک 80 سال کے شخص سے عطیہ لینا نہیں چاہ رہے تھے لیکن انہوں نے اس پر اصرار کیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ بھی مستحق طلبہ کی مدد کرتے رہیں گے۔''

جب ننکائی یونیورسٹی کے طلبہ کو اس کی بیماری کا علم ہوا تو انہوں نے اس کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کیا۔ ''ان کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا لیکن مجھے ان کی آنکھوں میں وہی معصومیت نظر آئی۔'' یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے انٹرنیٹ یونیورسٹی میسیج بورڈ پر لکھا۔ ''ان کی مسکراہٹ میرے دل میں اتر گئی اور اُمید ہے کہ میں بہت جلد انہیں مسکراتا ہوا دیکھ سکوں گا۔''

اسی یونیورسٹی کے ایک اسٹاف ممبر لیو وی زین نے چائنا ڈیلی کو اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب ان کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا کردار مثالی تھا۔ وہ بے حد فیاض اور انسان دوست شخصیت تھے۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخص نے اس ضعیفی میں رکشا چلا کر مستحق بچوں کی فیس ادا کی ہو۔''

نوّے سال کی عمر میں وہ بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ رکشا چلاتے ہوئے اسے چکر آتے اور ٹانگیں کانپنے لگتیں۔ اس کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اب وہ رکشا چلانے کے قابل نہیں رہا اس لیے اسے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ رکشا چلانے کے دوران اسے کوئی حادثہ پیش آجائے۔ بائی فینگ لی کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ وہ اپنی جمع پونجی جو پانچ سو یوآن یعنی 80 ڈالر پر مشتمل تھی لے کر یتیم خانہ کے زیر اہتمام چلنے والے پاؤ ہوا اسکول گیا اور کہا۔ ''اب میں بہت بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں اور رکشا چلانے کے قابل نہیں رہا اس لیے اب اسکول کو مزید عطیہ نہیں دے سکوں گا۔ ممکن ہے کہ یہ میرا آخری عطیہ ہو۔''

یہ سن کر تمام طالب علم اور اساتذہ رونے لگے۔ خود بائی فینگ لی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اس نے انہیں

تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میرے لگائے ہوئے پودے اب تناور درخت بن گئے ہیں۔ اب تم لوگ اس معاشرے کے کارآمد افراد ہو۔ جس طرح میں نے تمہیں سہارا دیا اسی طرح تم بھی دوسروں کا سہارا بنو، اُمید ہے کہ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا۔''

ریٹائر ہونے تک اس نے مجموعی طور پر تین لاکھ پچاس ہزار یوآن یتیم خانہ اور اس کے زیرانتظام چلنے والے اسکول کو عطیہ کیے جن سے تین سو بچوں کی فیس ادا کی گئی۔

بائی کو چائنا سینٹرل ٹیلی ویژن نے 2004ء میں ان بیس لوگوں میں شامل کیا جو دل چھو لینے والے دس افراد کے امیدوار تھے۔ 2005ء میں اسے پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا اور 23 ستمبر 2005ء کو وہ بانوے سال کی عمر میں وفات پا گیا لیکن اس کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ ہزاروں لوگوں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی۔ اسے چین میں ایک ایسے نیک انسان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس نے معاشرہ کے غریب بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے سخت محنت کی اور اپنی تمام ضرورتوں کو نظرانداز کر کے ان کی فیس کا انتظام کیا۔

بائی فینگ لی نے یہ ثابت کر دیا کہ عزم پختہ ہو تو انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے اور اس میں عمر کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس نے سیکڑوں غریب بچوں کی مدد کر کے لاکھوں لوگوں کے دل موہ لیے اور دنیا کو دکھا دیا کہ ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے امیر ہونا ضروری نہیں۔ جب ایک غیر تعلیم یافتہ رکشا چلانے والا تین سو بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر سکتا ہے تو جو لوگ بے پناہ وسائل کے مالک ہیں۔ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

اس رکشا ڈرائیور کی کہانی سے متاثر ہو کر ایک سابق ایڈورٹائزنگ ایگزیکٹو لی جیالون نے اس کی زندگی پر فلم بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ 46 سالہ شخص تیان جن میں ایک چھوٹی سی اشتہاری ایجنسی میں کام کرتا تھا اور 2005ء تک اس نے فلم انڈسٹری میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اب تک اس کی.... ایک فلم ٹی وی پر دو مرتبہ دکھائی گئی ہے۔ تاہم اسے فلموں سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اپنے فالتو وقت میں ڈراما کلاسیں اٹینڈ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک درجن کے قریب فلموں اور ٹی وی سیریز میں چھوٹے موٹے رول بھی کیے۔

''مجھے بائی فینگ لی کے بارے میں 1994ء میں معلوم ہوا جب میں ایک ڈرامے میں کام کر رہا تھا۔ اس کا ہیرو بائی فینگ لی کا بہت معتقد تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بائی 79 سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر گھر آ گیا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ گاؤں کے بچے فیس نہ ہونے کی وجہ سے اسکول نہیں جا رہے تو اس نے دوبارہ رکشا چلانا شروع کر دیا تاکہ مستحق بچوں کی مدد کر سکے۔''

لی نے اعتراف کیا کہ بائی فینگ کی تعریف کرنے کے باوجود وہ بہت جلد اسے بھول گیا۔ ''اس وقت میرا کام بہت اچھا چل رہا تھا اور مجھے کسی اور بات سے دلچسپی نہیں تھی لیکن جب میں نے اس کے انتقال کی خبر سنی تو گنگ رہ گیا۔ جب میں نے انٹرنیٹ پر اس کی کہانی پڑھی تو معلوم ہوا کہ اس نے 18 سال رکشا چلا کر غریب بچوں کی تعلیم کے لیے ساڑھے تین لاکھ یوآن عطیہ کیے۔ میں نے اسی وقت اس کی زندگی پر فلم بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کا اسکرپٹ لکھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں لیکن مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ 90 منٹ کی کہانی میں اس کی پوری زندگی کا احاطہ کرنا کتنا مشکل ہے۔ یہ اسکرپٹ ایک سال میں مکمل ہوا لیکن ایک دوست نے جو پروفیشنل اسکرین پلے رائٹر تھا۔ اسے مسترد کر دیا چنانچہ مشہور رائٹرز کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔''

ایک پروفیشنل سے مشورہ کرنے کے بعد لی کو معلوم ہوا کہ اس فلم پر چھ لاکھ یوآن یعنی 93000 ڈالر لاگت آئے گی جو اس کے بجٹ سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی کار، مکان اور بیوی کا زیور بیچ دیا اور وہ فیملی کے ساتھ کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ وہ فلم پروڈکشن پر توجہ دینے کی خاطر اپنا ایڈورٹائزنگ کا کام بھی چھوڑ چکا تھا۔

فلم کی شوٹنگ 2008ء میں شروع ہوئی اور بہت سے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اس میں کام کیا جن میں لیڈ ہیرو، آرٹ ڈائریکٹر اور سنگر شامل ہیں۔ فلم تو چند ہفتوں میں مکمل ہو گئی لیکن اسے فروخت کرنے میں ایک سال لگ گیا۔ کوئی تھیٹر اسے خریدنے پر تیار نہیں تھا۔ بہرحال 2009ء میں ایک ٹی وی اسٹیشن نے بہت کم قیمت پر اسے خرید لیا۔ لی نے اس میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے دیکھیں اور بائی فینگ کے بارے میں جان سکیں۔ تاہم اسے اُمید ہے کہ ایک دن یہ فلم سینماؤں میں بھی ریلیز ہو گی۔

تاریخی مقابلے

امجد رئیس

کھیلوں کے مقابلے کا ذکر تاریخ کے ہر دور میں ملتا ہے کیونکہ یہ مقابلے، لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے لیکن جب مقابلہ دیرینہ دشمن سے ٹھہرے تو سنسنی خیزی سوا ہو جاتی ہے۔ دونوں طرف کے حامی جوش میں بھر اٹھتے ہیں۔ خوب خوب شور مچا کر اپنے پسندیدہ کھلاڑی کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ کھلاڑی کی کامیابی پر خوش اور شکست پر غمگین ہو جاتے ہیں۔ ماضی قریب میں منعقد ان مقابلوں کا تذکرہ جو سنسنی خیزی کے باعث مقبولیت کی اوج پر تھے۔



کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کی پذیرائی

1980ء میں امریکا اور سوویت یونین کے تعلقات آزمائش کی بلندی کو چھو رہے تھے۔ اس بار آئس ہاکی بھی اعصاب شکن مقابلہ بننے جا رہا تھا۔ سوویت یونین کو افغانستان میں داخل ہوئے دو مہینے ہونے والے تھے۔ تخفیف اسلحہ کی بات چیت موقوف ہو چکی تھی۔ طرفہ تماشا، موقع بھی جارج واشنگٹن کی سالگرہ کا تھا۔ آئس ہاکی میں سیاسی ذائقے کی کڑواہٹ شامل ہو چکی تھی۔ آئس ہاکی کا مقابلہ دونوں سپر پاورز کے مابین محض ایک کھیل نہیں رہ گیا تھا۔ امریکا کی عزت نفس داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ سرد، سفید برف پر کولڈ وار کے شعلے رقص کرنے والے تھے۔

سوویت ٹیم، اسپڈنگ میں نمبرون تھی۔ ہارٹ فیورٹ سوویت آئس ہاکی ٹیم ''بگ ریڈ مشین'' کے نام سے معروف تھی۔ ریڈ مشین، متواتر اپنا پانچواں اولمپک گولڈ جیتنے جارہی تھی۔ امریکا دباؤ میں تھا۔ انہیں کسی بھی طرح میچ جیتنا تھا۔ ان کے حق میں ایک ہی بات تھی کہ وہ ہوم ٹرف پر کھیل رہے تھے۔ اولمپک سے کچھ عرصہ قبل سوویت یونین نے امریکا کو 3-10 سے شکست دی تھی۔ امریکی اپنے ہی گھر میں شکست ٹالنے کے لیے پُرعزم تھے۔ بلاشبہ یہ ایک اعصاب شکن مقابلہ تھا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی موجودگی، امریکا کی سابقہ شکستہ ہوم ٹرف اور جارج واشنگٹن کی سالگرہ جیسے عناصر نے مل کر امریکا کے لیے مقابلے کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنادیا تھا۔

آئس ہاکی نہایت برق رفتار کھیل ہے۔ دونوں طرف چھ چھ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ بیس منٹ کے تین وقفے دیئے جاتے ہیں۔ آئس ہاکی کے گول کیپر کو گول ٹینڈر کہا جاتا ہے۔ امریکی ٹیم کا جم کریگ (گول ٹینڈر) ایک ہیرو کی مانند کھیلا۔ دوسرے وقفے (پیریڈ) کے اختتام پر اسکور 2-3 تھا۔ امریکی خسارہ ایک حد تک محدود تھا۔ تاہم تیسرے پیریڈ کے آغاز پر امریکی قوم اعصاب زدگی کا شکار تھی۔ فیلڈ میں کھلاڑی برق کی مانند کوندرہے تھے۔ 2-3 کے اسکور کے باوجود امریکیوں کے لیے فتح خواب کی مانند تھی۔ فائنل پیریڈ کے دس منٹ پلک جھپکتے گزر گئے۔ اب صرف دس منٹ باقی تھے۔ اس وقت تمام توقعات اور امیدوں کے برخلاف امریکی ٹیم نے اسکور 3-3 سے برابر کردیا۔ ایک منٹ بعد امریکی کپتان نے ایک اور گول کر کے کرشمہ کردکھایا۔ قوم اس کرشمے کی برسوں سے منتظر تھی۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے سرک رہی تھیں۔ روسی کھلاڑی خوفناک حملے کررہے تھے۔ گول ٹینڈر جم کریگ زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سے گزررہا تھا۔ جم نے تمام تر توانائی اور صلاحیتیں گول بچانے کے لیے جھونک دی تھیں۔ اس کے ذہن سے ہر بات محو ہوگئی تھی۔ نظریں مقناطیس کی مانند گیند کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ انگ انگ میں بجلی بھری تھی۔

یو ایس ٹیلی ویژن کمنٹیٹر چلا رہا تھا۔ ''کیا ہم یہ سبقت برقرار رکھ پائیں گے؟ کیا آپ لوگ معجزے پر یقین رکھتے ہیں؟''

دفعتاً بزر بج اٹھا۔ پوری قوم ناچ رہی تھی۔ جشن کا آغاز ہوگیا تھا۔ بعدازاں امریکا نے فن لینڈ کو ہرا کے گولڈ میڈل حاصل کرلیا لیکن مقابلہ وہ تھا جس میں انہوں نے ناقابل شکست سوویت ٹیم کو ہزیمت سے دوچار کیا۔ یہ مقابلہ، اسپورٹس کے ناقابل فراموش لمحات بن کے یادداشت میں محفوظ ہوگیا۔ لیجنڈ کا لفظ چھوٹا پڑ گیا۔ مقابلے کو ''مریکل آن آئس'' کا نام دیا گیا۔ جسے ''دی مریکل آن مین اسٹریٹ'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

''جیتنے سے زیادہ لڑنا اہم ہے۔ فتح سے زیادہ یہ اہم ہے کہ تم کتنا اچھا لڑے۔'' یہ الفاظ اولمپک آئیڈیل، ڈورانڈو پیڑی کے تھے۔ پیڑی کا تعلق اٹلی سے تھا۔ وہ جس ناقابل یقین انداز میں 1908ء کی اولمپک میراتھن میں دوسرے نمبر پر آیا۔ فاتح کی جیت دھندلا گئی۔

چھریرے بدن کا پیڑی اپنی جان اور ہمت سے زیادہ بھاگا تھا۔ میراتھن کا راستہ چھبیس میل طویل تھا۔ ونڈسر کیسل سے وہائٹ سٹی اسٹیڈیم کے رائل باکس تک، لیکن شہزادی میری کی درخواست پر اس میں 385 گز کا اضافہ کردیا گیا تھا۔ یوں ٹریک کا اختتام کھیل کی نرسری ونڈو کے نیچے ہونا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ 385 گز کے اضافے سے میراتھن کی تاریخ میں نہ بھلادینے والے باب کا اضافہ ہوجائے گا۔

ڈورانڈو پیڑی، وائٹ سٹی پہنچنے والا پہلا ایتھلیٹ تھا۔ اس کے حریف پیچھے تھے لیکن اسٹیڈیم میں داخل ہونے کے بعد پہلے وہ غلط سمت میں مڑا۔ پھر نیویارک کے ٹائمز کے مطابق وہ ٹریک پر یوں لڑکھڑایا جیسے عالم خواب میں ہو۔ وہ چل رہا تھا نہ بھاگ رہا تھا۔ فنشنگ (اختتامی فیتے) سے تین سو گز دور وہ پہلی مرتبہ گرا۔ اس موقع پر ٹائمز کے رپورٹر کا تبصرہ تھا۔ ''یہ تصور ہی غیرانسانی تھا کہ وہ کسی سہارے یا مدد کے بغیر ریس جاری رکھ سکے گا۔'' تاہم پیڑی کسی نہ کسی طرح کھڑا ہوگیا اور اختتامی فیتے کی طرف بڑھنے سے اور اسے کراس کرنے سے پہلے مزید تین مرتبہ زمین بوس ہوا۔ آخری چند قدم اس نے آفیشلز کے سہارے طے کیے۔ اس کے پیچھے ہیس نامی ایتھلیٹ تھا۔

پیڑی ایگزاسٹ ہوچکا تھا۔ تاہم اس نے بدترین حالت میں ہمت اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کے عزم و ہمت نے دنیا کے دل جیت لیے۔ البتہ امریکیوں نے آخری لمحات میں پیڑی کو ملنے والی بیرونی سپورٹ پر احتجاج کیا۔ قاعدے قوانین کے تحت پیڑی کو ڈس کوالیفائی کرنا پڑا جب کہ وہ آخری لمحوں میں بھی ہیس

سے ایک منٹ آگے تھا۔ گولڈ میڈل ٹیس کے حصے میں آیا لیکن عوامی حمایت اور پڑی کے ہیروازم سے متاثر ہوئے۔ اگلے روز شام میں شہزادی الیگزینڈرا نے پڑی کو اسپیشل گولڈ کپ دیا۔ جو اس کی سپر ہیومن ایفرٹ کا اعتراف تھا۔

چمپئن بننے کا اس کا خواب محض چونسٹھ دن تک قائم رہا۔ ''شاک'' یہ وہ لفظ تھا جو مڈل ویٹ کی ٹائیٹل فائٹ کے لیے دنیا بھر میں بکثرت استعمال ہوا۔ شوگر رے رابنسن، آل ٹائم، پاؤنڈ، فار، پاؤنڈ (پاؤنڈ، فار پاؤنڈ، رینکنگ ہے، جو مکسڈ مارشل آرٹس میں بھی استعمال ہوتی ہے) وہ بیسٹ باکسر شمار ہوتا تھا۔ رنگ سے نکلنے کے بعد بھی اس کی شہرت پچاس برس تک ماند نہیں پڑی۔ اس کی فائٹنگ کا دور 1965-1940ء تک رہا۔ ویلٹر ویٹ اور مڈل ویٹ میں رابنسن کے اسٹائل اور پرفارمنس نے اسپورٹس رائٹر کو مجبور کیا وہ رابنسن کو ''پاؤنڈ، ٹو پاؤنڈ'' کی رینکنگ کی شناخت دیں۔ اس کے علاوہ رابنسن کو انٹرنیشنل باکسنگ ہال آف فیم میں شامل کیا گیا۔ 2002ء میں رابنسن ''دی رنگ'' میگزین کی لسٹ پر تھا۔ عنوان تھا ''گزشتہ اسی برس کے بہترین فائٹرز'' رابنسن کی وفات 1989ء میں ہوئی تھی۔ ہال آف فیم میں اسے 1990ء میں اور رنگ میگزین میں 2002ء میں شامل کیا گیا۔

اب آیئے پہلی سطر کی جانب......! انگریزی کی پہلی سطر میں پہلا لفظ شاک ہے۔ 51-1946ء تک ویلٹر ویٹ ٹائیٹل رابنسن کے پاس تھا۔ 58-1951ء کے دوران اس نے پانچ مرتبہ عالمی مڈل ویٹ ٹائیٹل حاصل کیا۔ اس دور میں اس کی شہرت اور کھیل عروج پر تھا۔ جب سے اس نے پیشہ ور فائٹس کا آغاز کیا تھا شکست کا ذائقہ صرف ایک مرتبہ چکھا تھا۔ وہ فتوحات کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ کل 200 فائٹس میں سے اس نے 108 ناک آؤٹ کیے تھے صرف تیرہ فائٹس ہاری تھیں۔

لیکن یہاں ٹرپن سے فائٹ کا احوال نہ بتانا تشنگی کا سبب بنے گا اس لیے اس میچ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تمام تر شائقین رابنسن کے حق میں تھے۔ کوئی ٹرپن کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ شرط کے اعداد ٹرپن کے خلاف 1-20 تھے لیکن رابنسن ٹرپن کو سنجیدہ لے رہا تھا۔ رابنسن نے خود نوشت حیات میں لکھا۔ میں ٹرپن سے متاثر تھا۔ اس کا بدن بلوط کے درخت کی مانند تھا اگر وہ کچھ زیادہ کوشش کر گیا تو میں مشکل میں پڑ جاتا اور یہی ہوا۔ ٹرپن کے ریکارڈ میں 41 پیشہ ور فتوحات تھیں اور وہ رابنسن کے خدشے کے مطابق کوشش کر گیا۔ رابنسن مشکل میں پڑ گیا۔ دوسرے راؤنڈ میں ٹرپن کے لیفٹ ہک نے رابنسن نے کو سہارا ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ٹرپن رنگ سے فاتح بن کے نکلے گا۔

تیسرا راؤنڈ، چوتھا، پانچواں بھی دلچسپ رہا۔ دیکھنے والوں کے پیسے وصول ہو رہے تھے۔ رابنسن پورے پندرہ راؤنڈ تک گیا۔ فیصلہ متفقہ تھا۔ بلاشبہ اسپورٹس کی تاریخ میں ایک اور یادگار اپ سیٹ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ٹرپن، برطانیہ کی جانب سے صدی کا پہلا عالمی مڈل ویٹ چمپئن بن گیا تھا۔ اس کے لیے وہ ایک ناقابل فراموش رات تھی۔ اس کے بچپن کا سپنا شرمندہ تعبیر ہو گیا تھا۔ سپنے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اسے شوگر رے رابنسن جیسے نامور باکسر کو شکست دینی پڑی تھی۔ بدقسمتی سے ٹرپن کی حکومت نیویارک پولو گراؤنڈ میں 64 دن بعد اختتام پذیر ہوگئی۔

یہ ایسا دھچکا ثابت ہوا کہ اس کا کیریئر زوال پذیر ہوتا ہوا خودکشی کی نذر ہو گیا۔

مئی سے 1956ء کے اواخر تک آسٹریلیا کے لیے جم لیکر کی جھلک کسی بھوت سے کم نہیں تھی۔ آسٹریلیا، انگلینڈ کے ٹور پر تھا۔ جم لیکر، مرے کاؤنٹی کی طرف سے آسٹریلیا کے خلاف کھیل رہا تھا۔ لیکر نے 88 رنز کے عوض آسٹریلیا کی دس وکٹیں پھول کی پتیوں کی مانند بکھیر دیں۔ 44 برس میں سرے پہلی کاؤنٹی تھی جس نے آسٹریلیا کو شکست کے ذائقے سے آشنا کیا۔ مزید یہ کہ 78 برس کے طویل عرصے میں لیکر پہلا باؤلر بن گیا جس نے آسٹریلیا کے خلاف ایک ہی اننگ میں دس وکٹیں سمیٹ لیں۔ دو مہینے بعد اس نے یہ کارنامہ پھر دہرایا۔ اس مرتبہ اس نے دس وکٹیں ہیٹ میچ کی اننگ میں حاصل کی تھیں۔ مجموعی طور پر ٹیسٹ سیریز میں فقط 9.6 کی اوسط سے 46 وکٹیں اپنے نام کیں۔ تاہم اولڈ ٹریفورڈ کے چوتھے میچ میں اگر انگلینڈ فتح گر ثابت نہ ہوتا تو جم لیکر کی غیر معمولی کارکردگی دھندلا جاتی۔ اولڈ ٹریفورڈ میں انگلینڈ کی فتح کے بعد سیریز جیتنا آسٹریلیا کے لیے ناممکن ہو جاتا۔

انگلینڈ نے پہلی اننگ میں 459 رنز سے دشوار اسکور کی بنیاد رکھ دی۔ جواب میں آسٹریلیا 48 رنز پر کھیل رہا تھا کہ لیکر نے دو وکٹیں گرا دیں۔ تیسری وکٹ ٹونی لاک نے لی۔ اس کے بعد جم لیکر نے تاریخ رقم کرنا شروع کی۔ لیکر

کے سامنے مہمان ٹیم کی وکٹیں خزاں رسیدہ پتوں کی مانند جھڑ رہی تھیں۔ لیکر نے باقی ماندہ سات وکٹیں محض بائیس گیندوں پر آٹھ رنز دے کر جھولی میں بھرلیں۔ آسٹریلیا کی پہلی اننگ چوراسی رنز پر تمام ہوگئی۔ لیکر نے 37 رنز دے کر نو وکٹیں گرائیں۔

اندھیرے میں امید کی کرن جھلملا رہی تھی۔ کسی طرح میچ ڈرا کر کے سیریز بچائی جائے۔ آسٹریلیا نے دوسری اننگ شروع کی۔ خراب موسم کی وجہ سے دو دن ضائع ہو گئے۔ اُمید کی کرن مزید روشن ہوگئی لیکن ایک بار پھر لیکر کا بھوت سامنے تھا۔ جو بے رحمی سے وکٹ پر وکٹ گرا رہا تھا۔ دو سو پانچ پر پوری ٹیم دس وکٹیں گنوا کر پویلین میں آرام کررہی تھی۔ جب کہ میچ کا وقت ختم ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔ جم لیکر ٹیسٹ میچ کی تاریخ کا پہلا باؤلر تھا جس نے تمام دس وکٹیں حاصل کیں۔ دونوں اننگز میں اس نے نوّے رنز دے کر انیس وکٹیں گرائیں۔ یہ ایک حیران کن کارنامہ تھا۔ دوسرے دن کے اخبارات میں لیکر کا کارنامہ نمایاں تھا۔ سرخیوں میں ایک سرخی تھی۔ ''جے سی لیکر نے آسٹریلیا کو ایک اننگ اور 170 رنز سے شکست فاش دی۔''

اب ایک فٹ بال میچ کا تذکرہ بھی ہو جائے جسے تاریخ ساز میچ کہا جاسکتا ہے۔

انگلش ہسٹری کی سب سے معروف تاریخ 1066 کے سال میں ہے، جب آخری انگریز بادشاہ اپنے تاج سے دستبردار ہوا۔ دوسری معروف ترین تاریخ ٹھیک نو سو سال بعد آتی ہے۔ 1966 ایک عہد ساز دن کا آغاز ہوتا ہے۔ رزم گاہ سجتی ہے۔ فٹ بال کے دیوانے ٹکراتے ہیں۔ ملین، بلین نگاہیں میدان پر ہیں۔ اس وقت جرمنی کو ہرانا گویا جوئے شیر کا لانا ہے۔ انگریز قوم کی شناخت اور فخر کا تعین فٹ بال کے میدان میں میچ کے نتیجے سے ہوگا۔ بوبی مور، پہلا انگریز کپتان بننے جارہا ہے۔ جولز ریمٹ ٹرافی اٹھانے والا وہ اوّلین انگریز کپتان ہے۔ جولیس ری مٹ میچ ورلڈ کپ کا فائنل ہے۔

ماہرین، منیجر الف رمسے کی ٹیم سلیکشن اور حکمت عملی پر سوالیہ نشان اٹھا رہے ہیں۔ تیرہ منٹ بعد یوں لگتا ہے کہ ناقدین کے سوال ٹھیک تھے۔ جب ہلمٹ ہالر جرمنی کی طرف سے گول کرتا ہے لیکن چھ منٹ بعد ہی جیوف ہرسٹ گول کر کے اسکور برابر کردیتا ہے۔ کھیل ختم ہونے میں بارہ منٹ رہ جاتے ہیں۔ اسکور 1-1 سے برابر ہے۔ سنڈے ٹائمز اپنے تبصرے میں ہرسٹ کو انگلینڈ کا اصل ہتھیار قرار دیتے ہو لکھتا ہے۔ ''ہو ہرسٹ ہے لیکن اس کا سر نہیں بوٹ کام ک ہے۔'' انگریزی الفاظ ہیں: was his boot, not his head.

ہرسٹ کے شاٹ کو جرمنی کا ہارسٹ روکنے کی کوش کرتا ہے اور بال مارٹن پیٹرز کی جانب نکل جاتی ہے۔ مارٹن، جرمن کیپر ٹلکوسکی کو جھانسا دے کر اسکور انگلینڈ کے ح میں 2-1 کردیتا ہے۔ شوروغل میں کان پڑی آواز سنا نہیں دے رہی ہے۔ الف رمسے اپنی ٹیم کو اشارا کرتا ہے ک جب تک فائنل وسل نہیں بجتی وہ یہ نہ سمجھیں کہ جرمنی ہار ہے۔ جرمنی کے تابڑتوڑ حملے جاری تھے۔ میچ ختم ہونے چند لمحے قبل وولف گینگ ویبر نے گول کردیا۔ میچ برابر ہو گیا۔ نتیجہ برآمد کرنے کے لیے ایکسٹرا ٹائم دیا گیا۔ دس منٹ گزرے تھے کہ ہرسٹ نے ایک بار پھر مہلک وار کیا۔ گیند جرمن گول پوسٹ کی اوپری باڑ سے ٹکرا کے واپس نیچے سف لکیر پر گری۔ اسٹیڈیم کھڑا ہوگیا۔ بہت معمولی فرق تھا۔ گیند لے کے اندر گری تھی یا باہر یا لکیر سے ٹکرائی تھی۔

بہرحال ریفری نے گول ڈیکلیئر کردیا۔ جرمنی ک طرف سے زبردست احتجاج ہوا۔ جرمنی کھلاڑی ریفری ک گرد جمع ہوگئے۔ ریفری نے فیصلہ تبدیل کرنے سے انک کردیا اور ہرسٹ کی تباہ کن کاوش ''گھوسٹ گول'' کے نا سے مشہور ہوئی۔ انگلینڈ کی جانب سے چوتھا گول بھی ہرسٹ نے کیا۔ ایک گول مارٹن پیٹرز نے کیا تھا۔ یوں ہرسٹ، فٹ بال ورلڈ کپ فائنل میں ہیٹ ٹرک کرنے والا پہلا کھلاڑ بن گیا۔

اب کچھ باتیں ٹینس پر بھی ہوجائیں۔

جب ورجینیا ویڈ کی فیملی جنوبی افریقا سے انگلین واپس آئی تو اس کا پہلا گھر ومبلڈن (ڈسٹرکٹ) تھا۔ و پہلی مرتبہ ومبلڈن ٹینس کلب گئی تو اسکول گرل تھی۔ ورجین ویڈ ایس اولین وزٹ سے پہلے ہی سینٹر کورٹ کے سحر می گرفتار تھی۔ ویڈ کو جب پہلی مرتبہ کلب میں کھیلنے کا موقع مل اس وقت بھی وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھ کہ وہ کبھی وہاں چیمپئن شپ نہیں جیت سکتی۔ اس کا عشق چیمپئن بننے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے اپنے الفاظ تھے ''میں ومبلڈن ٹینس کی پوجا کرتی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا ک وہاں میں کچھ کرسکوں گی جہاں ماضی وحال کے سپر اسٹارز ک افسانوی شہرت کا راج تھا۔''

یہ بھی اتفاق تھا کہ 1977ء میں ومبلڈن چیمپئن
ب کا سوال (100) موقع تھا اور برطانوی ملکہ کی سلور
بلی بھی تھی۔ حب الوطنی کی لہر موجیں مار رہی تھی۔ ورجینیا
یڈ، 16 ویں مرتبہ ٹائٹل حاصل کرنے کی کوشش کر رہی
ی۔ یاد رہے کہ ومبلڈن ٹائٹل سب سے قدیم اور دیگر
س ٹائیلو کے مقابلے میں سب سے گراں قدر سمجھا جاتا
ہے۔ ویڈ اکتیس برس کی ہو چکی تھی۔ ہر کوئی آگاہ تھا کہ یہ اس
ی آخری کوشش ہے۔ وہ برطانوی شہری تھی۔ ملکہ کی سلور
بلی تھی۔ ایونٹ کے سو برس مکمل ہو رہے تھے۔ 1962ء
ے بعد 1977ء کے فائنل میں ملکہ کی آمد متوقع تھی۔ قوم
ی خواہش تھی کہ ورجینیا ویڈ ٹائٹل حاصل کرے اور خود
مبلڈن ٹائٹل ویڈ کا خواب تھا (اگرچہ وہ ماضی میں بڑے
ے مختلف ٹائیلو میں فتح مند رہی تھی)۔

ویڈ یسی فائنل تک پہنچی تو مدمقابل کرس ریورٹ جیسی
ھلاڑی تھی۔ گھمسان کا رن پڑا اور ورجینیا ویڈ اسے شکست
ے کر فائنل تک جا پہنچی۔ کرس ریورٹ اس وقت ومبلڈن
مپئن تھی۔ فائنل میں آخری رکاوٹ ڈچ چیمپئن بیٹی اسٹو کی
نل میں سامنے تھی اور برطانوی ملکہ فائنل دیکھنے آرہی تھی،
سنی تھی، ہیجان تھا، تاریخی لمحات تھے۔ ویڈ گزشتہ پندرہ
واقع پر ومبلڈن میں ناکام ہوئی تھی۔

پہلا سیٹ بیٹی اسٹو نے 4-6 سے جیت لیا۔ یوں لگا
لہ پریوں کی کہانی جیسی کوئی انوکھی بات نہیں ہونے والی
یکن دوسرا سیٹ ویڈ نے 3-3 سے برابر کرنے کے بعد
6- سے دوسرا سیٹ جیتا تھا۔ کھیل نازک موڑ پر آگیا تھا۔
سرے سیٹ میں ویڈ 0-4 سے لیڈ کر رہی تھی۔ جب ایک
یم میں اسٹو نے فتح حاصل کی۔ تاہم وہ فائٹ بیک کرنے
ں ناکام رہی۔ وہ گیم بھی واحد تھا جو اسٹو نے فائنل سیٹ میں
اصل کیا تھا۔ فائنل سیٹ کا اسکور ویڈ کے حق میں 1-6 رہا۔

وہ ورجینیا ویڈ کی شام تھی۔ اسکول کی بچی نے
مبلڈن میں جو خواب دیکھا تھا، وہ اکتیس سال کی عمر میں
رمندۂ تعبیر ہوگیا، ویڈ کی فتح نے ملکہ کی سلور جوبلی کو دھندلا
یا۔ ویڈا نے ٹرافی سر سے بلند کی، اس کے چہرے پر
سکراہٹ تھی۔

سینٹر کورٹ پر سپر اسٹارز کی شہرت میں ایک اور نام
شامل ہوگیا تھا، ورجینیا ویڈ۔

پیرا کی بھی ایک مقبول کھیل ہے اس لیے اسے بھی
شامل کیا گیا ہے۔

جنوبی افریقا کی "نہائی ڈوٹوئٹ" نے پیرا کی میں دو
عالمی گولڈ میڈل حاصل کیے اور 2002ء کے کامن ویلتھ
گیمز میں دو عالمی ورلڈ ریکارڈ پاش پاش کر دیے۔ یہ ایونٹ
مانچسٹر میں منعقد ہوا تھا لیکن نٹالی کے گولڈ میڈلز سے زیادہ
حیران کن واقعہ وہ تھا جب اس نے 800 میٹر کے فائنل
میں آٹھویں پوزیشن حاصل کی۔ قاری الجھن میں ہوں گے
کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی، کون سی انہونی تھی۔ بات یہ ہے کہ
2001ء میں اسکوٹر کے حادثے میں نٹالی کی ایک ٹانگ
گھٹنے سے نیچے کاٹ دی گئی تھی۔ پانی میں 800 میٹر کی
ریس میں وہ پہلی کھلاڑی تھی جو اس کے باوجود فائنل میں
پہنچی اور آٹھویں پوزیشن حاصل کی۔ وہ ایونٹ فٹ
کھلاڑیوں کا تھا جب کہ اس کی ایک ہی ٹانگ تھی۔ انسانی
جذبے ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

نٹالی 1998ء میں جنوبی افریقا سے کوالالمپور آئی تو
پیرا کی میں اس کے سامنے روشن مستقبل جگمگا رہا تھا۔ نئے
کھلاڑیوں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔
فروری 2001ء میں ٹانگ کٹنے کے بعد اس کے پائے
استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ 2002ء کے کامن
ویلتھ گیمز میں مقابلے کے لیے اس کی آرزو جوان تھی۔
حادثے کے اٹھارہ مہینے کے اندر اندر انیس جولائی
2002ء میں اس نے ملٹی ڈس ایبلٹی، پچاس میٹر میں
ریکارڈ ٹائم کے ساتھ گولڈ میڈل لیا۔ دو دن بعد ملٹی ڈس
ایبلٹی کے 100 میٹر ایونٹ میں گولڈ حاصل کرتے ہوئے
نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ 2 اگست کو وہ غیر معذور کھلاڑیوں
کے ساتھ پول میں تھی۔ فائنل ایونٹ تھا۔ فاصلہ 800 میٹر،
نٹالی نے دس میں سے آٹھویں پوزیشن حاصل کی۔ اس کا
بہترین ٹائم 13.57 سیکنڈ تھا۔ دو دن بعد متفقہ طور پر وہ
پیرا کی کی غیر معمولی کھلاڑی قرار پائی۔

نٹالی لکھتی ہے۔ "میں نے خود کو ہمیشہ یہی سمجھا جیسے
میں حادثے سے پہلے تھی۔ فطرتاً میری خواہش تھی کہ میری
ٹانگ مجھے واپس مل جائے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ مجھے اس کے
بغیر ہی آگے بڑھنا تھا۔"

اولمپک میں پنٹاتھلون سے مراد پانچ مختلف ایونٹس
ہوتے ہیں۔ پنٹاتھلون نہایت مہارت اور سخت کوشش کا
متقاضی کھیل ہے۔ قدیم اولمپک میں لانگ جمپ، جیولین
تھرو، ڈسکس تھرو، شارٹ فٹ ریس اور ریسلنگ شامل
تھے۔

جدید اولمپک میں ماڈرن پنٹاتھلون میں شوٹنگ، سوئمنگ، فینسنگ، شہ سواری اور ریسلنگ شامل ہیں۔ ویمن پنٹاتھلون میں خواتین کھلاڑیوں کو گولڈ میڈل حاصل کرنے کے لیے درج ذیل پانچ کھیل میں برتری ثابت کرنی پڑتی ہے، ہرڈل ریس (100 میٹر)، ہائی جمپ، لانگ جمپ، شاٹ پٹ اور 200 میٹر کی ریس۔ مزید تفصیل اضافی معلوم ہوتی ہے۔ میری پیٹرز کی طرف آتے ہیں۔ 1972ء کے اولمپک مقابلوں میں ٹریک اینڈ فیلڈ کے میدان میں برطانیہ نے واحد گولڈ میڈل پنٹاتھلون کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ فتح یاب میری پیٹرز تھی۔ اس کے ارادے بلند تھے۔ اس کا تعلق شمالی آئر لینڈ سے تھا۔ 1964ء کے ٹوکیو گیمز میں وہ چوتھے نمبر پر آئی، جہاں برطانیہ ہی کی میری رینڈ نے چاندی کا تمغہ جیتا تھا لیکن 1968ء کے میکسیکو گیمز میں چار سال بعد یوں لگا کہ میری پیٹرز کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ میکسیکو میں وہ نویں نمبر پر آئی تھی۔

چار سال بعد میونخ، جرمنی میں پنٹاتھلون گولڈ کے لیے جرمن کھلاڑی ہیڈی روزنڈہال فیورٹ تھی جو ہوم گراؤنڈ پر پرفارم کرنے جا رہی تھی۔

جرمن کھلاڑی پانچوں کھیلوں کی اسپیشلسٹ تھی اسے جرمن دودھاری ہتھیار کہتے تھے۔ میری پیٹرز کے لیے یہ پہاڑ جیسا چیلنج تھا۔ مقابلے کے آغاز میں ہی وہ جوش اور عزم سے لبریز تھی۔ اس کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ پوائنٹس اسکور کرتے ہوئے اس نے اسٹائلش انداز میں روزنڈہال پر سبقت حاصل کرنا شروع کی۔ میری پیٹرز کے انگ انگ میں بجلی بھر گئی تھی۔ دونوں کے درمیان مقابلہ آخری مرحلے پر لٹک گیا۔ یہ مرحلہ تھا دو سو میٹرز کی ریس۔ صورت حال انتہائی سنسنی خیز اور نازک تھی۔ میری کو گولڈ میڈل حاصل کرنے کے لیے پوائنٹس اور سیکنڈوں پر انحصار کرنا تھا۔ میری فائنل ایونٹ ہار کے بھی جیت سکتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ روزنڈہال کے مقابلے میں فنشنگ لائن ایک اعشاریہ دو سیکنڈ کے اندر کراس کرے۔ جب کہ مشرقی جرمنی کی کھلاڑی برگ لنٹی کے خلاف صفر اعشاریہ چار (0.4) کے اندر اندر فنشنگ لائن عبور کرے۔ روزنڈہال ریس جیت چکی تھی۔ میری کے لیے اعصاب شکن مرحلہ تھا۔ اس نے جان لڑا دی۔ عالمی تناؤ میں اس بات کا انتظار تھا کہ

پاکستان میں پہنچنے والا ادب بھی اس عالمی فکری محاذ آرائی کے پس منظر میں پروان چڑھا جس نے دنیا کو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی تصورات و نظریات میں تقسیم کیا۔ ایک طرف مغرب نے سرمایہ دارانہ نظام کا علم اٹھایا تو روس اور بعد میں چین نے اشتراکیت کا نعرہ مستانہ بلند کیا۔ یہی تقسیم سیاسی اور ادبی سطحوں پر پاکستان میں بھی دیکھنے میں آئی، بلکہ پاکستان میں تو ان نظریات کی باہمی کشمکش نے کفر اور اسلام کی جنگ کا درجہ پایا۔ اس حوالے سے انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ مغرب کی دائیں بازو اور بائیں بازو کی سیاسی اصطلاحات کا تعین بھی قرآن و حدیث کے حوالے سے کیا گیا۔ پاکستان میں ان اصطلاحات کو قرآن کے دائیں اور بائیں ہاتھ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا میں بائیں بازو کا فکر تبدیلی، حرکت اور مظلوم طبقات کا حامی مقصود ہوتا ہے اور یہ بھی کوئی لازم نہیں کہ بائیں بازو کی جماعت کا مارکسزم یا لینن ازم کے ساتھ واقعی کوئی بنیادی یا براہ راست تعلق ہو۔ اس کے برعکس دائیں بازو کو روایت پسندی اور سرمائے کے غلبے کو برداشت کرنے والا فکر قرار دیا جاتا ہے۔

(دائیں اور بائیں بازو کی سیاست از پروفیسر وارث میر)

میری کتنا وقت لیتی ہے؟ قارئین کے ذہن میں رہے کہ میری کی عمر 33 برس تھی۔ وہ بخوبی آگاہ اور پُرعزم تھی کہ گولڈ میڈل کے بغیر گھر نہیں جائے گی۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی۔ وہ ہم وطنوں کو ٹریک اینڈ فیلڈ کا واحد گولڈ میڈل دینے کی آرزومند تھی۔ دو سو میٹر سے پہلے ہائی جمپ کا مقابلہ تھا اور اس سے پہلے کے مقابلوں میں وہ تین سو پوائنٹ لیڈ حاصل کر چکی تھی۔ اس کے اصل مدمقابل روزنڈہال اور برگ لنڈی پولاک تھیں۔ ہائی جمپ کا عالمی ریکارڈ روزنڈہال کے پاس تھا۔ 6.83 ہائی جمپ اور دو سو میٹرز میں روزنڈہال نہایت مضبوط تھی۔ دونوں مقابلوں سے پہلے میری ٹھیک طرح سو نہ سکی۔ دونوں میں وہ روزنڈہال سے کمزور تھی۔ ہائی جمپ میں میری چھ میٹرز سے اوپر نہ جا سکی اس کی لیڈ دفعتاً سکڑ کے 47 پوائنٹ رہ گئی۔ فائنل ایونٹ 200 میٹرز روزنڈہال نے جیت لیا تھا۔ آغاز میں میری اس کے شانہ بشانہ تھی۔ وہ زندگی میں کبھی اتنا تیز نہیں دوڑی تھی۔ تاہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ بی بی سی

...منٹیٹر چلا رہا تھا۔ ''کم آن، میری تمہیں اپنی زندگی کے لیے ...نا ہے۔'' آخری 80 میٹر کے لیے روز نٹز ہال نے رفتار ...ھائی اور فاصلہ 22.96 میں طے کیا۔ میری نے توانائی کا ...ر ذرہ سمیٹا اور آخری دس میٹر 1.12 سیکنڈ میں طے کیے۔ ...کھلاڑیوں کی نظریں اسکور بورڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ بورڈ پر ...تخمینہ ظاہر ہوا۔ میری نے کل 4.801 پوائنٹس حاصل کیے تھے۔ سیکنڈ کے دسویں حصے کے فرق سے وہ گولڈ میڈل لے ...ڑی۔ روز نٹز ہال سلور اور برگ لنڈی پولاک نے برانز میڈل حاصل کیا۔ اسی سال میری نے بی بی سی اسپورٹس ...پرسنالٹی آف دی ایئر ایوارڈ حاصل کیا۔

سولہویں صدی کی اسپورٹس ہسٹری میں محمد علی بہت ...وا نام تھا۔ علی 1966ء سے قبل کیریئر کا شاندار آغاز کر چکا تھا۔ 1966ء میں اس نے ویت نام وار کی مخالفت کی۔ اس کا باکسنگ لائسنس معطل ہو گیا اور پاسپورٹ لے لیا گیا۔ 1967-1970 میں وہ رنگ کی بجائے عدالت کے چکر لگا رہا تھا۔ اگست 1970ء میں اس کا کیس چل ہی رہا تھا جب اسے لائسنس واپس کر دیا گیا۔ وہ رنگ میں واپس آیا اور جیری کیوری کو تیسرے راؤنڈ میں شکست دی۔ بعدازاں بونا ...ینا کو شکست دے کر وہ جو فریزیئر کے سامنے کھڑا تھا۔ دو ...ناقابل شکست ہیوی ویٹ چیمپئن فائٹ نے بڑی شہرت پائی۔ اسے فائٹ آف دی سنچری کا نام دیا گیا۔ اسی فائٹ کی روداد خاص دلچسپ ہے لیکن ہمارا اصل موضوع ''رمبل ان دی جنگل'' ہے۔ اس لیے دیگر فائٹس کی تفصیل میں جانے سے احتراز ضروری ہے۔ جو فریزئر کے خلاف فائٹ آخری راؤنڈ تک گئی اور علی پوائنٹس پر ہار گیا۔ اس کے بعد دیگر فائٹس کے بعد وہ پھر جو فریزیئر کے مقابل تھا۔ اس مرتبہ علی فاتح بن کے نکلا۔

''رمبل ان دی جنگل'' باکسنگ ہسٹری کی گریٹسٹ اور غیر معمولی فائٹ تھی۔ پروموٹر ڈان کنگ اور زائر کا صدر موبوتو تھا۔ تاریخ تھی۔ تیس اکتوبر 1974ء۔ جارج فورمین کا عروج تھا۔ اس کے گھونسوں کی طاقت تاریخی تھی۔ وہ جو فریزیئر اور کین نارٹن کو دو دو راؤنڈز میں خاک چٹا چکا تھا۔

جو فریزیئر کو ہرانے کے بعد علی بمقابلہ فورمین کا اسٹیج تیار تھا۔ علی کو فیورٹ قرار دینے والے بھی شکوک وشبہات کا شکار تھے۔ علی کی عمر تیس سے اوپر تھی۔ فورمین سے لڑنا خودکشی کے مترادف تھا۔ فورمین نے آخری آٹھ فائٹس دو راؤنڈ کے اندر جیت لی تھیں اور جو فریزیئر سے ورلڈ ٹائیٹل بھی چھین لیا تھا۔

علی کا ڈنکا دنیا بھر میں ایسے ہی نہیں بجتا تھا۔ وہ عجیب چیز تھا۔ اس کے گھونسے، ٹانگیں، زبان ہر چیز بولتی تھی۔ اپنے اوپر اسے بے پناہ اعتماد تھا۔ بلا کی قوت برداشت تھا۔ ڈیوڈ فراسٹ نے علی کا انٹرویو کیا تو اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اگر تم سمجھتے ہو کہ دنیا کے لیے نکسن کا استعفیٰ بڑا حیران کن تھا تو آج میں دکھاؤں گا کہ حیرانگی کسے کہتے ہیں۔ میں مگرمچھ اور وہیل سے زور آزمائی کر چکا ہوں۔ میں رعد (rumble) کو ہتھکڑیاں ڈال کے جیل میں پھینک سکتا ہوں، میں چٹان کا مرڈر کر سکتا ہوں۔ میں نے پتھروں کو زخمی کیا ہے۔ اینٹوں کو اسپتال پہنچایا ہے، میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ میں ادویات کو بیمار کر دیتا ہوں۔''

محمد علی زائر میں بہت مقبول تھا۔ وہ جہاں جاتا، ہجوم نعرے زن ہوتا ''علی، اسے مار دو۔''

فائٹ کے دوران علی روایتی انداز میں رقص نہیں کر رہا تھا۔ وہ رسیوں پر ٹکا ہوا تھا جسے وہ ''روپ اے ڈوپ'' پالیسی کہتا تھا، اس کی زبان چل رہی تھی۔ فورمین ہارڈ ہٹر تھا اور علی اسے دعوت دے رہا تھا کہ وہ اپنی طاقت آزمائے۔ چہرہ علی نے بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً علی پنچ دکھاتا اور کبھی کارنر بدل دیتا۔ علی کا ٹرینر انجیلو ڈنڈی پریشانی کے عالم میں چلا رہا تھا۔ ''علی تم مارے جاؤ گے'' لیکن علی نے اپنا انداز نہیں بدلا۔ رنگ سائیڈ پر موجود رپوٹر جارج پلمپٹن شک میں پڑ گیا کہ فائٹ فکسڈ ہے۔

جارج فورمین کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا، نصف وقت گزر چکا تھا، فورمین کے انداز میں تھکاوٹ کا عنصر جھلکنے لگا۔ اس کے خوفناک پنچ علی پر اثر انداز ہونے میں ناکام ہو رہے تھے۔ علی نے ہاتھ کھولنے شروع کیے۔ پانچویں راؤنڈ میں علی نے فورمین کا ایک خوفناک پنچ جسم پر برداشت کیا، فورمین کو احساس ہوا کہ اس کا سامنا ایک مختلف باکسر سے ہے۔ بالآخر آٹھویں راؤنڈ میں علی کو موقع مل گیا، وہ رسیوں سے ہٹ گیا اور دائیں ہاتھ کے دو پنچ فورمین کے سر پر لگائے جس کے پیچھے بائیاں ہک تھا پھر آخری تباہ کن رائٹ پنچ۔ فورمین نے سنبھلنے کی ناکام کوشش کی لیکن ٹانگوں نے ساتھ نہیں دیا۔ فورمین نے کینوس کو چوما اور بروقت اٹھنے میں ناکام رہا۔ علی نے اپنا تاج واپس حاصل کر لیا تھا۔

مئی 1935ء کا دن۔ ایک ہی دن میں پانچ عالمی

ریکارڈ توڑنے کے بعد لگ رہا تھا کہ جیسی اوونز نامی سیاہ فام کھلاڑی اور اونچی پرواز کر سکتا ہے۔ یہ پرفارمنس ناقابل یقین تھی۔ یہ ریکارڈ اس عظیم کھلاڑی نے پینتالیس منٹ میں بنائے تھے۔ اس کارکردگی کی گرد کو چھونا ممکن نہیں تھا۔

لیکن اگست 1936ء برلن اولمپک جو ''نازی گیمز'' کہلائے۔ وہاں اوونز کسی اور موڈ میں تھا۔ سومیٹر کی کوارٹر فائنل میں اس نے ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔ ریکارڈ کو جرمن آفیشلز نے متنازعہ بنانے کی کوشش کی۔ فائنل میں تین اگست کو اس نے گولڈ میڈیل جیت لیا۔ اگست، اوونز نے دو سو میٹر کا ورلڈ اور اولمپک ریکارڈ پاش پاش کیا۔ نیز لانگ جمپ میں 26 فٹ پانچ انچ کے فاصلے کے ساتھ ایک اور گولڈ میڈل۔ یہ اولمپک ریکارڈ بھی تھا جو 1960ء تک قائم رہا۔ 5 اگست، دوسو میٹر میں گولڈ میڈل ورلڈ ریکارڈ 20.7 سیکنڈ، 6 اگست 100x4 امریکن ریلے ٹیم کا حصہ، ٹیم نے گولڈ میڈل حاصل کیا (ورلڈ ریکارڈ ٹائم 39.8 سیکنڈ)۔ یوں وہ دوسرا اولمپئن بن گیا جس نے ٹریک اینڈ فیلڈ میں چار گولڈ میڈیل حاصل کیے۔ یہ کارنامہ 1984ء تک قائم رہا جب تک کارل لیوس منظر عام پر نہیں آیا تھا۔

نازی پروپیگنڈا مشین اوونز کے خلاف تھی۔ اوونز نے چار دن میں نازی تھیوری کے بخیے ادھیڑ دیے کہ صرف آرین قوم سپر ہیں اوونز سپر ہیومن تھا۔ چار گولڈ میڈل، تین ورلڈ ریکارڈ برابر کیے اور چار اولمپک ریکارڈ۔ جب اوونز سے سوال کیا گیا کہ ہٹلر نے اسے مبارک باد نہیں دی۔ اوونز کا مبینہ جواب تھا۔ ''میں یہاں ہاتھ ملانے نہیں آیا تھا۔''

جیسے اوپر لکھا ہے اوونز نے 45 منٹس میں پانچ عالمی ریکارڈ توڑے تھے۔ وہ امریکن ٹریک اینڈ فیلڈ کا افسر۔ وہ اپنی فیلڈ کا عظیم ترین اور مقبول ترین کھلاڑی بھی تھا۔

اتنی کامیابی کے بعد بھی پریزیڈنٹ نے ہاتھ ملانے کے لیے اسے وہائٹ ہاؤس مدعو نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی سیاہ رنگت آڑے آ گئی تھی۔

ونٹر اسپورٹس۔ بولیرو

ہمارے لیے اسپورٹس کی یہ شکل یا لفظ اجنبی ہے۔ سراجیوو ونٹر اولمپکس میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ قارئین کو بولیرو سے متعارف کرایا جائے۔ بولیرو ون موومنٹ آرکیسٹرا کی شکل ہے جسے فرنچ میوزیشن نے کمپوز کیا تھا۔ اس میں اسٹائل اور حرکات کو نئی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ بیلے ڈانسنگ میں میوزک پر آرٹسٹک ڈانس کرتے ہوئے کسی کہانی، آئیڈیا یا تاثرات پیش کیے جاتے ہیں، بیلے میں جوڑی کا ہونا ضروری نہیں۔

بولیرو، برفانی سطح کے علاوہ گیت پر بھی کیا جاتا ہے۔ بولیرو کی مقبولیت ایک صدی سے اوپر چلی گئی ہے۔ بولیرو اور بیلے کی تفصیل زیادہ ہو جائے گی۔ راقم اولمپک کی طرف واپس آتا ہے۔

چودہ فروری 1986ء جین ٹورول اور کرسٹوفر ڈین، سراجیو (یوگوسلاویہ) میں برفانی ٹھوس میدان پر بولیرو (آئس ڈانسنگ) کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان کی بے مثال کارکردگی نے دنیا میں شائقین اور وہاں موجود ججز کے دل جیت لیے ہیں۔ برف کی سطح پر پھسلتے ہوئے انہوں نے بولیرو کی بے داغ تشریح کر کے ناظرین کو مجبور کر دیا کہ وہ کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ آرٹ اور ٹیکنیک کی شاندار کارکردگی جین اور ڈین کی جوڑی نے نو ججز سے پورے پوائنٹس لیے (یعنی چھ میں سے چھ)۔ براڈکاسٹر انجیلا رپن رطب اللسان تھی۔ ''وہ ایک ماسٹر پیس تھا۔'' حرکات، ردھم، رقص، کنٹرول، کوئی جھول، کوئی رخنہ نہیں۔ جھومنا، پھسلنا، گھومنا، لہرانا۔ چکرانا۔ بے مثال روانی۔ دونوں کے اجسام احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لیے زبان کے محتاج نہیں تھے۔ دونوں نے برف میں آگ لگا دی تھی۔ جسے دیکھے بغیر الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

بولیرو کو اولمپک اسپورٹس میں 1976ء میں شامل کیا گیا اور فوراً ہی رشین اسکیٹرز چھا گئے۔ انہوں نے 1976ء میں گولڈ اور سلور حاصل کیا۔ 1980ء میں گولڈ اور برانز جب کہ 1980ء میں جین اور کرسٹوفر نے پانچویں پوزیشن حاصل کی تھی۔ دونوں برطانوی شہری تھے۔ دونوں نے 1980ء کے بعد کامیابی و کامرانی کا ایک نیا سفر شروع کیا۔ 83-1981ء میں دونوں نے ورلڈ چمپئن شپ جیتی۔ 1984ء میں اولمپک پھر سر پر تھے۔ سراجیو میں دونوں نے تاریخی کامیابی حاصل کی۔ رشینز کو سلور اور برانز پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ کافی نہیں تھا۔ ان کی پیاس بجھی نہیں تھی۔ ایک ماہ بعد اوٹاوا ورلڈ چمپئن شپ میں انہوں نے 29 بار چھ میں سے چھ پوائنٹس لے کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اولمپک، یورپین اور عالمی مقابلوں میں وہ اپنے فن کا لوہا منوا چکے تھے۔

ڈینس ٹیلر 1985ء میں ایمبسی ورلڈ اسنوکر چمپئن شپ میں آیا۔ اسے ایک آفت رسیدہ، ناکام اور صلاحیت سے عاری کھلاڑی خیال کیا جا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی ایک فائنل

اور تین بھی فائنل ہار چکا تھا۔ مدمقابل دفاعی چمپئن اسٹیو ڈیوس جیسا قدآور کھلاڑی تھا۔ ڈیوس متواتر تیسری مرتبہ چمپئن بننے جارہا تھا۔ میچ کا آغاز ہوا۔ کسی کو حیرت نہ ہوئی جب ڈیوس نے اوپر تلے متواتر آٹھ فریم جیت لیے۔ میچ کے اختتام پر ڈینس ٹیلر نے کہا۔ ”میں سخت ندامت محسوس کررہا تھا۔ دھیان بی بی سی اور اسپانسرز کی طرف تھا۔ وہ لوگ بلاشبہ سوچ رہے ہوں گے کہ تاریخ کا بدترین فائنل کھیل جارہا ہے۔“

ہوا اس کے برعکس، فائنل تاریخ کا بہترین مقابلہ ثابت ہوا۔ نویں فریم میں ڈیوس نے اس کی سبز گیند مس کردی۔ نواں فریم ٹیلر نے جیت لیا۔ اس کا اعتماد بحال ہوا۔ سیشن کے اختتام پر اسکور ڈیوس کے حق میں 7-9 تھا، دوسرے روز ٹیلر نے گیم 11-11 سے برابر کیا۔ کشمکش جاری تھی۔ اسکور 13-13 ہوگیا۔ ایک بار پھر برابری کی بنیاد پر 15-15 میچ اختتامی مراحل کی طرف جارہا تھا اور سنسنی بڑھتی جارہی تھی۔ ڈیوس نے پھر دو فریم جیتے اور اسکور 15-17 کردیا۔ ڈیوس نے ایک فریم اور جیتنا تھا۔ دھڑکنیں بے قابو ہوگئیں۔ ٹیلر نے دباؤ کے اندر رہتے ہوئے زور لگایا۔ اسکور 17-17 ہوگیا۔ آخری فریم باقی تھا۔ سناٹا تھا۔ دیکھنے والے ٹینشن میں تھے۔ ڈیوس نے سبز گیند پاٹ کی تو ٹیبل پر کل بائیس پوائنٹس پڑے تھے۔ کرو یا مرو والی بات تھی۔ ٹیلر نے باقی تمام بالز پاٹ کرنی تھیں۔ دونوں کھلاڑی اعصاب زدہ تھے۔ ٹیلر نے براؤن پاٹ کی، پھر بلیو اور پنک۔ ٹیبل پر اٹھارہویں فریم کی اکلوتی سیاہ گیند پڑی تھی جس نے چمپئن کا فیصلہ کرنا تھا، حاضرین دم سادھے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ ٹیلر نے پاٹ کرنے کے لیے ڈبل استعمال کیا (جیسے کیرم بورڈ میں گوٹ براہ راست پاکٹ کرنے کی بجائے ری باؤنڈ کی کوشش کی جاتی۔ پوزیشن کے مطابق) ٹیلر نے سیاہ گیند مس کردی۔ ڈیوس کی باری تھی اور اس نے بھی گیند مس کردی۔ ڈراما عروج پر تھا۔ سنسنی ناقابل برداشت تھی۔ ٹیلر نے ایک بار پھر سیاہ گیند مس کردی۔ حاضرین پلک جھپکائے بغیر سیاہ گیند کو گھوررہے تھے۔ ڈیوس شاٹ کے لیے ٹیبل پر آیا۔ کامیاب کوشش اسے تیسری مرتبہ عالمی چمپئن بنا دیتی۔ ٹیلر میچ کو انتہائی حد تک لے آیا تھا۔ فائنل فریم کی آخری گیند۔ فائنل فریم کی ٹینشن اس وقت عروج پر تھی جب ٹیبل پر صرف رنگین گیندیں باقی رہ گئی تھیں۔ حاضرین اور کھلاڑیوں کی اعصابی وقلبی کیفیت کو پوری طرح قلمبند کرنا ممکن نہیں، پاکستان میں اسنوکر گزشتہ عشروں میں تیزی سے مقبول ہوا۔ فائنل فریم کا ڈراما سوا گھنٹے پر محیط تھا۔ کھلاڑی کبھی پانی کے گھونٹ لیتے اور کبھی تولیہ سے ہاتھ خشک کرتے۔ ڈیوس چمپئن تھا لیکن ٹیلر نے قطعی غیر یقینی کارنامہ انجام دیا تھا۔ لہٰذا تماش بین اسے کامیاب شاٹس پر تالیاں بجارہے تھے۔ رنگین گیندیں گرانے کے لیے کھلاڑی بہت سوچ سوچ کر کوشش کررہے تھے۔ گیند ہر مرتبہ پاٹ کرنے کے لیے نہیں کھیلی جاتی کیونکہ اکثر اوقات دونوں گیندیں ایسے زاویے پر ہوتی ہیں کہ پاٹ کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن قانون کے تحت کیو بال کے ذریعے مطلوبہ گیند کو ٹچ کرنا یا کھیلنا لازم ہوتا ہے۔ اس وقت کھلاڑی کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ شاٹ کھیل کے دونوں گیندوں کو پھر سے دشوار تر زاویے پر لائے۔ باری دوسرے کھلاڑی کو دے اور موقع کا انتظار کرے۔ ٹیلر نے پہلی مرتبہ سیاہ بال مس کی تو وہ ڈبل شاٹ کے ذریعے سینٹر میں پاٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ اب کیو بال اور سیاہ گیند ایسے زاویے پر تھیں کہ ڈیوس کے لیے پاٹ کرنا بہت رسکی تھا۔ وہ شاٹ کھیل کے بیٹھ گیا۔ خیر ایک بار پھر ٹیلر ٹیبل پر آیا اور ناکام رہا۔ ڈیوس نے چمپئن بننے کے لیے کیو سنبھالی اس کی نوک سے سفید گیند کو سیاہ گیند پر پھینکا۔ ٹیلر اور حاضرین کی سانسیں تھم گئیں۔ سیاہ گیند کو خالی ٹیبل پر پاٹ کرنا جوئے شیر بن چکا تھا۔ حیرت در حیرت، دونوں گیندیں یہاں وہاں ٹکرا کے ایسی لائن پر آئیں کہ سب سمجھ گئے کہ تاریخی ناقابل فراموش میچ ختم ہوگیا ہے۔ ڈیوس کا چہرہ اتر گیا۔ ٹیلر اٹھ کر ٹیبل پر آئے۔ اس کے تاثرات اعلان کررہے تھے کہ اس کا خواب پورا ہوگیا ہے۔ وہ کیو سنبھال کے جھکا، اسٹک سفید بال (کیو بال) کے ساتھ لگا کے سیاہ بال کا نشانہ لیا۔ اطمینان اور ارتکاز کے ساتھ ٹیلر نے کیو کے ذریعے سفید گیند کو ٹھوکر لگائی۔ گیند سیاہ بال سے ٹکرائی اور سیاہ گیند کارنر پاٹ میں جاگری۔

شور مچ گیا۔ تماشائی کھڑے ہوکر تالیاں بجارہے تھے۔ کیمرا مین کود پڑے۔ ڈینس ٹیلر پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے کیو اسٹک دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے سر سے بلند کرلی۔ راقم تاثرات بیان کرنے سے معذور ہے۔ ٹیلر نے ٹیبل پر آنے والی ٹرافی کو کس کیا۔ اسنوکر کے کھیل کا ناقابل فراموش باب ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ ہوگیا۔

آخری حصه

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

یه اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے که اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا که سفر نامه نگاری میں ایك نئے عہد کا اضافه کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو خشك تھے۔ سفر نامه پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجه رکھی ۔سفر نامے میں تاریخ و جغرافیه اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفر نامہ

وہ اپنی گاڑی سے ہنستی مسکراتی، لہکتی لہراتی ایسے میری جانب بڑھی کہ میں گھبرا گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں کے طریقے سے مبارک باد دے گی یعنی گلے لگے گی اور یہی ہوا اس نے اپنا پورا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کے نرم گرم بوجھ سے نہیں بلکہ بے اختیاری میں، میں نے گاڑی کا سہارا لے لیا۔ وہ بولی۔ ”گاڑی لے لی اور بتایا بھی نہیں۔ دوست تو ہر .... بات ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔“

بار بار مبارک دی تو میں نے جبراً اپنی ناک اس کے رخسار سے رگڑ کر جوابی کارروائی کی اور غیر محسوساتی انداز میں اسے علیحدہ کر دیا۔ شکریہ ادا کر کے دوستی کے ناطے اسے

بتایا کہ میری فیملی دس بارہ دن میں آرہی ہے۔ انہی کے لیے سارا انتظام کرتا پھر رہا ہوں پھر اسے فکرمندی سے کہا۔ ''اپارٹمنٹ کے لیے فرنیچر خریدنا ہے معلوم نہیں کہاں سے خریدوں؟''

وہ مسرت کا اظہار کر کے بولی۔ ''کینیڈی روڈ پر مسی ساگا میں فرنیچر کے بہت سے شوروم ہیں۔ ان دنوں وہاں سیل بھی لگی ہے۔'' پھر دوبارہ گلے سے لگ کر بولی۔ ''ویک اینڈ پر میں فارغ ہوں، کہو تو فرنیچر دیکھنے ایک ساتھ چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر گلے میں بانہیں ڈالے میرے جواب کے انتظار میں کھڑی رہی۔

اب کے میری جوابی کارروائی میں ہلکی سی شدت تھی تو وہ سرخ ہو کر خود پیچھے ہٹ گئی۔

دونوں اطراف سے ہمارے حملے اور جوابی حملے شاید جاری رہتے مگر اتنے میں منظر کی وین کسی آندھی اور طوفان کی طرح قریب... آ کر پارک ہوئی۔ اس کو اپنی گاڑی پہلے ہی دکھا چکا تھا مگر پھر بھی اس نے تازہ مبارک باد مجھ سے ہولے سے ہاتھ ملا کر اور کٹی کی طرح جپھی ڈال کر دی۔ اتنے میں دبی دبی اور پھنسی پھنسی ہنسی کی آواز کہیں سے سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو کچھ گاڑیوں کی اوٹ میں اختر شرم سے دُہرا ہو کر اپنی ہنسی ضبط کرنے کے مرحلوں میں تھا۔

کٹی نے جب یہ دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح پاکستانیوں نے اپنے ہی رنگ میں بھنگ ڈال دی ہے تو مجھے یہ کہتی ہوئی چلی گئی ''تم اندر آؤ تو لنچ روم میں بیٹھ کر پروگرام بناتے ہیں۔''

وہ تو یہ کہہ کر اندر چلی گئی مگر منظر اور اختر نے یہ پوچھ پوچھ کر میرے ناک میں دم کر دیا کہ کون سا پروگرام بنا رہے تھے؟ انہیں سچ بتایا تو بولے جھوٹ بول رہا ہوں۔ تنگ آ کر جھوٹ بولا کہ ڈنر کا پروگرام بنا رہے ہیں تو سچ مان کر بولے۔ ''اکیلے اکیلے جا رہے ہو؟''

کٹی کے ساتھ ویک اینڈ کا پروگرام میں شاید بنا ہی لیتا مگر مجھے نسرین کی جانب جانا تھا۔ اسے گاڑی کا نہیں بتایا تھا کیونکہ اسے سرپرائز دینا تھا۔

ویک اینڈ کو میری سیکیورٹی کی جاب بھی تھی۔ مجھے وہاں سے وارننگ مل چکی تھی کہ ہر دوسرے ویک اینڈ میں چھٹی کرنے لگا ہوں۔ مجھے وہاں کی سپروائزر نے بولا تھا کہ اگر آئندہ چھٹی کرنی ہو تو اپنی جگہ کسی دوسرے سیکیورٹی گارڈ کا نام دینا ہوگا جس کے پاس ویکن ہٹ سیکیورٹی کمپنی کا لائسنس ہو۔ ہم ہر بار تمہارے لیے کسی دوسرے کی منت نہیں کر سکتے کہ آ کر تمہاری شفٹ Cover کرے ورنہ ہم کوئی دوسرا گارڈ تمہاری جگہ رکھ لیں گے۔ مجھے یہ جاب ہرگز نہیں چھوڑنی تھی کیونکہ میرے اخراجات فیملی کے آنے سے بڑھنے والے تھے اس لیے میں نے مطیع اللہ سے بات کر کے اس کا نام اپنی جگہ دے دیا کہ اگلے چند ہفتے میری جگہ وہ کام کیا کرے گا۔

اگلے دو دن میں فیملی کی ایئر ٹکٹس کنفرم ہوئی تو اللہ کا شکر ادا کر کے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ ٹھیک بارہ دن بعد ہفتے کے روز بذریعہ پی آئی اے ٹورنٹو پہنچ رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ جمعہ کے دن نسرین سے مل کر اکیلا ہی مسی ساگا فرنیچر دیکھنے جاؤں گا۔ اسے اپنے ہمراہ گھر کی شاپنگ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میرا قیاس تھا کہ وہ مجھے گھر کے معاملات میں مصروفیت میں پا کر اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہ کرے اور نہ ذہنی انتشار کا شکار ہو۔

جمعہ کے دن تین بجے میں ہیمو سال سے نکلا تو سوچا کہ پہلے اپارٹمنٹ میں رک کر ذرا فریش ہو لوں اور بعد میں نسرین کی طرف جاؤں گا پھر ارادہ بدل کر اسٹیئرنگ اس کے گھر کی جانب موڑ دیا پھر بھی فون کر کے اپنے آنے کا بتا دیا۔ اس کے گھر جاتے ہوئے گاڑی میں ان راستوں سے لے آیا تھا جہاں بسیں نہیں چلتیں۔ چھوٹی چھوٹی سڑکیں جس کے دونوں جانب رہائشی آبادیاں تھیں۔ اسکول تھے، پارک تھے اور بے تحاشا درخت تھے۔ رہائشی علاقوں سے گزرتے ہوئے گاڑی کی رفتار آہستہ رکھنی ہوتی ہے اور آہستگی سے ڈرائیو کرتے ہوئے میں اردگرد کی خوب صورتی اور نفاست سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سڑک پر درختوں کا گھنا سایہ تھا۔ دونوں جانب کے بلند درخت اوپر جا کر آپس میں مل رہے تھے۔ کیسٹ پلیئر پر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا میرا پسندیدہ سرائیکی گانا چل رہا تھا۔

''سچا پئی کڈھیندی آں سجناں دا اے رومال۔ پتیاں نی ساوے رنگیاں تے پھل گلابی لال''

(اپنے سجن کے رومال پر میں کڑھائی کر رہی ہوں جس پر سبز پتے اور سرخ گلابی پھول ہیں)۔

رومانوی سرائیکی شاعری کو عطاء اللہ نے بہت خوب صورت دھن پر گایا ہے۔ پاکستان سے میں اپنے پسندیدہ گانوں کی ٹیپ ریکارڈز کروا کر لایا تھا۔ گاڑی پرانی تھی تو اس میں سی ڈی پلیئر نہ تھا۔ سال بدلتے رہے اور گاڑیاں

بدلتی رہیں۔ آٹھ سی ڈیز پلیئرز آئے، بلیوٹوتھ آیا اور سی ڈیز کا دور تمام ہوا... پھر موبائل فون پر ہزاروں گانے آئی ٹیون سے ڈاؤن لوڈ ہونے لگے مگر میرے پسندیدہ گانے کبھی بھی سو سے نہ بڑھ سکے۔ ہر سال پسندیدہ گانوں کی لسٹ میں دو تین گانے بڑھ جاتے ہیں۔ گائیکی، دھن اور شاعری کے علاوہ گانوں کی پسندیدگی کی ایک اور وجہ یادیں بھی ہوتی ہیں۔ کئی گانے اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے سنتا ہوں۔ کئی نغمے کچھ لمحوں سے جڑے ہوتے ہیں اور کئی لمحے کچھ نغموں کے باعث یادگار بن جاتے ہیں۔

نسرین کے اپارٹمنٹ پہنچا۔ باہر Visitors پارکنگ میں گاڑی لگائی اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ دروازہ اس نے کھولا تو دیکھا کہ گھر کے عام سادہ لباس میں صفائی کر رہی تھی۔ مجھے دروازے پر کھڑا دیکھ کر سٹپٹا گئی۔ بولی۔ ''ابھی تو فون کیا تھا اتنا جلدی کس طرح پہنچ گئے؟''

شلوار قمیص کو اس نے اپنا لیا تھا۔ لگتا تھا رات جو پہن کر سوئی تھی اسی میں پھر رہی ہے۔ صوفوں پر سامان بکھرا تھا۔ سعد کو گرمیوں کی چھٹیاں ملی ہوئی تھیں اور وہ ہمیشہ کی طرح نکھرا اجلا نہیں بلکہ ست سا صوفے پر بے زار بیٹھا تھا۔ اسے میرے جلدی آنے کی اُمید نہ تھی۔ ہمیشہ فون کر کے بسوں سے ڈیڑھ گھنٹے بعد پہنچتا تھا مگر آج آدھے گھنٹے میں اس کے دروازے پر موجود تھا۔ وہ اتنا گھبرائی کہ بیٹھنے کا بھی نہ پوچھا۔ میں مسکراتا ہوا سعد کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ گھبرائی اور شرمندہ کھڑی تھی کیونکہ میں عین گھر کی صفائی کے درمیان ہی اس کے سر پر موجود تھا۔

میں خاموش بیٹھا تھا اور وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''فون کہاں سے کیا تھا؟''

میں نے سعد کی جانب متوجہ ہو کر بے پروائی سے کہا۔

''جاب سے کیا تھا۔ فون پر نمبر تو آجاتا ہے۔ یہ اتنے سوالات کیوں کر رہی ہو؟''

میرے سوال کو نظر انداز کر کے صوفے پر میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیب لی ہے یا کسی نے رائیڈ دی ہے؟''

میں اس کی الجھی نظروں میں دیکھ کر بولا۔ ''اتنے سوال کرنے سے بہتر ہے تم آرام سے کام سمیٹ لو۔ کوئی اچھے کپڑے پہنو، ذرا خود کو سنوارو۔'' انگڑائی لے کر بولا۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

آنکھوں کی الجھن ہلکی شرمندگی میں بدلی۔ میں نے انہی آنکھوں میں مسکرا کر جھانکا اور بولا۔ ''اگر کام نمٹانے میں میری مدد چاہیے تو جھجکو نہیں۔ میں تو ہر وقت تمہارے لیے حاضر ہوں۔''

مسکراتے ہوئے اٹھی اور بولی۔ ''رہنے دو تمہارے فون کے بعد میں کھانا بنانے لگ گئی تھی۔'' صوفے پر پڑے کپڑے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تم اپنی جگہ، صوفے پر لیٹ جاؤ۔ میں صفائی سے فارغ ہو کر خود کو سنوارتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مسکرا کر اٹھ گئی۔

اس نے تکیہ اندر سے لا کر مجھے دیا۔ میں شوز اتارنے کے بعد اپنی ٹانگیں دراز کر کے صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ جلدی جلدی گھر کا کام مکمل کرنے لگی اور اسی دوران میں غنودگی میں چلا گیا۔

میں تب بیدار ہوا جب سعد کی آواز سنی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ماں اسے بیڈروم کے دروازے پر خاموش رہنے کی تنبیہ کر رہی تھی۔ گھر شیشے کی مانند چمک رہا تھا۔ نسرین خود تیار ہو کر اب بیٹے کو سنوار رہی تھی۔ گلابی شلوار قمیص پہنے وہ دل میں اتر رہی تھی۔ میں ہلکا سا اٹھ کر تکیے سے ٹیک لگائے اس کا اجلا روپ دیکھنے لگا۔

مجھے بیدار پا کر سعد نے ماں کو بتایا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں فنا کر دینے والے پیار کے علاوہ کچھ ڈر، خوف اور متعدد سوالات تھے۔ کچھ ایسا تھا جو اسے فاصلہ رکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اپنے تاثرات پر قابو پائے ہوئی مسکرا کر میری جانب آئی۔ فیملی کی امیگریشن پر بھرپور مبارک باد دینے کے بعد بولی۔ ''اپارٹمنٹ بھی مل گیا ہے۔ وہ لوگ کب آرہے ہیں؟''

یہ کہہ کر مجھ سے نظریں چرائے اپنے کھلے بال باندھنے لگی۔ میں نے دن بتانے سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ کہا۔

''انشاءاللہ دو ہفتوں میں آجائیں گے۔''

وہ میرے قریب صوفے پر آبیٹھی تو احترام میں اپنی ٹانگیں میں نے سمیٹ لیں۔ کارپٹ پر رکھے اپنے پاؤں پر نظر رکھتے ہوئے بولی۔ ''فیملی آرہی ہے تو تمہارے چہرے پر خوشی اور پیار بھی اتر آیا ہے۔''

میں اٹھ بیٹھا۔ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس اسے دیکھتا رہا۔ اس سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میری آنکھوں میں آئے پیار کو میری فیملی کی آمد سے جوڑ رہی تھی۔

فیملی کے آنے کی خوشی تو تھی مگر اس کے اجلے نکھرے حسن اور آنکھوں میں بسے خدشات اور کچھ سوالات نے ایک اداسی اس پر طاری کررکھی تھی۔ اس کا روپ اداسی کی چادر اوڑھے دمکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر میرے اندر رچی اس کے پیار کی موجیں اچانک کسی طوفان کی طرح سر اٹھانے لگیں۔ میرا وجود اس طلاطم کی وجہ سے بھٹنے لگا تھا۔ میری اندرونی کیفیت کو میرے چہرے اور آنکھوں نے عیاں کردیا۔ میں ایسے دیکھ رہا تھا اسے جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ آج خود پر ضبط مشکل تھا۔ سوچتا کہ اپنی انوکھی کیفیت کا اظہار کس طرح سے کروں کیونکہ وہ آج مجھ سے کترا کر بیٹھی تھی۔ آج پہلی بار اظہار کے لیے میری روح بے چین تھی۔ میں نے ہمت باندھی تو وہ ہمت ہارے بیٹھی تھی۔ اس پر چھائی اجنبی سی کیفیت مجھے کمزور کرگئی۔ ساتھ بیٹھ کر بھی بیگانی سی لگ رہی تھی۔ معلوم نہیں اس کے اندر کیا چل رہا تھا کہ وہ خفا سی، ناراض سی مگر اپنی اپنی لگ رہی تھی۔

جب اس نے آہستگی سے یہ کہا۔ ”فیملی آنے کے بعد تو تم ہم سے پل بھی نہ سکو گے۔“ تو میں اس کی حالت زار سمجھ گیا۔ میری فیملی کی آمد نے اسے اجنبی کردیا تھا۔ اس نے اپنے گرد کوئی ان دیکھی دیوار کھڑی کر لی تھی۔ ہمارے رویے اردگرد کے واقعات سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ اپنے پرخوف طاری کیے بیٹھی تھی۔ مجھے خوف کی یہ دیوار گرانی تھی۔ اس کا اعتماد اسے واپس لوٹانا تھا۔ اجنبیت کی چادر لے کر یقین کا سائبان اسے دینا تھا۔ اسے وہ نسرین بنانا تھا جو میرے سامنے صرف میری ہی تھی، آتے جاتے مسکراہٹوں سے نوازنے والی۔ میں سوچ رہا تھا کس طرح سے اسے اس کا غرور لوٹاؤں۔ کس طرح اسے یقین دلاؤں کہ اب میں وہ نہیں جو فرار کی راہ ڈھونڈا کرتا تھا۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہوں کہ یقین کی ڈور کسی عقیدے کی طرح ہوتی ہے۔ جتنی ریاضت کرواتی مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں اپنے چہرے پر انگلیاں ٹکائے سوچ رہا تھا کہ وہ بولی۔

”گھر کے لیے فرنیچر کا کیا سوچا؟ تمہیں سارا انتظام انہی دنوں میں کرنا ہے۔“ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی ٹھوڑی تلے ٹکائے میرے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”سنا ہے مسی ساگا میں فرنیچر سیل پر لگا ہوا ہے۔ وہیں جاکر دیکھنے کا ارادہ ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اکیلے جاؤ گے؟“ وہ بولی۔

جواب میں صرف اپنے کندھے اچکائے جس کا مطلب کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ دکھ بھرے انداز میں بولی۔ ”تمہاری فیملی آرہی ہے۔ اپنے معاملات میں میرا دخل شاید تم پسند نہیں کرو گے پھر بھی جہاں جہاں میری ضرورت محسوس کرو تو بتا دینا، تمہیں ذاتی معاملات میں مشورے دینے کا حق تو نہیں رکھتی مگر مجھے خوشی ہوگی جب یہ محسوس کروں گی کہ تمہارے فیملی کے معاملات سے میرا بھی کچھ تعلق ہے۔“

یہ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔ ہمارے تعلق کے کمزور ہونے کے خدشوں کے علاوہ وہ یہ بھی جانچ رہی تھی کہ میرا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ میں اندر سے مسکرا پڑا۔ اس کا یہ انداز مجھے بھا گیا۔

میں نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ ”گو اپنی فیملی کے معاملات سے تمہیں دور رکھنا چاہتا ہوں پھر بھی تم اصرار کرتی ہو تو ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ چلو۔“

تڑپ کر میری جانب شدت غم سے دیکھا اور کمزور لہجے میں بولی۔ ”نہیں تم نہیں چاہتے تو مجھے بھی تمہارے معاملات میں پڑنے کا شوق نہیں ہے۔“

بازو پکڑ کر جھٹکنے سے اس کا رخ اپنی جانب کیا اور دلگیر آواز میں بولا۔ ”ہو کیا گیا ہے تم کو۔ اس طرح تو کبھی تم نے مجھ سے بات نہ کی جو آج اتنے تکلف سے کررہی ہو۔ آج میں تمہارے لیے اتنا اجنبی کیسے بن گیا؟ میرا امتحان لے رہی ہو کہ اپنا؟“ اپنا دایاں ہاتھ اس کے رخسار پر رکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ”نسرین! مجھے بتاؤ کس بات کا تم کو ڈر ہے؟ تم کو اپنانے کا فیصلہ کرنے کا مطلب ہے کہ اپنی زندگی میں داخل کرچکا ہوں تم کو اور تم میرے معاملات میں مشورے دینے کی بھی اجازت مانگ رہی ہو؟ بولا۔ اتنے عرصے سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ وقت پاس نہیں کررہے تھے بلکہ ایک دوسرے کو وقت دے رہے تھے۔ کیوں سمجھتی ہو کہ میں تم سے فلرٹ کررہا تھا اور علیحدہ ہونے کا لمحہ آپہنچا۔ ایسا نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے تم مجھے فلرٹ نہیں سمجھتی مگر تم کو صرف ایک بار پھر یقین دہانی چاہیے تھی۔ مت مانگا کرو بار بار یہ یقین دہانیاں، یقین دہانیوں کے موڑ تو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ دھنیں تو بن چکیں، اب تو صرف ساز بجتے ہیں۔“ یہ بول کر میں مسکرایا تو اس کے ہونٹ بھی مسکرا اٹھے۔

اندر کمرے سے سعد کی آواز آئی تو وہ علیحدہ ہوگئی۔ میرے یہ سب الفاظ اسے کیا مجھ کو بھی تقویت دے گئے۔ وہ اٹھی اور مسکراتی ہوئی اندر سعد کے پاس چلی گئی۔

میں جب سے آیا تھا دیکھ رہا تھا کہ اس کے اندر بے اعتنائی سی آگئی ہے۔ اس بے اعتنائی میں گلے شکوے نہیں بلکہ وسوسے تھے۔ ڈر اور خوف چھپا تھا۔ کوئی دھڑکا تھا شاید جدا ہو جانے کا۔ خوف کا وار بڑا گہرا ہوتا ہے۔ بچھڑنے کا خوف لگ جائے تو بندہ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ مرنے کا خوف ہو تو کلمہ پڑھ لیتا ہے۔ لٹ جانے کا خوف ہو تو صبر کر لیتا ہے۔ وہ بھی یا تو وہم کا شکار ہو کر ہتھیار ڈال چکی تھی یا پھر صبر کی سِل سینے پر رکھ بیٹھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے اندر چھپی پیار کی چنگاری ایک شعلہ بن چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ایک بار اس کے دل میں مایوسی کی دراڑ آگئی تو بھرے گی نہیں بلکہ بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ اندر بیٹے کے پاس گئی تھی اور میں اپنے دونوں ہاتھوں میں احساس کی گرفت تھامے بیٹھا تھا۔

وہ واپس آئی تو سعد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مسی ساگا فرنیچر دیکھنے جانا ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''ابھی؟''

میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ابھی میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا جب تک تم ساتھ نہ ہو۔''

''کھانا تو کھا لو..... آئے اور سو گئے۔ نجانے کب سے کھانا نہیں کھایا۔''

واش روم کی جانب جاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ ''صرف چائے بنا دو کھانا بھی وہیں کہیں دیسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔''

☆......☆

اسے ابھی تک گاڑی کا نہیں بتایا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ سڑک پر آ کر بولی۔ ''مسی ساگا یہاں سے بہت دور ہے۔ بسوں سے تو بہت وقت لگ جائے گا۔''

گاڑی کی چابی میری پینٹ کی جیب میں تھی۔ چابی جیب سے نکال کر اپنی مٹھی میں بند کر کے سعد کو میں نے اٹھا لیا۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی میں چلیں گے تو ٹائم نہیں لگے گا۔'' یہ کہہ کر میں کار کی جانب بڑھا اور وہ حیرت سے اپنی جگہ کھڑی مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر سعد کو بٹھایا تو وہ بھی نظریں اٹھا کر حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی متحیر کھڑی تھی۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہنس کر بولا۔ ''کیوں منہ پھاڑے کھڑی ہو۔ جلدی سے بیٹھ جاؤ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

اب وہ اور سعد مل کر مجھ سے سوالات کرنے لگے۔ جب اس نے یقین کر لیا کہ یہ گاڑی میں نے خرید لی ہے تو بولی۔ ''پہلے کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے کیوں چھپایا؟ فون کر کے تو بتا سکتے تھے؟ کتنے کی خریدی؟ مجھ سے کچھ پیسے لے کر اچھی گاڑی خرید لیتے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران گاڑی کو میں ریورس میں ڈال کر روڈ پر لے آیا تھا۔ اس کی باتوں پر صرف ہنستا ہی رہا اور پھر گاڑی موڑ کر اس کا رخ مسی ساگا کی جانب کر دیا۔ ہائی وے 427 نارتھ سے ہوتا ہوا ایئرپورٹ کے قریب ہائی وے 401 ویسٹ پر آیا اور پھر مسی ساگا کا نیا نکور شہر کچھ دیر بعد شروع ہو گیا۔

ہائی وے کے دونوں جانب کہیں کہیں بلند عمارتیں نظر آتی تھیں۔ ہم آرام سے لمبے فاصلے لمحوں میں طے کرتے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کے علاوہ سعد بھی بہت خوش تھا۔ بڑے عرصے سے یہ دونوں میرے ساتھ بسوں کے دھکے کھاتے چلے آ رہے تھے۔ ٹک کر تو میں بھی نہ بیٹھتا تھا۔ جب بھی چھٹی ہوتی اور ہم بسوں میں بیٹھ کر کہیں نہ کہیں نکل جاتے تھے۔

کینیڈی روڈ کا Exit لیا اور کچھ ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے جہاں ایک ساتھ جڑے فرنیچر کے چند شوروم تھے۔ گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ پارک کر کے ہم ایک شوروم کے اندر داخل ہوئے۔

سیل کے بڑے بڑے بینرز شوروم کی دیواروں پر لگے تھے۔ پینٹ کوٹ پہنے سیل مین مستعد کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک سیل مین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مجھے بیڈ روم سیٹ کے علاوہ صوفہ سیٹ، ڈائننگ ٹیبل، میڈیا ٹرالی کے علاوہ کمپیوٹر ٹیبل چاہیے تھی۔ سیل مین مجھے مختلف بیڈز دکھائے جا رہا تھا جو مجھے پسند نہیں آ رہے تھے۔ اکثر میٹل کے بنے تھے۔ کچھ Compressed wood کے تھے۔ چند بیڈز دکھانے کے بعد سیل مین نے میرا موڈ بھانپ لیا۔ ایک بیڈ نسرین کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''میڈم! بیڈ تو بیوی پسند کرتی ہے مگر آپ ہیں کہ خاموش کھڑی ہیں۔''

میں نسرین کو کھڑا ہوا دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ سیل مین اب نسرین سے کہہ رہا تھا کہ آپ کو بیڈ دکھا دیے ہیں۔ آپ کو پسند کر لیں میں ابھی آتا ہوں۔ وہ کہہ کر لمبے قدم اٹھاتا اور باچھیں کھولے ایک اور کسٹمر کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے نسرین سے مسکرا کر کہا۔ ’’دیکھا! ہر ایک یہی تاثر دے رہا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔‘‘

ایسے بولی جیسے کوئی یاد دہانی کرا رہی ہو، کہنے لگی۔

’’تم اپنا میرے ساتھ مقابلہ کیوں کرتے ہو۔ تم تو شاید ایک دو دن پہلے پیار کے راستے پر چلے ہو اور میں تو تمہارے اسی اظہار کا مہینوں سے انتظار کر رہی تھی۔‘‘ پھر خوش ہوتی ہوئی بولی۔ ’’آج تمہارے اندر اپنے لیے کوئی انوکھا پیار دیکھ رہی ہوں۔ جبھی مجھے اپنی نظروں سے دور بھی نہیں ہونے دے رہے ہو۔‘‘

سنجیدگی سے بولا۔ ’’ہم ساتھ ساتھ تھے تو سب نارمل چل رہا تھا۔ جب سے فیملی کی امیگریشن اور پھر ٹکٹیں ہوئیں تو میرے اندر اچانک یہ ڈر اٹھا کہ میں تمہیں کہیں کھو نہ دوں۔ تم بدل جاؤ یا کہیں میں۔ کوئی بھی بدلے مگر نتیجہ تو تمہیں کھو دینا ہے۔ تمہیں کھو دینے کا خوف میرے دل کو، میری روح کو اور میرے دماغ کو جھنجوڑ گیا۔ تب یہ احساس ہوا کہ تم میرے لیے کتنی قیمتی ہو۔ آج تمہیں ذرا سا بدلا بدلا پایا تو ڈر گیا کہ کہیں یہ سب ختم نہ ہو جائے۔‘‘

مسرت لبریز لہجے میں بولی۔ ’’تمہارا اس طرح سے بے قرار ہونا بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ تم تو پھر بھی خوش قسمت ہو کہ تمہاری یہ بے قراری میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس میں کتنی کسک ہے وہ محسوس کر سکتی ہوں۔ ذرا یہ سوچو کہ جب میں بے قرار ہوتی تھی اور تم بے پروا ہوتے تھے۔ میری حالت تو سمجھنے والے صرف سرجی تھے۔‘‘

میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’محبت میں جیت کسی ایک کی نہیں بلکہ دونوں کی ہوتی ہے۔ اگر اس جیت کی ٹرافی ہوتی تو واقعی تم حقدار تھیں۔ صرف تم خوب صورت نہیں بلکہ تمہارے اندر کی روح تم سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔‘‘

سعد بچوں کے پلے ایریا میں مصروف تھا جو ہر بڑے شوروم، بینک یا ڈاکٹر آفس میں ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کی فکر نہ تھی جب ہم باتیں کر رہے تھے۔

وہ یہ بھی ٹھیک کہہ رہی تھی کہ اب میں اسے اپنی نظروں سے دور نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اس کے قرب میں رہنا مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر ہوتی تو نگاہیں اس کی تلاش میں بے چین ہو جاتیں۔ قیمتی چیزوں کی اہمیت تب ہوتی ہے جب اس کے چھن جانے کا دھڑکا لگ جائے۔ ایسا ہو جائے تو اسے سنبھال سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں اب نسرین پر سے اپنا سایہ بھی علیحدہ نہ ہونے دے رہا تھا۔ یہ سب میری فطرت کے خلاف تھا کہ کوئی روگ لگا بیٹھوں مگر یوں مجھے اپنی دیوانگی مطمئن اور خوش کرتی تھی۔

ہم دونوں کو وہاں فرنیچر پسند نہ آیا۔ مجھے لکڑی کا فرنیچر اچھا لگتا تھا۔ میرا بس چلے تو گھر کا گیٹ بھی لکڑی کا بنوا ڈالوں۔ اصلی لکڑی کا فرنیچر اتنا مہنگا کہ اس کی قیمت سننے کے بعد وہاں سے کھسکنا زیادہ موزوں لگا۔ صرف بیڈ روم سیٹ بیس ہزار ڈالر کا تھا۔ لکڑی کی ڈائننگ ٹیبل بارہ ہزار ڈالر کی تھی۔ بیڈ سے میٹرس زیادہ مہنگے تھے۔ ایک دو اور شو روم بھی تھے مگر وہاں کا احوال بھی مختلف نہ تھا۔ میں مخمصے میں پھنسا تھا کہ اب کیا کروں۔ فرنیچر خریدنے کی طاقت نہ تھی اور نہ خریدتا تو یہ بھی حل نہ تھا۔

کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جھنجلا اٹھا۔ نسرین کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ’’فرنیچر کا بعد میں کچھ سوچ لیں گے۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ پہلے کہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔‘‘

کہنے لگی۔ ’’اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟‘‘

’’بولو۔‘‘ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

’’میرے اکاؤنٹ میں نو ہزار ڈالر ہیں۔ سارے نہیں تو آدھے ہی لے لو۔ کچھ اپنے پیسے ملا کر چیری ووڈ کا فرنیچر لے لو۔ سارا بارہ ہزار ڈالر میں مل رہا ہے۔‘‘ کہہ کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں خاموش کھڑا رہا تو بولی۔ ’’بعد میں واپس کر دینا مگر ابھی تو لے لو۔‘‘

میں اسے دیکھ رہا تھا۔ سیدھا انکار کرتا تو ناراض ہو کر خاموش ہو جاتی۔

اس سے پیسے لینے کا روادار میں نہ تھا۔ مجھے یہی جواب مناسب لگا۔ ’’ایک تو تم سے یہ نو ہزار ڈالر نہیں سنبھالے جاتے۔ آگے ہم دونوں کو بہت سی ضرورتیں پیش آئیں گی۔ آئندہ کے لیے بچا کر رکھو۔ اس وقت کس سے مانگتے پھریں گے۔‘‘

اس نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے رضامندی میں سر ہلا دیا۔ پھر گویا ہوئی۔ ’’ایسا کیوں نہ کریں کہ Moving Sale سے خریدتے ہیں۔ فرنیچر اچھا بھی ہوگا اور ہمیں مناسب قیمت پر بھی مل جائے گا۔‘‘

لوگ جب اپنا گھر شفٹ کرتے ہیں تو بہت سی زیر استعمال چیزیں بیچ دیتے ہیں۔ اس کو یہاں Moving

Sale کہتے ہیں۔ دیسی لوگ عموماً اسی سیل سے اشیاء کی خریداری کرتے رہتے ہیں۔ نام تو اس سیل کا سنا تھا مگر خریدنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ کئی ایک تو یہاں سے چیزیں خرید کر آگے مہنگے داموں بیچ دیتے ہیں۔ اس سیل کے اشتہارات اخبار میں آتے رہتے ہیں۔ پرانے گھر کا فرنیچر نئے گھر میں فٹ نہیں بیٹھتا تو وہ اسے اونے پونے داموں بیچ دیتے ہیں۔

نسرین نے آئیڈیا دیا تو فوراً ہی میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گوروں کے صوفوں اور بستر پر کتے بھی سوتے ہیں اور معلوم نہیں وہ خود کس طرح سے رہتے ہیں۔ استعمال کرتے وقت ہمیشہ یہی خیال ذہن میں رہے گا کہ سارا سامان پلید ہے۔''

وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم گوروں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے خریدیں گے۔''

میں نے عقل استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اخبار میں اشتہار کے ساتھ کوئی مذہبی خانہ بھی ہوتا ہے کہ بیچنے والا مسلمان ہے یا کہ غیر مسلم۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تو ہم پاکستانی لوکل اخبار دیکھیں گے ان میں بھی تو اشتہارات ہوتے ہیں۔''

بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ نیا فرنیچر میری استطاعت کے باہر دکھائی دیتا تھا۔ بینک سے قرضہ لے کر فرنیچر خریدنا میرے نزدیک ایک انتہائی احمقانہ قدم تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں صبح ناشتا کرنے کے بعد ابھی تک خالی پیٹ تھا۔ بھوک ستا رہی تھی۔ نسرین سے کہا۔ ''کھانے کے بعد سوچتے ہیں۔ ویسے تمہاری بات مجھے ٹھیک لگتی ہے۔''

اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میرے بغیر تم کچھ بھی نہیں اور میں نے بھی اس کی سوچ کی تائید اپنے چہرے کے تاثرات سے دے دی۔

مسی ساگا میں ہائی وے 10 پر ہم ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ اس ہائی وے پر بلند و بالا عمارتیں روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ پہلو بہ پہلو کھڑی خوب صورت دمکتی عمارتوں نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ قریب ہی مشہور مال اسکوائر ون تھا۔ یہ سارا علاقہ ایک طرح سے مسی ساگا کا ڈاؤن ٹاؤن ہے۔ گاڑیوں اور لوگوں کا بے تحاشا رش تھا۔ پیدل گھومنے والے زیادہ تر سیاح تھے۔

ریسٹورنٹ کو پاکستانیوں نے خوب سجایا ہوا تھا۔ ویک اینڈ تھا تو پاکستانیوں اور ساتھ گوروں کا جم غفیر بھی کھانا کھانے جمع تھا۔ چھت سے فانوس لٹک رہے تھے اور ویٹرز مستعد کھڑے مہمانوں کو میزوں کے گرد کرسیوں پر بٹھاتے تھے۔ میزیں بھی اعلیٰ کٹلری سے سجی تھیں۔ فرش پر قالین بچھے تھے اور دیواروں پر پاکستانی ثقافت کو پیش کرتیں خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ بڑا ہال تھا اور کونے میں ایک گلوکار اپنا فن پیش کر رہا تھا اور ساتھ سازندے بیٹھے تھے۔

ایک معیاری ریسٹورنٹ تھا۔ بوفے میں متعدد ڈشیں ایک لائن میں لگی تھیں اور ہر شخص اپنی مرضی کا کھانا پلیٹوں میں ڈالے خوش گپیوں میں معروف تھا۔ عملے سے ایک پاکستانی ویٹریس نے مسکراہٹیں بکھیرتے ہمیں ایک میز کے گرد کرسیوں پر بٹھا دیا۔ ڈرنک کا پوچھا تو سعد کے علاوہ ہم دونوں نے سادہ پانی منگوایا۔ سعد تازہ لگلا اورنج جوس پینے لگا۔ کھانے کا پوچھا تو وہ لڑکی اردو میں بولی۔ ''آپ کا بیٹا فری ہے کیونکہ بارہ سال سے کم عمر کا ہے۔'' پھر بوفے کی طرف اشارہ کرتے بولی۔ ''آپ اپنی پسند کا کھانا وہاں سے لے سکتے ہیں۔''

میں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ پھر نسرین سے اردو میں مخاطب ہوئی۔ ''آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟'' اور اردو سے نابلد نسرین اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ جواب نہ پاکر ویٹرس شرمندہ سی ہوگئی۔ میں نے کہا۔

''یہ اردو نہیں جانتی۔''

ویٹریس نے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر اوپر نیچے آہستگی سے سر ہلایا۔ پھر مجھ سے انگلش میں بولی۔ ''آپ کی بیوی ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے، کیا یہ اسپین کی ہیں؟''

ساتھ سعد بیٹھا تھا تو مجھے شرمندگی ہوئی۔ شکر ہے کہ وہ ہماری جانب توجہ نہیں دے رہا تھا تو بچت ہوگئی۔ جواب نسرین نے دیا۔ ''میرا تعلق ایران سے ہے۔''

ویٹرس نے بات بدلی اور بولی۔ ''مجھے شک تھا کہ آپ ایران سے ہیں اتنی خوب صورت لڑکی ایران سے ہی ہوسکتی ہے۔''

میں نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔ ''چلیں کھانا لیتے ہیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

میں بوفے کی اتنی ساری ڈشز دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہاں بریانی، پائے، نہاری، قورمہ، بھنا قیمہ، مچھلی، میکرونی، نوڈلز، ساگ، چنے چھولے اور اس کے علاوہ میٹھے میں سوجی

اور گاجروں کے حلوے کے علاوہ بھی تو بہت کچھ تھا۔ ساتھ تندور کی گرم روٹیاں بھی دو ٹکڑے ہوئے پڑی تھیں۔ میں بسیار خور کبھی نہیں رہا مگر اس دن اتنے سارے پاکستانی کھانے دیکھے تو قابو نہ پاسکا۔ نسرین کے روکنے کے باوجود میں نے ڈٹ کر کھایا۔

اردگرد بیٹھی پاکستانی خواتین بار بار نسرین کو دیکھ رہی تھیں۔ اس دن پورے ریسٹورنٹ میں وہ نمایاں تھی۔ جلتے فانوسوں تلے وہ اور زیادہ دمک رہی تھی۔ وہ اتنی ساری نظروں کی تاب نہ لاکر شرم سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

وہی ویٹریس اب کچھ زیادہ مسکراہٹیں بکھیرتے آئی، ایک کپ میں رکھا سونف ہمارے آگے رکھ دیا۔ ایک چمچ لینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ”اردو کا کوئی مقامی اخبار آپ کے پاس ہے؟“

اس نے عین دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پھر خود ہی دو مختلف تازہ اخبار اٹھا لائی۔ اخبار میں کلاسیفائیڈ سیکشن انگریزی میں ہوتا ہے۔ ایک اخبار میں نے اور دوسرا نسرین نے دیکھنا شروع کردیا۔ کچھ دیر بعد ایک اشتہار نسرین نے مارک کر کے مجھے دکھایا۔ گھر کا سارا فرنیچر جو چیری کی لکڑی کا بنا تھا وہ Moving Sale پر لگا تھا۔ فون نمبر مسی ساگا کا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر جاکر اسی نمبر پر فون ملایا تو آگے بات کرنے والا پاکستانی تھا۔ نام جمشید بتا رہا تھا۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا اور پھر اس سے گھر کا ایڈریس لینے کے بعد دوسرے دن صبح دس بجے اس کے اپارٹمنٹ میں ملنے کا وقت مقرر ہوگیا۔

بل ادا کرنے کے بعد ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ مسی ساگا ڈاؤن ٹاؤن پورے جوبن پر نظر آرہا تھا۔ ہر جانب آنکھوں کو خیرہ کرتی روشنیاں عمارتوں سے پھوٹ رہی تھیں۔ بہت سی پاکستانی خواتین شلوار قمیص میں گھومتی نظر آرہی تھیں۔ روشنیوں کے باعث رات میں بھی دن کا گمان ہو رہا تھا۔ چلے تو ہم آدھے گھنٹے کے اندر اپارٹمنٹ پہنچ گئے۔

گاڑی پارک کرنے کے بعد باہر نکل کر میں سوچ میں کھڑا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میرا اپنا جی کر رہا تھا کہ رات یہیں گزاروں۔ گو متعدد بار یہاں میں رات کو قیام کرچکا تھا مگر اس دن خود منہ سے کہنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ وہ خود کہے تو میری مراد بر آئے۔ مجھے گم صم کھڑے دیکھ کر بولی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

آہستگی سے ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”کچھ نہیں واپس چلتا ہوں۔“

حیرت سے بولی۔ ”کل صبح فرنیچر دیکھنے نہیں جانا؟“

میں اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ”اوہ! وہ تو میں بھول گیا۔“

حیرت سے تکتے ہوئے بولی۔ ”سب ٹھیک ہے ناں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو بولی۔ ”پھر اوپر چلو۔“

اس نے قدم بڑھائے تو اس کی تقلید میں خوش خوش میں بھی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

☆......☆

صوفے پر تکیہ وہیں پڑا تھا جہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہیں اپنی پسندیدہ جگہ شوز اتارے اور لیٹ گیا۔ اس نے اپارٹمنٹ کی کھڑکیاں میرے کہے بغیر کھول دیں۔ لیک اونٹاریو سے چلتی ہوائیں کھڑکی سے اچانک اندر داخل ہوئیں تو اس نے چادر مجھ پر ڈال دی۔ سر گھما کر کھڑکی کے باہر دیکھا تو پوری فضا چاندنی میں نہائی نظر آگئی۔ آسمان کا جتنا حصہ نظر آرہا تھا وہاں کہیں کہیں بادل تیرتے نظر آئے۔

وہ مجھ سے بولی۔ ”میں سعد کو سلا کر آتی ہوں پھر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔“

وہ کمرے کی جانب بڑھی تو میں نے کہا۔ ”آج چائے نہیں ایرانی قہوہ پلادو۔“

”زعفران بھی ڈالوں؟“ اس نے پوچھا۔

میں رومینٹک ہو کر بولا۔ ”کپ سے اپنے لب لگا دینا، زعفران کی کیا ضرورت ہے۔“

وہ مسکرا کر کمرے میں چلی گئی۔ فوراً واپس آئی اور میری جانب نائٹ ڈریس پھینکتے ہوئے بولی۔ ”تبدیل کرلو، سارا دن ایک ہی لباس میں پھرتے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر دوبارہ کمرے میں چلی گئی۔

میں نے واش روم میں ٹھنڈے پانی سے شاور لیا اور تازہ دم ہوگیا۔ کپڑے تبدیل کر کے دوبارہ صوفے پر کپکپاتا چادر اوڑھے لیٹ گیا۔

میں اس کی سوچوں میں کھویا خاموش لیٹا تھا۔ وہ آئی تو مسکراہٹیں بھی ساتھ لائی۔ اس نے بھی گلابی کپڑے پہنے تھے۔ مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کچن میں چلی گئی۔ میں چاہتا تھا کہ میرے پاس بیٹھی رہے۔ مجھے اس کی مصروفیت کھل رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جان بوجھ کر ستا رہی ہے۔ اب اپنی قدر و قیمت مجھے بتا رہی ہے۔ پہلے اس کو

روکتا تھا کہ مجھے بھی ستایا نہ کرو، نخرے دکھایا نہ کرو۔ آج میرا پیار چھلکتے دیکھا تو اپنی اہمیت دکھلانے لگی۔ میں اس کے علاوہ اسے کیا کہتا کہ تم واقعی انمول ہو تمہارا کوئی مول نہیں۔

وہ قہوے کے دو کپ لائی۔ کپ کافی ٹیبل پر رکھا اور اپنا کپ منہ سے لگائے صوفے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پاؤں ہمیشہ کی طرح کافی ٹیبل کے کنارے رکھے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ میرے کپ سے قہوے کا ایک گھونٹ لے گی مگر ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا وقار ملحوظ خاطر رکھا۔ وہ واقعی انمول تھی۔

میں نے باہر کی چاندنی کو بے دھڑک آنے کے لیے لیونگ روم کی لائٹ بجھا دی۔ اسے میری عادت کا پتا تھا کہ تیز روشنی میں میں گھبرا جاتا ہوں تو خاموش بیٹھی قہوہ پیتی رہی۔ چاندنی لیونگ روم میں آئی تو اس سے گھل مل گئی۔ میں زعفران ملا قہوہ پینے لگا۔ ہم دونوں خاموش تھے کوئی بات نہ کرتا تھا کہ چھایا طلسم ٹوٹ نہ جائے۔ کچھ دیر بعد خاموشی کی چادر چیر کر وہ بولی۔ ”اتنا زیادہ پیار آج کیوں دکھا رہے ہو۔ میری جانب تمہاری اٹھتی نظریں آج جھکتی نہیں۔ بے چینی ہوتی ہے کہ اندر بات کچھ اور ہے۔ دہل جاتی ہوں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ پہلے کی طرح دیکھو تو بھی میرے لیے بہت ہے۔“

وہ دلوں کے بھید جانتی تھی کہ خاموشی کی زبان پڑھ لیتی ہے۔ میں تو نظریں بھی نیچی کیے بیٹھا تھا مگر وہ میرے دل کی باتیں کہہ رہی تھی۔ میرے غیر معمولی حرکات و سکنات سے میرے اندر کی کیفیت بھانپ رہی تھی۔ میں کسی چور کی طرح ڈرا بیٹھا تھا۔ میرے اندر اس کی عزت و حرمت کا پاس بھی تھا مگر اس کے مرمریں ہاتھوں اور رخ روشن کو چھونا بھی چاہتا تھا۔ کئی بار وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر روئی تھی مگر آج ان آنکھوں کی گہری جھیلوں میں ڈوبنا چاہتا تھا۔ آج اپنی کیفیت سے قاصر تھا اور سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ سمجھنا بھی نہ چاہتا تھا کہ میں وجہ تلاش کرتا رہ جاؤں اور وقت گزر جائے۔ ان لمحوں کو میں گنوانا نہ چاہتا تھا۔

میں اس کے سوال پر خاموش رہا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔ ”بولو! آج میرے لیے اتنا زیادہ پیار کیوں؟“

اس کی جانب دیکھنے کی تاب نہ تھی سامنے دیکھ کر بولا۔ ”شاید میرے اندر کوئی ڈر ہے کہ تمہیں کھو نہ دوں۔ فیملی کے آنے کی خوشی کے ساتھ تمہارے جدا ہونے کے دھڑکے بھی لگ گئے۔ تم سے دور ہونے کا تصور مجھے تمہارے اور زیادہ قریب لے آیا۔ آج اظہار کر نہیں رہا بلکہ ہو رہا ہے اور شاید اس لیے بھی کہ میری چاہت کا یقین تمہارے اندر اور مستحکم ہو جائے۔“

اس نے اپنا کپ ٹیبل پر رکھا اور میرے قریب نیچے کارپٹ پر آبیٹھی۔ میں اس کے اندر اچانک آئی تبدیلی پر حیران ہو رہا تھا۔ میرا کپ میرے ہاتھوں سے لے کر اسے بھی ٹیبل پر رکھا اور اپنا چہرہ میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے ضبط کرتے کرتے بکھر گئی ہو۔ سارا دن اپنے اندر پتھر کی دیوار کھڑی کرتی رہی اور شب آئی تو میرے دو بولوں نے وہ دیوار ریزہ ریزہ کر دی۔

اس کے گیلے گال میری ہتھیلیوں کو گرم آنسوؤں سے نم کر رہے تھے۔

اسے کھینچ کر اٹھایا اور ساتھ بٹھایا تو تڑپ کر سینے سے آ لگی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے سے بالوں کی لٹیں ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”گو ان آنکھوں میں تیرتے آنسو اس چہرے کی خوب صورتی بڑھا دیتے ہیں مگر ان میں آنسو مجھے نہیں دیکھے جاتے۔“ اس نے زور کی سسکی لی تو اس کے آنسو چنتے ہوئے بولا۔ ”شادی کے فیصلے کو میرا جذباتی فیصلہ مت سمجھنا۔ بڑی سوچ اور سمجھ بوجھ کے بعد یہ فیصلہ میں نے کیا ہے۔ مجھ پر اعتماد رکھو سب سنبھال لوں گا میں۔“

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور کمرے میں چاندنی ہوا سے ڈولتے پردے کے ساتھ لہرا لہرا کر آ رہی تھی۔

پھر ہم دونوں کھڑکی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ آسمان پر بدلیوں کے بیچ چاند کی شرارتیں جاری تھیں۔ اجلی شب کا چاند چمک رہا تھا۔ سیاہ بادل چاندنی کے سمندر میں تیرتے پھرتے تھے۔ بادلوں نے چاند کو ڈھانپا تو ان کے کنارے جھلملانے لگے۔ چاند چھپا تو آسمان پر ننھے ننھے تاروں کا غبار نظر آیا۔ ٹمٹماتے تاروں کا دھندلا سا غبار۔ بادل ہٹے تو پہلے سے بھی زیادہ چمکتا چاند نکلا۔ اتنا چمکدار کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ تارے بدھم پڑ کر کسی اوٹ میں جا چھپے۔ چاندنی نے زمین کے ہر نقش پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ پارک میں ایستادہ درختوں کی ٹہنیاں چاندنی سے برسر پیکار تھیں۔ سرو کے بلند درخت دم سادھے خاموش کھڑے تھے جیسے کسی شاہی دربار کے مستعد دربان۔

اس نے میری عادت اپنا لی تھی۔ میں اکثر اس کھڑکی میں کھڑا چاند اور اس کی چاندنی میں کھو جاتا تھا اور آج وہ

کھڑی دیر سے چاند کو دیکھے جارہی تھی۔ نہ جانے کون سی گم شدہ جنت کی تلاش میں تھی۔ وہ کیا خواب تھے جو چاندنی میں جھلملا رہے تھے۔ وہ چاند دیکھ رہی تھی اور میں اس کا چہرہ۔ گویا دونوں اپنا اپنا چاند دیکھ رہے تھے۔

اپنے کندھے سے اس کا چہرہ ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو۔''

اس نے سن کر عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ہونٹ ایسے کہ مسکرا رہی ہو۔ آنکھیں ایسی کہ جیسے اداسی نے گھیر رکھا ہو، چہرہ ایسا کہ اس پر لکھی تحریریں چھپا رہی ہو۔ کس کیفیت میں تھی سمجھ نہ پایا۔ الجھا گئی تھی مجھے۔ اس کے گھنے بال سنوارتے ہوئے میں بولا۔ ''محبت نہیں تو شکایت ہی کرلو مگر خاموش نہ رہو۔ جن لمحوں میں ہم آج کھڑے ہیں یہ قدرت کا انعام ہیں۔ یہ وقت پوری سحر انگیزیوں کے ساتھ ہمیں ملا ہے۔ معلوم نہیں یہ آئندہ ہمیں کس حالت میں ملتا ہے، اس سے بہتر یا......''

یہیں اس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش کردیا۔ مدھر لہجے میں بولی۔ ''اس سے آگے کچھ نہ کہو۔ خوش بخت وقت میں بدشگونیاں بددعائیں بن جاتی ہیں۔ ساری عمر ہارتی رہی آج جیتی ہوں تو وسوسوں کو درمیان میں مت لاؤ۔ بدنصیبی ہمیشہ سے میرا کاشانہ بنی ہے۔ لرز جاتی ہوں کہ میرا نصیب پھر کہیں مجھے گم نہ کردے۔'' سسکیاں لے کر میرے سینے سے لگ کر بولی۔ ''میرے خاندان کی عورتیں میرے بارے میں کہتی تھیں کہ اتنی خوب صورت لڑکی اور اتنے برے نصیب۔ سب مجھ پر ترس کھاتے تھے۔ شادی کے بعد لوگ مبارک باد دینے آتے مگر آنسو بہا کر چلے جاتے۔ مجھے میرے نصیبوں سے مت ڈراؤ۔ کہیں چھپا لو مجھے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اس کی سانسوں کی مہک میری گردن پر پھیلی تھی۔ اس کی سانسوں کی خوشبو کچھ نئے اور انجانے پیغام دیتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''اس بار تو میری بدنصیبی میرا مقدر تو نہیں بنے گی؟''

میں بولا۔ ''جس جذبوں سے تم نے مجھے روشناس کرایا ہے وہ کسی بدنصیب کے پاس کہاں ہوں گے۔ بدنصیب تو مفلس ہوتا ہے۔ اتنی زیادہ محبت دینے والی تو خوش نصیب اور غنی ہوتی ہے۔''

یہ سن کر وہ خوشی و مسرت سے میرے اندر تک سما گئی۔ محبت کے راستے میں اس نے چاندنیاں بچھادیں۔ کھلی ہوا اور پھیلی سحر انگیز چاندنی گدگداتی تھی۔ اس کے لمس میں کوئی خاص بات تھی، کچھ عجیب سا سرور تھا کہ جسم کے بجھے دیئے ایک ایک کر کے روشن ہونے لگے۔ اس کی سانسوں میں ایک ہیجان تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی انجانے ڈر سے دور ہٹ گیا۔

ہم رات گئے باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنی باتیں مجھے بتاتی اور میں اس کا چہرہ دیکھتا۔ جب مجھ سے میری باتیں پوچھتی تو میں اس سے اس کی باتیں کرتا۔ وہ ہنستی تو میں گلاب کی پتیاں چن رہا ہوتا۔ وہ مسکراتی تو اس کے چہرے پر روشن ستارے دیکھتا۔ اپنی سیاہ زلفیں چہرے سے ہٹاتی تو آسمانی چاند حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگتا۔ وہ سحر تھی کہ شب تھی کہ ہولے سے چلتی کوئی ہوا تھی۔ وہ روشنی کی کوئی کرن تھی جو میرے اندر کے اندھیروں میں اجالا کرگئی۔ وہ آہستگی سے برستی کوئی بارش تھی جو میرے وجود کو سرشار کررہی تھی۔

رات میں صوفے پر سویا۔ سونے سے پہلے مجھے ایک اور تکیہ لاکر دیا۔ میں لیٹا تو مجھے کمبل اوڑھا دیا۔ ساتھ کافی ٹیبل پر پانی کا بھرا گلاس رکھا۔ جانے سے پہلے پوچھا۔ ''کچھ اور تو نہیں چاہیے۔''

میں نے جواب نہ دیا۔ وہ چلی گئی اور میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

آنکھ کھلی تو سورج نہیں نکلا تھا۔ اٹھ کر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ ہفتے کی صبح تھی اور پورا شہر خاموشی میں ڈوبا تھا۔ باہر سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ درختوں کے پتے صبح کی ہوا کے ساتھ ساتھ ورد کررہے تھے۔ صبح کا نور چہار سو پھیلا تھا۔ خاموشی اَن کہے راگ چھیڑ رہی تھی۔ پھر جگمگاتی رنگین صبح طلوع ہوئی۔ سورج کی پہلی کرنوں میں تازگی اور شوخی تھی۔ کئی رنگ آسمان نے کرنوں سے مستعار لیے اور رنگوں سے رنگین ہوگیا۔ پرندوں کے غول انجانی منزلوں کی جانب روانہ ہوتے۔ پھر رنگ آہستہ آہستہ پھیکے پڑنے لگے۔ صبح کا سحر ٹوٹنے لگا اور میں دوبارہ صوفے پر آلیٹا۔ کچھ ہی دیر میں پھر نیند میں ڈوب گیا۔

☆......☆

ہم گاڑی میں مسی ساگا فرنیچر دیکھنے جارہے تھے۔ ہائی ویز خالی پڑی تھیں۔ ہمیں دس بجے پہنچنا تھا مگر ہم لیٹ ہوچکے تھے۔ وہ صبح جب بیدار ہوئی تھی تو میں سویا ہوا تھا۔ جب میں نیند سے جاگا تو صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

پوچھا کہ مجھے جگایا کیوں نہیں تو جواب دیا۔ ''سوتے ہوئے احمق احمق لگ رہے تھے۔ دیکھ کر اچھے لگے تو نہیں جگایا کہ آتے جاتے دیکھتی رہوں گی۔'' کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ''لڑکیوں میں یہی برائی ہے، پیار نہ کرو تو آگے پیچھے گھومتی ہیں۔ پیار کر لو تو بدتمیزی کرنے لگتی ہیں اور شادی کر لو تو اسٹک اٹھا لیتی ہیں۔''

سن کر وہ ہنس دی۔ اسے ہنستے دیکھا تو میں بھی ہنسنے لگا۔

سب نے مل کر ناشتا کیا اور اب فرنیچر دیکھنے مسی ساگا جا رہے تھے۔ راستے میں نسرین نے بتایا کہ آج سعد کے دوست کی سالگرہ ہے۔ اسے تین بجے ڈراپ کرنا ہے۔ میں نے کہا۔ ''فکر کیوں کرتی ہو۔ گاڑی ہے تو ڈراپ بھی کر دیں گے اور رات کو پک بھی کر لیں گے۔''

اس نے میری جانب مسکرا کر دیکھا ایسے کہ جان گئی ہو کہ میری اگلی رات بھی اس کے ہاں گزرے گی۔

پچھلے دنوں سے گرمی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں کی گرمی کا حساب یہ ہے کہ جب درجہ حرارت تیس درجے ہو جائے تو ٹورنٹو والے بلبلا اٹھتے ہیں مگر آج آسمان پر کہیں کہیں بادل نظر آ رہے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ رات مجھے ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی اور آج صبح سے میں اسپرنگ جیکٹ پہنے ہوئے تھا جو نسرین اپنے پاس سنبھال کر رکھتی تھی۔

ہم دیئے گئے ایڈریس پر پہنچے تو وہ چھ منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے پہلے فلور پر دو بیڈ روم کا فلیٹ تھا۔ لیونگ روم میں صوفے پڑے تھے۔ ساتھ چیری ووڈ کی ڈائننگ ٹیبل اور اس کے قریب برتنوں کی الماری رکھی تھی۔ ایک بیڈ روم میں پورا بیڈ روم سیٹ بمعہ ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری کا تھا۔ سب سیاہی مائل رنگ میں لکڑی کا سا تھا۔ دوسرے کمرے میں دو سنگل بیڈ رکھے تھے۔ فون پر جس سے بات ہوئی وہ جمشید تھا۔ ہمیں تپاک سے ملا۔ دو صحت مند لڑکیاں ٹائٹ شرٹ اور پینٹ میں گھوم پھر رہی تھیں۔ برتنوں کی الماری کے آس پاس ایک بزرگ جن کی جسامت خاصی کمزور تھی وہ کرسی پر ناراض سے بیٹھے ہمیں غصے سے گھور رہے تھے۔ سفید کرتہ شلوار اور چہرے پر سفید کشتی داڑھی سے وہ کوئی حکیم صاحب لگ رہے تھے۔

فرنیچر اچھی حالت میں تھا جو مجھے ایک نظر دیکھتے ہی پسند آ گیا۔ مشورہ نسرین کا تھا تو وہ ستائش بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

پاکستانی لڑکیوں کا لباس مجھے خاصا معیوب لگا۔ نہ سر پر دوپٹا اور نہ کندھے ڈھکے ہوئے۔ کپڑے ایسے کہ شرم کے مارے میری نظریں دوبارہ ان کی جانب نہ اٹھیں۔ میں اس لیے بھی فکر مند تھا کہ لڑکیاں یہاں بڑھ کر ایسی ہو جاتی ہیں، حکیم صاحب نے تو اپنی روایات نہیں چھوڑی تھی مگر پوتیوں پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکے تھے۔ جمشید سلجھا ہوا لڑکا تھا اور ہمیں سارا فرنیچر دکھا رہا تھا۔ اتنے میں ایک جواں سیال عورت کہیں سے برآمد ہوئی جو شاید حکیم صاحب کی بہو تھیں۔ حکیم صاحب اب ہمارے ساتھ ساتھ اپنی بہو کو بھی طیش بھری نظروں سے گھورنے لگے۔ وہ عورت چھلکیلے لباس کی بدولت اپنی عمر سے خاصی کم لگ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ حکیم صاحب کا بیٹا یعنی اس عورت کا شوہر بھی کہیں موجود ہوگا مگر وہ نظر نہ آیا۔ عورت نے صوفے پر بیٹھتے ہی ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور دایاں ہاتھ دراز کر کے صوفے کی پشت پر پھیلا دیا۔ میری نظریں اس جانب خود بخود اٹھیں تو نسرین نے نظروں میں تنبیہ کر کے مجھے باز رکھا۔

عورت حکیم صاحب سے تحکمانہ انداز میں غالب ہوئی۔ ''ناشتا تم نے کر لیا ہے کہ نہیں؟''

حکیم صاحب کڑک کر اپنی جگہ سے بولے۔ ''تمہیں کیا جو ناشتا کروں یا نہ کروں تم تو آرام سے سوتی رہو۔''

سسر کے ساتھ یہ انداز تخاطب مجھے خلاف تہذیب محسوس ہوا۔ پھر جمشید حکیم صاحب سے بولا۔ ''ابا جان! یہی جواب دے دیتے کہ ناشتا کر لیا ہے۔ طعنے دینا کیا ضروری تھا۔''

پھر ایک لڑکی کمرے سے برآمد ہوئی اور حکیم صاحب سے بولی۔ ''ابا جان! آپ بھی ہر وقت امی سے لڑتے رہتے ہیں۔ کتنا تو ہم آپ کا خیال رکھتے ہیں مگر آپ کو تو ہر وقت جھگڑا کرنے کا بہانہ چاہیے۔''

میرے منہ سے بے ساختہ اوہ نکلا۔ معاملہ کسی حد تک میری سمجھ میں آ گیا۔ حکیم صاحب نے اپنی حکمت کے زعم پر پاکستان میں ایک جوان لڑکی سے شادی کر لی۔ لڑکی کے ماں باپ کو صرف کینیڈا کا پاسپورٹ اور حکیم صاحب کی دولت نظر آئی تو انہوں نے اپنی بیٹی حکیم صاحب کے حوالے کر دی۔ حکیم تھے تو اولاد بھی ہو گئی۔ ادھر حکیم صاحب اچانک بوڑھے ہوئے تو ادھر لڑکیاں دیوار پر لگی کسی بیل کی طرح جوان ہو گئیں۔ حکیم صاحب کو اپنی روایات یاد آئیں تو

انہوں نے کُرتہ شلوار زیب تن کر لیا۔ بیوی اور لڑکیوں نے کینیڈا کے اطوار دیکھے تو انہوں نے اپنا لباس اور طرز زندگی خود چن لیا۔ حکیم صاحب جب اس کنبے کی نگرانی کے قابل نہ رہے تو مشتعل رہنے لگے اور انجام یہ نکلا کہ جنریشن گیپ کی ازلی کشمکش شروع ہو گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر میں کیا چل رہا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے۔ حکیم صاحب محبت اور قرینے سے معاملات سنبھال سکتے تھے مگر انہوں نے یہ ہنر نہ آزمائے۔ عورت کو عزت ملے تو تن من وار دیتی ہے۔

میں نے سارے فرنیچر کی قیمت پڑھی تو حکیم صاحب بیچ میں آ کودے۔ ڈانٹ کر کہا ''پانچ ہزار ڈالر۔'' میں انکاری ہو گیا۔ حکیم صاحب نے مطلع کیا کہ دو ہزار کی تو صرف برتنوں کی الماری ہے۔ میں نے تنگ کر کہا کہ الماری اپنے پاس رکھیں باقی چیزیں دے دیں۔ حکیم صاحب دھاڑے، پانچ پانچ سو کا تو صرف سنگل بیڈ ہے۔''

میں نے انہیں یاد دلایا۔ ''ایک سنگل بیڈ تو آپ کے زیر استعمال ہوگا، اسے اپنے پاس رکھیں اور دوسرا مجھے دے دیں۔''

خاتون خانہ کے لبوں پر ہلکی سی دلکش مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں نے انہیں سنگل بیڈ پر سلایا تو بھڑک اٹھے۔ طیش میں فوراً آئے اور بولے۔ ''میاں! اپنے کام سے کام رکھو۔ میں کہیں بھی سوؤں تم صرف فرنیچر کی بات کرو۔''

میں نے کہا۔ ''الماری اور ایک بیڈ نکال کر ڈھائی ہزار بنتے ہیں۔ پاکستانی ہونے کے ناطے پانچ سو آپ چھوڑ دیں اور پانچ سو میں چھوڑتا ہوں۔ پندرہ سو کی جگہ دو ہزار دوں گا۔''

مجھے اب حکیم صاحب سے بات کر کے مزہ آ رہا تھا۔ نسرین کچھ نہ سمجھی تو الجھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو سعد کو ساتھ لے کر صوفے پر جا بیٹھی۔

برتنوں کی الماری کی میرے اپارٹمنٹ میں جگہ نہ تھی اور بیڈ میں ایک کنگ سائز بیڈ کے علاوہ صرف ایک ہی سنگل بیڈ سما سکتا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری بھی تو بیڈ روم میں آنی تھی۔

حکیم صاحب شش و پنج میں بیٹھے تھے۔ خاتون خانہ بے نیازی سے بیٹھی مسکرائے چلی جا رہی تھیں۔ لڑکیاں ماں کے ہمراہ لگی بیٹھی تھیں۔

جمشید نے دو ہزار میں کھڑے کھڑے معاملہ طے کر دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر ابا حضور نے کپڑوں کی الماری بھی دو ہزار میں بنا دی تو باقی کا سامان کہیں مفت میں نہ دینا پڑ جائے۔

میں نے جمشید کے ساتھ مل کر سارے سامان کی لسٹ بنائی۔ دو ہزار ڈالر کیش اس کے ہاتھ پر رکھے۔ لسٹ پر اس کے اور اپنے دستخط کیے۔ جی میں آیا کہ حکیم صاحب کا انگوٹھا بھی لگوا لوں مگر دنگا فساد سے بچنے کے لیے ارادہ ترک کر دیا۔ انہیں متوقع دن کا بتایا کہ فون کر کے کسی Moving company کی مدد سے یہ گھر خالی کر جاؤں گا۔

جانے سے پہلے خاتون خانہ کہنے لگیں۔ ''آپ کی بیوی بولتی کم ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اوپر والے کا کرم ہے۔ ہمیشہ ہی مہربان رہا ہے۔''

یہ کہہ کر نسرین کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔ نکلتے نکلتے خاتون خانہ کو دیکھا وہ جن کھا جانے والی نظروں سے حکیم صاحب کو دیکھ رہی تھیں اب انہی نظروں سے وہ مجھے دیکھ رہی تھیں۔

باہر نکلے تو نسرین روک کر بولی۔ ''یہ تو بتاؤ کہ اتنا سارا فرنیچر اتنا سستا کیوں دے دیا؟''

''اس لیے کہ مجھے بیٹا بنا لیا ہے اور اسی ناطے تم کو یعنی بہو کو تحفہ دیا ہے۔'' وہ کچھ نہ سمجھ کر سر ہلاتی رہ گئی۔

☆......☆

فرنیچر لینے کا بوجھ سر سے اترا تو ریلیکس محسوس کرنے لگا۔ اس کے علاوہ گھر کا بقایا سامان خریدنا کوئی دشوار طلب کام نہ تھا۔ خان قیصر کا ایک دوست پاکستان سے فوڈ آئٹمز امپورٹ کرتا تھا۔ اس کا اپنا ایک بڑا گودام بھی تھا۔ خان نے گروسری وہیں سے کرنے کا مشورہ دیا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ لسٹ مجھے دینا اور سارا سامان وہ خود لے آئے گا۔ اس کے علاوہ ٹی وی اور فون وغیرہ ایک دن میں لیے جا سکتے تھے۔

ہم واپس جا رہے تھے کہ راستے میں حلال پیزا شاپ کا بورڈ دیکھا تو گاڑی وہیں روک دی۔ نسرین کہتی رہ گئی کہ گھر جا کر وہ کھانا بنا لے گی مگر میں خود نہیں چاہتا تھا کہ وہ اب گھنٹوں کچن میں مصروف رہے۔ وہ جب بھی کچن میں گھستی تو گھنٹوں لگا کر ہی باہر نکلتی۔ میں ایک کے بجائے دو پیزے لایا تو اس نے اپنا موڈ خراب کر لیا۔

''کیا رات کو بھی پیزا کھاؤ گے؟'' خفگی سے بولی۔

میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”کئی بار رات کو کھایا ہے۔ تمہاری قسم کبھی کچھ نہیں ہوا۔“

سن کر زیادہ بھڑک اٹھی اور بولی۔ ”رات کا کھانا میں ضرور بناؤں گی۔ یہ دونوں پیزے ابھی تم کو اکیلے ختم کرنے ہوں گے۔“

دراصل جب اس نے یہ بتایا تھا کہ سعد دوست کی سالگرہ پارٹی میں جارہا ہے تو میرے ذہن میں یہ خیال اسی وقت آگیا تھا کہ میں اور نسرین ہمبر پارک کی کھلی فضا میں یہ وقت گزاریں گے۔ گھر کے بند ماحول میں بیٹھنے سے کہیں بہتر تھا کہ لیک اونٹاریو کے اندر بنے اس پارک میں جائیں جہاں شروع کے دنوں میں وہ مجھے لاتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے رات کا کھانا بنانے کی فکر ہو اسی لیے دو پیزے لے آیا۔ باہر کے کھانے کو فضول خرچی اور وقت کا زیاں سمجھنے کے علاوہ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ غذائیت میں باہر کے کھانے معیاری نہیں ہوتے۔

میں نے اس کی بحث سے بچنے کے لیے گاڑی میں کیسٹ پلیئر آن کردیا۔ عطاء اللہ کی آواز میں کوئی گانا لگا تھا۔ سنتے ہی ہاتھ بڑھا کر پلیئر بند کردیا اور طیش کے عالم میں بولی۔ ”مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔“

☆......☆

سعد کو اس نے اچھی طرح تیار کردیا تھا۔ نئے کپڑوں میں وہ واقعی کوئی شہزادہ لگ رہا تھا۔ بغل میں اس نے دوست کا گفٹ دیا ہوا تھا۔ میں اسی دوران صوفے پر آرام کرتا رہا۔

اپارٹمنٹ تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ ایک ایرانی فیملی میں بچے کی سالگرہ تھی۔ میں نیچے گاڑی میں انتظار کرتا رہا اور وہ سعد کو چھوڑ کر گاڑی میں آبیٹھی۔ کھانا ہم نے کھا لیا تھا۔ ڈیڑھ پیزا جو کھانے سے رہ گیا تھا وہ اس نے کچن میں نہیں بلکہ لیونگ روم میں چھوڑ دیا تھا۔

ہم اپارٹمنٹ پہنچے تو میں بولا۔ ”میرے لیے چائے بنا کر جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ ہمبر پارک چلتے ہیں۔“

اس نے مڑ کر پوچھا۔ ”یہ خیال اچانک کیسے آگیا تم کو؟“

”جب تم نے سعد کی پارٹی کا بتایا تھا اسی لیے تو دو پیزے لایا کہ وہاں رات کے کھانے کی فکر کرکر کے تم اپنے ساتھ میرا بھی موڈ خراب نہ کردو۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی اور پھر مسکرا کر بولی۔ ”کمال کی چیز ہو تم بھی ہر وقت دماغ میں کچھ نہ کچھ چلتا رہتا ہے۔“ یہ کہہ کر پیزے کے دونوں باکس اٹھائے اور کچن میں چلی گئی۔

☆......☆

آج وہ خوب بنی سنوری تھی۔ اس نے شوخ رنگ کا لباس پہنا تھا جس پر سفید رنگ کی ہلکی کشیدہ کاری تھی۔ شلوار قمیص اس پر خوب جچتے تھے۔ وہ اس دن بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں اسے نظریں بھر بھر کر ایسے دیکھتا تھا جیسے اس کی حقیقت پر مجھے شبہ ہو۔ مجھے اونگھ لگ گئی تھی اور وہ اس دوران اپنے آپ کو سنوارتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔ میں جاگ کر پھر سے اس کی آنکھوں میں جا سویا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ آخری بار میرے لیے تیار ہوئی ہے۔ اس کی خوشیوں بھری وہ آخری رات ہے اور پھر سے ایک طویل انتظار۔ ایک ایسی جدائی جس میں کوئی ملاپ ہے یا نہیں۔ اسے سنورا دیکھا تو بڑھ کر گلے لگا لیا۔ اس سے کہتا تھا کہ اب اپنے سے تم کو کبھی جدا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک کمزور انسان اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھا جیسے سب اختیارات میرے ہاتھوں میں ہوں۔ میں اس کو اپنی دسترس میں سمجھنے لگا تھا۔ اس دن میرے قدم زمین پر مضبوطی سے پڑ رہے تھے۔ ایسے جیسے تخت میرے قدموں تلے ہو مگر وہ آخری شب تھی جس کے بعد میں نے اپنے آپ کو انتہائی بے بس، لاچار اور مجبور محسوس کیا۔ اس شب کے بعد ایسے گھاؤ لگے کہ زخم مندمل نہ ہوئے۔ میری زندگی ایک تیز دھار آرا بن گئی جو ہر روز مجھے چیرتی اور ہر شب مجھے ریزہ ریزہ کرتی۔

ہم اپارٹمنٹ سے روانہ ہوئے تو خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان کا ایک بڑا حصہ بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ فضا معطر تھی جب ہم ہمبر پارک پہنچے۔ یاد دلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ پارک میں نے تمہارے لیے ڈھونڈا تھا۔“

میں بولا۔ ”نہیں! اس پارک میں تم کو میں نے ڈھونڈ لیا تھا۔“

مسکرا کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں تمہیں یہاں تب لائی تھی جب ہم دوسری بار باہر ملے تھے۔ میں تمہاری پسند ناپسند جانتی تھی بھی تو تمہیں یہاں لائی تھی۔ تم نیویارک میں تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہو۔ جب تم نے فون کر کے بتایا تھا کہ میں آرہا ہوں تو

تمہارے لہجے سے ایسا لگا کہ کہا ہو میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ اس رات میں دیر تک جاگتی یہ سوچتی رہی کہ تم آؤ تو تم کو کیا پیش کروں کہ حیران رہ جاؤ۔ پھر سوچا تمہیں اس پارک میں لے آتی ہوں۔ جس کو قدرت کے مناظر اچھے لگتے ہوں اس کے لیے اس سے بہتر جگہ کون سی ہوگی؟ گو اس دن ٹھنڈک تھی مگر تم میرے ساتھ بہت خوش تھے۔ مجھے تحائف دیئے جو نیو یارک سے لائے تھے، یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ ایک بات کہتے کہتے اس دن رہ گیا تھا۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کون سی بات؟''

پارک میں دور لیک اونٹاریو کے کنارے درختوں کے جھنڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جب ہم وہاں بیٹھے تھے۔ ایک فاصلہ رکھ کر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ تم ہنسی تھی تو لگا کہ تمہارے اوپر اڑتے کچھ پرندے لحظہ بھر کے لیے رک گئے ہوں، شاید تمہاری ہنسی سننے کے لیے۔ اس لمحے ایک خوب صورت سا خیال تمہارے بارے میں دل میں آیا تھا۔ ایک ایسا خیال جس کو کوئی بھی خوب صورت عنوان دے دو۔ جیسے پیار، خیال، دوستی، چاہت، مسکراہٹ گہری آنکھیں، سیاہ زلفیں، خوب صورت ہاتھ۔ یہ نازک لب......'' پھر اس کی آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔ ہم اس راستے پر چل رہے تھے جو دونوں جانب درختوں سے گھرا تھا۔ درخت ہوا کے جھونکوں سے سرگوشیاں کررہے تھے۔ ہر جانب رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب سے گزرے جہاں مرغابیاں اپنے عکس پر تیرتی تھیں۔ کئی لوگ جوڑوں کی صورت چہل قدمی کررہے تھے۔ وہ ایک دوسرے میں گم تھے جیسے آس پاس کوئی نہ ہو۔ ہمارے بھی آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہم سارے پارک میں تنہا تھے۔ دل چاہتا یہ راستہ طویل ہوتا جائے۔ دل چاہتا چلتے رہیں۔ ان پھولوں کے درمیان چلتے رہیں۔ کوئی منزل ہو اور نہ کہیں پہنچنے کی آرزو۔ بس چلتے رہیں بھلے خاموش ہوں۔ چلتے چلتے آسمان پر چھائے اودے اور بھورے بادلوں میں چلے جائیں۔ اسی طرح چلتے رہیں اور یہ سفر نا تمام ہو۔

ہم جھیل کنارے چھوٹے درختوں کے اس کنج میں آبیٹھے جہاں پچھلی بار ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ سامنے نیلا پانی دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تیز ہواؤں کے باعث موجوں میں تلاطم تھا۔ دور پرے ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کی عمارتیں ساکت کھڑی تھیں۔ فضا میں پرندے زقندیں بھرتے تھے۔ کیا خوب صورت بے خودی میں گھرے لمحے تھے۔

وہ فاصلہ رکھ کر بیٹھی تھی۔ میں ذرا قریب ہوا تو ناز سے مسکرا پڑی۔ میں جھیل کے پانیوں میں دیکھنے لگا جہاں درختوں کا عکس جھومتا تھا۔ ہم خاموش بیٹھے ان کہی باتیں کرتے تھے۔ فضا میں پتوں کی سرسراہٹ اور موجوں کی گونج تھی۔ زندگی میں پہلی بار اپنا ماضی اور حال دونوں بھول بیٹھا تھا۔ ان لمحوں کا اسیر بن گیا تھا جن میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ مجھ سے پوچھتی تھی۔ ''میرے لیے آج اتنے رومینٹک ہوگئے ہو، مجھ میں کون سی ایسی تبدیلی دیکھ لی؟ کیا ایسا میں نے کردیا کہ میری حیثیت ہی بدل گئی؟''

وہ ایسے سوال کل سے کرتی آرہی تھی۔ ہر بار میرے جواب پر مسرتوں میں بکھر جاتی۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ تبدیلی صرف تم میں آئے۔ میں کیوں نہ بدلوں۔ تمہارے چھن جانے کا خوف مجھے تمہارے اتنا قریب لے آیا ہے۔'' اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''دل کرتا ہے تمہیں تنگ کروں۔ ستاؤں تم کو غصہ دلاؤں تاکہ تم روٹھ جاؤ۔ جب روٹھو تو مناؤں اور تم نہ مانو تو بار بار مناؤں۔''

پھر ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے پر سیاہ زلفیں بکھیر گیا۔ اپنی زلفیں ہٹاتے ہوئے وہ بولی۔ ''سچ بتاؤ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو؟''

میں نے پوچھا۔ ''تم بتاؤ یہ جھیل کتنی گہری ہے؟''

وہ بولی۔ ''معلوم نہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''مجھے بھی نہیں معلوم میرا پیار کتنا گہرا ہے۔''

اس نے پھر پوچھا۔ ''مجھ سے بچھڑ جانے کا خوف اس لیے تو نہیں کہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرنے لگے ہو۔''

بادلوں بھرے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''قیمتی چیز جب ملکیت بن جائے تو کھو دینے کا دھڑکا لگ جاتا ہے۔ نیکیاں بڑھ جائیں تو شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ کوہ نور مل جائے تو ہر کوئی چور لگنے لگتا ہے۔ تم ملی ہو تو بد دعاؤں سے خوف آنے لگا ہے۔''

کبھی باتیں کرنے لگتے اور کبھی اپنی اپنی سوچوں میں ایک دوسرے کی دنیا گھومنے لگتے۔ وہ اتنے قریب تھی کہ اس کی گرم اور معطر سانسیں میرا چہرہ چھوتی تھیں۔ اس کے

بالوں سے اٹھتی بھینی بھینی نسوانی خوشبو سے ہوائیں بھی بدمست ہوتی تھیں۔

جب سے کینیڈا آیا وہ میری زندگی کا حسین ترین دن بن گیا تھا۔ اس دن کے بعد میں ڈرا ڈرا رہنے لگا۔ جہاں کہیں کوئی خوش خبری سنی یا کوئی خوب صورت نظارہ دیکھا تو ساتھ یہ ڈر بھی اٹھتا کہ قضا پھر کچھ چھین لینے تو نہیں آگئی۔ اس نے مجھے سکھایا کہ محبت کیسے کی جاتی ہے۔ محبت کے کیا قرینے ہوتے ہیں۔ یہ بتایا کہ محبت بنا پائے کیسے نبھائی جاتی ہے۔ یہ بتایا کہ اگر پالے قطعیت کے انداز بدل جاتے ہیں پر محبت نہیں بدلتی۔ وہ یہ بھی بتا گئی کہ پیار ہمیشہ اداس اور محروم لوگوں سے ملتا ہے۔ یہ صرف جسمانی ملاپ نہیں بلکہ دلوں کا رشتہ بھی ہوتا ہے۔

میرے ایک کندھے پر اس کا سر اور دوسرے پر اس کے ہاتھ کی گرفت تھی جو کبھی نرم اور کبھی سخت پڑ رہی تھی۔ میری گردن پر اس کی کھلی اور بند ہوتی پلکوں کا لمس تھا۔

جھیل کے درمیان سے ایک کشتی گزری تو موجیں لپک کر کناروں کی جانب آئیں۔ کشتی کے مسافر دور سے ہاتھ ہلاتے گزر رہے تھے۔

سرشاری کے عالم میں وہ بولی۔ ''اچھا کیا کہ تم ٹورنٹو آگئے اور وینکوور یا مونٹریال نہیں گئے۔ اس سے اچھا یہ کیا کہ کین سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ یاد ہے پہلی بار کین سینٹر میں اشوک کمار کے دفتر کے اندر تم نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اشوک تمہارا اچھا دوست تھا۔ میں نے اپنا دل تم سے جوڑا تو وہ میری عزت کرنے لگا تھا۔ ہمیں اپنے دفتر میں بٹھا کر خود کاؤنٹر پر بیٹھ جاتا۔ جس دن تم نہیں آتے تو مجھ سے خود کہہ دیتا کہ آج اسے فون کرکے پوچھوں گا۔ ایران کا رضا تم سے چڑھتا تھا۔ تمہیں تو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ تم سے حسد کرنے لگا ہے اور تم اس سے ہر وقت بغلگیر ہوتے تھے۔ وہ بھی اچھے دن تھے جب تم کو اپنی تلاش تھی اور مجھے کسی کی۔''

وہ مجھ سے ایسی ہی باتیں کررہی تھی اور میں اس کی سانسیں گن رہا تھا۔

میرا اسے بہت کچھ کہنے کو دل کررہا تھا۔ بہت اچھا لگتا ہے اس سے اپنے دل کی باتیں کرنا جو آپ کے احساسات جانتا ہے جو آپ کی آواز کے زیر و بم سے آپ کی دماغی حالت بھانپ لیتا ہے اور آپ بھی اس کے دیکھنے کے انداز سے اس کی کیفیت جان جاتے ہیں۔ نسرین اور میرے درمیان ایسا ہی جذباتی تعلق بن چکا تھا۔ اس نے شاید مجھ سے پوچھا بھی نہیں مگر میں اسے بتانے لگا۔

''وہ دن جو تم یاد کررہی ہو۔ وہ میری ٹورنٹو کی جدوجہد کے ابتدائی دن تھے۔ مجھے کچھ بن کر فیملی کو جلد سے جلد بلانا تھا۔ مجھے اپنی چار سالہ بیٹی کی یاد شدت سے آتی جو اپنا ننھا ہاتھ میرے چہرے پر رکھ کر سوتی تھی۔ میں درد کی شدت سے رو پڑتا۔ اس سرد موسم میں تنہائی مجھے ڈستی تھی۔ تب پہلی حدت مجھے تمہاری آنکھوں سے ملی۔ تمہارے آنے سے پہلے یہ زمین میرے لیے سرد تھی۔ اس میں کوئی نرمی اور گداز نہ تھا۔ زندگی اداس اور بوجھل تھی۔ زمین برف سے ڈھکی ہوتی اور آسمان بے رنگ بادلوں سے بھرا ہوتا۔ ایک ہی طرح کے دن تھے۔ صبح سو کر اٹھتا تو گزرا کل دوبارہ سے شروع ہو جاتا۔ نئی تاریخ کا پرانا دن۔ وہی کپڑے، وہی جیکٹ اور وہی جوتے جنہیں دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔'' کہیں سو تو نہیں گئی یہی دیکھنے کے لیے اس کی طرف چہرہ موڑا اور اسے دیکھ کر بولا۔ ''میری ایک ہی طرح کی سوچوں کی وجہ سے جذبات کہیں برف میں دفن ہو گئے تھے۔ تمہیں تو شاید معلوم بھی نہیں کہ میرے کپڑوں تلے سیکیورٹی گارڈ کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ کین سینٹر سے سیدھا سیکیورٹی کی جاب پر جاتا اور اوپر کا لباس اتار کر سیکیورٹی گارڈ بن جاتا۔ کیا دن تھے وہ جب نہ یہ نظارے جاذب نظر تھے اور نہ کوئی خوب صورت رفاقت میسر تھی مگر جب تم نے دل کے تار چھیڑے تو برف پگھلنے لگی۔ غبار چھٹے اور مناظر روشن ہوتے گئے۔'' اسی دوران اس نے کندھے سے سر اٹھایا اور مسکرا کر دیکھنے لگی۔ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی ناک پکڑ کر اپنی جانب آہستگی سے کھینچی تو وہ ساری کی ساری چلی آئی۔

کچھ دیر بعد ہم اس منظر سے اٹھے اور دوسرے منظر میں آبیٹھے۔ یہ دوسرا مقام بھی برا نہ تھا۔ ہوائیں زور سے چل رہی تھیں۔ شجر جھوم رہے تھے۔ ہر جانب پھول تھے جو اپنی شاخوں پر لہرا رہے تھے۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھے تھے جو لوگ چہل قدمی کررہے تھے وہ اب اوجھل تھے۔ شاید موسم کے تیور دیکھ کر چلے گئے تھے۔ پرندے خاموش ہو گئے۔ گھٹا چھائی اور پھر مینہ برسنے لگا۔ بادلوں نے اپنے منہ ایک ساتھ کھول دیے۔ آسمان سے جھرنے بہنے لگے۔ تیز ہوائیں بارش کے پانیوں کو اڑائے پھر رہی تھیں، مینہ کی بوچھاڑ ہمارے قدم جمنے نہیں دے رہی تھی۔ بارش سب کچھ زیروزبر کیے جارہی تھی۔ ہم بھاگ بھاگ کر درختوں کی پناہ لینے کی

وشش کررہے تھے۔ اسے بارش سے بچانے کے لیے ہر
رح کے جتن کررہا تھا۔ اپنی اسپرنگ جیکٹ سے میں نے
س پر سائبان بنایا مگر وہ کبھی بھیگ جاتی اور کبھی بچ جاتی۔
اخوں اور پتوں کے بے پناہ شور سے ڈر کر وہ مجھ سے لپٹ
ئی۔ اپنے بھیگنے پر مجھے تردد نہ تھا فکر اس کی تھی کہ بید مجنوں
ی شاخ جیسی نازک لڑکی کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ پانی سے اس
کے بال چہرے پر چپک گئے۔ وہ میری بھیگی شرٹ میں منہ
چھپائے کھڑی تھی۔ گرفت اتنی شدید کہ آخری بار مل رہی
ہو۔ اس کا گرم گرم معطر سانس میرے رخساروں کو چھونے
لگا۔

بارش کا شور کچھ دیر جاری رہا جس تیزی سے آئی تھی
سی طرح اچانک تھم گئی مگر ہوائیں پانی کے قطرے لیے
جھومتی ہوئی چلتی تھیں۔ چھتوں سے ٹپ ٹپ پانی گرنے کی
آوازیں تھیں اور پھر دم توڑتی ہواؤں کا شور تھا۔ موسم بھیگ
گیا۔ اردگرد دیکھا تو دور دور تک ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہ
تھا۔

بارش رکی تو غول کے غول پرندے اڑ رہے تھے۔
ادل پھٹے اور سورج کی کرنیں جھانکنے لگیں۔ سورج کی نارنجی
روشنیوں سے پرندے چمک رہے تھے۔ بارش نے قدرت
کے رنگ اور زیادہ نمایاں کردیے۔ تتلیاں کہیں سے نمودار
ہوئیں اور ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ پھروں کو کوئی بوسا
لا تو مچل اٹھیں۔ ہواؤں کی تلخی نرمی میں بدلی اور کوئی
سندیسے سنانے چلی آئیں۔ گلوں نے کہیں سے کوئی عرق
چرایا تو تتلیاں ان کے گرد رقص کرنے لگیں۔

اس کے چہرے پر چھائے بھیگے بالوں سے پانی
موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ اس کے گیلے ہاتھ ہولے سے
کپکپا رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں کو اپنی ہتھیلیوں کے
درمیان چھپایا تو میری آنکھوں میں دیکھ کر حیا سے اپنی نظریں
جھکا لیں۔ کشش اور پیار کی سنسناہٹ اس کی انگلیوں کے
پوروں میں بھٹکی تھی۔

آج اس میں بلا کی دلفریبی تھی۔ اس کی آنکھوں کی
گہرائیوں میں ایک طوفان برپا تھا۔ شاید وہ ہمیشہ سے ایسی
ہو گی کیونکہ آج میں اسے مختلف نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں
اپنا ہر لمحہ اس کے لیے وقف کرچکا تھا۔

میں سوچ رہا تھا جب میں قدرت کے حسین مناظر کا
حسن بیان کرسکتا ہوں تو اس کے حسن کی تعریف کیوں کر نہ
کروں۔ اس کے بھیگتے سلگتے حسن کی تعریف نہ کرنا بھی
قدرت کی تعریف سے منہ موڑنا مجھے لگا۔ اس کا ہاتھ تھام کر
جذب وکیف کی کیفیت میں پڑا۔

"جس تعریف کے تم لائق تھی وہ میں نے کبھی نہ کی۔
آج صدق دل سے کہتا ہوں کہ تمہارا روپ اس جہاں کا
نہیں بلکہ کسی اور جہاں کا لگتا ہے۔ دودھ میں شہد گھولو، کچھ
گلابی پھولوں کی پتیاں ڈال کر ذرا سا زعفران چھڑکو تو تمہارا
یہ رنگ نکل آئے۔ بال ایسے کہ چاند کو سیاہ بادلوں نے گھیر
رکھا ہو۔ آنکھیں ایسی کہ دو گہری جھیلیں ہوں اور......"

میری بات کے درمیان ہی ہنس پڑی۔ ہنستی رہی رکی
نہیں۔ ہنستے ہنستے بولی۔ "تمہاری زبان سے اتنی تعریف جچتی
نہیں۔ یوں لگتا ہے مذاق اڑا رہے ہو۔ تعریف نہ ہی کرو تو
بہتر ہے۔ میری تعریف کرنی ہو تو زبان سے نہیں بلکہ
آنکھوں سے کیا کرو جس طرح سے کرتے آرہے ہو۔
میرے قصیدے ایسے کررہے تھے جیسے خبریں پڑھ رہے
ہو۔"

شرمندگی سے بولا۔ "اسی لیے تو کسی کی تعریف اس
کے سامنے نہیں کرتا۔ میں الفاظ سے زیادہ جذبوں سے کام
لیتا آرہا ہوں۔ مجھے تو زندگی میں کوئی ایسا ساتھی چاہیے جو
میرے الفاظ سے زیادہ میرے کردار کو سمجھے۔ الفاظ تو کوئی
جھوٹ بول کر بھی ادا کرسکتا ہے مگر متواتر ایک عمل میں
جھوٹ کم ہی ہوتا ہے۔ کچھ کہہ نہ پانا میری کمزوری ہے اور
کوئی تو ہو جو اس کمزوری کے ساتھ میرا ساتھی بنے۔"

"اتنے کم عرصے میں تم کو یہ جان پائی ہوں کہ تم
شرمیلے ہو۔ اندر جذبات تو رکھتے ہو مگر بولنے سے شرماتے
ہو۔ تمہیں خوف یہ ہوتا ہے کہ اگر سننے والے نے تمہارے
الفاظ کو ایک بار جھوٹ کہہ دیا تو تمام عمر اس سے کچھ کہہ نہ پاؤ
گے۔ کوئی تمہارے احساسات کو جھوٹ کہہ دے یہ تم
برداشت نہیں کرسکتے اور اس لیے زبان کا استعمال کم کرتے
ہو۔ جس گرفت سے تم مجھے لیے کھڑے ہو یہی مضبوطی ہزار
باتیں مجھ سے کہہ رہی ہیں۔" وہ خوب صورتی سے میری
عادات کا خلاصہ بیان کرگئی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "اور
تمہاری بیوی...... وہ کیا تمہارے اظہار نہ کرنے کی عادت کو
قبول کرچکی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کی آنکھوں میں کئی
سوال ابھرے۔ میں نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے اسے
بتایا۔ "وہ زبان سے اظہار کو زیادہ اہم سمجھتی ہے اور اسی لیے
اکثر خفا رہتی ہے۔ کئی بار پیار سے، لڑ کر، شور مچا کر اور ہر حربہ

استعمال کر کے اسے سمجھا چکا ہوں کہ میری اس کوتاہی کو نظر انداز کرلو مگر میری یہ عادت ایک بڑی برائی بن گئی ہے اس کی نظر میں۔ ہماری شادی کے دو ماہ بعد عید تھی۔ وہ چاند رات کو توقع لگا بیٹھی کہ اس کے لیے چوڑیاں اور مہندی لے آؤں گا۔ ان چیزوں کی نزاکت کا مجھے کیا ادراک۔ سیدھا سا دیہاتی ذہن کا انسان ہوں۔ خالی ہاتھ گھر رات کو آیا تو بہت روئی تھی۔ میں آج تک اس کے رونے پر شرمندہ ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "پھر بعد میں چوڑیاں اور مہندی تو لائے ہوں گے؟"

"نہیں! کبھی نہیں لایا۔ کوشش بہت کی مگر چوڑیاں خریدنا میرے بس سے باہر ہے۔"

وہ سن کر ہنس دی، بولی۔ "اگر یہ کہتے کہ میں لاتا تھا تو کبھی یقین نہ کرتی۔ اتنا تو تمہیں میں جان گئی ہوں۔ تم اپنا اظہار خوب صورت مناظر، اچھی شاعری، دلفریب موسیقی اور اپنے لکھے الفاظ سے زیادہ کرتے ہو۔"

میں آسمان کے اس حصے کو دیکھنے لگا جواب گہرا نیلا اور شفاف تھا۔ ہواؤں سے جو بادل رہ گئے تھے وہ کہیں کہیں لہرا رہے تھے۔ ان بادلوں نے عجیب وغریب قسم کی شکلیں اختیار کرلی تھیں۔ آسمان کے ایک حصے پر تین بلند چٹانیں بن گئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عظیم الشان ٹرانگو ٹاورز ہوں۔ وہ ٹرانگو ٹاورز جو کنکورڈیا کے ٹوبیس کیمپ کے راستے پر پڑتے ہیں۔ زمین سے آسمان کی بے کراں وسعتوں میں چھید کرتے ٹرانگو ٹاور جو قراقرم کے پہاڑوں کی ہیبت میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔ بارش کے بعد نہ ہی کیچڑ ہوا اور نہ کہیں پانی کھڑا تھا۔ راستوں پر پڑی پانی کی تہہ سے زمین نمودار ہوئی۔ گھاس اور پھولوں کے رنگ اور نکھر گئے۔ زمین و آسمان سب دھل کر ایسے لگتے تھے کہ دنیا کی تخلیق کچھ لمحے پہلے ہوئی ہے۔ گھاس کے ٹکڑوں پر پڑے بارش کے قطرے آئینوں کی طرح چمکنے لگے۔ ہم چلتے ہوئے پارک میں بنی ایک جھیل کے کنارے بینچ پر آبیٹھے۔ جھیل کے گرد درختوں اور جھاڑیوں پر چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شور تھا۔ پانی میں مرغابیاں تیر رہی تھیں۔ جھیل کی سطح آسمان کے لیے آئینہ ہی تھی۔ آسمان کا نیل و نیل الگ، بادل اور ان کے سارے رنگ، اڑتے پرندے جھیل میں عکس کی صورت واضح نظر آتے تھے۔

کچھ دیر پہلے جو ہم بھیگ رہے تھے اور پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے چلتی ہوا نے ہمیں خشک کردیا۔ پہلے جو وہ سہمی ہوئی تھی مگر اب مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"ایران میں تمہارا خاندان ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں ان کی کمی محسوس ہوگی۔ گو یہاں تمہارے پاس ہوں مگر میرے اکیلے کا ساتھ ان کی کمی پوری نہیں کرسکتا۔ زیادہ نہیں تو کم ہی مگر رابطہ تم کو رکھنا چاہیے۔ راستے بند مت کرو۔ وقت کی دھول تو راستوں کے نام ونشان تک مٹا دیتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی چبھن کا شکار ہو جاؤ۔"

وہ اداسی سے بولی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟ تم چاہتے ہو میں واپس چلی جاؤں؟"

اس کا ہاتھ تھام کر میں نے کہا۔ "ہرگز یہ نہیں کہتا کہ واپس چلی جاؤ۔ بھائی تم کو بلا رہے ہیں۔ بڑا بھائی بیمار ہے۔ تم تو اس کی بیماری کا یقین کرنے کو بھی تیار نہیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ وہ واقعی بیمار ہو۔ پھر اتنی بڑی جائیداد میں تمہارا حصہ بھی ہے اور بھائی تمہیں وہ حصہ دینا بھی چاہتا ہے۔ اپنے لیے نہیں تو سعد کے لیے وہ پراپرٹی کام آئے گی۔ اسے بیچ کر یہاں گھر لے سکتی ہو۔ دو ہفتوں کے لیے ہی چلی جاؤ۔"

آہستگی سے بولی۔ "دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ دونوں بھائی مجھے عزیز بھی ہیں مگر اب مجھے اعتبار نہیں رہا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چھوٹا بھائی اب بڑے بھائی سے شکوہ کرتا ہے کہ بہن کو ہم نے اکیلا کردیا ہے۔ تن تنہا کینیڈا میں رہ رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے واپس آجاؤں۔ کہتے ہیں کہ واپس جاکر جس طرح چاہوں اپنی مرضی سے زندگی گزاروں۔ ایک بار گئی تو بھائی شاید مجھے واپس نہ آنے دیں۔" پھر میرے سینے پر سر رکھ کر بولی۔ "تمہارے بغیر میں نہیں رہ سکتی۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔"

میں نے بے چینی سے کہا۔ "تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا کہ وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے بلانا چاہتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "اس لیے نہیں بتایا کہ تم نے پہلے کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ جاکر ان سے مل آؤں۔ نہ میں نے جانا ہے اور نہ تم نے جانے دینا ہے۔ اس لیے کچھ نہیں بتایا۔"

یہ سن کر کہ اس کو دونوں بھائی مکمل طور پر واپس بلانا چاہتے ہیں تو میں نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری سی آگئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جائے گی۔ میں اپنے آپ کو یہ سوچ کر کوس رہا تھا کہ کیوں اسے ایران جانے کا مشورہ دیا۔

میں اس سے بولا۔ "اب تو تمہیں کبھی نہیں جانے

دوں گا۔ تم نے تو مجھے ڈرادیا ہے۔ تم کہیں کھوگئی تو کہاں تم کو ڈھونڈوں گا۔ ابھی تم آرام سے اِدھر رہو۔ بعد میں سوچیں گے کہ تمہارا رابطہ تمہارے خاندان سے کس طرح جوڑا جاسکتا ہے۔" میں اس کی باتیں سن کر مضطرب ہوگیا تھا۔ اگر کبھی وہ اپنے ملک جانا بھی چاہتی تو میں نے بہرحال بے حد فکرمند ہوجانا تھا کہ وہ واپس آئے گی یا نہیں۔

وہ کہنے لگی۔ "میں سوچتی ہوں کہ چھوٹے بھائی کو سپانسر کرکے بلوالوں۔ وہ یہاں ہوگا تو میرا ایران آنا جانا آسان رہے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا کیس یہاں سے تیار کرکے بھیج دیں گے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

ایک کانٹا میرے دل میں چبھ گیا تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت گھرانے کی لڑکی تھی۔ اسے آئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے گھر والوں کو ایک دن اس کی فکر ہونی ہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے تو مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔ اگر کبھی اس کے دل میں بھائیوں کی محبت یا پھر بچپن کی یادیں جاگ اٹھتیں تو اسے میں روک بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس زاویے سے سوچا بھی نہ تھا۔ آج اس نے میری سوچ کے دھارے اس جانب موڑ دیئے تھے۔ وہ میرے لیے اتنی قیمتی ہوگئی تھی کہ اسے اپنی بانہوں کے حصار سے بھی باہر نہیں نکلنے دے رہا تھا۔

میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے آہستگی سے اس سے پوچھا۔ "اکثر ایک بات سوچتا رہتا ہوں، کم عمری میں تمہاری شادی ہوگئی۔ پھر سعد پیدا ہوا۔ پہلے بھائیوں نے تمہیں پابندیوں میں رکھا تھا اور پھر شوہر نے۔ سعد ہوا تو تم گھر میں بند ہوگئیں۔ تم ہمیشہ ڈری اور خوف زدہ رہتی تھیں۔ شوہر کی قید سے نکلی تو کچھ ماہ تہران میں ماموں کے پاس گزارے اور پھر کینیڈا آگئیں۔ یہ بتاؤ کہ اتنی سمجھداری، لوگوں سے برتاؤ، کون سی بات کہاں کرنی ہے اور کہاں نہیں، یہ سلیقے، یہ طریقے، یہ دانش کی باتیں......! یہ سب کسی تجربے کا نچوڑ ہیں جو تم کو کبھی ملا۔ والدین نے بھی نہیں سکھایا کیونکہ وہ شروع میں ہی وفات پاگئے تھے اور نہ بھائیوں نے کوئی توجہ تم پر دی۔ مجھے یہ بتاؤ یہ دنیاداری تم نے کہاں سے سیکھی کہ میری بھی استانی بن بیٹھیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "تجربہ صرف وہ نہیں ہوتا جو کسی چیز کے حصول کے لیے آپ کی کوشش یا جستجو آپ کو دیتی ہے۔ زندگی کا بڑا تجربہ آپ کو آپ کی محرومیاں اور نامراد خواہشیں دیتی ہیں۔ مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے بکھرنے کا تجربہ ہے۔ اپنی نامکمل خواہشیں دفن کردینے کا بہت تجربہ ہے۔ اپنی ضرورتوں کو کچلنے کا تجربہ ہے۔ اس اذیت کا تجربہ ہے جب شوہر کا ہاتھ پہلی بار بلاوجہ مجھ پر اٹھا تھا اور پھر وہ ہاتھ اٹھتا چلا گیا اور میں تجربات سے گزرتی رہی۔ تم کہتے ہو کہ میں ڈگری لے کر اپنے آپ کو سنواروں تو تمہاری یہ خواہش میں ضرور پوری کروں گی مگر اپنے آپ کو سنوارنے کے مراحل سے میں پہلے ہی گزر چکی ہوں۔"

بڑے پتے کی بات کر گئی تھی۔ مجھے سوچ میں پاکر بولی۔ "ضروری نہیں کہ زندگی کے ہر کھیل میں آپ کے پاس اچھے کارڈز آپ کے ہاتھ میں ہوں۔ برے ہاتھوں سے کھیل کر بھی جیتا جاسکتا ہے۔ تمہارے دل کو بھی تو آخرکار جیت ہی لیا ہے۔" یہ کہہ کر ہنس دی۔

میں اس سے بولا۔ "تمہارے پاس پیار کی اتنی بڑی طاقت ہے کہ مجھے جیتا نہیں بلکہ ہرادیا ہے۔ ہار کر میں نے تم کو پایا ہے اور کھویا کچھ بھی نہیں۔" اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولا۔ "دن نہیں بلکہ لمحے یاد رہ جاتے ہیں۔ اتنے خوب صورت پل میں کبھی نہیں بھول سکوں گا جو آج تمہاری محفل میں گزرے۔ یہ پل میری ساری حیات پر بھاری ہیں۔ بہت وزن ہے ان لمحوں کا۔ بہت زیادہ۔"

پھر سورج افق کے پار ڈھلنے لگا۔ افق پر پھر سے سونا پگھلنا شروع ہوا اور چہرہ اس کا گلابی ہوگیا۔ سارا جہاں رنگین ہوا تو چھوٹی جھیل بھی رنگوں میں ڈھلتی چلی گئی۔ وہ بھی آسمان کی طرف دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ کہتی تھی۔ "یہ دنیا کتنی خوب صورت ہے پر ہمیں نظر کیوں نہیں آتی جب دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں بولا۔ "باہر کی خوب صورتی نظر نہیں آتی جب اندر اداسی بھری ہو۔ دل متحیر ہو تو تمہارا یہ خوب صورت ساتھ اسے موم کرسکتا ہے مگر کسی سنگدل کی رفاقت تو دنیا ہی ویران کرجاتی ہے۔"

آج وہاں سے اٹھنے کو جی نہ کرتا تھا۔ اٹھ جاتے تو پیار کی یہ مالا ٹوٹ جاتی جو دونوں نے مل کر پروئی تھی۔ ملگجا اندھیرا پھیلا تو اس کا چاند چہرہ چمکنے لگا۔ میرے ہونٹوں نے اس کے چہرے کو چھوا تو اس نے مزاحمت نہ کی۔ نشان اس کے چہرے پر پڑے تو ہاتھوں سے صاف کرنے لگا مگر اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔ بولی۔ "یہ نشان نشانی بن کر رہنے

دو۔" اور میں بہت سی نشانیاں اسے دے آیا۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو اندھیرا پھیلا تھا۔ میں بار بار مڑ کر پارک کے وہ گوشے دیکھتا تھا جہاں ہم آج بیٹھے رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اس شام مجھے پارک سے بچھڑنے کا ملال تھا۔ وہ ساتھ بھی تھی مگر معلوم نہیں موہوم سی اداسی کیوں چھائی تھی۔ مجھے اپنی غمگین کیفیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ وقت ٹھہر جاتا اور میں اس کے ساتھ گزرے لمحے چھتا رہتا۔ میں بہت دیر اسے بانہوں میں لیے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ ہم دوبارہ بھی یہاں آئیں گے؟ میں ہاں میں جواب دیتا مگر کیا معلوم تھا مجھے کہ پھر یہاں آؤں گا، بار بار آؤں گا مگر اکیلا۔ اس کی یادوں کی شمعیں روشن کیے ہر اس جگہ بیٹھوں گا، یہاں جہاں وہ میرے ساتھ میرے سینے سے لگ کر بیٹھی تھی۔ سب مناظر وہی ہوں گے۔ سب رنگ وہی ہوں گے مگر وہ ساتھ نہ ہوگی اور تب یہ سب نظارے، رنگ پھیکے لگیں گے۔

ہم سعد کو سالگرہ پارٹی سے لے کر واپس اپارٹمنٹ پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ سعد سالگرہ کا احوال تفصیل سے بتا رہا تھا۔ بولتے بولتے تھک جاتا تو سانس درست کر کے دوبارہ بتانے لگتا۔ میں اسے گود میں لیے بیٹھا ہاں ہوں میں جواب دے رہا تھا۔ اس کی ماں سے میں نے کہا تھا کہ دوپہر والا پیزا مائیکرو وویو میں گرم کردے مگر معلوم نہیں وہ کچن میں دیر سے کھسی کیا کر رہی تھی۔ اس وقت اپنی شکل دکھاتی جب باہر آکر سعد سے کہتی کہ "کیوں اتنا بول رہے ہو۔ سانسیں تو درست کرلو، انکل کو کیا تھکا رہے ہو۔" یہ کہہ کر پھر غائب ہو جاتی۔ میں کسی نامعلوم اداسی میں گھرا خاموش بیٹھا تھا۔

وہ پیزے کی جگہ میرے لیے مٹن بنالائی۔ وہ کھانے کے معاملے میں صرف اپنی سنتی تھی۔ میں نے بھی اس سے بحث کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کھانا میز پر لگاتے ہوئے بولے چلی جارہی تھی۔ "باہر کے کھانے میں معلوم نہیں کیا ملاتے ہیں۔ کوئی غذائیت نہیں ہوتی۔ ایسی چیزیں کھا کھا کر شکل کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ اپنی عمر سے زیادہ کے لگنے لگے ہو۔ وزن گر گیا تھا...... اور...... وغیرہ وغیرہ۔"

میں ہاتھ باندھ کر بولا۔ "میرے وزن کو واقعی میری چڑ بنا دیا ہے۔ زہر بھی دو تو کھالوں گا مگر وزن کے طعنے کیوں دیتی ہو۔ لگتا ہے جان بوجھ کر ستاتی ہو۔ غصہ دلاتی ہو۔"

کچن میں جاتے ہوئے بولی۔ "جتنا بھی غصہ کرلو، مجھے فرق نہیں پڑے گا۔ بات تو میں ٹھیک کر رہی ہوں۔"

میں نے بے بس ہو کر سعد سے کہا۔ "My Little friend...we both are on some boot."

اس نے جواب دیا۔ "Off cousie! uncle nadem."

☆......☆

کھانا کھا کر سعد سو گیا اور ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ آج وہ اپنی سیٹ پر نہیں بلکہ میرے ہمراہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ پاؤں اسی طرح کافی ٹیبل پر تھے۔ میری تصویروں کے البم اور میری ویڈیوز اس کے پاس پڑی تھیں۔ ایک بار اسے دیکھنے کے لیے دی تھیں تو واپس نہیں لے جاسکا تھا۔ لڑ جھگڑ کر میری شادی کی ویڈیو دوبارہ دیکھ رہی تھی۔ میں اس لیے نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ شادی کی ویڈیو میں میری مونچھیں اور بڑھی شیو دیکھ کر ہنستے ہنستے دوبھر ہو جاتی تھی۔ کئی بار تو اس کے ہنسنے پر مجھے اپنی تضحیک محسوس ہوئی۔ اظہار بھی کیا مگر باز نہ آتی تھی۔ ویڈیو میں مجھے بہنیں رنگین دوپٹا اوڑھائے میرے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھیں اور ادھر یہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ میں اسے کہتا کہ یہ ہنسنا بند نہ کیا تو سعد کے پاس اندر سونے جارہا ہوں۔ میں بے زار ہو کر اٹھنے لگتا تو بازو سے کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیتی۔ بہت پچھتاتا تھا بعد میں کہ کیوں اسے ہنسنے سے روکتا تھا، پھر اسے ہنستے نہ دیکھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ پاگل ہو گئی ہے۔ عجیب وغریب حرکتیں کر رہی تھی۔ میری مہم جوئی کی تصویریں دیکھ کر میرا مذاق اڑاتی۔ خفا ہوتا تو بازو پر زور سے چٹکی بھرتی۔ میں غصے میں ڈانٹتا تو گلے لگ جاتی۔ ایسے جیسے کھلونا سمجھ کر مجھ سے کھیل رہی ہو۔ جب کہتا کہ جا کر سو جاؤ مجھے نیند آرہی ہے تو کہتی۔ "آج ساری رات جگاؤں گی۔ اپنی مرضی سے یہاں ٹھہرے ہو تو میری مرضی سے رات گزارو گے۔"

جب شرارت سے پوچھا کہ آخر تمہاری مرضی ہے کیا تو اپنے نازک ہاتھوں کے مکے بنا کر مارنے لگتی۔ کبھی بہت دیر خاموش رہتی اور کبھی بولتی چلی جاتی۔ بہت عجیب لگ رہی تھی وہ اس رات۔ یہ وہ نسرین نہ تھی جسے میں جانتا تھا بلکہ یہ تو کوئی شیدائی نسرین تھی۔

بہت دیر جاگے ہم اس رات۔ وہ رات گئے تک متواتر بولتی رہی تھی۔ شاید تھک گئی تھی جبھی تو میرے گھٹنوں پر سر رکھے سو گئی۔ بڑی احتیاط سے میں اٹھا کہ کہیں جاگ نہ

جائے مگر وہ جاگ گئی اور پھر آنکھیں موندھ لیں۔ اس کے سر تلے تکیہ رکھا۔ اندر سے کمبل لا کر اس پر ڈالا اور بہت دیر اس کے سرہانے بیٹھا اس کے بال سنوارتا رہا۔ اسے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ میرا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا تو مسکان اس کے لبوں پر تھی اور بہت دیر تک رہی۔ آخر کار اسے سلا دیا، خود اندر جا کر سعد کے ہمراہ لیٹ گیا۔

☆......☆

آج میرے اندر بے چینی بھری تھی۔ وہاں سے اٹھ کر آیا تو دوبارہ اداسی بھر گئی۔ کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند کہیں کھو گئی تھی۔ لیٹے لیٹے اٹھا کہ دوبارہ اس کے پاس جا کر اس سے باتیں کروں۔ باہر آیا تو وہ گہری نیند میں ڈوبی تھی۔ اچھا مرد، عورت کی نیند کا احترام کرتا ہے۔ میں نے بھی احترام کیا اور آج اس کی سیٹ پر آنکھیں بند کیے بیٹھ گیا۔ لائٹ بند تھی مگر چاند کی پھیکی اور اداس روشنی لیونگ روم میں پھیلی تھی۔ خاموشی اتنی کہ اس کی دھیمی سانسوں کی آواز آتی تھی۔ اندھیرا سا محسوس ہو رہا تھا مگر وہاں سے بھی اس کا چہرہ کسی چاند کی طرح چمکتا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کمبل اوڑھے ایسی سوئی تھی جیسے سارے دکھ نمٹائے سکھوں کی چادر اوڑھے ابھی لیٹی ہے۔ کمبل اس کے پاؤں سے ہٹا تو جا کر میں نے پاؤں کمبل سے ڈھانپ دیئے۔ تھوڑا سا کسمسائی مگر پھر بے سدھ ہو گئی۔

میں نے کبھی اس کے اپارٹمنٹ میں سگریٹ نہیں پی تھی اور اس رات بھی شدید طلب کے باوجود سگریٹ نہ سلگا سکا۔ سوچا کہ اس کے قریب جا کر اس کی سانسیں سونگھتا ہوں مگر پھر سوچا کہ اچانک اٹھ گئی تو ڈر جائے گی۔ اگر ایک بار مچل گئی تو اوسان بحال ہونے میں دن نکل آئے گا۔

اسے سوتا چھوڑ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ گو چاند آسمان پر بڑا تھا مگر چاندنی پھیکی پھیکی تھی۔ آج بجھا بجھا چاند بدلیوں سے کھیلتے کھیلتے تھکا ہارا ساکت کھڑا تھا۔ بے زار چاند تھا یا کہ میں، سمجھ نہ پایا مگر کوئی ایک تو تھا۔ کچھ دیر کھڑکی میں کھڑا رہا اور پھر میں اور چاند دونوں اکتا گئے۔ وہ بادلوں میں چھپا اور میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں کافی ٹیبل پر دراز کیں اور یوں آنکھ لگ گئی۔

کچھ دیر ہی سویا ہوں گا کہ وہ مجھے جگا رہی تھی۔ آنکھیں کھولیں تو سورج کی ہلکی روشنی لیونگ روم میں پھیلی تھی۔ وہ حیرت کے عالم میں مجھے جگا رہی تھی۔ وہ بہت متعجب تھی۔ بولی۔ ”کیا ساری رات یہیں سوتے رہے؟“

مجھے بدستور نیند کے عالم میں پایا تو کہنے لگی۔ ”شاید کمرے میں نیند نہیں آ رہی ہو گی تم صوفے پر سو جاؤ میں کھڑکی کے پردے گراتی ہوں۔“

وہ کھڑکی کی جانب گئی کہ اتنے میں فون کی کرخت گھنٹی بجنے لگی۔

بڑبڑاتی ہوئی واپس ہوئی اور فون اٹھایا۔ میں اسی دوران صوفے پر لیٹ چکا تھا۔ کمبل اپنے پر ڈال کر چہرے پر لے رہا تھا کہ اس کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ کوئی دکھ، کوئی کرب اس کے لہجے میں تھا۔ میری نیند اڑ گئی اور اٹھ بیٹھا۔ وہ فارسی میں زور زور سے بات کر رہی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا کہ فون ایران سے ہے۔ چہرہ اس کالٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ بات کرتے کرتے نڈھال ہو کر سعد کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اٹھ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ فون بند ہوا تو وہ رونے لگی۔ میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ تھامے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ بار بار پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے مگر وہ جواب نہ دے پا رہی تھی۔ روتی چلی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی بری خبر تھی مگر میں معلوم کرنے میں بے چین تھا کہ خبر کیا ہے۔ اسے اٹھا کر صوفے پر بٹھایا اور دوڑ کر پانی کا گلاس فریج سے بھر کر لایا۔ زبردستی پانی پلایا اور پانی کچھ چھلک کر اس کی قمیص پر آ گرا۔ آخر کار بول پڑی۔ ”بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ چھوٹے بھائی نے فون پر ابھی اطلاع دی ہے۔“

یہ وہی بھائی تھا جس نے جائیداد کے لالچ میں اس کی شادی اپنے ایک ملازم سے کر دی تھی۔

یقینی طور پر اس کے لیے بڑا صدمہ تھا۔ قریبی عزیز کی مرنے کی خبر اگر پردیس میں ملے تو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ وہ تو بری طرح سے روئے چلے جا رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ میں تو بھائی کی بیماری کو ڈھونگ سمجھ رہی تھی۔ مجھے تو خیال بھی نہ تھا کہ وہ اتنا بیمار ہے کہ مجھے بلاتے بلاتے خود چلا جائے گا۔ مجھے کتنی منت سماجت سے فون کر کے بلاتا تھا۔ کہتا تھا کہ اپنا کیا میری جائیداد کا حصہ بھی لے لو مگر ایک بار میرے مرنے سے پہلے اپنا چہرہ تو دکھا جاؤ۔ میں بھی کتنی خود غرض ہوں کہ اپنی پسند اور خوشی کے آگے بھائی کھو بیٹھی۔

میں اسے صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اللہ کی مرضی اور بھائی کے لیے دعا و مناجات کی باتیں کر رہا تھا مگر وہ پچھتاؤں کی دلدل میں گر کر دھنستی چلی جا رہی تھی۔ اتنا رو رہی تھی کہ میں پریشان ہو گیا۔ اس کو کہتا رہا کہ خود کو سنبھالو

ورنہ سعد پریشان ہو جائے گا۔ ایسا لگتا کہ وہ میری بات سن ہی نہیں رہی۔ صوفے کے کونے میں منہ دیئے بیٹھی ایسے رو رہی تھی کہ اس کا جسم لرز رہا تھا۔

تسلی کے ہمیشہ چند جملے ہوتے ہیں جو میں بار بار دہرا چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہرگز چپ نہ ہوگی جب تک تھک نہیں جاتی۔ وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں ہوتا۔ میں بھی دل میں سوچتا کہ جتنا زیادہ روئے گی تو دل کا غبار باہر نکال پھینکے گی۔ اپنے بھائی کی باتیں کرے گی۔ بچپن کے قصے بیان کر کے اپنا دل ہلکا کرے گی۔ اسی دوران اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کے لیے میں موجود ہوں گا تو آہستہ آہستہ اسے قرار آتا جائے گا۔

اسے زبردستی گھما کر اپنے سامنے کیا تو آنکھیں کیا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ سر کے بال بکھرے اور ہونٹ نیلے پڑے تھے۔ میں اسے گلے لگا کر دلاسے دیتا رہا۔

ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے چند دنوں میں واپس جانا ہو گا۔ چھوٹا بھائی بلا رہا ہے۔ نہ گئی تو ہم دونوں مر جائیں گے۔''

سن کر میرے سر پر ایک پہاڑ پھٹا اور اپنے ساتھ مجھے بھی ریزہ ریزہ کر گیا۔ کل ہی تو کہہ رہی تھی کہ گئی تو مجھے واپس نہیں آنے دیں گے اور آج واپسی کی باتیں کر رہی تھی۔ سوچا صدمے کی حالت سے باہر نکلے گی تو اپنے ارادے پر قائم نہیں رہے گی۔ اسے کہوں گا کہ ابھی نہیں بلکہ کچھ ماہ بعد سردیوں میں چلی جانا۔ میری بات وہ کیسے ٹال سکتی تھی۔

مجھے ادراک تھا کہ اب گئی تو واپسی کبھی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر بھی میں لرز گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ جب وہ یہ کہتی تھی کہ میں واپس جا رہی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا کہہ رہی ہو تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ واپسی تو صرف اصل منزل کی جانب ہوتی ہے اگر یہ کہتی کہ جا کر واپس آجاؤں گی تو دوسری بات تھی مگر یہاں تو وہ آکر واپس جا رہی تھی۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''ضرور جاؤ تمہیں جانا بھی چاہیے مگر یہ بتاؤ کہ واپس کب آؤ گی۔ یہاں تمہارا گھر ہے۔ سعد کی تعلیم اور اس کا مستقبل ہے۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''معلوم نہیں کب آؤں گی۔ میرا بڑا بھائی باپ کی جگہ تھا۔ ہر بار فون کر کے کہتا کہ میں مر رہا ہوں، ایک بار ملنے آجاؤ اور میں ہر بار انکار کر دیتی۔ آج وہ مر گیا ہے تو پچھتاوؤں میں گھر گئی ہوں اور چھوٹا بھائی تو بالکل اکیلا ہو گیا ہے۔ اس کو تنہا چھوڑ کر کیسے آپاؤں گی؟''

میں رنج سے خاموش ہو گیا۔ اس لمحے اس سے کوئی بات کرنا اسے سمجھانا بے سود تھا۔ اسے وقت دینا بہت ضروری تھا۔ ماتھے سے اس کے بال ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''سعد کو کیا بتاؤ گی؟''

کہنے لگی۔ ''کیا بتاؤں اسے کہ تمہارے ماموں مر گئے جو تم کو بے پناہ چاہتے تھے۔ وہ سعد سے بہت پیار کرتے تھے۔ میں انہیں ہمیشہ برا سمجھتی رہی مگر وہ برے نہ تھے۔ میں تو خود اچھی نہ تھی جو بھائی کی قدر نہ کی۔ اس سے بڑی میری کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے۔''

راکھ میں دبی رشتوں کی محبت ایک چنگاری سے شعلہ بن گئی تھی۔ اس کا بھائی حیات تھا تو اس کی برائیاں اس کے ذہن پر غالب تھیں اور جب وہ مر گیا تو برائیاں دب گئیں اور اچھائیاں یاد آنے لگیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جو دسترس میں ہو اس سے دور بھاگتا ہے اور جو کھو جائے اس کے گن گاتا ہے، اس کی خواہش اور تمنا کرتا ہے۔ میرا خدشہ بجا تھا کہ وہ اپنے خاندان سے کٹ کر نہیں رہ سکتی اسی لیے تو کہتا تھا کہ جا کر ایک بار مل آؤ۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج نہیں تو کل بھائیوں کی محبت جاگے گی تو وہ سب تہس نہس نہ کر دے جو اتنی محنت اور لگن سے یہاں بنایا ہے۔ یہ اس کا امتحان تھا کہ دونوں جگہ توازن کیسے قائم رکھتی ہے۔ پہلے بھی غلط تھی جو پیچھے سب بھول بھلا کر میری بن بیٹھی تھی اور مجھے بھول کر کہیں مجھے بے حیثیت نہ کر دے۔

''نسرین! تم ہمیشہ مجھے امتحان میں ڈالتی رہی ہو اور آج خود کٹہرے میں کھڑی ہو۔ مجھے تو معلوم تھا کہ عزتوں کا پاس کیسے رکھا جاتا ہے اور اب دیکھتا ہوں تم پیار کا پاس کیسے رکھتی ہو۔''

کبھی آنسو بہانے لگتی اور کبھی خاموش ہو کر سوچوں میں کھو جاتی۔ رونے لگی تو اس کا سر اپنے کندھے پر رکھا۔ سر کو تھپکا تو چپ ہو گئی۔ پھر خود ہی سر ہٹایا اور اکیلی بیٹھے رونے لگی۔ ہر غم مجھ سے بانٹتی تھی اور آج سارے دکھ اکیلی سہہ رہی تھی۔ مجھے شاید بھول بیٹھی تھی۔ اپنے غم کی دیواریں کھڑی کر کے اکیلی ان سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''سعد کو اٹھا لاؤں؟''

بولی۔ ''نہیں، وہ رویا تو کس طرح اسے چپ کراؤں گی۔''

''میں ہوں ناں، میں اسے سنبھالوں گا۔'' میں بولا۔

رنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''اس کا ماموں مرا ہے۔ بڑا

صدمہ ہے اس کے لیے۔"
میں کہنے لگا۔" وہ آئے تو اس کے سامنے زیادہ نہ رونا، بچہ ہے گھبرا جائے گا۔ کم عمر بچے کسی کے مرنے پر زیادہ اثر نہیں لیتے۔ اپنے آپ کو تھام کر رکھنا۔ اسے شاید وہ دکھ ہو جو تمہیں ہوا ہے۔ اس نے تو کبھی اپنے باپ کو بھی یاد نہیں کیا کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ چھوٹے بچے بڑے غم نہیں پالتے۔"

پھر اس کے لیے میں نے ناشتا بنایا۔ کافی بنائی، زبردستی اسے ناشتا کرایا۔ پھر اس سے کہا کہ چھوٹے بھائی کو خود فون کر لو، ڈھارس بندھ جائے گی دونوں کی۔ جو ہوا نہ وہ تم روک سکتی تھی اور نہ کوئی اور اپنے دور چلے جائیں تو دکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔"

آنکھوں میں گہری سوچ لے کر بولی۔" اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کس طرح سے بھائی منت سماجت کرتا تھا مگر میں آگے سے جھگڑا اور بدتمیزی کرتی تھی۔ میں نے بڑے اور چھوٹے دونوں بھائیوں پر ظلم ڈھایا۔ میرا اللہ بھی مجھے تب تک معاف نہیں کرے گا جب تک اپنے گناہوں کی تلافی نہیں کرتی۔"

پھر میرے بار بار کہنے پر چھوٹے بھائی کو ایران فون ملایا۔ فارسی میں بات کرتی رہی۔ بیچ میں ہچکیاں لے کر رونے لگتی اور پھر متواتر روتے چلی گئی کہ مجھے خود اٹھنا پڑا۔ اس سے فون بند کروایا اور لا کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ گلے لگ کر روتی رہی۔ روتے روتے کہنے لگی۔" چھوٹا بھائی کہہ رہا تھا کہ جلدی آجاؤ، بڑے بھائی نے تمہاری جائیداد کے علاوہ اپنے دو گھر بھی میرے نام کر دیئے ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ کینیڈا چھوڑ کر واپس آجاؤ بہت کچھ ہے یہاں پر میرے اور سعد کے لیے۔"

اس کی ہر بات سے مجھے یہی لگ رہا تھا کہ وہ رکنے والی نہیں۔ اس نے جانا ہی جانا تھا اور میں بھی تہیہ کر بیٹھا تھا کہ اسے نہیں روکوں گا۔ عورت ایک بار ہاتھ چھڑا لے تو کبھی اسے روکنا نہیں چاہیے کیونکہ وہ ہاتھ چھڑانے سے پہلے ہی جا چکی ہوتی ہے۔ مرد تو پھر بھی لوٹ آتا ہے مگر عورت نہیں پلٹتی۔ اگر نسرین نے میرا سوچے بنا اپنی جانے کی ٹھان لی تھی تو میں نے بڑے حوصلے اور وقار سے اسے برداشت کرنا تھا۔ اسے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دینا تھا کہ میرا بھی کچھ سوچا ہے کہ کیسے جی پاؤں گا اگر تم چلی گئیں۔ اگر چھوڑ کر جانا تھا تو بار بار میرے راستے میں کیوں آتی رہیں۔ تمہارے بھائی کے مرنے پر میں تو تمہارے پاس تھا، تمہیں دلاسے دیتا تھا مگر تم چلی گئی تو میرے پاس کوئی کندھا بھی نہیں جہاں سر ٹکا کر دو آنسو بہا سکوں۔ مجھے کون دلاسے دے گا۔ کون میرا غم بانٹے گا۔ مجھے بھی کہہ دیتی کہ میں دکھی ہوں، مجھے ایک بار جانے دو، جھوٹی تسلی ہی دے دیتی کہ ایک بار جانے دو، تمہاری خاطر لوٹ آؤں گی۔ بڑی خوشی سے تمہیں جانے دیتا۔ یہ دکھ تو نہ ہوتا کہ میری آنکھوں میں بنا دیکھے چلی گئی۔
میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے یہی سوچ رہا تھا کہ نسرین یہ تو تمہاری خو نہ تھی نہ جانے یہ ادا کہاں سے تم نے سیکھی۔

اتنے میں سعد بیدار ہو کر کمرے سے باہر نکلا۔ ماں کو روتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ آہستگی سے چلتا ہماری جانب آیا۔ آنکھوں میں خوف و حیرت کی ملی جلی کیفیت تھی۔ میں نے سعد کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔" ادھر ماں کے پاس بیٹھو۔ وہ رو رہی ہیں۔ تم تو اب بڑے ہو گئے ہو اسی لیے تمہاری ذمہ داری ہے انہیں چپ کراؤ، تسلیاں دو۔"
ماں کے ساتھ بیٹھا تو وہ بیٹے سے لپٹ کر رونے لگی۔
سعد بولا۔" ماما! ماموں نے پھر ڈانٹا ہے۔ جب بھی ان کا فون آتا ہے آپ پورا دن روتی ہیں۔"
نسرین کو ایک دم چپ لگ گئی۔ سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔" سعد تمہارے ماموں مر گئے ہیں۔ وہ اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔"
وہ بولا۔" تو آپ کیوں رو رہی ہیں۔ اچھا ہوا مر گئے۔ ہر وقت تو آپ کو ڈانٹتے تھے۔"
وہ غصے سے بولی۔" وہ مر گئے اور تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ وہ تمہارے ماموں تھے۔ تم میں بڑوں کا ادب نہیں ہے؟"
میں نے آہستگی سے کہا۔" اس کو کیوں ڈانٹتی ہو، اسے کیا معلوم کہ وہ رشتہ تمہارے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تو وہی بولے گا جو دیکھے گا یا پھر سنے گا۔"
میں نے سعد سے کہا۔" دوست! تم واش روم ہو آؤ، پھر مل کر ناشتا کرتے ہیں۔"
نسرین یہ کہتے ہوئے اٹھی۔" آپ بیٹھیں ناشتا میں تیار کرتی ہوں۔"
کچھ دیر بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر سعد کو ناشتا کرا رہی تھی۔ میں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی اس نے کافی لا کر دی تھی۔ اس پر حزن کی کیفیت طاری تھی۔ رونے کے باعث اسے ہلکا ساز کام لگ گیا تھا۔ ناک سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھرے تھے۔ دوپٹا کس

کر سر پر اس طرح سے باندھا تھا کہ ماتھا بھی چھپ گیا تھا۔
دوسرے دن میری جاب تھی مگر نسرین کو اس حالت میں چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ لہٰذا سپروائزر کے Vice mail پر فون کر کے پیغام چھوڑ دیا کہ اگلے دو روز میں نہیں آسکوں گا۔
نسرین کا دن روتے گزرا۔ میں سعد کے لیے بیٹھا رہا۔ رات کا کھانا ایک عربی ریسٹورنٹ سے بنوا کر لایا۔ شام تک اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ درمیان میں وہ اپنے بھائی کے قصے بتاتی رہی۔ اسے میں متواتر سمجھاتا رہا تھا کہ اس کے مرنے میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ آخری دنوں میں تمہارے لیے روتا تھا کیونکہ اس کے دل میں guilt تھا۔ تم اسے معاف کر دو تو اس کی روح کو چین ملے گا۔ وہ تمہیں اس لیے بلوانا چاہتا تھا کہ اس کے سامنے تم اسے معاف کر دو۔ نماز کے بعد قرآن پڑھو اور اللہ کو گواہ بنا کر دل سے اسے معاف کر دو۔ دیکھنا تمہیں بھی سکون ملے گا اور تمہارے بھائی کو بھی۔ پھر وہ نماز اور قرآن لے کر بیٹھ گئی۔ شام کے بعد وہ پہلے سے بہت بہتر نظر آنے لگی تھی۔
ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ اسے تو زبردستی کھلانا پڑا تھا۔ کھانے کے بعد بولی۔ ”مجھے ٹریول ایجنٹ کا نمبر دے دو، ٹکٹس بک کروانی ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”آج تو سنڈے ہے۔ دفاتر بند ہوں گے۔ کل فون کر لینا لیکن سعد کو تو بتاؤ کہ تم لوگ ایران جا رہے ہو۔“
تھکے ہارے انداز میں بولی۔ ”یہ تم بتاؤ، مجھے معلوم ہے وہ ضد کرے گا۔“
”کیا بتاؤں اسے؟ کہ کتنے دن یا ہفتوں کے لیے جا رہے ہو۔“ میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
اسی آواز میں بولی۔ ”جھوٹ بول دو کہ جلد واپس آجاؤ گے گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے۔“ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔ ”اگر وہیں رہنا پڑ گیا تو اسے ادھر ہی بتا دوں گی۔ اسی دوران یہ وہاں ایڈجسٹ بھی کر لے گا۔“
میں یہ سوچ کر اداس ہوتا کہ اس کے سارے معاملات میں، میں کہاں ہوں۔ وہ ہے، سعد ہے، اس کا بھائی اور خاندان ہے۔ میں اس کی زندگی میں کبھی تھا کہ نہ تھا یا پھر وہ سارا وہم تھا۔ کیا وہ سارا خواب تھا۔ جب میرے ساتھ اتنی آ جڑی تھی۔ پہلی بار تو یہ بولی تھی کہ میرے سارے دکھ تم لے لو اور اپنے مجھے دے دو۔ یہ ہم دونوں سے نہیں سنبھلتے اور آج یہ کیا کہ اپنے دکھ درد علیحدہ کر کے اکیلی جا بیٹھی تھی۔ اسی لیے تو اس سے پیار کا اقرار نہ کرتا تھا کہ کر لیا تو نبھانا پڑے گا۔ آج معلوم پڑا کہ پیار کرنا تو آسان ہے پر نبھانا کتنا مشکل ہے۔
مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہے۔ جا کر واپس بھی آئے گی یا کہ نہیں۔ جب کہتی کہ شاید واپس نہ آؤں تو میرے دل کو خنجر سے کاٹ کر رکھ دیتی۔ وہ یہ بھی نہ سوچتی تھی کہ جا رہی ہے تو میرا کیا بنے گا اور جا کر واپس بھی نہ آئی تو مجھے وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکے گی۔ نسرین تم نے مجھ سے مشورہ تو کیا، اس معاملے میں بات کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ تمہارے اپنے فیصلے ہیں اور خود ہی اکیلے کیے جا رہی ہو۔ یہ فیصلے کر کے میرے چہرے کی جانب بھی ایک بار نہیں دیکھا کہ وہاں کیا طوفان اٹھ رہے ہیں اور کیا کیفیتیں ڈوب رہی ہیں اور مجھ سے کام بھی کیا لے رہی ہو کہ سعد سے جھوٹ بولوں کہ تم لوگ واپس آجاؤ گے۔ میں تو تم سے کہتا تھا کہ پیار سے گندھ کر تم بنی ہو تو پھر یہ ستم مجھ پر کیوں۔ نسرین جانے سے پہلے ایک بار پلٹ آؤ۔ تم ضرور جاؤ مگر جانے سے پہلے میری آنکھوں میں تو دیکھتی جاؤ۔ ایسا کرتے ہیں میں سعد سے جھوٹ بولتا ہوں اور تم مجھ سے بولو۔ بھلے نہ لوٹنا مگر جھوٹ ہی بول دو۔ سعد تو شاید ہی میری باتوں سے بہلے مگر میرا یقین کرو میں بہل جاؤں گا۔
میں نے اپنی پوری قوت سے خود پر جبر کرتے ہوئے سعد کو اپنے پاس بٹھایا۔ اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔ ”سعد! تمہاری ماما کے بھائی مر گئے ہیں۔ تم نے دیکھا ناں وہ کتنی دکھی ہیں۔ صبح سے رو رہی ہیں۔“
وہ فوراً بولا۔ ”ماموں اچھے نہیں تھے۔ ہر وقت ماما کو رلاتے رہتے تھے۔“
میں نے اس کے گالوں پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں وہ اچھے تھے۔ بہنوں کو بھائی ڈانٹ دیا کرتے ہیں مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اچھی بات ہو گی کہ تم لوگ چند دنوں کے لیے ایران چلے جاؤ۔ اسکول کھلنے سے پہلے واپس آجانا۔ وہاں جانے سے ماما بھی خوش ہو جائیں گی اور تم کو بھی بریک مل جائے گا۔“
معصومیت سے میری جانب تکتے ہوئے وہ بولا۔ ”تو آپ بھی ساتھ چلیں۔ اکٹھے جائیں گے اور اکٹھے واپس آ

آئیں گے۔"

نسرین دوسرے صوفے پر بیٹھی ہمیں بغور سن رہی تھی۔

میں نے سعد سے کہا۔ "میری تو جاب ہے۔ چھٹی نہیں ملے گی۔" پھر نسرین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لوگوں نے دیر کردی آنے میں تو لینے خود پہنچ جاؤں گا مگر تم لوگوں کو میرے بغیر ہی جانا پڑے گا۔"

پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے انکل کے بغیر اکیلے ہی جاؤ مگر وہاں سے میرے لیے بہت سی کہانیاں لانا نہ بھولنا۔ ایسی کہانیاں جس میں صرف تم اور میں ہوں۔ ایک ساتھ گھومتے پھرتے ہوں۔ خوب مزے مزے کی باتیں کریں۔ نہ ایک دوسرے سے خفا ہوں اور نہ ایک دوسرے کو چھوڑ جائیں۔" یہ کہتے کہتے میری آواز بھرا گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں اٹھ کر واش روم گیا تو نسرین مجھے بیٹھی دیکھتی رہی۔

واش روم سے واپس آیا تو ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ دایاں ہاتھ ٹھوڑی تلے، صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مار کر نکلا تو بولی۔ "میرا غم محسوس کر کے تمہاری آنکھیں بھی بھر آئیں؟"

سعد کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ "آنسو بہت کم نکلتے ہیں، اندر پتھر نہیں موم کا دل ہے پر پگھلنا مشکل سے ہے۔ ایک بار پگھل جائے تو آنکھوں سے بہتا رہتا ہے۔ کوئی جتن کروں تب بھی یہ دریا نہیں اترتا۔"

اس کی آنکھوں میں کئی سوالات تھے یا انجان بن بیٹھی تھی یا پھر واقعی نہ سمجھی تھی۔ میں اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا کہ کہیں ان میں چھپی شکایتیں پڑھ نہ لے۔ میں اس سے شکوہ کر کے اپنے جذبوں کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رات ماں اور بیٹے کو جلدی سلانے کے لیے کمرے میں بیٹھ گیا اور خود جاگنے کے لیے صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گو پچھلی رات صوفے پر بیٹھے بیٹھے ڈیڑھ دو گھنٹے ہی سویا ہوں گا مگر اب بھی نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔ دماغ تھکا اور سوچیں منجمد تھیں۔ قدرت کا نظام ہی ایسا ہے کہ جتنا بڑا غم ہوگا اتنی ہی سوچیں ٹھٹھر جاتی ہیں۔ یادداشت مدھم پڑ جاتی ہے۔ اپنے آپ کو رلانے کے لیے اس کے ساتھ بیتے لمحے، اس کی باتیں یاد کرنے کی سعی کرتا تھا مگر دل و دماغ میری خواہش کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ آنسو بہانے میں ناکام ہوا تو اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہر جانب اداس کر دینے والا منظر تھا۔ وہ چاندنی جو کبھی دل و دماغ کو تازہ کرتی تھی جو کبھی تن من میں سحر پھونکتی تھی مگر آج اتنی پھیکی کیوں لگ رہی تھی۔ پارک میں لگے درخت جو ہمیں دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگتے تھے اور آج جیسے کوئی شب غم کا درد سنا رہے ہوں۔ فضا ساکت اور افسردہ تھی۔ دکھ کی شدت اندر سے بندے کو تنہائی کا شکار کر دیتی ہے اور میں اسی تنہائی میں گھرا تھا۔

میری گزری سب راتیں واقعی عجیب ہوتی ہیں اور آج کی رات غم میں ڈوبی تھی۔ کبھی درخت کی چوٹی پر چمکتا چاند دل میں محبت کے چراغ روشن کرتا تھا مگر آج جیسے گرد اڑا رہا ہو۔ میں چاند نہیں بلکہ دور کسی لائٹ ہاؤس کی چوٹی پر جلتی بجھتی مدھم سی زرد روشنی دیکھنا چاہتا تھا جو دور پرے کے مسافروں کو راستہ دکھلانے کے علاوہ ان میں کوئی اداسی بھی بھرتی ہے۔ وہ روشنی جو رنج کی شدت بڑھا دیتی ہے۔ بوجھل فضا میں درخت ساکن تھے۔ بادل تھے مگر ایسے کہ رو رو کر تھک گئے ہوں۔ ہوا کبھی چلتی تو آہ و بکا کرتی ہوئی آتی تھی۔ درد کی ایک لہر میرے پاؤں سے اٹھی اور سر تک دوڑ گئی۔ آنسو خشک اور دل بھاری تھا۔

واقعی بڑی عجیب رات تھی جیسے کسی میت کے سرہانے بیٹھی روتی سسکتی رات۔

پوری رات بے چین رہا۔ بار بار کمرے کی جانب دیکھتا جہاں وہ سو رہی تھی۔ اپنے غم اور دکھ میں ڈوبی اور مجھ سے کٹ کر سوئی تھی۔ ہمارے دکھ تو سانجھے تھے مگر وہ اپنے آپ کو علیحدہ کر کے بیٹھ گئی تھی، یہ تو تمہارا انداز نہ تھا نسرین۔ تم تو سراپا محبت کا بہتا بہاؤ تھی مگر آج یہ بہاؤ کم کیوں گیا ہے؟ مجھ سے اپنے درد بانٹتی۔ آزما کر تو دیکھتی مگر تم نے تو مجھے غیر ہی بنا ڈالا ایک پل میں۔

"فاصلے ایسے بھی ہوں گے سوچا نہ تھا۔ سامنے بیٹھا تھا مگر وہ میرا نہ تھا۔"

صبح کی نماز پڑھ کر سکون ملا اور وہیں صوفے پر سو گیا۔ کھٹکا ہوا تو آنکھ کھل گئی۔ سورج کی روشنی کھڑکی سے اندر آرہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ کب بیدار ہوئی، کیا کرتی رہی مجھے کوئی ادراک نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کب بیدار ہوئیں؟"

بولی۔ "ذرا دیر پہلے۔"

مجھ سے پوچھا۔ "رات کب سوئے تھے؟"

صوفے پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جیسے ہی کمرے میں گئیں۔ فوراً سو گیا تھا۔'' کچھ دیر میرے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔

میں واش روم سے نکلا تو اس نے چائے بنا کر میرے لیے کافی ٹیبل پر رکھی تھی۔ خود اپنا مگ تھامے صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھ سے بولی۔ ''ٹریول ایجنٹ کا فون نمبر ہے تو مجھے دے دو۔''

میں نے نمبر دیتے ہوئے پوچھا۔ ''خود بات کرو گی یا میں کروں؟''

''میں خود کرتی ہوں۔'' یہ بول کر فون کی جانب بڑھ گئی۔

کچھ دیر فون پر لگی رہی۔ ٹورنٹو سے پیرس اور پھر وہاں سے ایئر فرانس پر تہران کے لیے فلائٹ کی بات کر رہی تھی۔ جب ون وے ٹکٹ کا کہا تو میرا دل جیسے ہاتھی کے پاؤں تلے آ گیا ہو۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا اسے تک رہا تھا۔ وہ اس ذہن سے جا رہی تھی کہ واپس نہیں آنا۔ مجھے صدمے کے ساتھ حیرت بھی تھی کہ اتنی ناسمجھ ہو سکتی ہے۔

اپنا یہ بھرا اپارٹمنٹ، سعد کا اسکول اور اس کا کیریئر! ان سب کو چھوڑے جا رہی ہے۔ مجھے غصہ آنے لگا کہ کم از کم مجھ سے اگر پوچھتی نہیں مگر ایک بار بات تو کر لیتی۔ لمحے بھر میں مجھے اجنبی بنا دیا۔

پھر وہ فون پر اپنے اور سعد کے کوائف اور کریڈٹ کارڈ کا نمبر دینے لگی۔ جب وہ فون پر بات کرتے ہوئے اپنی فلائٹ کی تاریخ دہرا رہی تھی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ وہی دن تھا جس دن میری فیملی پاکستان سے آ رہی تھی۔ اس کی پیرس کی فلائٹ کے ٹھیک تین گھنٹے بعد انہوں نے لینڈ کرنا تھا۔ اس نے ٹرمینل ون سے روانہ ہونا تھا اور پی آئی اے ٹرمینل تھری پر اترتی تھی۔

کیسے کیسے امتحانوں میں مجھے ڈال رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نسرین ہے جو دو دن پہلے تک میرا دامن نہیں چھوڑتی تھی۔ میری بات میں بات ملاتی، ہنستا تو ہنس پڑتی، سوچتا تو سوچوں میں پڑ جاتی۔ میں ہاتھ تھامتا تو ساری چلی آتی۔ وہ اپنی نگاہوں میں مجھے رکھتی اور خود میری نظروں میں رہتی۔ مجھے ہر لمحہ اپنی خوشبو بنا کر رکھتی پھر آج اتنی اجنبی اور پرائی کیوں بن گئی۔ اس کا بھائی فوت ہوا تو قصور نہ اس کا اور نہ میرا مگر خود کو اور ساتھ مجھے یہ سزا کیوں دے رہی تھی۔ کہاں سارے معاملات میرے سپرد کر دیے تھے اور کہاں اپنے سارے معاملات اکیلے اکیلے نمٹا رہی تھی۔ میں حد درجہ خود کو پستی میں گرتا محسوس کر رہا تھا۔ فوری ردِعمل میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ سوچا کہ ذہنی کیفیت سے نکل کر خود مجھ سے بات کرے گی۔ وہ بری کبھی نہ تھی مگر اسے میرے احساسات کو سمجھنے کے لیے وقت چاہیے ہوگا۔ میں اسے غصہ دکھا کر اس کا ذہنی کرب قطعاً نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے جیسے کڑی دھوپ میں مجھے کسی دوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔

فون بند کرنے کے بعد سامنے آ بیٹھی۔ مجھے اپنے پاسپورٹ اور امیگریشن کے کاغذات دیتے ہوئے بولی۔ ''ان کی فوٹو کاپیاں کرا کے ٹریول ایجنٹ کو دینی ہیں۔'' یہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے کاغذات لیے تو کہنے لگی۔ ''مجھے بھی تمہارے ساتھ ٹریول ایجنٹ کے پاس جانا ہوگا؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں، تم سعد کا خیال رکھو، میں کاغذات دینے کے بعد کہیں اور جاؤں گا۔ ذرا لیٹ آؤں گا۔''

اثبات میں سر ہلا کر خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے پوچھا۔ ''ون وے ٹکٹس لی ہیں؟''

بولی۔ ''معلوم نہیں وہاں حالات کیا ہوں، واپسی کی لیتی تو زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک Valid رہتی۔ جب آنا ہوا تو واپسی کی وہیں سے لے لوں گی۔''

میں خاموش بیٹھا رہا کہ شاید وہ کچھ بولے۔ کچھ لمحوں بعد میں نے پوچھا۔ ''اور کچھ نہیں کہنا؟''

''اور کیا؟'' سوالیہ انداز سے پوچھا۔

''کوئی بات، کچھ اور یاد کر لو شاید کچھ بھول نہ گئی ہو۔'' میں بولا۔

جواب دیا۔ ''کیا بھول گئی ہوں؟ میں کچھ بھی نہیں۔''

''میں بھی تو ابھی تک نہیں سمجھ پایا۔ چلتا ہوں اور ہاں اپنا خیال رکھنا اور سعد کا بھی۔ تم دونوں مجھے بہت عزیز ہو۔ تم دونوں کو دکھی اور اداس نہیں دیکھ سکتا۔''

''وہ تو میں جانتی ہوں۔'' وہ بولی۔

میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہی تو پوچھنا چاہتا تھا کہ کہیں بھول تو نہیں گئیں۔''

میں باہر نکل رہا تھا تو وہ بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

کاغذات اور پاسپورٹس کی فوٹو کاپیاں بنوائیں۔

ٹریول ایجنٹ جاننے والا پاکستانی تھا۔ اس کے ٹکٹس وہاں خود چیک کیے کہ کہیں جلد بازی میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھی ہو۔ پیرس میں ٹرانزٹ کا پوچھا کہ کہیں چار گھنٹے سے کم Stay نہ ہو ورنہ اگر ٹورنٹو کی فلائٹ لیٹ ہوئی تو پیرس سے تہران کی فلائٹ نکل جائے گی۔ اگر ایسی صورت حال بن جائے تو لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ مسافر خوار ہو جاتے ہیں۔ ان کی فلائٹ کا شیڈول صحیح طرح سے دیکھنے کے بعد میں مطمئن ہوا۔ ٹریول ایجنٹ کو فوٹو کاپیاں دیں اور اس نے کہا کہ ٹکٹس وہ کل کوریئر کر دے گا۔

مجھے جانا تو کہیں نہیں تھا صرف کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا تھا۔ بے خیالی میں گاڑی کا رخ ہمبر پارک کی جانب موڑ دیا۔

پارک میں اسی مقام پر آبیٹھا جہاں دو دن پہلے درختوں کے کنج تلے بیٹھے تھے۔ سامنے وہی جھیل تھی جو اس دن تھی۔ سارے موسم دل سے جڑے ہوتے ہیں۔ دل آباد ہو تو جہاں آباد ہوتا ہے دل ٹوٹ جائے تو جہاں برباد لگنے لگتا ہے۔ آج تیز زرد دھوپ نے ماحول کو سوگوار بنا دیا تھا۔ افسردگی میں تنہائی سے بڑا غمگسار کوئی نہیں ہوتا۔ یہاں آپ اور آپ کا دل آپس میں محو گفتگو ہوتے ہیں۔ بچی اور رنج باتیں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ کچھ باتیں آپ کی ہوائیں سنتی ہیں، کچھ لہریں، کچھ پھول اور شجر اور باقی پنچھی سنتے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہی پرندے جو کل تک ان درختوں پر نغمۂ دل گاتے تھے مگر آج نالہ و شیون بلند کر رہے ہیں۔ اس دن اس سے یہی کہا تھا کہ میں دن نہیں، لمحے یاد رکھتا ہوں اور آج انہی لمحوں کو یاد کرتا جھیل کنارے بیٹھا تھا۔ وہ یہی کہہ رہی تھی اس دن کہ تمہاری محبت نے مجھے اس پارک کا مالک بنا دیا ہے۔ یہ ساری زمین، پھول، درخت، جھیلیں اور یہ سب پرندے میرے ہیں۔ آج اس کی نگری میں رنج و الم میں ڈوبا ایک درخت تلے .... بنا آس کی اجازت کے آبیٹھا تھا۔ آج دل اس کی دوری پر نہیں بلکہ اس کو کھو دینے پر درد میں مبتلا تھا۔ کیا بھائی کے مرنے کا دکھ مجھے جیتے جی مار کر پورا کرنا چاہتی تھی؟ میں گھاس پر لیٹ کر آسمان کو تکنے لگا اور پھر اسی آسمان نے نہ جانے کب مجھے وہیں سلا دیا۔ بیدار ہوا تو سائے لمبے ہو رہے تھے۔ پچھلی دو راتوں سے نہیں سو سکا تھا۔ جھیل کی لہروں سے منہ دھویا اور واپس اس کے اپارٹمنٹ اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے گیا۔ وہاں جانے کا جی نہ کرتا تھا کہ کہیں پھر سے اس کی بے توجہی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ اس کی بے اعتنائی سے دیکھتی نظریں میرے دل کے آر پار اتر جاتی تھیں مگر اسے میں اس حالت میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں یہ داغ نہیں لے سکتا تھا کہ اسے غم کی حالت میں اکیلا کر گیا۔ دروازہ اس نے کھولا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور میں نظریں چرائے کترا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سعد کا پوچھا تو بولی اسے اس کے دوست کی ماں اپنے ساتھ لے گئی ہے جس کی اس دن سالگرہ تھی۔ بتا رہی تھی کہ اس کی ماں تعزیت کے لیے آئی تھی۔

میں سر ہلا کر اپنے شوز اتارنے لگا۔ مجھ پر نقاہت طاری تھی۔ صبح سے صرف چائے کا کپ پیا تھا۔ پورا دن سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔ ”آج صبح تم اپارٹمنٹ اور سامان کی بات کر رہی تھیں؟“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ ”یہ بھرا گھر کس طرح سے خالی کرو گی؟“ مگر دل یہ کہہ رہا تھا کہ اس بھرے دل سے مجھے کس طرح سے نکالو گی۔

وہ شکست خوردہ سی میرے قریب صوفے پر آبیٹھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کرب سے بولی۔ ”بغیر ناشتا کیے چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔“

جواب میں بولا۔ ”تم اپارٹمنٹ کی بات کر رہی تھیں۔ مجھے بتاؤ اس کا کیا کرنا ہے۔ دس دنوں بعد تم جا رہی ہو۔ گورنمنٹ آف کینیڈا کے قوانین کے تحت چھ ماہ اسے رکھ سکتی ہو۔ ان کو لیٹر لکھ دو کہ میں ایران جا رہی ہوں اور چھ ماہ سے پہلے واپس آجاؤں گی۔ جھوٹ ہی کہہ دو اگر آنا نہ ہو سکا تو بتا دینا جس کو کہو گی سامان اسے دے دوں گا یا اسے سیل کر کے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ڈال دوں گا۔ تم چیک وہاں لکھ کر کیش کر سکتی ہو۔“

شدت غم سے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ حالت ایسی کہ ہاتھ بھی پکڑا تو یہ چھلک پڑیں گی۔

اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نسرین! تمہیں اپنے اور سعد دونوں کے لیے مضبوط رہنا ہوگا۔ تمہارے بھائی کی وفات ایک قدرتی عمل ہے۔ ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں، ایک بڑا فیصلہ کر کے تم جا رہی ہو۔ تمہیں وہاں بہت سی ذمے داریاں لینی اور نبھانی ہیں۔ خود ٹوٹ کر جاؤ گی تو بکھرے ہوؤں کو کیسے سمیٹو گی؟“

میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''آگے کچھ مت کہو۔ یہ بتاؤ ابھی کہاں سے آرہے ہو؟''
''ہمبر پارک میں اسی جگہ سو گیا تھا جہاں دو دن پہلے بیٹھے تھے۔''
''پچھلی شب کتنے بجے سوئے تھے؟'' اس کی آنکھوں سے اب آنسو رواں تھے۔ لہجے میں کسی لغزش کا احساس بھی تھا۔

''صبح کی نماز پڑھ کر سویا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔
اس نے پھر پوچھا۔ ''پارک میں اکیلے بیٹھے رہے؟''
میں اس کے اندر اٹھتی اچانک تبدیلی کو دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پلٹ آئی ہے، ابھی تو زیادہ دور گئی بھی نہ تھی کہ لوٹ آئی۔ پیار میں تڑشی گئی مورت تھی تو پلٹتی کیوں ناں؟
میں نے جواب دیا۔ ''اکیلا کہاں تھا۔ تم بھی تو ساتھ تھیں۔ تم خود نہ تھیں پر یادیں تو تھیں۔''
اس کی آنکھوں کی گہرائی میں کوئی طوفان سا برپا تھا جس کی قوت سے اس کا وجود شکست و ریخت کا شکار تھا۔ ندامت اسے میرے قریب آنے سے بھی روک رہی تھی۔ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ شرمندگی اسے نظریں بھی ملانے نہیں دے رہی ہیں۔ جھجک کر میرا ہاتھ پکڑا اور جب پکڑ لیا تو پوری مضبوطی سے تھام کر بولی۔ ''مجھے معاف کردو۔ میں اپنے حواس میں نہ تھی۔ کیا کچھ کرتی چلی گئی اور تمہارا احساس تک نہ کیا۔ تمہاری مرضی کے بغیر تو مجھے واپسی کا ارادہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا مگر یہاں تو میں ٹکٹس بھی لے بیٹھی۔''
میں بغیر نظریں جھکائے اسے سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس کے۔
مجھے خاموش پا کر بولی۔ ''تم مجھ سے خفا ہو گے، میں اسی قابل تھی کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔''
''ناراض میں نہ تھا بڑا شدید صدمہ مجھے ملا، توقعات بہت تھیں اس لیے صدمہ پہنچا۔ توقعات تم سے نہ رکھتا تو بتاؤ کس سے رکھتا؟ ایک لمحے میں چلے جانے کا فیصلہ کرلیا اور یہ بھی نہ دیکھا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ تم اگر روٹھ جاتی تو منا لیتا مگر جو چلے جانے کی ٹھان لے تو اس کو کیسے روکا جاتا ہے یہ مجھے معلوم نہیں، اگر تم کو معلوم ہے تو مجھے بتاؤ۔''
تڑپ کر بانہیں میرے گلے میں ڈال کر رو پڑی۔ رندھے گلے سے کہنے لگی۔ ''مجھے ایران نہیں جانا، مجھے کہیں نہیں جانا۔ تمہیں چھوڑ کر تمہارے علاوہ خود کو بھی اکیلا کر دوں گی۔ ہر مشکل وقت میں تم سے بات کرتی رہی ہوں

مرزا جعفر علی حسرت دہلوی بھی اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان کو ولادت 1150ھ کے لگ بھگ دہلی میں ہوئی، ان کے والد مرزا ابوالخیر عطار تھے۔ حسرت دہلوی کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ جوانی میں شاعری کا شوق دامن گیر ہوا۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ سے مشورۂ سخن کرتے رہے، ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ حسرت دہلوی نے دہلی کے بعد لکھنؤ کو اپنا وطن بنایا اور تقریباً 56 برس کی عمر میں 1207ھ/1792ء میں وفات پائی مفتی گنج لکھنؤ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔
مرسلہ: حمایت علی، سرگودھا

اور اب کی بار خود ہی سارے پروگرام بنا ڈالے۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ تم سے پوچھا تک نہیں اور ٹکٹس بھی لے لیں۔ یہ بھی کہہ دیا کہ شاید واپس نہ آؤں۔ تم سے پوچھا کیا، تمہارا... احساس تک نہ کیا۔ تم صبح چلے گئے تو تمہاری کمی محسوس ہونے لگی۔ جسے چند گھنٹے اپنے سے دور نہ کر سکی اس سے ساری عمر کس طرح دور رہ سکوں گی۔ میں غلطی پر غلطی کرتی رہی اور تم نے مجھ سے شکایت تک نہ کی۔ مجھے دلاسے دیتے رہے۔ تمہارے دل میں کیا سے کیا دکھ اٹھتے ہوں گے اور میں تم سے بے غرض رہی۔'' اپنا سر میرے کندھے سے اٹھا کر میری جانب دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا دل کتنا بڑا ہے۔ سارے درد سہہ گئے اور چہرے پر اس کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے معاف کردو۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ اپنے اندر کے احساسِ جرم میں اتنا ڈوبی کہ اردگرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مرے ہوؤں کے ساتھ ساتھ زندہ لوگوں کو بھی مار رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر گلے سے لگی، اتنا روئی کہ میری شرٹ آنسوؤں سے بھگو دی۔
اس نے میرے ان کہے شکوؤں کا جواب اس انداز سے دے دیا تھا کہ وہ سب بھول بیٹھا جو دو دن سے سوچتا چلا آرہا تھا۔ میرے اندر کے گلے شکوے اس کے الفاظ اور آنسوؤں نے دھو ڈالے۔
اس کو اپنائیت سے کہا۔ ''پلیز! اب اس سے زیادہ نہیں رونا، کل سے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ روتے

روتے جھکتی بھی نہیں ہو۔ کوئی بھی بات ہو آنسو تمہاری آنکھوں سے بہنے کے لیے ہر وقت تیار ہوتے ہیں۔ گو تمہاری گیلی آنکھیں بہت خوب صورت لگتی ہیں مگر میرا عکس چھپ جاتا ہے۔ میں ان آنکھوں میں خود کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف اپنے آپ کو نہ کسی دکھ کا سایہ اور نہ کسی غم کے ڈورے۔"

پھر اس کی آنکھیں مسکرائیں تو رنج کی دیواریں ایک چھناکے سے ٹوٹ گئیں جو کل سے اس لیونگ میں کھڑی تھیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے کھانا کھایا ہے؟"

جواب دیا۔ "نہیں! تمہارا انتظار کر رہی تھی مگر تم نے بھی تو آتے آتے بہت دیر کردی۔"

میں بولا۔ "چلو اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔ میں بھی صبح سے بھوکا ہوں۔"

وہ بولی۔ "تمہارے خالی پیٹ گھر سے جانے کا اتنا دکھ تھا کہ میں نے تمہاری پسند کا کھانا تیار کیا اور خود بھی بھوکی بیٹھی رہی۔ ٹھان لی تھی میں نے کہ کھانا کھاؤں گی تو تمہارے ساتھ ورنہ بھوکی بیٹھی رہوں گی۔"

کھانے کے بعد اس نے چائے بنا کر مجھے دی۔ اس سے کہا کہ فریش ہو جاؤ۔ سوگ کی حالت میں زیادہ دیر رہو تو جن چمٹ جاتے ہیں۔ کپڑے تبدیل کر کے بالوں میں کنگھی کرلو پھر سعد کو لینے جاتے ہیں۔ وہ ہلکا سا مسکرا پڑی اور میں سوچنے لگا کہ اب اس کے بعد کیا کرنا چاہیے؟

میرا مطمع نظر اس کو روکنا نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ملک، اپنے رشتہ داروں کے پاس آتی جاتی رہے، جس طرح سے سب تارکین وطن آتے جاتے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ وہ اپنے خاندان سے دوبارہ رابطے میں آجاتی۔ بڑے بھائی کی وفات پر جائے گی تو سب اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اگر اب نہیں تو کبھی نہیں جاسکتی تھی۔ جب بھی اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ملک اور اپنے خاندان سے کٹ گئی ہے تو بیمار پڑ سکتی تھی۔ اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے جس طرح سے اس نے بھائی کی موت پر ردعمل دیا تھا اس سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنے گھر، اپنے بھائیوں، ان کے بچوں اور خاندان سے مضبوطی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ انسان کی زندگی میں کئی مراحل آتے ہیں جب وہ اپنے خونی رشتوں کی جانب لپکتا ہے۔ ایسے مواقع پر جب پیچھے کے سب راستے بند ہوں تو ذہن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس کے جانے میں ایک بڑی قباحت یہ تھی جس کا اس نے خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ بھائی چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے واپس اپنے ملک آجائے۔ میرے خیال میں بڑے بھائی کا اس پر رعب و دبدبہ تھا۔ چھوٹے کے بارے میں اس نے کبھی ایسی بات نہ کی تھی کہ اس سے کوئی شکایت یا ڈر ہو، بڑا بھائی اب دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میرے گمان کے مطابق چھوٹا بھائی اسے زبردستی روک نہیں سکتا تھا۔

اس کو ایران جانے میں ایک اور بھی بڑی مصلحت تھی۔ وہ یہ کہ اپنے حصے کی جایداد ساری یا آدھی بیچ کر یہاں کوئی اپارٹمنٹ یا گھر لے سکتی تھی۔ اس پراپرٹی پر اس کا حق تھا۔ سعد کا حق تھا۔ یہاں گھر تو لوگ لے لیتے ہیں مگر پوری زندگی اس کی قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔ جس کا گھر Paid off ہو تو وہ خوش قسمت کہلاتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کا اپنا گھر ہو جائے۔ کرائے کے گھروں سے جان چھوٹ جائے تو زندگی آسان ہو سکتی تھی۔

باقی رہا میرا مسئلہ تو میں اپنی خود غرضی کی بھینٹ انہیں نہیں چڑھا سکتا تھا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر وہ خود واپس آنا چاہے تو اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اب یہ نسرین پر منحصر تھا کہ وہ وہاں جا کر کیا فیصلہ کرتی ہے۔ واپسی کا فیصلہ یا واپسی کے راستے بند کرنے کا۔ وہ جتنی جذباتی بھائیوں کے لیے تھی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہیں رہ جائے۔ پھر یہی سوچتا کہ اگر وہ مجھے چھوڑ کر وہاں رہنے کا ارادہ کرتی ہے تو وہ یہاں رہ کر بھی مجھے چھوڑ سکتی ہے۔

میں ہر پہلو پر بڑی عرق ریزی سے غور کر رہا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا اس وقت ایران جانا اس کے لیے سود مند ہے۔ میں سارے معاملے میں اپنے آپ کو نہیں رکھ رہا تھا۔ جو عہد میں نے اپنے سے باندھا تھا کہ ساری زندگی اس کی خوشیوں اور اس کے تحفظ کا نگران رہوں گا، اس عہد کو نبھانے کا وقت اب آ گیا تھا۔

مجھے اس کے واپس نہ آنے کا خدشہ تھا۔ وہ اس لیے کہ حالات بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ گو وہ اپنے ملک، اپنے گھر جا رہی تھی مگر میرے ذہن میں وسوسے بھی بہت تھے اور جو آگے جا کر سچ ثابت ہوئے۔ اگر مجھے ہلکا سا بھی ادراک ہوتا کہ وہاں جا کر اس کے ساتھ یہ حالات پیش آسکتے ہیں تو اس کو قطعاً نہ جانے دیتا۔ وہ چاہتی تو بھی نہ جانے دیتا کیونکہ میں یہ کر سکتا تھا۔ وہ تو میں اسے پہلے بھی روک سکتا تھا جب

وہ جارہی تھی مگر اس کی منشا کے خلاف میں کوئی اقدام نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ بہت پچھتایا بعد میں کہ اپنی عقل اور سمجھ پر بھروسا کرتے ہوئے اسے ایک دلدل میں دھکیل دیا۔ زندگی میں جتنے بھی برے فیصلے میں نے کیے اور سب کو ملا لیا جائے تب بھی یہ فیصلہ ان پر بھاری تھا مگر میری نیت اچھی تھی اور دل پر صبر کی سِل رکھ کر انہیں بھیجنے کا فیصلہ کر بیٹھا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے واپس آئی تو اچانک اس کی محبت دل میں کسی طوفان کی طرح اٹھی جب اسے دیکھ کر یہ سوچا کہ چند دنوں بعد وہ ایسے سفر پر روانہ ہو رہی ہے جہاں سے واپسی کے امکانات آدھے ہیں بلکہ اس سے بھی ذرا کم۔ میرا اصل امتحان اب یہ تھا کہ اپنے فیصلے پر کس طرح سے قائم رہتا ہوں۔ میرے اندر جاری جنگ نے شدت پکڑ لی تھی کہ اسے روک لوں یا جانے دوں۔ میری زندگی کے وہ دن بہت مشکل دن تھے۔

وہ آئی تو اس کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں اداسی تھی۔ وہ پچھلے دو دن سے شدید ذہنی تلاطم سے گزرتی آرہی تھی۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جانے کا فیصلہ شدت غم سے کیا تھا اور پھر نہ جانے کا فیصلہ شدت غم سے بچنے کے لیے کیا تھا۔ میری وجہ سے رک جاتی تو کبھی بھی میری بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔ بھائی اور خاندان سے دور رہ کر مجھ سے نہیں جڑ سکتی تھی۔ آج مجھ سے مطمئن تھی تو ہوسکتا ہے کل بدظن ہو جاتی۔ میں اسے ایران بھیجنے کا ایک بڑا فیصلہ کر چکا تھا اور اب اسے اپنا مکمل اعتماد دے کر بھیجنا تھا۔

اسے اپنے قریب بٹھایا۔ آج اس کے حسن میں اہم چیز اس کی تمکنت تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ ''اب بتاؤ کس فیصلے پر پہنچی ہو؟''

گردن گھما کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جارہی ہوں، کہیں نہیں، نہ تو ایران اور نہ ہی تم سے دور۔ بھائی تو مر چکا ہے اس کے لیے یہیں دعا کیا کروں گی۔ سعد کی سردیوں میں کرسمس کی چھٹیاں ہوں گی تو دو ہفتے کے لیے ہو آؤں گی۔''

''پہلا فیصلہ بھی مجھ سے پوچھ کر نہیں کیا تھا اور دوسرا یہ فیصلہ بھی اپنی مرضی سے کر رہی ہو۔'' میں بولا۔

حیرت سے میری جانب پوری گھوم کر بولی۔ ''کیا مطلب ہے اس بات کا۔ کیا تم سب حالات جانتے ہوئے بھی یہ چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟''

اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ ''یہ نہیں چاہتا کہ تم چلی جاؤ۔ یہ چاہتا ہوں کہ واپس آنے کے لیے جاؤ۔ بھائی کا رشتہ بہت قریبی ہوتا ہے۔ بعد میں جاؤ گی تو کئی انگلیاں تم پر اٹھیں گی کہ بھائی کب کا مر گیا اور یہ اب آرہی ہے۔ اب تک تو سب کے دلوں میں تمہارے لیے ہمدردی ہے تو اس میں بھی دراڑ پڑ جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ جاؤ گی اور ادھوری ادھوری پھرو گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم بعد میں کسی ذہنی تکلیف کا شکار ہو۔ میں تمہیں ادھورا نہیں بلکہ مکمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو فیصلہ تم نے جانے کا کیا تھا گو طریقہ ٹھیک نہ تھا مگر فیصلہ ٹھیک تھا۔''

''اور......؟'' اس نے طنزیہ انداز سے کہا۔

میں نے جواب میں کہا۔ ''اور یہ کہ تمہاری پراپرٹی پر تمہارا اور سعد کا حق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کو تمہارا حصہ ملے اور یہ چاہتا ہوں کہ یہاں تم لوگ اپنا اپارٹمنٹ یا گھر خرید لو۔ کرائے کے گھروں سے تم کو اور سعد کو ہمیشہ کے لیے چھٹکارا ملے۔ یقین کرو زندگی آسان ہو جائے گی۔'' اس کی باتوں میں حیرت تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

''گھر وغیرہ یہاں پر تب لوں گی جب وہاں سے واپس آسکوں گی اگر نہ آئی تو......؟'' قدرے طیش میں بولی تھی۔

''تم واپس آؤ گی میرے لیے اور سعد کے لیے۔ میں ہر پل تمہارا انتظار کروں گا۔ یقین کرو تمہارے جانے پر جتنا میں دکھی ہوں وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میرا دل کٹ رہا ہے جو تم کو رضامند کر رہا ہوں۔ تمہاری جدائی کا تصور بھی مجھے گھائل کر دیتا ہے اور تمہاری جدائی کہیں میرے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو۔ یقین کرو میرا۔ یہ سب میں صرف تمہارے لیے کر رہا ہوں۔ مجھے صرف تم سے ایک یقین دہانی چاہیے کہ تم کبھی بھی وہاں مستقل سکونت کا ارادہ ذہن میں نہیں لاؤ گی۔''

''کیوں یہ سب کر رہے ہو، تم کو نہیں معلوم وہاں کتنے مسائل ہیں۔'' وہ کرب سے بولی۔

میں نے تھکے لہجے میں کہا۔ ''تم کو تمہارے لیے جانے کا کہہ رہا ہوں اور اپنے لیے واپس آنے کی منت کر رہا ہوں۔'' بھائی اور خاندان سے تمہارا رابطے میں رہنا ضروری ہے ورنہ ہر وقت روتی رہو گی۔ بے چین رہو گی۔ نہیں چھوڑ سکتی تم اپنے خاندان کو۔''

وہ رونے لگی۔ اس کے دوپٹے سے میں اس کے آنسو
صاف کرتا رہا۔

اپنی آنکھوں سے میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں
لے لیا۔ منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے جائیداد
وغیرہ نہیں چاہیے۔ مجھے نہ جانے دو۔ روک لو۔ مجھ سے یہ
پراپرٹی وغیرہ کا کام نہیں ہوتا۔ یہ پراپرٹی میرے پاؤں کی
زنجیر نہ بن جائے۔“

”اگر بننے لگے تو سب چھوڑ کر واپس آجانا۔ تم کو
یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بڑا بھائی دنیا میں نہیں
اس سے تم ڈرتی نہیں۔ چھوٹا بھائی تم پر دباؤ نہیں ڈال
سکتا۔“ میں کہہ رہا تھا۔

وہ شک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کہیں
ایسا تو نہیں کہ فیملی آنے کی وجہ سے مجھے اپنے سے دور
کررہے ہو؟“

یہ سن کر میں غم و رنج سے کراہ اٹھا۔ اس کی بات بری
لگی۔ اس کی محبت پر پیار آگیا۔ اس کے شک میں اس کی
محبت پوشیدہ تھی۔ اسے اپنی بانہوں میں لے کر اپنا سر اس
کے کندھے پر رکھ دیا۔ کہنے لگا۔ ”مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں
سوچتیں۔ اگر ایسا سوچتیں تو کہہ دیتیں کہ نہیں جاتی میں۔ کوئی
تمہیں زور زبردستی تو نہیں بھیج سکتا ہے۔ نسرین! تمہارے
اندر بہت پیار ہے جو میرے اندر ہے وہ بھی رکھ لو۔ تھوڑا
تھوڑا کرکے لوٹاتی رہنا۔ تم ہی اتنے پیار کی حفاظت کرسکتی
ہو۔ مجھ سے کہیں کھو نہ جائے۔“

غم کی شدت نے مجھے اپاہج کردیا تھا۔ جسم میرا شل
تھا۔ غم کا وار اتنا کاری ہوتا ہے اس کا ادراک مجھے اس دن
ہوا۔ روئے ہم دونوں تھے مگر اس کی آنکھیں اور میرا دل۔

میری کیفیت ایسی ہوگئی تھی کہ میری زندگی میں اس
کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میرا ہر لمحہ اس کے نام ہے۔ میں
بے اختیار ہوگیا تھا گو سارے اپنے اختیار وہ مجھے دے بیٹھی
تھی۔

اسے جانے سے روک دیتا تو دل پر داغی بوجھ رہ
جاتا۔ اگر جانے پر راضی کرتا تو دل کٹنے لگتا تھا۔ میرے
پاس اذیت میں رہنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ وقت
نے مجھے اس دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا جہاں ایک جانب
کانٹوں بھرا راستہ اور دوسری جانب کھائی تھی اور یہ بھی نہ تھا
کہ راستے سے پلٹ آتا۔ مجھے کوئی نہ کوئی راستہ اختیار کرنا
تھا۔ اپنی فیملی کے آنے کی خوشی اور نسرین کے بچھڑنے کا غم
ایسے آپس میں مدغم ہوئے کہ نہ رونے کے قابل رہا اور نہ
ہنسنے کے۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”اس وقت تمہاری کیفیت کو مجھ سے
بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔ تمہارے چہرے پر بچوں کے آنے
سے جو رونق میں نے دیکھی تھی وہ غائب ہوگئی ہے۔ مرجھا
سے گئے ہو۔ میرے جانے پر افسردہ ہو اور میں بھی نہیں جانا
چاہتی تو پھر مسئلہ کیوں بنا رکھا ہے۔ دیکھ نہیں رہے تھے کہ سعد
بھی جانے پر خوش نہیں ہے۔ تم کو سعد کتنا پیارا ہے، کیا اس کی
خوشی کا بھی احساس نہیں تم کو؟“

میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ منت سماجت سے مجھے قائل
کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ خدشات اس کے بھی بجا تھے
اور میں بھی اپنی جگہ کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ اپنی بات جاری
رکھتے ہوئے بولی۔ ”اس جائیداد اور پیسوں کے لیے مجھے
زبردستی اپنے سے دور کیوں کرنا چاہتے ہو؟ تمہارے کہنے پر
داخلہ بھی لے رہی ہوں۔ نصیب میں ہوا تو جاب کرکے کوئی
اپارٹمنٹ لے لوں گی۔ کچھ عرصہ بعد جاکر چھوٹے بھائی سے
مل لوں گی۔ خاندان والوں سے اپنے روابط بھی دوبارہ قائم
کرلوں گی۔ مجھے جانے پر مجبور نہ کرو۔“

مجھے معلوم تھا کہ جب بھی چھوٹا بھائی رو رو کر اسے
فون کرکے بلائے گا تو اس کی محبت ایک دم جاگ اٹھے گی۔
اگر تب گئی تو کبھی نہیں آئے گی۔ ابھی تو میرے پیار میں
بندھی ہے اور اس پیار کے بھروسے پر اسے بھیج سکتا تھا۔ اگر
میرے دل سے جڑی رہی تو میرے لیے وہیں ٹھہرنے کا
کوئی ارادہ نہیں باندھے گی۔

میں نے اس کا چہرہ فرط محبت سے اپنے دونوں
ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”وہ جائیداد تمہارا اور سعد کا نصیب
ہے۔ نصیب کو ٹھوکر نہیں مارتے۔ ابھی سعد کے اسکول کی
چھٹیاں ہیں۔ تم حکومت کو بتا کر جاؤ اور چھ ماہ میں واپس
آجانا۔ داخلہ اگلے سمسٹر میں کرالیں گے۔ تمہاری ڈاک
کے لیے پوسٹ بکس لے لیں گے۔ مجھے اتھارٹی دے دینا۔
ہر روز تم کو ای میل کروں گا اور ہر دن تمہارے جواب کا
انتظار کروں گا۔ ایک ایک بات تم کو بتایا کروں گا اور ہر
بات تم سے ہر روز پوچھوں گا۔ تم نہ ہوگی پھر بھی اسی صوفے
پر بیٹھ کر لیٹ کر تمہارا انتظار کیا کروں گا۔“ پھر اسے اپنی
بانہوں میں لے کر بولا۔ ”تمہارا اور میرا تعلق اگر کمزور ہوتا
تو کبھی کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ مضبوط اور پائیدار تھا تو کامیاب
رہا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارا بھائی یا کوئی بھی تم کو مجھ سے دور

رکھ سکتا ہے۔ ایسا نہ ہوگا اور نہ ہونے دوں گا۔ خوشی خوشی جاؤ گی تو یہاں میں مطمئن رہوں گا۔ اگر اسی طرح روتی جاؤ گی تو ہر وقت بے چینی لگی رہے گی۔ ہمیشہ کے لیے کہاں جا رہی ہو؟ واپس آؤ گی ہنستی مسکراتی سعد کے ساتھ۔ ایک بار جاؤ گی تو چین سے پھر یہاں رہ سکو گی۔''

اسے چپ لگ گئی۔ بھیگی پلکیں خشک ہو گئیں۔ آنکھیں ایسے خالی خالی جیسے سارے سوال مٹ گئے ہوں۔ وہ آنکھیں جہاں پانی کے تالاب بھرے تھے۔ وہ پانی اتر گئے۔ پیار کے پھولوں سے لہلہاتی آنکھیں جیسے بنجر ہو گئیں۔ اس کے چہرے کو تھام کر قریب سے دیکھا تو نہ وہاں کوئی خوشی اور نہ اداسی تھی۔ وہاں ناامیدی نے ڈیرے ڈال دیئے۔ ہاتھ ٹھنڈے برف تھے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھرا تو وہ کسی بے جان کا چہرہ تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ سوچا اسے باہر لے چلتا ہوں۔ یہاں بیٹھے رہے تو ہر طرح کی باتیں ہوں گی۔ وہ اٹھی، اسکارف سر پر باندھا اور اب کار میں بیٹھے سعد کو لینے جا رہے تھے۔ مجھ پر دوہرا بوجھ تھا۔ اسے بھی سنبھالنا تھا اور خود کو بھی گرنے نہیں دینا تھا۔

سعد اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی دنیا کے باہر کیا ہو رہا ہے اور اسے معلوم بھی نہ ہونے دینا تھا۔

کھانا کھانے ہم ایک ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ وہ کچھ نہ بول رہی تھی۔ اس کی چپ چپ کیفیت مجھے گھائل کر رہی تھی۔ یہی کہتی رہی کہ مجھے نہیں جانا۔ جب جب وہ کہتی تھی کہ میں نے یہیں تمہارے پاس رہنا ہے، مجھے ایران نہیں جانا تو اندر سے میرا دل خوشیوں سے بھر جاتا۔ اس کی اس ضد میں میرے لیے پیار اور چاہت چھپی تھی۔ اب وہ خاموش تھی تو میں اس سے کچھ ملتا جلتا سننے پر بے تاب تھا۔ میں مکمل ایک عام انسانی فطرت کی عکاسی کر رہا تھا جو اپنے پیار، عزت، دولت اور شہرت سب کے لیے خود غرض ہوتا ہے۔ مجھے نسرین سے بلاواسطہ وہی الفاظ سننے تھے جس سے میری اہمیت اجاگر ہوتی تھی۔

کھانا آیا تو سعد نے نہ کھایا کیونکہ وہ کھا کر آیا تھا۔ اس نے میرے بار بار کہنے پر ذرا سا چکھ لیا اور پھر ویٹر کو بلا کر کہا کہ یہ سب پیک کر دو۔

اگلے سارے دن ندامت و [illegible] گزارتا۔ وہیں سے سیدھا جاب پر آتا۔ وہ اٹھ کر مجھے ناشتا دیتی۔ ہر روز کچھ نہ کچھ لنچ کے لیے ساتھ دیتی۔ فیکٹری میں سب حیران تھے کہ یہ کھانا میں کہاں سے لاتا ہوں۔ مفتی اور مطیع اللہ کو سختی سے تنبیہ کی تھی کہ کسی کو نہ پتا چلے کہ میں کہاں ہوتا ہوں۔ وہیں سے سیدھا اسی کے پاس جاتا۔ پاکستان میں اپنی فیملی سے مکمل رابطے میں تھا۔ بیوی کو آنے کے لیے ہدایات دیتا اور نسرین کو جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتا۔ وہ میری زندگی کے بڑے عجیب دن تھے۔ کسی کو پانا اور کسی کو کھونا دونوں قصے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

ایک سہ پہر جاب سے واپس آیا تو وہ ہر روز کی طرح خاموش تھی۔ گھر کے سامان کو بنا کر رکھ رہی تھی کہ اس کے جانے کے بعد کہیں بکھرا بکھرا نہ لگے۔ کچھ اپنے اور باقی سعد کے کپڑے علیحدہ کر لیے تھے جو ساتھ لے جانے تھے۔ سامان مختصر لے کر جا رہی تھی اس لیے کہ اسے واپس آنا تھا۔ میرے لیے یا اپنے لیے مگر اسے لوٹ کر ضرور آنا تھا۔ وہ مجھ سے ناراض ناراض سی پھر رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر خاموش آنکھوں اور بے تاثر چہرے سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''تم بیٹھو، میں چائے لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

میں شوز اتار کر صوفے پر دراز لیٹا تھا۔ چائے میز پر رکھ کر جانے لگی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ ہلکی سی قوت لگا کر چھڑانا چاہا کہ بتا سکے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں التجا کی تو پاؤں کی جانب بیٹھ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور اسے تکنے لگا۔ کافی دیر کچھ نہ بولا تو مجھے بنا دیکھے کہنے لگی۔ ''کوئی بات کرنی ہے؟''

میں نے جواب میں کہا۔ ''پورا دن کیا کرتی رہیں؟ سعد بھی نظر نہیں آ رہا۔ کیا اسے پھر دوست کے گھر بھیج دیا؟''

''ہاں! اس کے دوست کی ماں کو فون پر بتایا کہ میں واپس ایران جا رہی ہوں۔ وہ آئی تھی۔ باتیں کرتی رہی۔ ابھی گئی تو سعد کو لے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی اپنے منگیتر کے ساتھ شام کو آ کر اسے لے جانا۔''

نہ جانے کیوں مجھے اس کا منگیتر کہنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس سے حیرت سے بولا۔ ''کیا کہا تم نے، منگیتر؟''

بولی۔ ''سالگرہ پر سعد کو چھوڑنے گئے تھے تو بھی بولا تھا۔''

میں مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا، کہنے لگی۔ ''تمہیں اچھا نہیں لگا؟''

میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"ایک بار پھر کہنا پلیز ایک بار۔ تمہارے منہ سے پھر سن کر اچھا لگا۔"

وہ سر جھکائے شرما کر مسکرا رہی تھی بولی۔ "My Fiance۔"

میں اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ "سب کو کہتی ہو کہ میں منگیتر ہوں اور مجھ سے کہتی ہو کہ فیملی آنے کے بعد شادی کی دوبارہ آفر کرنا تو بتاؤں گی۔"

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں مجھ سے یہ رشتہ بنا کر تم نے مجھے کتنی بڑی طاقت دے دی ہے۔ بولو آج کیا مانگتی ہو۔ کیا چاہتی ہو؟ اپنی جان تک دے دوں گا آج مانگ کر تو دیکھو۔"

میرے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ کر لیٹ گئی۔ کہنے لگی۔ "تم سے کئی بار میں نے وعدہ کیا تھا جو تم کہو گے وہی کروں گی یہ بھی ایک بار کہا تھا کہ جو بھی سوچو گے انہی سوچوں میں ڈھل جاؤں گی۔ اب اپنے وعدے مجھے نبھانے ہیں۔ تمہارے کہنے پر میں جا رہی ہوں۔ اپنے آپ کو میں نے بہت سمجھایا کہ اگر تم پر اعتماد نہیں تو میرے ایران جانے یا نہ جانے سے تم کو کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر اعتماد ہے تو آج سارا اعتماد کر کے دیکھتی ہوں۔ مجھے یقین ہے تم کچھ اچھا سوچ کر ہی مجھے بھیج رہے ہو گے۔"

میں اس کے پیار میں ڈوب گیا۔ اس کے لفظوں میں وہ بار تھا کہ اپنا بولنا بے معنی لگا۔ اسے کوئی جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ بات کرتی تھی تو لفظ دل میں اترتے تھے جیسے تاک کر بات کر رہی ہو۔ بولی۔ "مجھے تم سے دو چیزیں چاہئیں اگر بھائی مجھے روکنے کا کہے تو اس سے کہہ سکوں کہ میں نے ندیم سے شادی کر لی ہے۔ مجھے یہ جھوٹ بولنے کی اجازت دے دو اور دوسری میری خواہش ہے کہ آج مجھے کسی اچھی جگہ سے ڈوبتے سورج کا منظر دکھا دو۔"

اسے کہتا رہا کہ کل جا کر شادی کر لیتے ہیں مگر اس نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ بھائی چند دن پہلے مرا ہے، اس وقت شادی بدشگونی ہو گی۔ اگر رضا مند ہو جاتی تو اسی دن اس سے شادی کر لیتا۔

گو آج بادل تھے مگر سورج ڈوبتے ڈوبتے کئی رنگ پھر بھی دے رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آج وہ ڈوبتا سورج میرے ہمراہ دیکھنا چاہتی ہے اور آئندہ اکیلے کس طرح یہ منظر دیکھ پاؤں گا۔

اس سے کہا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ابھی نکلتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "شہر کے باہر نارتھ میں کسی جھیل کنارے بیٹھ کر یہ منظر دیکھتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد میری گاڑی ہائی وے 410 نارتھ پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے 427 نارتھ سے 401 ایسٹ لی تھی اور چند کلومیٹر دور ہائی وے 410 نارتھ لے کر مڈلینڈ کی جانب جا رہا تھا۔ اس نے ٹراؤزر شرٹ پر گلابی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ لمبے بالوں پر ذرا نیچے ہیئر کلپ لگایا تو بالوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ جلدی میں اس نے تھرماس میں چائے بنا کر بھری اور ساتھ چھوٹے ٹریول بیگ میں کچھ کھانے کے لیے بھر لائی تھی۔

ہم ٹورنٹو سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کینیڈا کتنا خوب صورت ہے۔ نیلے آسمان تلے سیاہ بادل کہیں کہیں چھائے تھے۔ دور دور تک تا حد نظر سرسبز کھیت تھے جن کا سبزہ دیکھ کر نظریں نہ ہٹتی تھیں۔ کئی ایک فارم تھے جہاں دسیوں کی تعداد میں ہرن پھرتے نظر آ رہے تھے۔

ہماری گاڑی "بیری" کو کراس کر گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت شہر جو دیکھتے ہی نظروں میں کھب گیا۔ صاف ستھرا اور اجداد شہر جو نکھری فضا میں بہت دلکش نظر آتا تھا۔ گاڑیاں میرے اردگرد تیزی سے گزر رہی تھیں۔ سورج اور بادلوں میں آنکھ مچولی جاری تھی۔ بادل جب سورج کو ڈھانپ لیتے تو زمین کا سبزہ اور نکھر آتا۔ بادل جب ہٹ جاتے تو وہی زمین لشکارے مارنے لگتی۔

مجھ سے کہنے لگی۔ "تم کو میں نے سورج غروب ہونے کا منظر دکھانے کا کہا تھا اور لگتا ہے تم سورج کے تعاقب میں چل پڑے ہو۔"

"پہلی بار کوئی فرمائش کی ہے۔ ایسے منظر میں رکنا چاہتا ہوں جو تمہارے چہرے پر سج جائے۔" میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔ وہ اداسی میں ڈوبی تھی مگر مسکراتے ہوئے بہت پیاری لگی۔ دل ابھی بوجھل تھا مگر اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر طمانیت ملتی تھی۔ آگے ایک جگہ ہائی وے سے ہٹ کر بائیں جانب کوئی بے نام جھیل تھی۔ کئی مقام پر اسے لمبی جنگلی گھاس نے گھیرا تھا۔ آس پاس پیپل کے درخت تھے اور پھر سرسبز کھیتوں کے میدان دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ میں نے گاڑی آہستہ کر کے اسی جانب موڑ دی۔ چند لکڑی کے بینچ پڑے تھے مگر دور دور تک ہمارے علاوہ کوئی نہ تھا۔ خنز

ہوا سے پیپل کے درخت جھوم رہے تھے۔ ہواؤں کے زور سے پتوں کی سرسراہٹ اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ بادل کہیں سیاہ اور کہیں سفید تھے۔ جہاں سفید تھے وہاں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ گہری سانس لے کر کچھ ہوا میں نے پھیپھڑوں میں بھری اور بہت ساری مجھ سے ٹکرا کر اندر سے مجھے تروتازہ کرگئی۔ ہم گاڑی روکے اس منظر کو دیکھ رہے تھے جہاں سورج افق میں اترنے کے لیے ہمارا انتظار کررہا تھا۔

وہ بینچ پر جا بیٹھی اور میں گاڑی سے تھرماس اور بیگ اٹھا لایا۔

سامنے کھیتوں میں جہاں جہاں گندم پک رہی تھی وہاں دھانی رنگ سونا اگل رہا تھا، جہاں آس پاس سبزیوں کے کھیت تھے وہاں گہرا سبز رنگ اترا تھا۔ دونوں رنگ علیحدہ علیحدہ واضح نظر آرہے تھے۔

میں نے دو کپوں میں چائے بھری۔ اسے دی تو وہ چونک پڑی۔ کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں سے اٹھتی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

کہنے لگی۔ ''پورے منظر میں تمہیں کیا اچھا لگ رہا ہے۔''

میں بولا۔ ''تمہارا چہرہ، بادلوں سے گلابی شعاعیں منعکس ہوکر تمہارے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔ اس منظر میں تمہارے چہرے کے علاوہ کوئی اور چیز خوب صورت نہیں۔''

میں اس کی جدائی کے رنج میں ڈوبا تو میری طرف وہ دیکھنے لگی۔ بولی۔ ''میں واپس ضرور آؤں گی میرا انتظار کرنا، مجھے فراموش کردیا تو آکر پوچھوں گی نہیں بلکہ خوب لڑوں گی جھگڑا کروں گی۔ وعدہ کرو میرے ساتھ ساتھ رہو گے؟''

اپنے دائیں بازو کا گھیرا اس کی گردن کے گرد بنا کر بولا۔ ''مجھے میرا وعدہ یاد ہے جو پہلے کیا تھا کہ تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں کوئی نیا وعدہ نہیں کروں گا بلکہ اسی پرانے وعدے کو دُہراؤں گا کہ تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اللہ کی اس زمین و آسمان، سورج، بادلوں، شجر اور پرندوں اور ان ہواؤں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جو وعدہ کیا تھا اس پر قائم رہوں گا۔''

سن کر خوشی سے چھلک پڑی اور خود کو میرے اندر چھپالیا۔

پھر سورج ڈوبنے لگا اور افق پر کئی رنگ نہیں بلکہ گلابی رنگ چھایا تھا۔ گلابی رنگ شوخ ہوا تو عنابی بن گیا۔ پورا افق عنابی رنگوں سے بھر گیا اور وہی رنگ اس کے چہرے کا بنا۔ پھر سارا جہاں عنابی ہوگیا۔ زمین اور آسمان کے رنگ ایک ہوگئے۔ اس کے چہرے اور جھیل کے رنگ ایک ہوگئے۔ رنگ آسمان سے اترے اور جھیل میں غوطہ زن ہونے لگے۔ سارے شجر، پنچھی، بادل اور وہ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ ہم حیرت سے وہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایسا سورج تو کبھی نہ ڈوبا تھا۔ ایسے رنگ تو کبھی نہیں نکھرے تھے۔ بادل کبھی ایسے تو نہیں رنگے تھے۔ زمین کا سبزہ کبھی ایسے تو نہیں دکھا تھا۔ آج وہ فرمائش کر کے اس منظر میں داخل ہوئی تھی تو سب منظر گل و گلاب ہوکر اس کے آگے بچھ رہے تھے۔ میں حیرت سے کبھی اس کا چہرہ دیکھتا اور کبھی سارا جہاں۔ آج میرے رب نے سارا جہاں اس کے چہرے میں سجا دیا تھا، پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ جھیل کی سطح پر ٹپ ٹپ قطرے برس رہے تھے۔ جھیل کے پانی لہرائے تو رنگ تھر کنے لگے۔ ایسا ماحول بدلا کہ ہم لاچار تھے پھر بھی اٹھنے کو تیار نہ تھے، پھر شام کا سرمئی رنگ چھانے لگا۔ بوندا باندی تو رک گئی مگر ہم بھیگتے رہے۔ اس کے پیار نے مجھے گلابی عنابی کردیا، پھر ہم اٹھے تو سارے رنگ اپنے ساتھ لے کر اٹھے۔

ایک خوب صورت منظر اور میرے دلاسوں نے اسے بہت سا سنبھال لیا تھا۔ اب اس امید اور یقین کے ساتھ جارہی تھی کہ وہ واپس آئے گی مگر مجھے کون یقین دلاتا کہ وہ واقعی واپس آئے گی۔ ملنے والے پاکستان سے روانہ ہورہے تھے۔ ان کا ملنا ایک طرح سے ختمی تھا۔ جدا ہونے والے تو اس انداز سے بچھڑ رہے تھے کہ ان کے پلٹ کر آنے کا یقین نہ تھا بلکہ امید بھی اس کے رونے سے مدھم ہوتی چلی گئی تھی۔ میں ایک بڑا جوا کھیل رہا تھا۔ خود اپنے آپ کو اس کی خوشیوں کی خاطر داؤ پر لگا دیا تھا۔ کوئی احساس جرم میری زندگی میں نہ رہ جائے اسی خیال سے اسے ایران بھیجنے کا ایک بڑا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔ کوشش کرتا کہ اس کے سامنے اپنی اداس کیفیت کو چھپا کر جاؤں مگر دل اپنے نشانات چہرے پر چھوڑ ہی دیتا۔

مجھے ٹوٹتے پاتی تو ایسی نظروں سے دیکھنے لگتی جیسے پوچھتی ہو کہ بھیج تو رہے ہو مگر اپنی حالت نہیں دیکھتے کہ جیسے صدمے کا کوئی پہاڑ ٹوٹا ہو تم پر، اگر جا کر واپس نہ آئی تو پھر کیا کرو گے۔ وہ جب اس نظروں سے دیکھتی تو دل اور روح دونوں گہری اداسی میں گھر جاتے۔ اس کی جدائی ایک پھانس کی طرح تھی۔ تازہ پھانس کی چبھن بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بہت تکلیف دہ۔

ایک دن میں ہیوسال سے سیدھا اس کی جانب نہیں بلکہ سیدھا اپنے اپارٹمنٹ آگیا۔ اسے فون کر کے بتا دیا تھا کہ دیر سے آؤں گا۔ مجھے کچھ تنہائی چاہیے تھی۔ اس کے سامنے نہیں پر اکیلا تو چند آنسو بہا کر اپنا غم غلط کر سکتا تھا۔

اپارٹمنٹ میں سر جی اور شہباز ملے تو سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کہاں ہوتا ہوں، کیا کرتا رہتا ہوں، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ شیو اتنی کیوں بڑھا رکھی ہے۔ جواب کچھ نہ بن پایا تو خاموش رہا۔ ان کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ دیکھا تو سر جی بھی ساتھ چلے آرہے ہیں۔ پوچھا۔ ''ہوا کیا ہے جو چھپتے پھر رہے ہو؟''

ان سے کہا۔ ''نسرین کا بھائی مر گیا ہے اور وہ ایران جارہی ہے۔'' حیرت سے ان کا منہ کھلا رہ گیا۔

جب مختصر تفصیل بتائی تو انہیں غصہ آگیا۔ بولے۔ ''اب تو قل بھی ہو چکے ہوں گے بلکہ جمعرات کی دیگیں بھی تقسیم ہوگئی ہوں گی، اب وہ جا کر کیا کرے گی۔ تم نے روکا کیوں نہیں؟''

''وہ تو نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں ہی اسے بھیج رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

رک کر میرا چہرہ حیرت سے دیکھنے لگے، بولے۔ ''پاگل ہو گیا، ہرنی کو بھیڑیوں کی کچھار میں بھیج رہے ہو؟''

میں خاموش رہا تو کہنے لگے۔ ''بتا رہا ہوں بڑی غلطی کر رہے ہو پچھتاؤ گے۔''

میں نے کہا۔ ''سر جی! آپ اندر بیٹھیں میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔''

میں مارٹن گرو روڈ پر اپنے پسندیدہ پارک کی جانب چل پڑا اور انہوں نے پیچھے سے آواز دی۔ ''کب جارہی ہے؟''

بغیر مڑے میں نے جواب دیا۔ ''جس دن میری فیملی آرہی ہے اسی دن۔''

ان کی بڑبڑانے کی آواز مجھ تک آرہی تھیں مگر میں آگے نکل چکا تھا۔

پارک میں آبیٹھا تو دیکھا میرا ساتھی درخت ہمیشہ کی طرح تنہا کھڑا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور اسرار کھلنے لگے۔ آج چاند پھیکا تھا۔ چاندنی ایسے محسوس ہوتی کہ جیسے ماتم کر رہی ہو۔ میں اور میرا ساتھی آمنے سامنے تھے۔ میری نظر اس کے سیاہ ہیولے پر تھی۔ لگتا تھا خاکستر ہو گیا ہے۔ اس کا میرا نصیب ایک ہی تھا۔ سردیوں میں برف کی سفید چادر اوڑھی تھی۔ سرد اور ٹھٹھرا نصیب تھا ہم دونوں کا۔ بہار آئی تو پہلے سفید اور پھر گلابی پھولوں کی مالائیں پہن لیں۔ ہواؤں کی خوشبو اس کے نصیب سے تھیں۔ گرمیوں میں گلابی پھول اس کے پتے بنے تو مل کر انہوں نے اسے سبز لباس پہنا دیا۔ جس حالت میں آیا مگر رہا ہمیشہ تنہا۔ پارک کے بیچ بالکل اکیلا سب کو تکتا رہتا۔ میں آج اس کے سامنے ایک بینچ پر بیٹھا تھا اور وہ افسردگی سے کھڑا مجھے دیکھتا تھا۔ وہ میرا دکھ درد سمجھتا تھا تبھی تو آج اس کے پتے ایسے سرسراتے جیسے سسکیاں لے رہے ہوں۔ عطر بیز ہوائیں جو بہار میں چلی تھیں وہ انجانی منزلوں کی جانب رخصت ہوگئی تھیں۔ معلوم نہیں اسے سفید اور گلابی پھولوں کے لیے کتنا طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک لمبا انتظار اسے سہنا پڑے گا میری طرح کیونکہ ہم دونوں ساتھی تھے۔

اس درخت کو دیکھتے دیکھتے میرے اندر تنہائی کا شدید احساس اٹھا۔ اسی تنہائی نے یکلخت کہیں سے آکر مجھے دبوچ لیا۔ سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہوگئی۔ آنکھوں کے پپوٹے نم ہوگئے۔ پتھرائی نظروں سے اسی درخت کو دیکھنے لگا۔ خیال بدلنے کے لیے نظریں ہٹائیں تو پھولوں کی جھاڑیوں پر پڑیں۔ پژمردہ پھول جھاڑیوں کے نیچے پڑے تھے۔ جو شاخوں پر تھے وہ نڈھال تھے۔ اڑے رنگ اور ڈھلکے ہوئے بقول فضا ایسی کرب ناک کہ پورا جہاں غم زدہ تھا۔ رنج والم کا ایک طوفان میرے اندر سے اٹھ رہا تھا۔ دل رویا تو پانی آنکھوں سے بہنے لگا۔ ہتھیلی کو آنکھوں پر رگڑ کر آنسو خشک کیے اور سگریٹ سلگا کر گہرے کش لینے لگا۔

ہو گئی تم سے محبت کہ حسیں بات ہوئی
ایسا لگتا ہے کہ ویرانے میں برسات ہوئی
ہم جو اپنے آپ سے چھپے پھرتے تھے
تم سے مل کر کہیں خود سے ملاقات ہوئی

میں تھکا ہارا اور جیسے کسی بازی میں مات کھائے اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ اسے میں نے اکیلا نہیں کرنا تھا جو اس حالت میں بھی اسی کی طرف چلا آیا تھا۔ آنکھوں میں اس کی دسیوں سوالات تھے مگر جوابات میرے پاس ایک نہ تھا۔ کترا کر گزرنا چاہا مگر راستہ اس نے نہ چھوڑا۔ نمناک لہجے میں بولی۔ ''کہاں تھے؟ کیوں اتنی دیر کردی۔ معلوم تو ہے تم کو کہ میں انتظار کر رہی تھی۔''

میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم میری طرح دیر نہ کرنا۔ میں تمہاری طرح بہادر نہیں کہ لمبا انتظار

کر سکوں۔" وہ بھی میرے پاس بیٹھی تھی تب میں نے پوچھا۔ "پیکنگ کب مکمل کرو گی؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "دو دن رہتے ہیں کل کرلوں گی۔" پھر چونک کر سوال کیا۔ "تمہاری فیملی کب آرہی ہے؟"

اس کے چہرے پر نظریں رکھے جواب دیا۔ "اسی روز جب تمہاری فلائٹ ہے تم جاؤ گی تو تین گھنٹے بعد وہ لینڈ کریں گے۔"

وہ شاک میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"کیا بتاتا، تم فون پر ٹکٹس کنفرم کررہی تھیں اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔"

کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر سر ہلاتے ہوئے جیسے مطمئن ہوگئی ہو۔ کہنے لگی۔ "اچھا ہے میری طرح اس رنج سے نہیں گزرو گے جس میں مجھے مبتلا کررہے ہو۔ اسی دن بیوی بچے آجائیں گے تو میں یاد بھی نہیں آؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ پتھر کی طرح اپنی جگہ ساکت ہوگئی۔

میں بولا۔ "میری بات آج غور سے سنو۔ جانتا ہوں میری بیوی اور بچے آرہے ہیں مجھے وہ کتنے عزیز ہیں تم جانتی ہو۔" پھر اس کا ہاتھ تھام کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے بولا۔ "کوئی بھی رفاقت تمہارا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ غم ہستی کا مداوا کہیں بھی نہیں۔ کسی کا پیار اور توجہ مجھ سے تمہاری یاد نہیں چھین سکتی۔ زندگی کے جس موڑ پر تم کو اپنے سے جدا کررہا ہوں وہاں کوئی بھی انسان تمہاری خلا پوری نہیں کرسکتا۔ یہ خلا یہ جگہ صرف تم ہی آکر پُر کرسکتی ہو۔ تمہاری جدائی کا احساس میری روح کی گہرائی میں اتر کر گھر بنا بیٹھا ہے۔ میری ذات میری روح کبھی کسی کے قید میں نہیں رہی مگر آج سچے دل سے کہتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنا اسیر بنا دیا ہے تم سحر ہو کہ جادو ہو تم کیا ہو۔"

بات کرتے کرتے میں چپ ہوگیا۔ میں کن الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کروں۔ میرے فقرے، میرے سر اور تال سب کھو گئے تھے۔ میری نم آنکھیں میری کیفیت کو بیان کررہی تھیں۔

وہ رونے لگی تھی۔ روتے روتے چپ ہوئی تو ایسا لگا کہ ضبط کیے بیٹھی ہو۔

دوسرے دن میں جاب سے جلدی آگیا۔ اگلے دن جمعے کے دن کی چھٹی لے لی ہفتے کو اس نے چلے جانا تھا۔

اس نے اپنا سامان پیک کرلیا تھا۔ مختصر سامان لے کر جارہی تھی کیونکہ اسے واپس آنا تھا۔

کسی کا اپنے وطن جانا ایک معمول کی بات ہوتی ہے مگر وہ جس انداز سے اور جہاں جارہی تھی وہ معمول کی بات نہ تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی لالچی بن سکتا تھا۔ بھائی کے علاوہ بھی کئی قریبی رشتے تھے جن کی نظر میں یہ مرکھپ گئی تھی۔ ایک بڑی جائداد کے کئی حصے دار تھے۔ ان لوگوں کے درمیان ایک اکیلی لڑکی اپنے کم سن بیٹے کے ہمراہ اپنے ملک کے دور افتادہ قصبے کی جانب جارہی ہے تو کئی خطرات بھی مول لے رہی ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ اتنی گہرائی میں ان خطرات کا میں نے ادراک بھی نہ کیا تھا مگر اسے سب خطرات سے مکمل آگاہی حاصل تھی جبھی تو نہ جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سب عجیب وغریب ہو رہا ہے۔ اپنے آپ کو عقل مند سمجھ کر میں شدید غلطی کررہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کی آئندہ کی زندگی میں مصائب کے انبار لگنے والے ہیں۔ وہ تو کبھی کبھار اپنی خوشی کو دبا جاتی تھی، کہتی کہ مجھے خوشیاں راس نہیں آتیں۔

نسرین کا ساتھ مثالی تھا۔ وہ جدا ہوئی تو معلوم ہوا کہ جدائی کا گھاؤ کتنا گہرا ہوتا ہے۔ میں کسی سے بات کررہا ہوتا تو بیچ میں اس کی یادیں آکر ستانے لگتیں۔ میں اس کی خوشبو محسوس کرتا۔ وہ لمحے چن چن کر یاد کرتا جب جب وہ ساتھ ہوتی تھی۔ میرا دردیہ بھی تھا کہ اس کی جدائی کا دکھ میں اکیلا سہہ رہا تھا۔ کسی سے کھل کر اپنے درد بھی نہیں بانٹ سکتا تھا۔

وہ نسرین جو پاس نہ تھی پر لگتا کہیں ادھر ہی ہے۔ ابھی آئے گی اور سب سے پہلے یہی کہے گی کہ اپنی شکل دیکھو کیا بنا رکھی ہے۔ اپنا وزن دیکھو سوکھ گئے ہو۔ پھر قریب آکر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہر بار یہی پوچھتی کہ مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔ ہر بار پوچھتی اور ہر بار یقین دلانا پڑتا۔ اسے محبت میں کبھی مات نہ دے سکا اور پھر یہ لڑائی ہی میں نے چھوڑ دی۔ اس کے پاس پیار کا ایک بڑا خزانہ تھا۔ جتنا مجھ پر لٹاتی وہی اتنا بڑھتا گیا۔ وہ محبت کا عرق کشید کرکے قطرہ قطرہ مجھے پلاتی رہی اور اب اس کی تاثیر میرے رگ و پے میں سرائیت کرچکی ہے۔

میں اس قابل نہ تھا کہ اس کی اتنی بھرپور رفاقت مجھے ملتی۔ ایک عام سا انسان جو سب کی طرح عام سی زندگی جی رہا تھا یا کسی کی دعا مجھے لگی اور وہ مجھے آملی۔ میں اس کی اس خصوصی توجہ کا ہرگز مستحق نہ تھا۔ ایک بار میرا ہاتھ تھامے بیٹھی

اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سرخ و سفید ہاتھوں میں میرا ہاتھ بجھا بجھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے جو مجھے دل دے بیٹھی ہو۔ کہنے لگی دماغ نہیں چلا بلکہ میرا دل تم پر مچل گیا ہے اور دل پر میرا بس نہیں۔

میں اس کی عزت کا قدر دان تھا۔ معلوم نہیں کہ کیوں میرے جذبات اس سطح پر کبھی نہیں پہنچے جہاں عورت اور مرد کا ملاپ ہوتا ہے۔ ہم تنہا ہوتے تو میری نظروں میں عقیدت بھر جاتی۔ میں اسے اس استانی کی طرح سمجھنے لگتا جس کو کلاس کا کوئی بچہ اسے پسند کرنے لگتا ہے اس کے سامنے میری حالت ایسی ہوتی جیسے کسی ویران مزار کے کونے میں بیٹھا میں ورد کر رہا ہوں میں اکثر اسے تنگ کرتا رہتا کہ اسے غصہ آجائے۔ شروع میں تو چڑ سی جاتی تھی مگر پھر میری عادت کو سمجھ کر ہمیشہ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ میں اسے تنگ کر کر کے زچ ہو جاتا مگر وہ آنکھوں میں مسکراہٹ لیے خاموش رہتی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے اکثر اسے پاؤں سے ٹھوکے لگاتا رہتا۔ تنگ آکر آخر بول پڑتی۔ ”دور ہٹو ورنہ میں اٹھ جاؤں گی۔“ میں باز نہ آتا مگر وہ کبھی وہاں سے نہ اٹھتی۔

اس کے جانے کے دن قریب آئے تو اس استانی کی کلاس کا چھوٹا بچہ جوان ہو گیا۔ وہ میری جسارتوں پر حیرت سے میری طرف دیکھتی تھی۔ میں اس کی گرم سانسیں سونگھتا، اس کے لب چھوتا، اس کے خوب صورت چہرے پر اپنے نشانات ثبت کرتا مگر اس سے کبھی آگے نہ بڑھتا، میں یہ سب کرتا تو وہ حیرت اور پیار سے مجھے دیکھتی رہتی جیسے کوئی انہونا کام کر رہا ہوں۔ نسرین ایک پھولوں بھرا باغ تھا جہاں کے پھول میں چرا چرا کر سونگھتا۔

پھر وہ میری زندگی پر ایک بڑا سوالیہ نشان لگا کر چلی گئی۔ میری زندگی اس کی یادوں میں غرق ہو گئی۔ میرے خواب پھیکے پڑ گئے۔ وہ پیارے لمحے، چمکیلی صبحیں، مسرت لبریز شامیں، سحر میں ڈوبے تصور کے رنگین جزیرے غروب آفتاب کے سب رنگین مناظر، طلوع آفتاب کے تازہ اور نکھرے رنگ، وہ پرندوں کے رسیلے نغمے، وہ کناروں سے ٹکرا کر پلٹتی موجیں، شاخوں اور پتوں سے الجھتی چاندنی، وہ گلابی آسمان تلے پرواز کرتے سیاہ چمکدار پرندے، وہ تازہ بارشوں کے قطروں سے بھرے مخملی گھاس کے سبز قالین، وہ رقص کرتی تتلیاں، وہ امیدوں کی طرح چمکتے جگنو اور وہ اس کی آنکھوں میں لہراتے لال ڈورے، کیا وہ سب جھوٹ تھے؟

اس نے اپنا سوٹ کیس پیک کر لیا تھا۔ اپنا جسم لے کر اپنی روح میرے حوالے کر چکی تھی۔ اپارٹمنٹ کے در و دیوار پر خاموشی اور اداسی چھائی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے کیونکہ کل اس کی فلائٹ تھی۔ سعد جا کر سو گیا تھا۔ وہ اصرار کر کے مجھے کھانا کھلاتی رہی اور میں شدت غم سے اپنا چہرہ اپنے دامن سے لپیٹے بیٹھا تھا۔ آج اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ معلوم نہیں اسے کون سی خوشیاں ملی تھیں کہ اس کی آنکھیں بار بار چمک اٹھتیں۔ مجھ سے بولی کہ آخری بار سامنے پارک میں جا بیٹھتے ہیں۔

ہم پارک میں اسی درخت تلے رکھی بینچ پر آبیٹھے جہاں اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ چھوٹے فقروں میں ادھوری باتیں کرتے تھے۔ بات کرتے کرتے کوئی گہری سانس لے کر میں خاموش ہو جاتا۔ مجھ پر پژمردگی چھائی تھی میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا تھا۔ ہم کچھ نہ کہہ کر بھی اپنی ساری ان کہی باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتیں جو دو دلوں کا راز ہوتی ہیں۔ وہ باتیں جن کا امین جسم کا رواں رواں ہوتا ہے۔ وہ باتیں جو زبان سے ادا نہیں کی جاتیں۔ وہ باتیں جو ایک دل کہتا ہے اور دوسرا دل سنتا ہے اور جانتا ہے آج چاند کی پھیکی چاندنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے جن پر میرا چہرہ جھکتا چلا گیا۔

اس نے آج مجھ سے جدا ہونا تھا۔ ہم ٹورنٹو پیرسن ایئرپورٹ کے ٹرمینل ون پر کھڑے تھے۔ بورڈنگ پاس ہم نے حاصل کر لیے تھے۔ سوٹ کیس ہم نے چیک ان کرا دیا تھا۔ ہاتھ میں اس کے ایک سفری بیگ تھا۔ سعد پھٹی پھٹی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا اور میں سعد کے سر پر ہاتھ رکھے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کو گلے لگا کر جدا کیا۔ ان کے آنسو خشک تھے۔ وہ دونوں سیکیورٹی کی لائن میں کھڑے تھے اور میں انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسکینر سے گزر کر مجھے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا طوفان کہ اس کی زد میں میرا پورا وجود آکر تنکا تنکا ہو گیا۔ وہ اندر چلے گئے تھے اور میں وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ پھر میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور قدم بڑھاتا ٹرمینل تین کی جانب بڑھنے لگا جہاں کچھ دیر بعد میری بیوی اور بچے پاکستان سے آرہے تھے۔ میری زندگی کا پرانا باب شروع ہوا چاہتا تھا، بیوی بچے اور میں۔ پرانے مثلث میں زندگی کی نئی شروعات ہونے والی تھی۔



بوڑھا مصور

ابن کبیر

اس کے ہاتھوں میں وہ جادو تھا کہ لوگ اس کی مصوری دیکھ کر اش اش کر اٹھتے لیکن اس کی زندگی ایک الجھی ڈور تھی۔ کسی معما سے کم نہ تھی۔ اس کی زندگی میں بہت ساری لڑکیاں آئیں پھر بھی وہ کنوارہ رہا۔ اس نے زندگی کو کھیل سمجھ لیا تھا۔

ایک معروف مصور کا زندگی نامہ

ٹھا ٹھا ٹھا۔ فائر کی آواز سنائی دی۔ منڈیر پر بیٹھے پرندے ڈر کر اڑ گئے اور وہ کھڑکی میں اداس کھڑا رہ گیا۔

اس نے آسمان کی سمت جاتے پنچھیوں کو دیکھا، جو اڑان بھرنے کے بعد اب بکھر گئے تھے۔

تھال میں بہت سا گوشت اور باجرہ باقی تھا۔ اس نے گہری سانس لی کیونکہ اُس نے بڑی محنت سے گوشت کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس کام میں اس کا خاصا وقت اور توانائی صرف ہوئی تھی۔ اب وہ 80 برس کا ہو چکا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی یادداشت اور صحت کھوتا جا رہا



تھا۔

اس اُمید پر کہ شاید پنچھی لوٹ آئیں، وہ کچھ دیر کھڑکی میں کھڑا رہا۔ اس نے نیچے سڑک پر نظر ڈالی۔ رات کی بارش کیچڑ کی صورت اپنا پتا دیتی تھی۔ کوئٹہ ہوٹل سے کوئلے پر تیار ہونے والی چائے کی خوشبو اس کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دُور ایک بھکاری کشکول لیے بیٹھا تھا۔ اُس کی بیساکھیاں سامنے دھری تھیں اگرچہ وہ معذور نہیں تھا۔

یہ بیساکھیاں تو لوگوں کو ٹھگنے کا طریقہ تھا۔ بھکاری ہوٹل پر کام کرنے والے اس لڑکا سے زیادہ کماتا تھا، جو روز بوڑھے مصور کے لیے تندور سے روٹیاں لے کر آتا تھا۔

بارہ سالہ لڑکے کا نام رفیق آفریدی تھا۔ اس کا خاندان افغانستان میں ایک ڈرون حملے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ جب حملہ ہوا، لڑکا اپنے گھر کے صحن میں کھیل رہا تھا۔ دھماکے کی شدت سے وہ اڑ کر دور جا گرا اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ لڑکے کا چچا اسے اسپتال لے کر پہنچا۔ اس کے ہاتھ پاؤں تو سلامت تھے، مگر جب وہ آئینہ دیکھتا تو چہرے پر موجود زخم کا نشان ماں باپ سے جدا ہونے کا کرب ناک واقعہ یاد دلا دیتا۔

''جب ام بے ہوش تھا، تو ہمارا ماں ہمارا سر دباتا تھا۔'' لڑکے نے ایک دن بوڑھے کو بتایا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ بے ہوشی میں بھی اُسے پیاس ستاتی تھی... اور اُس کی زخمی ماں اپنے دوپٹے کو پاس بہتے دریا سے گیلا کر کے لاتی اور پانی کے قطرے اس کے گلے میں ٹپکا دیتی۔ یوں سانس چلتی رہی۔

''تو اب تمہاری ماں کہاں ہے؟'' بوڑھے نے لڑکے سے پوچھا تھا۔

لڑکے کی مسکراہٹ میں زمانوں کا کرب تھا۔ ''چچا کہتا ہے، وہ تو حملے کے وقت ہی مر گئی تھی، ام کو وہم ہوا تھا۔''

لڑکا یہ کہہ کر فوراً کھڑا ہو گیا تاکہ بوڑھا شخص جس کا فلیٹ کینوس اور رنگوں سے بھرا رہتا ہے، اس کے آنسو نہ دیکھ لے۔

''میں تمہاری پینٹنگ بناؤں گا، ٹھیک ہے؟'' اس نے کہا۔

''پینٹنگ؟'' لڑکا سمجھ نہیں سکا۔ ''اچھا تصویر۔ مگر...''

وہ چپ ہو گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ تصویر بنے گی تو چہرے کا زخم بھی اُس کا حصہ ہوگا، جو ساری زندگی ماں باپ کی یاد دلاتا رہے گا۔ لڑکے نے بہانہ بنا دیا کہ وہ اپنی تصویر نہیں بنوانا چاہتا کیوں کہ قیامت کے دن اُس میں جان ڈالنی پڑے گی، بہتر ہے بوڑھا کسی طوطے کی تصویر بنا دے۔

کھڑکی کے پاس کھڑے مصور کو لڑکے کا خیال آیا تو اس کی اداسی دوچند ہو گئی۔ اس نے پھر چوکھٹ پر پھیلے باجرے اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھا۔

اُسے پرندوں سے عشق تھا۔ لندن میں بیتے تین عشروں میں اس نے جانوروں سے دوستی کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ کراچی کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں بھی اس تعلق کو قائم رکھنے کا کچھ نہ کچھ انتظام کر لیا تھا۔

وہ کھڑکی کی منڈیر پر تھال رکھ دیتا اور پرندے آن کر چگتے رہے۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ ایک پرندہ... گوشت کا ٹکڑا حلق میں پھنسنے کے باعث تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اس واقعے کا مصور نے باقاعدہ سوگ منایا۔ چند روز تک پرندے بھی اس کے فلیٹ کی کھڑکی پر نہیں اترے، شاید وہ بھی سوگ منا رہے تھے۔ اس دن کے بعد سے وہ گوشت باریک، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹتا، تاکہ پنچھیوں کو تکلیف نہ ہو۔

آرٹ کے قدر داں اس بوڑھے آرٹسٹ کو تصدق سہیل کے نام سے جانتے تھے، مگر آرٹ کی دنیا سے باہر وہ ایک گم نام، گوشہ نشین بوڑھا شخص تھا، جس نے ایک بار ایک شخص سے اپنا تعارف کروایا، تو اُس اجڈ آدمی نے اُسے چانٹا رسید کر دیا۔

یہ اُس روز کی بات ہے جب تصدق سہیل کے گھر ڈاکا پڑا تھا۔

☆......☆

وہ دو آدمی تھے کپڑے میلے، شیو بڑھی ہوئی اور منہ گٹکے سے بھرے ہوئے۔ انہوں نے پیک وہیں فرش پر تھوک دی تھی۔

''سالے بڈھے، جلدی بتا، پیسا کہاں چھپایا ہے؟''

''میرے پاس تو کوئی پیسا نہیں۔ بس، کچھ پرندے اور کچھ پینٹنگز ہیں۔'' اُس کی طبیعت کی شوخی برقرار تھی۔

''گھر میں اور کون کون ہے؟'' پہلا ڈاکو بولا۔ اس نے اب بھی پستول تان رکھی تھی۔

''ارے بھائی کوئی نہیں ہے اور اس پستول کو تو نیچے کرو۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔''

''تیرے بیوی بچے کدھر ہیں؟'' دوسرے ڈاکو نے کہا۔

''نہ تو بیوی ہے، نہ ہی بچے۔ میں نے تو شادی ہی نہیں کی

کی۔‘‘اس نے آنکھ ماری۔ ’’تمہاری شادی ہوئی ہے کیا؟‘‘
ڈاکو سٹپٹا گئے۔ جب انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے قہقہہ لگایا۔ ’’شادی تو ہے ہی جھنجٹ۔ شادی ہوئی تو بیوی ہوگی، بچے ہوں گے، ان کی ضروریات ہوں گی اور ضروریات پوری کرنے کے لیے پیسے چاہییں۔ پیسا حلال طریقے سے نہیں ملے گا تو بندہ ڈاکے ہی ڈالے گا ناں۔‘‘
ڈاکو کو سبکی محسوس ہوئی۔ ’’سالے بڑا سیانا بن رہا ہے۔ تو کیا پروفیسر ہے؟‘‘
’’نہیں، میں تو مصور ہوں۔ میرا نام تصدق سہیل ہے۔‘‘ اس نے قہقہہ لگایا تھا، مگر اگلے ہی لمحے اسے لگا، جیسے دنیا گھوم رہی ہو، پھر درد کا شدید احساس ہوا۔
جب وہ زمین پر گر گیا اور چند سیکنڈز تک گرا رہا، تب اور اک ہوا کہ ایک ڈاکو نے اسے تھپڑ رسید کیا تھا۔
اس میں اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ زمین پر پڑا دیواروں سے ٹکے کینوسوں کو دیکھ رہا تھا، جن میں رنگوں سے ایک کہانی لکھی تھی۔ ہر فن پارے میں کئی کردار تھے۔ کردار، جو اس لمحے اپنے خالق کو بے بسی سے زمین پر گرا ہوا دیکھ رہے تھے۔
دونوں ڈاکوؤں نے فلیٹ کی تلاشی لی مگر کوئی قیمتی چیز نہیں ملی، جو تھوڑا بہت کیش تھا، وہ لے کر چلتے بنے۔ البتہ اس واقعے سے بوڑھے کو سبق مل گیا کہ ان اجڈ انسان سے ہنسی مذاق صحت کے لیے مضر ہے۔ ایک خیر خواہ نے یہ مشورہ بھی دیا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ پاس رکھا کرو تاکہ ایسے موقع پر ان کے منہ پر دے مارو۔
’’ارے میری پینٹنگز تو بکتی ہی بیس تیس ہزار کی ہیں ایک ڈیڑھ لاکھ کہاں سے لاؤں گا؟‘‘ بہ ظاہر وہ ہنسا تھا مگر اس کا اندرون رو رہا تھا۔
اس کی مقبولیت اور احترام اپنی جگہ، مگر کل کی طرح آج بھی تصدق کو یہ شکوہ تھا کہ گیلری مالکان اُسے اس کا حق نہیں دیتے۔ اس کے فن پاروں کی قیمت بہت قلیل مقرر کرتے ہیں۔
’’تو تم اتنی کم قیمت رکھتے ہی کیوں ہو؟‘‘ خیر خواہ نے کہا۔ اس کا نام شفیق مرزا تھا اور وہ خود بھی ایک شوقیہ مصور تھا۔
’’میں کہاں رکھتا ہوں۔‘‘ اس نے کاندھے اچکائے۔ ’’خود ہی رکھ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں، آپ کا کینوس بہت چھوٹا ہوتا ہے، مگر میں لڑتا نہیں۔ گزارہ ہو جاتا ہے۔‘‘
’’اور تمہاری ان پریوں کا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔ جو تمہارے لیے ماڈلنگ کرتی ہیں؟‘‘ دوست نے ٹہوکا دیا۔
وہ سر پیچھے پھینک کر ہنسنے لگا۔ اور کچھ دیر ہنستا ہی رہا۔
اس نے کبھی اپنی شخصیات کو پردوں میں نہیں رکھا، دنیا جانتی تھی کہ وہ ایک شوخ اور رنگین مزاج شخص ہے۔ ساری زندگی عورتوں میں گھر ا رہا تھا۔ اب بھی ان ہی کی صحبت اسے بھاتی تھی۔ جس طرز کی وہ مصوری کرتا تھا، اس میں ماڈل کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی، مگر پھر بھی خواتین چلی آتیں۔ تصدق ان کی مالی ضروریات کا خیال رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتا۔
’’وہ سب تمہیں بیوقوف بناتی ہیں۔‘‘ دوست نے منہ بنایا۔
’’جانتا ہوں یار۔‘‘ وہی اداسی عود کر آئی، جو گزشتہ چند ماہ سے اس پر حملے کر رہی تھی۔ ’’مگر اکیلا آدمی ہوں، وہ آجاتی ہیں، تو گپ شپ ہو جاتی ہے، ان کے دکھڑے سن لیتا ہوں، اپنی کہانیاں سنا دیتا ہوں۔‘‘
’’اسی لیے کہتا تھا شادی کر لے، مگر تو نے کبھی میری بات مانی ہی نہیں۔‘‘ دوست نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا، جس میں برف گھل چکی تھی۔
تصدق مسکرایا۔ ’’شادی فارغ لوگوں کا کام ہے، آرٹسٹ شادی کر لے، تو پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔‘‘
اس نے کہہ تو دیا، مگر اُسے یاد تھا، کئی عشروں قبل، جب وہ جوان تھا، تب اُس نے یہ بیڑیاں اپنے پیروں میں ڈالنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ اُسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی، جس کا وہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک ناکام محبت تھی۔ شاید اُسی محبت نے اُسے وہ بنا دیا، جو وہ آج ہے۔
ایک بیاسی سالہ، تنہا رہنے والا مصور، جس کے فن پاروں میں جمالیاتی پہلوؤں پر جنسی عنصر غالب ہے۔
اس کا دوست جا چکا تھا۔ نیچے چائے کے ہوٹل سے اٹھتا کوئلے کا دھواں ماند پڑ گیا۔ سڑک پر بیٹھے فقیر کو غنودگی نے آن لیا تھا اور صوفے میں دھنسا تصدق دھیرے دھیرے ماضی میں اترنے لگا۔ وہ اپنے بچپن کی سمت جا رہا تھا، جالندھر کی سمت، جہاں اُس نے آنکھ کھولی تھی۔
تب وہ ایک سینئر مصور نہیں تھا، وہ بلند قامت افسانہ نگار بھی نہیں تھا، تب وہ ایک بچہ تھا، جس کے گھر کے صحن میں ایک بڑا سا نیم کا درخت تھا، جس پر ایک ڈائن کا بسیرا تھا۔

☆......☆

☆سن 1937ء، جالندھر:

گلی میں گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی، پھر سناٹا چھا گیا۔
وہ اپنے لحاف میں مزید دبک گیا۔ چند لمحوں بعد دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھایا۔ صحن کے دوسرے کونے پر کھڑے نیم کے درخت میں کچھ ہل چل ہوئی۔ دو آنکھیں چمکیں۔ وہ لرز گیا اور چارپائی پر لیٹے اپنے بڑے بھائی کی سمت کھسک گیا۔
یوں لگا جیسے درخت سے کوئی اتر رہا ہے۔ اگلے ہی پل پھر چیخ سنائی دی۔ لحاف کے اندر وہ کپکپا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے کوئی پُراسرار وجود چارپائی کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے لحاف کھسکا کر اسے دیکھ لیا تو اسی لمحے اس کی موت واقع ہو جائے گی اور وہ ابھی نہیں مرنا چاہتا تھا۔ وہ تو جینے کا خواہش مند تھا مگر... اس پُراسرار وجود کا کیا جائے جو چارپائی کے گرد حرکت میں تھا۔
اس نے وہ تمام آیات دہرانی شروع کر دیں جو مولوی صاحب کی بیوی نے اسے یاد کروائی تھیں۔ وہ جانے کب تک ان آیات کو دہراتا رہا۔ اذان کی آواز کانوں میں پڑی تو کچھ پل کو سکون ملا، تب ہی اس کی آنکھ لگی۔
اگلی صبح وہ بخار میں تپ رہا تھا۔ گھر میں کہرام مچا تھا۔ دادی نے اپنے ٹوٹکے آزمائے مگر بات نہیں بنی۔ باپ گل باغ خان کو خبر کرنے کے لیے ایک آدمی کچہری روانہ کیا گیا۔
باپ ادھر سول ناظر تھا۔ اس نے کہلوا بھیجا کہ کام زیادہ ہے۔ وہ شام تک لوٹے گا تب تک بچے کے سر پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتے رہو۔
بچے کی دادی نے اپنے بیٹے کے کہے پر عمل کیا، مگر بچے کا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھول کر درخت کی سمت دیکھتا، پھر غنودگی میں اتر جاتا۔
آخر اس کو پھر خبر کی گئی۔
جالندھر میں ان دنوں جاڑا پڑ رہا تھا۔ شامیں جلدی اتر آتیں۔ اندھیرا چھاتا تو لگتا جیسے زندگی پر جمود چھا گیا ہے۔ اس بار سول ناظر نے معاملے کو سنجیدگی سے لیا۔ وہ تانگہ کر کے سیدھا ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔
ہندو ڈاکٹر بڑا اڑیل شخص تھا۔ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ البتہ گل باغ خان نے بھی دنیا دیکھی تھی، کس شخص سے کس طرح بات کرنی ہے، کیسے اسے رام کرنا ہے، وہ خوب جانتا تھا۔
سورج کی آخری کرنیں ابھی آسمان میں تھیں کہ تانگہ محلے میں آ کر رکا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر آرتھواسکوپ کانوں سے لگائے لڑکے کی دھڑکن جانچ رہا تھا۔
''سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔'' ڈاکٹر تھوڑا مایوس دکھائی دیا۔
''تو پھر؟ اس کا جسم تو بخار سے پھنک رہا ہے۔'' باپ نے کہا۔
پردے کے پیچھے حرکت ہوئی۔ بوڑھی عورت باہر آ گئی۔ ''میں کہوں، بچہ ڈر گیا ہے۔''
ڈاکٹر نے بڑھیا کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یوں بھی وہ جلدی میں تھا۔ یہ مسلمانوں کا علاقہ تھا اور ایسے علاقے میں شام ڈھلنے کے بعد ہندو خود کو بے چین محسوس کرتے تھے۔ اس نے چند گولیاں دیں۔ بچے کے باپ سے کچھ بات کی اور چلتا بنا۔
بچہ اب کچھ سنبھل گیا تھا۔ گرم دودھ پی کر چہرے کی بشاشت لوٹنے لگی تھی۔ دادی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔
''وہاں...... وہاں ایک عورت ہے؟'' آخر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
''کہاں؟'' بوڑھی عورت کے لہجے میں حیرت تھی۔ بچے نے درخت کی سمت اشارہ کیا۔
''اچھا، اس درخت پر۔'' عورت مسکرا دی۔ ''اور وہ دکھائی کیسی دیتی ہے بھلا؟''
بچہ نے بتانے کی کوشش کی، اپنی سی کوشش مگر اس کا ذخیرہ الفاظ محدود تھا، وہ اس کا سراپا بیان کرنے سے قاصر تھا۔
''میں...... میں اس کی تصویر بناتا ہوں۔'' بچہ دوڑا دوڑا گیا پینسل اور کاغذ لے آیا۔ وہ اس عورت کی جسے وہ چڑیل سمجھتا تھا تصویر بنانے لگا۔ بڑھیا اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ باپ ڈاکٹر کو چھوڑ کر لوٹ آیا تھا، اس نے بچے کو خود میں مگن دیکھا تو اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔
آخر بچے نے ایک عورت کی ٹوٹی پھوٹی شبیہہ بنائی اور اپنی دادی کی سامنے رکھ دی۔
''وہ ایسی ہے، دیکھو...... لمبے گندے بال...... خطرناک آنکھیں...... ڈراؤنی شکل...... لمبے لمبے ناخن......''
''ارے یہ تو نفیسہ کی تصویر ہے۔'' عورت ہنسنے لگی۔ لڑکے نے حیرت سے پلکیں جھپکیں۔ عورت بولی۔ ''وہ میری بہن تھی۔ زندہ ہوتی تو آج میری طرح اس کے دانت بھی گر گئے ہوتے۔ وہ اسی نیم کے درخت پر رہتی ہے، کبھی کبھی مجھ سے ملنے اترتی ہے، تو پریشان مت ہوا کر۔ اور یہ جو تصویر ہے ناں......''
بوڑھی عورت نے پینسل لے کر کاغذ پر چند لکیریں

بھیریں۔ شبیہ کے بال کچھ سیدھے ہوگئے، آنکھوں کے گرد حلقے کا جل معلوم ہونے لگا، لمبے لمبے بازوؤں میں کچھ ترتیب ابھر آئی اور شبیہ کچھ قابل قبول ہوگئی۔

"یہ دیکھ۔" اس نے کاغذ بچے کے سامنے کر دیا۔ "ایسی دکھائی دیتی ہے میری بہن نفیسہ۔ وہ آتی رہتی ہے مجھ سے ملنے۔ تجھے تھوڑی کچھ کہے گی۔ سب ہی عورتیں ایک سی ہوتی ہیں۔"

بچے نے اپنی دادی کی بات مان لی۔ یہی سبب ہے کہ چار راتوں بعد، جب آسمان پر چاند بجھ گیا تھا اور نیم کے درخت سے ایک سایہ اترا تھا، تب اس نے ذرا خوف محسوس نہیں کیا، اس..... عورت کے عجیب و غریب بالوں، ڈراؤنی آنکھوں، لمبے ناخنوں اور مڑے تڑے پیروں پر بھی اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

اس کے ذہن میں یہ تصور بیٹھ گیا تھا کہ سب ہی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں، جیسی یہ چڑیل ہے۔ انہیں اسی حالت میں قبول کر لینا چاہیے۔

وہ تصویر جو اس نے بنائی تھی، وہ ایک عرصہ گودام میں کہیں پرانی کتابوں کے بیچ پڑی رہی۔ جلد وہ کاغذ بوسیدہ ہوگیا۔ ایک روز بارش ہوئی تو گودام میں پانی بھر گیا۔ وہ کاغذ اس پانی پر بہتا ہوا، اس نیم کے درخت تک گیا اور اس کی جڑ سے لپٹ گیا اور پھر غائب ہوگیا۔

وہ تصدق کا پہلا فن پارہ تھا اور اب وہ عشروں بعد ہی دوبارہ مصوری کی سمت مائل ہونے والا تھا اور وہ بھی اس دیس میں نہیں جس کا وہ باسی تھا جس کی آب و ہوا سے وہ یوں واقف تھا، جیسے اپنی ماں کو جانتا تھا بلکہ ایک ایسے دیس میں، جو اس کے لیے یکسر اجنبی تھا، بالکل اپنے باپ کی طرح۔

☆......☆

☆سین 2007، کراچی:

"آپ کا سن پیدائش کیا ہے؟"

کئی برس بعد، جب وہ ایک معروف مصور بن چکا تھا، جب اس کے فن پاروں کی دھاک بیٹھ چکی تھی، تب ایک نوجوان صحافی نے اس سے یہ سوال کیا تھا، اسی فلیٹ میں، جہاں وہ اپنے آخری دن گزارنے والا تھا۔

اس نے ایک نظر اس صحافی کو دیکھا اور سوچا کہ اگر وہ بہ وقت شادی کر لیتا تو اس کا پوتا اسی عمر کا ہوتا مگر اس نے پیروں میں شادی کی زنجیر نہیں ڈالی، ایک آزاد پنچھی کی طرح آسمانوں میں اڑتا رہا۔ کبھی اس جنگل میں، کبھی اس جنگل میں...اور یونہی زندگی گزرتی گئی، وقت کا دریا بہتا رہا اور اب......اب وہ کراچی میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں بیٹھا تھا، اس کے سامنے ایک نوجوان صحافی تھا، جو اس سے سوال کر رہا تھا کہ اس کا سن پیدائش کیا ہے۔

اس نے اپنا سن پیدائش بتایا۔ "1930ء تھا۔"

تب صحافی نے سوال کیا کہ مہینا کون سا تھا۔ اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ نوجوان دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا۔ کھلی کھڑکی سے کوئلے پر پکتی چائے کی مہلک ان تک پہنچ رہی تھی۔ دور کہیں بس کا ہارن سنائی دیا۔ پڑوس میں ٹی وی اونچی آواز میں چل رہا تھا۔

"بھئی، ہمارے زمانے میں سن یاد رکھ لیا جائے یہی بڑی بات تھی، تاریخ اور مہینا کوئی یاد نہیں رکھتا تھا۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "ہاں، اگر بچے کے پیدا ہونے کے آس پاس کے دنوں میں کوئی بڑا واقعہ ہوا ہو، جیسے عید، کرسمس، ہولی دیوالی، تو یاد رکھنا آسان ہو جاتا تھا مگر میرے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ بس والدین یہی کوشش کرتے کہ ایسا مہینا منتخب کریں کہ بچے کو فوراً اسکول میں داخلہ مل جائے، وہ جلدی سے میٹرک کرے اور اس کی نوکری لگ جائے۔"

صحافی اس کی بات سمجھ چکا تھا۔ "تو آپ جالندھر میں پیدا ہوئے؟"

تصدق نے سر ہلایا۔ اب صحافی جالندھر کے بارے میں پوچھنے لگا۔ یہ سوالات تصدق سہیل کو ماضی میں لے گئے۔ بٹوارے سے پہلے کے ہندوستان میں۔

اب وہ پنجاب کے ایک ہرے بھرے کھیت میں کھڑا تھا۔

جالندھر، ایک چھوٹا سا قدیم شہر۔ پُرسکون اور سرسبز۔ اور اسی چھوٹے سے شہر کی خوش بو اُس کی سب سے توانا یاد تھی۔ اسی شہر کے مناظر اس کے خوابوں میں رنگ بھرتے تھے۔

آج کا جالندھر ایک ترقی یافتہ شہر ہے، جہاں صنعتی انقلاب کے اثرات پوری طرح پہنچ گئے ہیں، البتہ اب سے آٹھ عشروں قبل یہ ایسا نہیں تھا۔ یہاں زندگی ٹھہری ہوئی تھی، ساحل سمندر سے 748 فٹ بلندی پر واقع اس شہر کا رقبہ بارہ کلو میٹر تھا مگر تصدق کے لیے تو اس کا رقبہ بس وہ کھیت تھا جو اس کی نظروں کے سامنے لہراتا۔ وہ محلہ تھا جس کی گلیوں میں وہ کھیلتا۔ وہ گھر تھا جہاں وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مقیم تھا۔

وہ دو بھائیوں اور چار بہنوں میں بڑا تھا، مگر بڑا ہونے کا احساس بہت جلد اس کا ساتھ چھوڑنے والا تھا۔

اب تصدق وہ بچہ نہیں رہا تھا جس نے ایک روز ایک چڑیل کو درخت سے اترتے دیکھا تھا۔ وہ یہ واقعہ بھول گیا تھا۔ اب وہ اکثر درخت پر چڑھ جاتا اور بچوں کے رسائل پڑھتا رہتا۔ اس کا ایک ہندو دوست مطالعے کی اس عادت کو بیماری کہا کرتا تھا۔

"بھگوان قسم، تم تو کتابی کیڑے بن گئے ہو۔ یہ اسکول کی کتابیں کیا کم ہیں، جو تم کہانیوں میں سر کھپاتے رہتے ہو۔" موہن تلملا کر کہتا۔ "اگر میرے پتاجی کو خبر ہو جائے کہ ان کا پتر کہانیاں پڑھتا رہتا ہے، تو اس کا سر پھوڑ دیں۔"

درخت کی شاخ پر بیٹھے تصدق کو موہن کی کہی بات یاد آئی تو وہ ہنسنے لگا۔ شاخوں کے خاموش گوشوں سے چند پنچھی اڑ گئے۔

اس کے زیادہ دوست نہیں تھے۔ وہ کم گو اور اپنے خول میں بند رہنے والا بچہ تھا۔ جب دیگر لڑکے گلیوں میں شور مچاتے، وہ کچھ دور، کوئی کتاب اٹھائے، مطالعے میں غرق ہوتا۔

عشروں بعد جب وہ اپنی یادیں کھنگالا کرتا تو تقسیم سے پہلے کے جالندھر میں خود کو بچوں کا مشہور رسالہ "نونہال" پڑھتے ہوئے دیکھتا۔ وہ اکثر لوگوں کو بتاتا کہ اس نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی تھیں، جو نونہال میں شائع ہوئیں۔ مگر جب کوئی پوچھتا کہ میاں کیا اُس وقت نونہال کا اجرا ہو گیا تھا؟ تو وہ گڑبڑا جاتا۔

مطالعے میں غرق تصدق کو یکدم احساس ہوا کہ اس نے بہت دن سے موہن کو نہیں دیکھا۔ وہ اس کے محلے کی سمت نہیں آیا تھا۔ آخری بار وہ دونوں چند روز قبل اسکول میں ملے تھے۔

اسکول کی فضاؤں میں بھی اب تناؤ بھرا رہتا۔ ایک عجیب سی چپ تھی، اساتذہ کے چہروں پر پریشانی کا سایہ نظر آتا۔

ہندوستان دو حصوں میں بٹنے والا تھا۔ کل تک جو پڑوسی تھے اب اجنبی بن گئے، کل تک جو ایک وجود تھا اب اُس میں دراڑ ابھرنے والی تھی۔

لڑکے نے اس تخت کی سمت دیکھا، جہاں کبھی اس کی دادی سویا کرتی تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے، سن 1944 کی ایک سرد تاریک رات بوڑھی عورت خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس نے اسی تخت پر لیٹے لیٹے خدا کو یاد کیا اور آنکھ موند لیں۔ تصدق پر انکشاف ہوا کہ جب سے دادی کا انتقال ہوا ہے، وہ عجیب و الخلقت عورت دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ وہ سر جھٹک کر کتاب پر جھک گیا مگر کتاب میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔

سورج غروب ہونے لگا۔ ماحول میں حبس تھا۔ اس کے لیے مطالعہ جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ سر بھاری ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ حیران کن طور پر ہر طرف چپ تھی۔ لگتا تھا، زندگی رکی ہوئی ہے۔ اسے محسوس ہوا، جیسے وہ دنیا میں اکیلا انسان ہے۔ تنہائی نے اسے خوف زدہ کر دیا۔

اگلے ہی پل ایک کھٹکا ہوا۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کا خون خشک ہو گیا۔ وہی پُراسرار عورت ایک شاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں تصدق پر ٹکی تھیں اور اس کی لمبی زبان باہر جھول رہی تھی۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، چلّانا چاہتا تھا مگر اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اسے لگا، جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ عورت شاخ سے لٹکی جھول رہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب آئی تو تصدق کو گرمی کا جھونکا محسوس ہوا... وہ دھیرے دھیرے مر رہا تھا۔

اچانک عورت نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ دھب سے زمین پر گری۔ اس نے مڑ کر تصدق کی سمت نہیں دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور دیوار کے پاس پہنچ کر غائب ہو گئی۔

تصدق کا ذہن اندھیرے میں اترنے لگا۔ وہ توازن کھو بیٹھا اور زمین پر گر گیا مگر اُسے درد کا احساس نہیں ہوا۔ اسے تو بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ کچھ بہت ہولناک رونما ہونے والا ہے۔

جب باپ تھکا ہارا صحن میں داخل ہوا، تو لڑکا منہ کے بل زمین پر پڑا تھا، یوں لگتا تھا جیسے دھرتی کا بوسہ لیتا ہو۔ اس نے شور مچا کر سب کو اکٹھا کیا اور لڑکے کو چارپائی پر ڈال دیا۔

اسے ایک بار پھر بخار نے آن لیا تھا۔ جسم پھنک رہا تھا مگر اس بار اسے بیماری کی کھائی میں دھکیلنے والی بدروح فقط اس کے شکار پر نہیں نکلی تھی، اس کا نشانہ تو یہ خطہ تھا۔ وہ لاکھوں افراد کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔

کانگریس کی پالیسیوں اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے معصوم انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ محمد علی جناح کے ذہن میں پُرامن ہجرت کا جو خواب تھا وہ سبوتاژ ہوا۔ تناؤ بڑھتا گیا، شہر، محلے، گلیاں بٹ گئیں۔ جو ہمیشہ سے ساتھ تھے، وہ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔

تقسیم کے بعد فسادات ہوئے اور ہجرت کے وقت خون خرابہ ہوا۔ گھر جلائے گئے، عورتیں اور بچے قتل ہوئے، لڑکیوں کی عصمت دری ہوئی، اپنے اپنوں سے بچھڑ گئے، ٹرینیں کٹ گئیں اور آدمیوں کے ذہنوں سے خوش گوار یادیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محو ہوگئیں۔

☆......☆

بدروح اپنی چالیں چل رہی تھی۔ قدم قدم پر آسیب کا سایہ تھا۔

تصدق ان ہولناک مناظر کا گواہ بنا۔ پنجاب میں آگ لگ گئی تھی۔ گرونانک کے نام لیوا سکھ تلواریں سونتے نکل آئے۔ کل تک جو محبت سے ملتے تھے، وہ نفرت اگلنے لگے۔ مسلمانوں کے لیے ہجرت لازم ٹھہری۔ اس کے خاندان کو بھی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا۔

اس کا خاندان بھی ہزاروں بدنصیب خاندانوں کی طرح آگ وخون کا دریا عبور کرکے، آسیبی گھاٹیاں پھلانگتے ہوئے، خون سونگھتی بدروحوں سے چھپتے چھپاتے آگے بڑھتا رہا... ایک روشن صبح وہ بارڈر عبور کرنے میں کامیاب رہے۔

اور بارڈر عبور کرتے ہی دنیا بدل گئی۔ انہیں فضا میں آکسیجن کی موجودگی کا احساس ہوا، پرندوں کی چہک سماعتوں میں رس گھولنے لگی، تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑا اور بھوک چمک اٹھی۔

تصدق اب پاکستان میں تھا۔ اس ملک میں، جو اس کی شناخت بننے والا تھا، جس کی کہانیاں وہ رنگوں کے ذریعے بیان کرنے والا تھا، جس سے اپنے رشتے کو وہ بین الاقوامی حیثیت دینے والا تھا مگر یہ سب بہت بعد میں واقع ہوا۔

اس وقت تو تصدق نوجوان تھا اور وہ بدروح کہیں پیچھے رہ گئی تھی، جس کا نیم کے درخت پر بسیرا تھا۔ جالندھر اس کے دل میں ضرور مہکتا تھا، مگر نیا شہر بھی اس کی دھڑکن بن گیا تھا اور ایسا بے سبب نہیں تھا کہ یہ کوئی عام شہر تھا۔ یہ لاہور تھا، ہزاروں سال قدیم، تاریخی اہمیت کا حامل شہر لاہور۔ باغوں کا شہر، جو دریائے راوی کے کنارے واقع تھا۔

یہ تصدق کو بعد میں پتا چلا کہ لاہور کا ذکر ہندوؤں کی مقدس کتب میں بھی تھا۔ پرانوں کے مطابق رام کے بیٹے راجا لوہ نے شہر لاہور کی بنیاد رکھی تھی اور یہاں ایک قلعہ بنوایا۔ دسویں صدی تک یہ شہر ہندو راجاؤں کے زیر تسلط رہا۔ گیارہویں صدی میں سلطان محمود غزنوی نے پنجاب فتح کیا۔

البتہ اس وقت تصدق کو ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت وہ ایک عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ یہ معاشی پریشانیوں اور بے فکری کے درمیان کی عجیب وغریب کیفیت تھی، جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل تھا۔

وہ لاہور سے بغل گیر ہو رہا تھا۔ کبھی شاہی قلعے کا رخ کرتا، جسے اکبر نے ازسرنو تعمیر کروایا تھا، کبھی شالامار باغ کا، جس کے پیچھے شاہجہاں کا ذہن تھا۔ ادھر راوی کنارے ایک حسین باغ تھا جو شہزادی جہاں آرا کی سوچ کا پرتو تھا۔

ان دنوں جب زندگی دھیرے دھیرے اپنی سمت کا تعین کر رہی تھی، اس نے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخلہ لے لیا تاکہ میٹرک کا مرحلہ طے کرکے گھر والوں کی کفالت کی ذمے داری سنبھال لے۔

جالندھر میں وہ اینگلو ہائی اسکول اور کرسچن ہائی اسکول میں زیر تعلیم رہا تھا۔ تمام امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے۔ البتہ اب پوزیشن لینے سے زیادہ سند حاصل کرنا مقصد تھا جو اس نے جلد ہی حاصل کرلی۔

مطالعے کی عادت عود کر آئی تو لائبریریوں کا رخ کیا۔ البتہ پرانے لاہور کی ایک نجی لائبریری میں قدم رکھنے کے بعد پھر وہ کہیں نہیں گیا۔ وہ لائبریری ایک ضعیف العمر شخص چلاتا تھا۔ یہ اس کے گھر ہی کا ایک کمرا تھا۔ سہ پہر میں بوڑھے آدمی کی بیٹی اس کے لیے چائے لاتی، تو ایک پل کو تصدق کی دھڑکن رک جاتی۔ لڑکی کا چہرہ ہر اس چہرے سے مختلف تھا جو اس نے کبھی دیکھا تھا اور پھر اس میں ایک اسرار اور تھا کہ جتنا وہ اس کا چہرہ یاد رکھنے کی کوشش کرتا، اتنا وہ محو ہوجاتا۔ ہر بار تصویر دھندلا جاتی۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس کی کوئی تصویر بنالے مگر یہ مرحلہ کبھی طے نہ ہوسکا۔

تصدق اب سنجیدہ ادب کی سمت آگیا تھا۔ پریم چند، کرشن چندر اور منٹو نے اسے گرویدہ بنالیا۔ وہ ان ہی ادیبوں سے ملنے کو اس ضعیف العمر ریٹائر شخص کی لائبریری میں جاتا، جس کی بیٹی جب چائے لیے کتب خانے میں داخل ہوتی تو شیلف میں موجود کتابیں اسے تکنے لگتیں اور کتابوں میں موجود کردار اپنے مکالمے بھول جاتے۔

کتابوں ہی نے اسے نیا نام دیا۔ پہلے وہ تصدق رسول ہوا کرتا تھا۔ فارسی ادب نے لفظ سہیل سے روشناس کیا۔ یہ یمن میں طلوع ہونے والے تاباں ستارے کا نام تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ سہیل کا لاحقہ لگالیا۔

بہت برس بعد...... وہ ہنستے ہوئے یہ دعویٰ کرنے والا تھا کہ پاکستان میں سہیل کا نام اختیار کرنے والا وہ پہلا شخص ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ تھا، جس کی تصدیق یا تردید دشوار تھی،

اس لیے جو سنتا، چپ ہو جاتا۔
ایک سہ پہر وہ لائبریری پہنچا تو شیلف میں رکھی کتابیں اداس تھیں اور کردار سر جھکائے بیٹھے تھے، اس نے مطالعے کی کوشش کی مگر جی نہیں لگا۔ کچھ عجیب رونما ہوا تھا۔ جس بزرگ کی وہ لائبریری تھی۔ وہ بھی تھوڑے مضمحل معلوم ہوتے تھے۔ سہ پہر شام میں ڈھلنے لگی مگر وہ اسرا منظر میں داخل نہیں ہوئی جو اپنے ساتھ اپنا جادو لایا کرتی تھی۔ آخر وہ اکتا گیا۔
نکلتے ہوئے ہمت جتا کر بزرگ سے پوچھا۔ ”وہ لائبریری دو روز بند رہی؟ سب خیریت تو ہے جناب؟“
بوڑھے نے گہرا سانس لیا۔ ”میاں، ہماری صاحب زادی کی شادی تھی۔ شکر ہے، یہ مرحلہ طے ہوا۔“
شاید بوڑھے نے کچھ اور بھی کہا تھا مگر تصدق سن نہ سکا۔ وہ یوں کھڑا تھا، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ اس روز لائبریری سے نکل کر وہ سیدھا راوی کنارے گیا اور آنکھوں میں قید آنسوؤں کو بہنے دیا۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ آخر دریا کو اپنی رفتار دھیمی کر کے اس کے غم میں شریک ہونا پڑا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے، جس کے نام سے بھی وہ ناواقف تھا۔
عشق ناکام کے تجربے نے اسے کچھ تلخ کر دیا۔ اس کی سر گشتی آوارہ گردی میں بدل گئی۔ وہ منہ پھٹ اور ضدی ہو گیا۔ گھر کے کاموں سے جی اچاٹ ہوا۔ میٹرک کے بعد مزید پڑھنے سے انکاری ہو گیا اور ملازمت کی تلاش کو بوجھ قرار دینے لگا۔
آوارگی پر پہلے تو ڈانٹ ڈپٹ ہوئی باز نہیں آیا تو درگت بنائی گئی مگر یہ نسخہ اب کارگر نہیں رہا تھا۔ یہ دس سالہ تصدق رسول نہیں۔ بلکہ بیس سالہ تصدق سہیل تھا۔
وہ خود بھی منتشر تھا، کوئی واضح مستقبل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لائبریری جانا اس نے کم کر دیا۔ لاہور کے باغات اور عمارتوں میں دلچسپی ماند پڑ گئی۔ دوبارہ دریا کی سمت بھی نہیں گیا۔
البتہ ایک شے نے اس کی توجہ پوری طرح اپنی سمت مبذول کروائی۔ وہ ایک مقدس عمارت تھی، ایک صوفی کی درگاہ، مرکز تجلیات۔
لاہور داتا کی نگری تھا۔ یہاں کا اصل بادشاہ وہ تھا جو بارہ سو برس سے اس تخت پر بیٹھا تھا، جس کی موجودگی شہر کا سکون تھا۔
داتا دربار اس کے من میں کھب گیا۔ اسے وہ عمارت بھا گئی جہاں محفل سماع جاری رہتی، لنگر تقسیم ہوتا، اطمینان تیرا کرتا۔ نئی ریاست کی سمت آنے والے اجڑے بکھرے خاندان ادھر اترتے اور سنور جاتے۔
وہ پہلی بار ادھر گیا اور اس مزار کی چوکھٹ پر اپنا دل چھوڑ آیا۔ اپنی کٹیا کی سمت لوٹا تو بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ پھر وہاں جائے، تجلیات کے سامنے سر جھکائے، نور میں بہتا جائے۔
البتہ اس عشق کی راہ میں عجب رکاوٹ آن پڑی۔ لاہور چھوڑنے کا حکم صادر ہو گیا اور ایسا بے سبب نہیں تھا۔ وجیہہ نوجوان خاندان میں جھگڑوں کا سبب بن رہا تھا۔ سب کو لگتا تھا کہ لڑکا بگڑ گیا ہے، ان کی بیٹیوں پر ڈورے ڈال رہا ہے۔
ایک روز ننھیال کی خواتین نے آکر خوب شور مچایا۔ الزامات کی پوری فہرست تھی ان کے پاس۔ بہت تو تو میں میں ہوئی۔ اس کے باپ نے اعلان کر دیا کہ اب ننھیالیوں سے قطع تعلق کر لیا جائے مگر کچھ روز بعد لڑکے کے ددھیالی پہنچ گئے۔ ان کے پاس بھی شکایات کی پٹاری تھی۔
اس کے ابا نے فیصلہ کر لیا کہ موزوں یہی ہے کہ لڑکا شہر چھوڑ دے۔ اس نے تصدق کو اپنے سالے کے ہاں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا جو لاہور سے میلوں دور ایک صنعتی شہر میں مقیم تھا۔
ایک جل تھل شام تصدق اُس ٹرین میں جا بیٹھا جو دھواں چھوڑتی، شور مچاتی ساحلی شہر کی سمت جاتی تھی۔

☆......☆

”مگر تم کراچی کیوں چلے آئے؟“
یہ سوال کوئی اور کرتا تو وہ ذرا فلمی انداز میں کہتا، بس جناب، خاندان کی ساری لڑکیاں ہماری محبت میں گرفتار ہو گئی تھیں... مگر وہ ایسا نہیں کہہ سکتا تھا کہ سامنے ایک عالم تھا ایک محترم و معتبر شخص، اردو ادب کا پہلا مستند نقاد، محمد حسن عسکری۔
”سر، فقیر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا آرزو مند تھا۔“ اس نے کوشش کی کہ لہجے میں انکساری بھر دے مگر استاد نے آواز میں چھپی شرارت کو بھانپ لیا۔
”اور گزر بسر کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ سامنے دھرے کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ یہ کراچی کے اسلامیہ کالج کا ایک خاموش گوشہ تھا جس کی دھندلی کھڑکیوں سے سرما کی دھوپ اندر داخل ہو رہی تھی اور ماحول کو خوابیدہ بنا رہی تھی۔
”بس سر، کراچی آنے کے بعد ایک انشورنس کمپنی سے

وابستہ ہوگیا، تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "اور یہاں آپ سے ملاقات ہوگئی۔"

"آپ میں قابلیت ہے، مطالعہ جاری رکھیں، البتہ نصاب سے بھی غفلت مت برتیں، امتحانات میں سوال نصابی کتب ہی سے آئیں گے۔" عسکری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ دھوپ ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ان کا ماتھا روشن تھا۔ کمرے میں چھائی خاموشی اشارہ تھی کہ اب وہ جاسکتا تھا۔

تصدق باہر آگیا۔ اس نے عسکری صاحب کے سامنے وہ بات نہیں کہی جو وہ اپنے یاروں کے سامنے کہا کرتا تھا۔

"بھائی، میں تو بس ان ہی کو پڑھتا ہوں۔ دیوانہ ہوں ان کا۔ ان ہی کی تحریروں سے متاثر ہو کر اب فرانسیسی ادب پڑھ رہا ہوں۔"

"تو اسی وجہ سے تمہیں کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا؟" ایک دوست نے، جس کا نام افتخار تھا، آنکھ ماری۔

"وہ مون سون کی پہلی بارش تھی، انگریزی کی کلاس میں عسکری صاحب کی آواز صحرا میں پکارنے والے کی پکار معلوم ہوتی تھی۔" تصدق نے یکدم کہانی کار کا روپ دھار لیا۔ "انہوں نے ڈکنز کے بارے میں سوال کیا تھا..."

"اور تم نے اتنی ڈینگیں ماریں کہ تم مانیٹر لگ گئے۔" لڑکے نے بات اچک لی۔ ٹولی میں قہقہہ بلند ہوا۔ سب سے بلند قہقہہ خود تصدق کا تھا۔

اس زمانے میں صرف ایک شے تصدق کی توجہ کا محور تھی۔ ادب۔ اس نے اپنی عشق کرنے کی فطری صلاحیت کو بھی عارضی طور پر تج دیا تھا۔ زرناب سے بھی فقط عسکری صاحب کی کتب پر گفتگو کیا کرتا۔

اس دوشیزہ سے اس کی پہلی ملاقات کراچی یونیورسٹی کی ایک ادبی تقریب میں ہوئی تھی۔ ملاقاتیں چند ماہ جاری رہیں، مگر پھر زرناب کی آنکھوں میں، جس میں سوات کا سارا حسن سمایا ہوا تھا، ناامیدی کے رنگ اتر آئے۔ اس نے زچ ہو کر اپنی سہیلی سے کہا تھا۔ "وہ تو عسکری صاحب کے عشق میں مبتلا ہے۔"

"آج نہیں تو کل، یہ بھوت اتر جائے گا۔" سہیلی نے تسلی دی۔

"مگر اس وقت تک زرناب پرواز کر چکی ہوگی۔" لڑکی کے لہجے میں تھوڑی اداسی تھی۔

اور ایسا ہی ہوا، جب تصدق کو ادراک ہوا کہ وہ لڑکی، جس سے وہ گھنٹوں کینٹین میں بیٹھا فرانسیسی اور انگریزی ادب کے تقابل پر بحث کیا کرتا تھا، اُسے ادب سے زیادہ جالندھر کی وہ مہک پیاری تھی، جو تصدق اپنے وجود میں اٹھائے پھر رہا تھا۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، لڑکی سوات ہی کے ایک جوان سے بیاہ دی گئی۔

اُن ہی دنوں تصدق سہیل کا پہلا افسانہ کراچی سے نکلنے والے جریدے "شہلا" میں شائع ہوا اور وہ زرناب کا غم بھول گیا۔

اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی اپنے استاد محمد حسن عسکری کے مانند ترجمے کی سمت متوجہ ہو۔ یاد رہے کہ عسکری صاحب نے "مادام بواری" اور "موبی ڈک" جیسے شاہ کار ناولز کو کمال مہارت سے اردو روپ دے کر قارئین کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ تصدق بھی اس میدان میں قدم رکھنے کا آرزومند تھا مگر عسکری صاحب نے نوجوان کو افسانہ نگاری میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا مشورہ دیا۔

"مشورہ کیا صاحب!" اس نے اپنے دوست افتخار سے کہا، جو چلغوزے چھیل رہا تھا۔ "حکم تھا حکم۔ اور ان کی حکم عدولی فقیر کے لیے کہاں ممکن ہے۔"

یہ کہہ کر تصدق کاغذ پر جھک گیا۔ اس کا تخیل سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ وہ ایک پری کی کہانی لکھ رہا تھا، جو پرواز کر گئی تھی، سوات کی اُور، اور پیچھے ایک نیم کا درخت رہ گیا تھا جس پر اس کی یاد کا بسیرا تھا۔

تصدق کا یہ افسانہ کراچی کے ایک معتبر جریدے میں شائع ہوا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کئی جرائد میں اس کے افسانے چھپے۔ عسکری صاحب کو متاثر کرنے کے چکر میں وہ نصابی کتب سے لاتعلق ہوگیا تھا۔ اس پر مستزاد، اپنی معلومات کو اپنی علمیت سمجھ بیٹھا تھا اور اسی غلط فہمی کا اس نے خمیازہ بھگتا۔

سیکنڈ ایئر کا نتیجہ آیا تو کلاس کا مانیٹر... میکبتھ اور اوتھیلو پر سیر حاصل بحث کرنے والا، والٹیر اور روسو پر اپنے ساتھیوں کو لیکچر دینے والا محمد حسن عسکری کا چہیتا طالب علم تصدق سہیل... فیل ہوگیا تھا۔

یہ صدمے سے زیادہ شرمندگی کا احساس تھا جس نے اس کا حوصلہ توڑ دیا۔ یہ سوال ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا کہ اب وہ اپنے استاد کا سامنا کیسے کرے گا؟ باقی طلبا سے نظریں کیسے ملائے گا؟

اُس نے کالج ہی چھوڑ دیا۔۔اور پھر کبھی عسکری صاحب کے سامنے نہیں گیا۔

"کب تک یوں بھاگتے پھرو گے، کبھی نہ کبھی تو ان سے سامنا ہونا ہی ہے۔" افتخار نے کہا۔ اس وقت وہ عسکری صاحب ہی کے مضامین کا مجموعہ "انسان اور آدمی" پڑھ رہا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" تصدق نے اعتماد سے سر ہلا۔

"کیوں، کیا کراچی چھوڑ رہے ہو؟" دوست نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ سرما چلا گیا تھا اور کھڑکی کے باہر تڑاکے کی دھوپ تھی۔ "میں یہ ملک چھوڑ رہا ہوں۔"

جب وہ پلٹا تو افتخار کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور کتاب اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

☆......☆

"گرل فرینڈ سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ بس، غصے میں آکر میں نے ملک چھوڑ دیا۔"

برسوں بعد جب اس نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی تو موقع پر موجود افتخار نے ٹہوکا دیا۔

"بڑے میاں، اب تمہاری یادداشت ساتھ نہیں دیتی۔ بھول گئے، تم فیل ہوگئے تھے سیکنڈ ایئر میں۔"

"ہاں ہاں، وہ معاملہ بھی تھا، مگر گرل فرینڈ سے ہونے والا جھگڑا بھی ایک وجہ بنا۔" وہ ہنسا۔

"اچھا، تم نے کبھی ذکر تو نہیں کیا تھا۔" افتخار کے لہجے میں شبہات تھے۔ اسے اپنی یادداشت پر شک ہو رہا تھا۔ وہ اب خاصا بوڑھا ہوگیا تھا۔ "خیر، اس جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟"

"دوسری گرل فرینڈ۔" تصدق نے قہقہہ لگایا۔ بے ساختگی، ہنسی پورے کمرے میں دوڑ گئی۔ افتخار بھی ہنسنے لگا۔

تصدق جو کہانیاں سنایا کرتا تھا، ان میں فرق کرنا مشکل تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نے فیل ہونے کے بعد کالج چھوڑ دیا اور کبھی عسکری صاحب کے سامنے نہیں گیا، مگر یہ بھی درست ہے کہ ان ہی دنوں وہ محلے کی ایک سانولی سلونی لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا۔

لڑکی کا خاندان بنگلور سے ہجرت کر کے کراچی آن بسا تھا۔ اس کے بھائی منہ پھٹ اور لڑاکا تھے اور ماں کی زبان قینچی سے تیز تھی۔

رومان پرور خطوط کے تبادلے اور پارک میں ہونے والی چند خوشگوار ملاقاتوں کے بعد لڑکی نے شادی کا مطالبہ کر دیا۔ کچھ عرصے تو وہ ٹالتا رہا مگر ایک دن لڑکی کا آنسوؤں سے تر خط ملا، اس نے تقاضا کیا تھا کہ یا تو اپنے گھر والوں کو رشتے لے کر بھیجو، یا مجھے بھول جاؤ۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ لڑکی سے محبت نہیں کرتا تھا مگر وہ ایسے جذباتی خط کی قطعی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس نے سوچا، جب تک ادھر رہوں گا ان ہی مسائل میں الجھا رہوں گا۔ بہتر ہے، یہاں سے کوچ کر جاؤں۔

اُس دور میں برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں افرادی قوت درکار تھی، ویزا بہ آسانی مل گیا۔ اس نے برطانیہ کا انتخاب کیا اور 61ء کی ایک آزردہ دوپہر لندن جانے والی پرواز میں سوار ہوگیا۔

جب وہ سامان اٹھائے محلے سے نکلا تھا تو اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی لڑکی کے مکان پر نظر ڈالی تھی۔ وہاں بے نام سی اداسی چھائی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔

لندن ایک الگ دنیا تھی۔۔اس کی مہک جالندھر کی مٹی جیسی سوندھی سوندھی تو نہیں تھی، مگر دل موہ لینے والی تھی۔ اس کے باغات میں لاہور کے باغوں کی طرح پرندے چہچہاتے تو نہیں تھے مگر ان باغات میں ہمہ وقت سکون گنگناتا رہتا۔ اس کے دریا کراچی کے ساحل سے مختلف تھے۔ ہر چیز صاف اور دھلی دھلی تھی اور وہاں رات اترتے ہی آزادی کے رنگ برسا کرتے تھے اور یہ وہ رنگ تھے، جن میں وہ خود کو رنگنا چاہتا تھا۔

لندن کا ماحول اتنا آرام دہ اور کشادہ تھا کہ اُسے نہ تو چھت کی پروا تھی، نہ ہی فاقوں کی۔ بے گھر افراد کے ایک شیلٹر ہوم میں رات گزرتی، بیدار ہونے کے بعد پبلک ٹوائلٹ کا رخ کرتا، ایشیائی کمیونٹی کے کسی لنگر خانے سے پیٹ بھرنے کا اہتمام بھی ہو جاتا مگر یہ جھنجھٹ چند ہی روز رہا۔ جالندھر ہی کے ایک صاحب سے ایک صبح ملاقات ہوگئی۔ ایک چھوٹے سے گودام میں کام مل گیا۔

مگر کام کرتا کون کافر چاہتا تھا۔ جی تو کہیں اور اٹکا تھا۔ برطانیہ کے رنگوں میں رنگنے کی خواہش ہر خواہش پہ قوی تھی، عشق کرنے، دل لگانے کی آرزو ہر آرزو پر غالب تھی۔

"حسن جو چار سو بکھرا پڑا ہے، اسے آنکھوں میں بھرنے ہی کو وقت تھوڑا ہے، اوپر سے آٹھ گھنٹے کی ملازمت کی۔" وہ خود سے کہتا۔ "یہ تو سراسر زیادتی ہے۔"

نوجوان تصدق بیماری کا بہانہ بنا کر ہر دوسرے روز ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتا۔ ادھر سے سرٹیفکیٹ پکڑتا اور گودام

سے چھٹی لے لیتا۔ گودام مینیجر کو تصدق کے مرض کا ادراک تھا کہ وہ خود جب نیا نیا آیا تھا تو چاروں طرف پھیلے حسن اور آزادی کے کرشموں نے اُس کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں مگر وہ اپنے پیچھے ایک خاندان چھوڑ کر آیا تھا، بوڑھے ماں باپ، بیوی بچے...... سو وہ سر جھکا کر کام میں جت گیا مگر تصدق کا معاملہ دیگر تھا۔ ایک تو اس نے شادی کی بیڑیاں اپنے پیروں میں نہیں ڈالی تھیں پھر ماں باپ سے رابطے میں بھی وقفے در آئے تھے، اوپر سے باغی تھا۔

جس ڈاکٹر کے پاس وہ ہر ہفتے ایک ان دیکھا مرض لیے پہنچ جاتا، وہ بھی جلد سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ایک دن اس ایشیائی نوجوان کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ''لڑکے، سچ سچ بتاؤ، تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

تصدق نے سچائی بیان کردی۔ ''کچھ نہیں!''

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ ''بھائی، تم ملازمت کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے، پارٹ ٹائم کام کرو، اتنا کہ گزر بسر ہوجائے اور باقی وقت گھومو پھرو، عشق لڑاؤ۔''

''واہ کیا مشورہ دیا ہے۔'' تصدق کھل اٹھا۔ ''خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔''

''بچے۔'' ڈاکٹر کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ''نوجوان میں نے شادی نہیں کی... اور مفت میں ایک مشورہ دے رہا ہوں، تم بھی ان چکروں میں نہیں پڑنا، سمجھ گئے؟''

تصدق نے کسی سپاہی کی طرح سیلیوٹ کیا۔ ''سمجھ گیا صاحب۔''

اُس وقت تک نہ تو تصدق جانتا تھا، نہ ہی اس ڈاکٹر کو خبر تھی کہ قدرت کا اصل منصوبہ کیا ہے؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ آخر تصدق یہاں لندن میں کیا کررہا ہے؟

البتہ چند روز بعد اس راز سے پردہ اٹھنے والا تھا۔

☆......☆

پنچھی نے پر پھیلائے اور اڑان بھری۔ اس کے پروں کی حرکت سے پُراسراریت نے جنم لیا۔ یکدم وہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر ٹھہر گیا اور تصدق کو یوں لگا جیسے وقت رک گیا ہو۔

اس نے حیرت سے اس پنچھی کو دیکھا جو ہوا میں معلق تھا، یہاں تک کہ اس کے پر بھی ٹھہرے ہوئے تھے اور پرندے کے عین پیچھے ایک نیم کا درخت تھا، جس کی گھنی شاخوں میں کسی کا بسیرا تھا۔

''نیم کا درخت اور یہاں؟'' وہ بڑبڑایا۔ ماضی عود کر آیا۔ جالندھر کی مٹی کی مہک سے نتھنے بھر گئے۔ وہ عالم غنودگی میں پیڑ کی سمت بڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ اس کے قریب ہوتا گیا، دھڑکن بڑھتی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے درخت سے دو آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔

وہ عالم حیرت میں آگے بڑھ رہا تھا، سوچ رہا تھا کہ یہ درخت یہاں کہاں سے آگیا۔ یکدم اُسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ لڑکھڑایا اور زمین پر آرہا۔ یکبارگی منظر بدل گیا۔ ماضی کی دھند چھٹ گئی۔ اب وہ حال میں تھا، جہاں نہ تو کوئی درخت تھا، نہ کوئی پنچھی۔

ایک دوشیزہ آنکھوں میں معذرت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''آئی ایم سوری، میں دیکھ نہیں سکی۔''

وہ لمحۂ موجود میں پلٹ آیا۔ دوشیزہ کی شیریں آواز پھر سماعتوں سے ٹکرائی۔ اگلے ہی پل اس اپسرا نے ہاتھ بڑھا دیا۔ تصدق کو لگا جیسے وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہے، اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ پھولے نہ سما رہا تھا۔

وہ کھڑا ہوگیا۔ لڑکی نے پھر معذرت کی اور آگے بڑھ گئی۔ تصدق نے گہری سانس لی اور دائیں بائیں دیکھا اور تب ایک حیران کن انکشاف ہوا۔ اس کے چاروں طرف خوب صورت لڑکیوں کا جمگھٹا تھا۔

اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ لڑکیاں اس کے گرد اکٹھی نہیں ہوئی تھیں بلکہ وہ ایک قطار میں کھڑی خوش گپیاں کررہی تھیں۔ ہاں، ادھر چند لڑکے بھی تھے مگر گنتی کے۔

اس نے نظر اٹھائی، سامنے عمارت کے ماتھے پر ''ایس ٹی مارٹنز اسکول آف آرٹ'' لکھا تھا۔

یہی وہ عمارت تھی جو پاکستان کو ایک منفرد مصور عطا کرنے والی تھی مگر اس لمحے اگر کوئی تصدق سے کہتا ہے کہ وہ مصور کوئی اور نہیں، بلکہ تم ہو تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاتا۔ اسکول کے زمانے میں ڈرائنگ میں اسے دلچسپی ضرور تھی مگر پینٹنگ کی بابت وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

مگر قدرت فیصلہ کرچکی تھی۔

پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ آرٹ اسکول میں شام کے پروگرام میں داخلے ہو رہے ہیں۔ اس نے خود سے کہا، جہاں گوپیاں، وہاں کنھیا، اپنی تقدیر کا ہاتھ تھامے چلے چلو میاں۔

تصدق قطار میں لگ گیا۔ خوشی خوشی فیس جمع کروائی اور کلاس میں جا بیٹھا۔ جلد ہی اسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوگیا۔

کلاس روم میں داخل ہوتے ہی سب کو رنگ اور کینوس تھما دیے گئے۔ سامنے ایک نیوڈ ماڈل بیٹھی تھی، جس کے خوب صورت خدوخال کو کینوس پر اتارنا تھا۔

تصدق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دائیں بائیں دیکھا، تو پایا کہ ہر طالب علم ماڈل کے حقیقی پہلوؤں کو خوب صورتی سے پینٹ کررہا تھا۔ ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق اس نے بھی رنگ کینوس پر بکھیرنا شروع کردیے۔

اس کے ہاتھوں کی حرکت میں ایک ایسا توازن تھا، جو اس کے لیے اجنبی تھا، رنگ اس کے برش میں یوں لپٹ گئے تھے کہ وہ خود بھی حیران تھا، کچھ رونما ہورہا تھا۔

کینوس پر ایک ٹھہرے کا سا منظر بن گیا۔ بغیر چہرے اور ہاتھوں والی جسمانی ساخت ابھر آئی، ایک سایہ سا سامنے آنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک ''ممی'' دھند اور اندھیرے کے دبیز پردے سے برآمد ہورہی ہے۔

اسی اثنا میں وہاں تعینات معلمہ مس سوزی نے طلبا و طالبات کی پینٹنگز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اُن صاحبہ کے تنقیدی، کاٹ دار جملے تصدق سہیل کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ نوجوان مصوروں سے وہ کوئی رعایت نہیں برت رہی تھی۔

تصدق یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہورہا تھا کہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو مصوری کی ابجد سے بھی ناواقف تھا۔

فربہی کی جانب مائل، سانولی رنگت والی ادھیڑ عمر خاتون تصدق کے پیچھے کھڑی اس کی پینٹنگ کا جائزہ لے رہی تھی۔ تصدق کو اسکول کے اساتذہ یاد آئے، جو غلطی پر طلبا کو گدی سے دبوچ لیا کرتے تھے۔ تصدق کو اپنی گدی پر خارش سی محسوس ہورہی تھی، لگ رہا تھا کہ تھپڑ رسید ہونے کو ہے۔

مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ دو الفاظ سنائے دیے۔ ''شان دار۔''

اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا مگر مس سوزی اسے نہیں، پینٹنگ کو دیکھ رہی تھیں۔

''سب اسٹوڈنٹس ادھر آجائیں۔'' مس سوزی نے تالی بجائی۔ سب اس فن پارے کے گرد اکٹھے ہوگئے جسے تصدق قطعی فن پارہ تصور نہیں کرتا تھا۔

''یہ ہے تخیل کے آزادانہ استعمال کی مثال۔ دیکھو، اس نے وہ پینٹ نہیں کیا جو سامنے تھا بلکہ وہ کینوس پر اتارا جو وہ محسوس کرتا تھا۔''

سب تالیاں بجانے لگے۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ اتنی ستائش کے باوجود نوجوان مصور کا رنگ پیلا کیوں پڑا ہوا ہے۔

جب کلاس ختم ہوئی اور سب ایک ایک کر کے چلے گئے اور مس سوزی نے اپنی مخصوص نشست سنبھال کر پائپ سلگایا تب پاکستانی نوجوان سر جھکائے اس کے پاس گیا۔ کچھ دیر کھڑا رہا۔ مس سوزی اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ آخر اس نے ساری کہانی کہہ ڈالی۔ بتا دیا کہ اس نے اسکول میں کیوں داخلہ لیا؟ جو پینٹنگ اس نے بنائی، وہ کیا تھی؟ اور جب اس کی تعریف کی گئی تو اس نے کیسی ہتک محسوس کی۔

''سنو لڑکے۔'' مس سوزی نے بھاری آواز میں کہا۔ ''تم پیدائشی مصور ہو، چاہے تم اس بات سے بے خبر ہو۔ ویسے کرتے کیا ہو؟''

''جی کچھ نہیں۔'' وہ مسکرایا، مگر مس سوزی کی سنجیدگی دیکھ کر سنبھل گیا اور اپنے حالات اور جذبات سے آگاہ کردیا۔

''سنو، اس جانب توجہ دو۔'' مس سوزی نے پائپ دوبارہ سلگایا۔ ''اِس کام کا اچھا معاوضہ ملے گا۔ پھر جو چاہے کرتے رہو۔''

بات اس کے دل کو لگی۔ اگلی شام وہ پھر وہیں تھا اور پھر اس نے اپنی کئی شامیں اسی آرٹ اسکول میں گزاریں۔

اس آرٹ اسکول نے نہ صرف تصدق کی زندگی بلکہ پاکستان کی ماڈرن مصوری کی تاریخ پر بھی ان مٹ نقوش چھوڑے۔ اسی کی وجہ سے ہمیں تصدق سہیل جیسا انوکھا مصور ملا جو ایک تصویر میں کئی تصاویر پینٹ کیا کرتا تھا جس کا ہر کینوس ایک کہانی بیان کرتا، جس میں کردار چلتے پھرتے نظر آتے اور جس میں در آنے والی عورتیں کبھی تو ایک پری معلوم ہوتیں اور کبھی ایک چڑیل۔

☆......☆

تصدق سہیل ''ایس ٹی مارٹنز اسکول آف آرٹ'' سے کتنے برس وابستہ رہا؟ پانچ برس؟ دس برس؟ پندرہ برس؟

یہ حیران کن امر ہے کہ اس درس گاہ سے تصدق سہیل کی وابستگی پورے تین عشروں پر محیط تھی، جی ہاں، پورے تیس سال۔ یہیں، مس سوزی کی زیرِ نگرانی مصوری سیکھی، ادھر ہی نوجوانوں میں یہ فن منتقل کیا۔ فن پاروں کی فروخت کا سلسلہ بھی وہیں سے شروع ہوا۔ ادھر ہی پہلی نمائش ہوئی۔

اگر کہا جائے کہ پاکستان کا ایک معروف مصور ''ایس ٹی مارٹنز اسکول آف آرٹ'' سے برآمد ہوا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

1854 میں لندن میں قائم ہونے والی یہ درس گاہ 1989

تک متحرک رہی۔۔اور آخر کے برسوں تک تصدق اس کا حصہ رہا۔

البتہ ایسا نہیں تھا کہ وہ ادھر جم کر بیٹھا رہا۔ وہ اکثر سفر میں رہتا۔ جب اسے مصوری کا معاوضہ ملنے لگا تو اسے احساس ہوا کہ ملازمت کی جھنجٹ کیوں پالی جائے۔ جلد یہ ادراک بھی ہوگیا کہ یہ فن ہاتھ آنے کے بعد کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا بھی ضروری نہیں، بس کینوس اٹھاؤ، مختلف قسم کے رنگوں کو ایک تھیلے میں بھرو اور سفر پر نکل پڑو۔ گھومو پھرو جب پیسوں کی ضرورت ہو کینوس لے کر کسی پُرہجوم جگہ کسی فوارے کے پاس بیٹھ جاؤ۔ لوگ خود آس پاس اکٹھے ہو جائیں گے، کچھ دیر بعد اپنا پورٹریٹ بنانے کی درخواست کردیں گے۔ ان سے اُن کی جیب کے مطابق بھاؤ تاؤ کرو اور کام شروع کردو۔

اگر اس زمانے میں یورپ میں کسی نوجوان کو ملازمت کی ضرورت نہ رہے، سفر کی سہولت ہو، تو نوّے فی صد امکان یہی ہوتا تھا کہ وہ یہی بن جائے۔ تصدق کی طبیعت تو ویسے ہی آوارگی پر مائل تھی۔

اُس نے یہی طرز زندگی پوری طرح اختیار کرلیا۔ اب وہ ہوتا، رنگ ہوتے، کینوس ہوتا اور گو یہاں ہوتیں۔

جی ہاں، تصدق لڑکیوں ہی میں گھرا رہا۔ اکثر کہا کرتا۔ ”ایک ہی زندگی ملی ہے، اس کا ہر پل قیمتی ہے۔“

آنے والے برسوں میں تصدق جہاں فن پارے تخلیق کرتا رہا وہیں اس نے ہپیوں کی مانند برطانیہ کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا۔ سڑکوں پر سویا۔ شیلٹر ہومز میں ٹھہرا۔ اس دوران وہ حادثات کا بھی شکار ہوا، ایک بار بس کھائی میں گرگئی تھی، ایک بار اسے قبرستان میں رات گزارنی پڑی، چوبیس گھنٹے حوالات میں رہا، ایک دور افتادہ قصبے جب کوئی چھت نہ ملی، تو بیمار بن کر اسپتال میں جا پڑا الغرض اس نے زندگی کا ہر تجربہ کیا۔

البتہ زیادہ وقت لندن کے علاقے بیں واٹر میں لب سڑک، سیاحوں کے لیے پینٹنگ کرتے گزرا۔ خیالات کے اظہار کے لیے وہ عام طور سے روغنی رنگوں کا چناؤ کرتا تھا مگر جب ضرورت پیش آئی تو واٹر کلر بھی استعمال کیے۔

طریقہ کار یوں تھا کہ رات تین بجے بیدار ہو جاتا۔ یوں لگتا، جیسے کسی نے کاندھا جھنجوڑ کر کھڑا کردیا ہو۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر ایک کپ کافی کا انتظام کرتا اور پھر رنگوں کی پُراسرار دنیا میں کھو جاتا۔

عام طور پر تصدق چھوٹا کینوس استعمال کرتا۔ یہ فیصلہ

آغا خان سوم

(1878-1957ء)

سلطان سر محمد شاہ بن امام آغا علی شاہ اسماعیلیہ فرقہ کے اڑتالیسویں امام۔ کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلی عالمگیر جنگ میں برطانیہ کی مدد کی، جس کے صلے میں انہیں سر اور ہزہائی نس کے خطاب ملے اور گیارہ توپوں کی سلامی مقرر ہوئی۔ فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ماہر، عظیم مدبر اور سیاست دان تھے۔ 1906ء سے 1912ء تک مسلم لیگ کے صدر رہے۔ 1930ئ، 1931ء میں گول میز کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ 1934ء میں برطانیہ کی پریوی کونسل میں لیے گئے۔ 1947ء میں جمعیت الاقوام کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے مرید تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جنیوا میں انتقال کیا اور وصیت کے مطابق اسوان میں دفن ہوئے۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ شہزادہ علی اور شہزادہ صدر الدین مگر ان کی وصیت کے مطابق شہزادہ علی کے بیٹے شہزادہ کریم ان کے جانشین مقرر ہوئے، جو آغا خان چہارم کہلاتے ہیں۔

شعوری تھا۔ تصدق ایک ہپی تھا۔ زندگی میں کسی نوع کی جھنجٹ کی خواہش نہیں تھی۔ بڑے کینوس لے کر سفر کرنا یوں بھی خاصا مشکل تھا۔ وہ تو ایک اسٹریٹ آرٹسٹ تھا۔ عام طور سے آرڈر چھوٹے پیس ہی کے ملتے، جو گاہک ہاتھ میں اٹھائے، یا بغل میں داب خوشی خوشی لے جاتے۔

یہ 76ء تھا، جب لندن کی Hawthorndon گیلری میں تصدق کی پہلی نمائش ہوئی۔

گو کہ ایک ہپی کی مانند وہ خود کو عالمی دنیا کا شہری تصور کرتا تھا مگر جب اسے پاکستانی فن کار کہہ کر متعارف کروایا گیا تو اس کا سینہ فخر سے پھول گیا اور تب ہی دل میں یہ خواہش جاگی کہ اسے پاکستان میں بھی اپنے فن کی نمائش کرنی چاہیے۔ ہپی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ خواہش اُسے ایک صدمے سے دوچار کرنے والی ہے۔

☆......☆

"صاحب، آپ کے پاس تو کوئی ڈگری ہی نہیں۔"

یہ جملہ اس پر بجلی بن کر گرا۔ وہ کراچی کی ایک معروف آرٹ گیلری کے مالک کے سامنے بیٹھا تھا جو آرٹ ڈیلر کم، بیوپاری زیادہ لگ رہا تھا۔

"جناب والا، میں لندن کے ایس ٹی مارٹنز اسکول آف آرٹ سے وابستہ ہوں۔" لہجے میں خفیف سا احتجاج تھا۔

"آپ اس کے تاریخی کردار سے تو واقف ہوں گے۔"

"جی جی مجھے علم ہے۔" ان صاحب نے پان کی پڑیا کھولتے ہوئے کہا۔ "مگر میاں، آپ کے پاس اُن کی ڈگری تو نہیں ہے ناں۔"

"اس کے باوجود انہوں نے مجھے وہاں آرٹ سکھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔" اس نے چڑ کر کہا۔ "اور لندن کی Hawthorndon گیلری والے شاید نرے احمق ہیں، جنہوں نے میری نمائش کی۔"

"میاں آپ تو ناراض ہو گئے۔" گیلری کے مالک کے منہ میں پان کا بیڑا تھا۔ "بات یہ ہے کہ آپ کی پینٹنگز کا سائز چھوٹا ہے اور پھر آپ پہلی مرتبہ آئے ہیں۔"

"میں آپ کی گیلری میں پہلی نہیں... آخری مرتبہ آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی سمت چل دیا اور وہ صاحب اگل دان ہی ڈھونڈتے رہ گئے۔

یوں تو تصدق سہیل نے لندن کے سینٹرل اسکول آف آرٹ میں بھی کچھ وقت گزارا تھا، مگر اسے جلد احساس ہو گیا کہ ادھر اس کا ذکر بے کار ہے، یہاں فن کو پرکھنے کے بجائے پروفائل پرکھنے کا رواج تھا۔

"یہاں دوستوں کو نوازا جاتا ہے۔" ایک روز اس نے اکتا کر خود سے کہا اور ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔

کراچی آ کر جیسے تیسے اس نے اپنے فن پاروں کی نمائش کرائی۔ یہ 78ء کی بات ہے۔ بے شک وہ خوش تھا کہ اس کا فن اپنے ہم وطنوں کے سامنے آ گیا، مگر دل بجھا ہوا تھا۔ سبب گیلری مالکان کا رویہ بنا۔ اسے واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ وہ ایک غیر معروف آرٹسٹ ہے۔ فن پاروں کی قیمت ذرا کم رکھی جائے گی۔

ابتدا میں قیمت چھ سو سے ڈیڑھ ہزار روپے تک قیمت رکھی گئی۔ تصدق نے زیادہ بحث نہیں کی۔ اسے تو گزر بسر کے لیے پیسوں کا انتظام کرنا تھا، پھر یہ کہہ کر دلاسا دیا گیا تھا کہ "اگلی بار جب آپ پاکستان آئیں گے، تو قیمتیں بڑھا دیں گے!"

لندن لوٹتے ہوئے وہ کچھ مطمئن تھا مگر اسے کہاں خبر تھی کہ پاکستان کے گیلری مالکان اگلے پندرہ سال تک اس کے فن پارے اسی قیمت پر فروخت کرنے والے تھے۔

☆......☆

آسمان پر تاریکی تھی۔ بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور لندن سویا ہوا تھا۔

اور ایسے میں تصدق کینوس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ذہن خالی تھا۔ کوئی خیال نہیں تھا، کوئی پیکر نہیں تھا۔ بس وہ تھا کینوس تھا اور رنگ تھے۔

اس نے برش سے کینوس پر ایک اسٹروک لگایا۔ اور دُور ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ جھینگروں کی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ہوا کا جھکڑ دیوار سے ٹکرایا۔ دور کسی پرندے کے پر پھڑپھڑائے۔ دھیرے دھیرے کینوس میں چھپی تصویر واضح ہونے لگی۔ اس کا لاشعور سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ ایک کہانی سامنے آ رہی تھی۔

اس نے جلدی جلدی کچھ اسٹروک لگائے۔ تصویر کے خد و خال واضح ہو گئے۔ رنگ جمنے لگے۔ یہی تصدق سہیل کے کام کرنے کا طریقہ تھا۔ صبح تڑکے، بلکہ آدھی رات کو اٹھ جاتا اور کام کا آغاز کر دیتا، ایک لکیر کھینچتا اور پھر اُسے بیٹھا تکتا رہتا۔ کہانی خود بہ خود اس تک پہنچ جاتی۔ اس کے فن پارے لاشعور سے برآمد ہوتے تھے۔ لاشعور جو قدرت سے جڑا ہوا ہے۔ تمام رازوں سے واقف ہے۔

ایک بار اسے کہانی مل جاتی تو پھر وہ بڑی توجہ سے پینٹ کرتا اور اس وقت تک کرتا رہتا جب تک جدید دنیا کے مصائب، ٹریفک کا شور، ٹی وی اور ریڈیو کی کریہہ آوازیں، گلیوں میں چلاتے ہاکر اسے تنگ نہ کرنے لگتے... اور تب وہ پینٹنگ ترک کر دیتا۔

تب وہ شہر سے باہر نکل جاتا۔ کافی دور ایک جنگل تھا بہت چھوٹا سا جنگل وہ ایک تھال میں گوشت کے ٹکڑے رکھتا اور قریب اس جنگل کی سمت چلا جاتا۔ اپنے دوستوں سے ملنے۔

یہ لومڑیاں تھیں، جنہیں اس کی آمد سے قبل اُس کے پہنچنے کی خبر ہو جاتی اور وہ اس کے استقبال کو اکٹھی ہو جاتیں۔ وہ اس کی باتیں تو نہیں سمجھتی تھیں مگر جب وہ بولتا تو اسے دیکھتی رہتیں اور گوشت چباتی رہتیں اور اگر گوشت ختم ہو جاتا تب بھی وہیں رہتیں، تاآں کہ وہ اپنی کہانی نہ سنا لے۔

لومڑیوں سے باتیں کرتے ہوئے عام طور سے وہ

اپنے بچپن کا ذکر کرتا۔ جالندھر کا یا پھر لاہور کی اس لڑکی کا جس سے کبھی اسے محبت ہوئی تھی یا پھر انگریٹ کا۔

انگریٹ، ایک اداس اپسرا۔ جس کی کھوئی کھوئی آنکھوں کے پیچھے ایک غصیل دریا تھا۔ ایک مٹیالا دریا۔

انگریٹ اس کی محبت تھی۔ اس کی آخری محبت۔ وہ بھی اس کی طرح دیوانی تھی، اس کی طرح باغی، مگر ایک فرق تھا کہ وہ اب ٹھہراؤ کی کھوج میں تھی۔

تصدق ساری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، حتمی فیصلہ مگر یہ فیصلہ انگریٹ کو قبول نہیں تھا۔ جب تصدق نے پہلی بار لڑکی کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا تو اسے ڈپریشن کا دورہ پڑ گیا۔ انگریٹ کو سنبھلنے میں کئی دن لگے مگر وہ پوری طرح نہیں سنبھل سکی۔

وہ محبت، جو انگریز لڑکی اس ایشیائی نوجوان سے کرتی تھی اس کے لیے روگ بن گئی۔ تصدق بھی اُسے چاہتا تھا مگر شادی نہ کرنے کا فیصلہ حتمی تھا۔ یہ ایک طے شدہ معاملہ تھا۔ وہ خود کو مصوری کے لیے وقف کر چکا تھا۔

اور یہی ان کی جدائی کا سبب بن گیا۔

اس نے لومڑیوں کو انگریٹ کی کہانی سنائی۔ وہ اس کی بات سمجھ تو نہیں سکیں مگر تب تک سنتی رہیں، جب تک اس نے کہانی کہہ نہیں لی اور پھر وہ تھال اٹھا کر واپس لوٹ گیا۔

☆......☆

جس دور میں تصدق سہیل نے مصوری کا آغاز کیا، مغرب میں مختلف تحاریک زوروں پر تھیں۔ رنگوں کے سمندر میں جدت کی لہریں اٹھ رہی تھیں مگر وہ ان سے دور رہا، اس کے ہاں اپنی علامتیں تھیں، اپنی کہانیاں تھیں، مچھلی نما عورت، پنچھی نما عورت، گھوڑے پر سوار عورت، اور آدمی کے سر والا گھوڑا۔ ایک ہی کینوس میں مختلف خانے، ہر خانے میں ایک کہانی۔

اس کے ہاں نیوڈ آرٹ ضرور تھا مگر اس میں تلذذ کا کوئی سامان نہیں تھا بلکہ وہ تو دیکھنے والے کو سراسیمہ کر دیتا، اس کی فکری ترتیب کو توڑ ڈالتا۔ اسے چونکا دیتا۔

1979 کے سن کو اُس کے فنی کیریر میں خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ اکتوبر گیلری لندن میں اس کی تصاویر سجائی گئیں تو تاریخ و تہذیب کے اس مرکز میں ہر فن کے قدردان کو خبر ہو گئی کہ ایک ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔

اُسی کامیاب نمائش کے بعد بی بی سی جیسے معتبر ادارے نے تصدق سہیل کے فن پر ایک ڈاکومینٹری پیش کی۔ آنے والے برسوں میں تصدق سہیل کی لندن اور کراچی میں نمائشیں ہوئیں۔

فرق بس یہ ہوتا کہ لندن کی نمائش اس کے لیے مسرت لاتی اور کراچی کی نمائش کے بعد ایک بے نام اداسی گھیر لیتی۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ پاکستان میں آرٹ کے لیے ماحول سازگار نہیں۔ قدغن ہے، موئے قلم کو زنجیر پہنا دی گئی ہے۔ اور رہی سہی کسر آرٹ کے ٹھیکے داروں نے پوری کر دی جن کے ذہن پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

87ء میں تصدق اپنا فن لیے اس شہر پہنچا، جسے وہ اپنی داستان میں عشروں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

یہ داتا کی نگری تھی، یہ زندہ دلوں کا شہر تھا۔ یہ وہ بستی تھی جہاں ایک لائبریری میں وہ پہلی بار عشق کے تجربے سے سرشار ہوا تھا۔

اس نے پرانے لاہور کے اس محلے کا بھی رخ کیا مگر وہاں اب کسی لائبریری کے آثار نہیں تھے۔ وہ باغات بھی خاک ہوئے۔ راوی بھی خشک ہوا۔

لاہور کی نمائش میں شائقین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ کچھ شناسا چہرے بھی دکھائی دیے۔ یہ اس کے خاندان کے دور پرے کے رشتے دار تھے، جو تجسس کے زیر اثر چلے آئے۔ تصدق کو احساس تھا کہ وہ ان سے کٹ چکا ہے اور فاصلہ اتنا ہے کہ اسے پاٹنا دشوار ہے۔

جس روز معروف برطانوی نشریاتی ادارے "چینل فور" نے پاکستانی صدر ضیا الحق کی فضائی حادثے میں موت کی خبر دی، اسی شام چینل نے ایک پاکستانی آرٹسٹ کی زندگی اور فن پر جامع ڈاکومنٹری بھی پیش کی تھی۔ اور وہ آرٹسٹ... تصدق سہیل تھا، جو دھیرے دھیرے بوڑھا ہو رہا تھا مگر تب اُسے اپنے بڑھاپے کا احساس نہیں تھا۔

یہ احساس اسے 89ء میں ہوا، جب وہ اپنے فن پارے لیے ہندوستان کے شہر فیض آباد پہنچا۔

نمائش تو کامیاب رہی مگر شہر کی آب و ہوا اسے راس نہیں آئی، وہ بیمار پڑ گیا۔ صحت یاب ہونے میں کئی روز لگے اور اسے جالندھر دیکھنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ گو ایک بار اس نے ہمت جٹا کر کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔ اس کی بستی اسے بھول چکی تھی۔

92ء میں تصدق کا فن سویڈن پہنچ گیا۔ ہالینڈ میں اس کے فن پاروں کی پہلی نمائش 93ء میں ہوئی۔ اسی برس اُسے دہلی میں اپنا فن پیش کرنے کا موقع ملا۔

اور دہلی میں پھر وہی پُراسرار واقعہ پیش آیا جو فیض آباد میں پیش آیا تھا۔ وہ یکدم بیمار پڑ گیا۔ جالندھر کو دیکھنے کی خواہش پھر سینے ہی میں رہ گئی۔

جالندھر بدل چکا تھا۔

☆......☆

''اب تو میں نے نمائشوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا ہے۔''

بوڑھے تصدق سہیل نے اپنے دوست شفیق مرزا سے کہا۔ ان کے سامنے پٹھان کے ہوٹل کی چائے دھری تھی۔ پڑوسی کے فلیٹ سے ٹی وی کی آواز آرہی تھی، صدر پرویز مشرف کا قوم سے خطاب جاری تھا۔ صدر نے خود پر ہونے والے خودکش حملے کا ذکر کیا تھا۔

''اچھا کیا۔'' دوست نے چائے کا کپ اٹھایا۔ ''یوں بھی تم 80 کا ہندسہ عبور کرنے کو ہو، آخرت کے حساب کتاب کی فکر کرو۔''

تصدق نے قہقہہ لگایا تو کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھا پرندہ اڑ گیا۔

دوست اس کے مزاج سے واقف تھا۔ اس نے موضوع بدل دیا اور پوچھنے لگا کہ فن پاروں کی فروخت کا سلسلہ کیسا جا رہا ہے۔

''وہی پرانا طریقہ ہے، قدرداں خود دروازے تک پہنچ جاتے ہیں۔'' تصدق نے جواب دیا۔

''مگر قدرداں ہیں کتنے؟'' وقار مرزا کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''اور تمہارے دوستوں کے رویے میں کچھ تبدیلی آئی؟''

وقار مرزا کا اشارہ گیلری مالکان کی سمت تھا۔ وہ سب خود کو تصدق کا دوست قرار دیتے، اس کے فن کی تعریف کرتے، اس کے قد کو تسلیم کرتے مگر جونہی وہ کہتا ہے کہ اب اس کے فن پاروں کی قیمت بڑھادی جائے تو بہانے شروع ہوجاتے، سو طرح کے جواز تراشتے جاتے طرح طرح کی کہانیاں سنائی جاتیں۔ آخر وہ اکتا کر چپ ہوجاتا۔

''میرے دوست میری موت کا انتظار کررہے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگایا، جو تلخی سے لبریز تھا۔ ''وہ میری پینٹنگز اکٹھی کیے بیٹھے ہیں کہ میں مروں تو انہیں مہنگے داموں بیچ دیں۔''

''مجھے ان سے ہمدردی ہے۔'' دوست نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ''ان مظلوموں کو خبر نہیں ہے کہ تم کتنی ڈھیٹ ہڈی ہو۔''

دونوں بوڑھوں نے قہقہہ لگایا جسے دروازے کے باہر گھنٹی پر ہاتھ رکھے اسے نوجوان آرٹسٹ نے بھی سن لیا جو تصدق سہیل کا عقیدت مند تھا اور اپنے کیریر سے متعلق مشورہ کرنے آیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تصدق سہیل کے سامنے بیٹھا تھا۔ نوجوان نے فلیٹ پر نظر دوڑائی۔ بیشتر دیواروں سے کینوس ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ہر کمرا اسٹوڈیو معلوم ہوتا تھا۔ فلیٹ میں عجیب سی بو تھی، جس کا اصل ماخذ وہ کھڑکی تھی جہاں باجرا اور گوشت کے ٹکڑے بکھرے تھے اور پانی سے بھرا برتن دھرا تھا۔ نوجوان اس بوڑھے شخص کے بارے میں سوچنے لگا جو گزشتہ آٹھ عشروں سے تنہا جی رہا تھا، جسے دکھ سکھ بانٹنے کے لیے کوئی اپنا میسر نہیں تھا، جس کی دیکھ ریکھ کے لیے آج کوئی اس کے پاس نہیں تھا۔

''دیکھو جس انسان میں صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنی جگہ خود بناتا ہے۔'' تصدق سہیل کی آواز نوجوان کو واپس اس کمرے میں لے آئی جہاں وہ بیٹھا تھا۔ تصدق سہیل نے بات جاری رکھی۔ ''میں تو یہی کہوں گا کہ نوجوان آئیں اور خود کو منوائیں۔ جو لوگ آج مصوروں کے وفود کا حصہ بن کر بیرونِ ملک جاتے ہیں کیا وہ سب حقیقی فن کار ہیں؟ قطعی نہیں!'' اس نے سر نفی میں ہلایا۔ ''تم محنت جاری رکھو، گھبراؤ نہیں۔ سمجھے۔''

''مگر سر، آپ اتنے عرصے سے کام کررہے ہیں مگر آپ کو اب تک!'' نوجوان جھینپ رہا تھا۔

''کوئی حکومتی ایوارڈ نہیں ملا۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں تم۔'' تصدق نے اس کی بات پوری کردی۔ ''دیکھو، میں باقی بڈھے کھوسٹ آرٹسٹوں جیسا نہیں، جو بیٹھ کر روتے رہیں کہ حکومتی سطح پر ہماری خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا۔'' اس نے رک کر سانس لیا۔ ''مجھے کسی تمغے یا ایوارڈ کی خواہش نہیں۔ اور اگر تم اس سمت آرہے ہو تو پھر تم بھی یہ خواہش مت رکھنا، اگر فن سے محبت ہے تب ہی اس شعبے کا رخ کرنا، سمجھے۔''

''جی سمجھ گیا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''کچھ لوگ فقط تمغے حاصل کرنے اور پیسے کمانے کے لیے مصور بنتے ہیں۔ پیسے کمانے پر مجھے اعتراض نہیں۔'' تصدق نے کاندھے اچکائے۔ ''لیکن فن کا احترام لازم ہے۔ مصوری تو رنگوں کی شاعری ہے جو صدیوں سے ہوتی آئی ہے۔''

جب نوجوان ڈیفنس کی اس عمارت سے باہر نکلا جس کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ملک کا معروف مصور گوشہ نشینی

کی زندگی بسر کر رہا تھا تو وہ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھا۔ ایک جانب جہاں اسے خوشی تھی کہ اسے تصدق سہیل جیسے نابغے سے ملنے کا موقع ملا وہیں ان حالات کو دیکھ کچھ افسوس بھی ہوا جس سے یہ بے بدل مصور دوچار تھا۔

اوپر فلیٹ کے ایک صوفے میں دھنسا تصدق سہیل ٹی وی چینلو بدل رہا تھا۔ ہر جگہ خبریں، ہر چینل پر ٹاک شوز۔ اسے سیاست سے نفرت تھی۔ ایک چینل پر غلام علی کی غزل دیکھی، تو رک گیا اور توجہ سے سننے لگا۔ اب وہ موسیقی میں خاصی دلچسپی لینے لگا تھا اور اس کا ایک خاص سبب تھا۔

وہ ایک چوبیس سالہ لڑکی تھی، جو تازہ تازہ مصوری کی سمت آئی تھی اور ہفتے میں ایک بار اس سے ملنے ضرور آتی۔ اس کا باپ غزل گائیک تھا۔ لڑکی کی اپنی آواز بھی دل کش تھی۔ اس کی وجہ سے تصدق کی موسیقی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

تصدق نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا تو یکدم اسے احساس ہوا کہ اسے آخری بار آئے ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا۔ اس عرصے میں اس کا فون بھی نہیں آیا۔

''تو کیا وہ بھی خودغرض اور مطلبی نکلی؟'' اس نے سرد آہ بھری۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ماضی میں ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر اداکارہ اُس سے عشق کرنے کی دعوے دار تھی، ہر دوسرے دن فلیٹ پہنچ جاتی، تقریبات میں پہلو میں دکھائی دیتی۔ ساتھ جینے مرنے کے قسمیں کھاتی۔

فقیر منش مصور اس محبت کے بدلے میں بھلا کیا دے سکتا تھا، سوائے اپنی پینٹنگز کے۔ تصدق سہیل نے اپنے کئی فن پارے اسے تحفے میں دیے اور جب اس کے پاس اچھا خاصا کلیکشن ہوگیا، اس نے بوڑھے مصور سے ملنا ترک دیا۔

کچھ دیر بعد غزل ختم ہوگئی اور پھر خبروں کا طوفان آگیا۔ اس نے اکتا کر ٹی وی بند کر دیا۔

رات اتر رہی تھی۔ فلیٹ میں خاموشی تھی۔ دور سے دیکھنے والے کو یوں لگتا جیسے بوڑھا آرٹسٹ صوفے میں سویا ہوا ہے مگر وہ جاگ رہا تھا اور اس وقت اپنے مالی حالات کی بابت سوچ رہا تھا۔ برطانیہ میں ہونے والے Bonhams اوکشنز 2007 اور 2008 میں اُس کے فن پارے اچھے داموں فروخت ہوئے۔ اِس سودے سے حاصل ہونے والی آمدنی کے طفیل خوش حالی کا ایک مختصر عرصہ ضرور نصیب ہوا مگر وہ پیسے دھیرے دھیرے ختم ہو رہے تھے۔ حالات پھر پرانی ڈگر پر آنے والے تھے۔

ادھر فن پاروں کی فروخت کا سلسلہ بھی روایتی سست روی کا شکار تھا۔ جن گیلریز میں اس کے فن پارے آویزاں تھے وہاں سے خال خال ہی اچھی خبر ملتی۔ وہ بھی تب جب وہ خود فون کر کے پینٹنگز کی فروخت کے بارے میں دریافت کرتا۔ اگر وہ خود فون نہیں کرتا تو عام طور سے خاموشی چھائی رہتی۔

تصدق سہیل کو اپنے فن پاروں کی نقول کی فکر بھی لاحق تھی۔ کچھ دو نمبر آرٹسٹ، چند شاطر گیلری مالکان کے ساتھ مل کر تصدق سہیل کی جعلی پینٹنگز بنا کر فروخت کر رہے تھے۔

اس کے باعث نہ صرف اُسے مالی طور پر نقصان ہو رہا تھا بلکہ اس کے فن پر بھی حرف آ رہا تھا۔ دو نمبر آرٹسٹ اس کے کسی فن پارے کی نقل تو تیار کر سکتا تھا مگر اس میں اپنی روح شامل نہیں کر سکتا تھا۔ برش اور رنگوں سے وہ کہانیاں نہیں سنا سکتا تھا جو تصدق سہیل کا خاصا تھا۔

بوڑھے مصور نے گہرا سانس لیا اور اپنے اپارٹمنٹ کو دیکھا جہاں فقط فن پاروں اور تنہائی کے اور کچھ نہ تھا۔ ان فن پاروں پر بہت سے آرٹ ڈیلرز کی نظریں گڑی تھیں۔ کل ایک غیر معروف آرٹ ڈیلر نے درجن بھر فن پارے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر اس سے چند ہی لمحوں کی گفتگو کے بعد تصدق نے جان لیا کہ وہ فن کا قدردان نہیں، بیوپاری ہے، جس کی اکلوتی خواہش ہے کہ بوڑھا مصور جلد از جلد جہان فانی سے کوچ کر جائے اور پھر وہ اس کے فن پارے مہنگے داموں بیچے۔

مذکورہ آرٹ ڈیلر کے رویے کی مذمت کی جاسکتی ہے مگر ایک شخص تو اتنا لالچی اور ظالم تھا کہ تصدق سہیل کو نشہ آور شے پلا کر بے ہوش کر دیا اور فن پارے اٹھا کر چلتا بنا۔ کچھ دیر بعد جب حواس بحال ہونے لگے اور تصدق سہیل نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو کمزوری کے باعث پاؤں ڈگمگا گئے اور چہرہ کسی نوکیلی چیز سے جا ٹکرا۔ ایک پل میں خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ایک تو نشہ آور محلول کا اثر، دوسری طرف خون کا بہنا تصدق سہیل کو لگا جیسے دیواریں قریب آ رہی ہیں، عمارت ڈھے رہی ہے اور نیم کے درخت سے کوئی عورت اُس کی سمت آ رہی ہے۔

رنگ بکھر رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور غنودگی میں اتر گیا۔

صبح ملازمہ نے آ کر دروازہ کھولا اور بوڑھے کو یوں فرش پر پڑا دیکھا تو چلا چلا کر پوری عمارت سر پر اٹھا لی۔ چند پڑوسیوں نے اسپتال پہنچایا۔ زخم گہرا نہیں تھا مگر صدمہ تو گہرا

تھا۔ صحت یاب ہونے میں بڑا وقت لگا۔

☆......☆

''بھئی میں پچھلے دس برس سے آپ کے پاس آرہا ہوں، ہماری دنیا جہاں کے ہر موضوع پر گفتگو ہوتی ہے، کیا آپ جانتے ہیں میں کون ہوں کیا کرتا ہوں کہاں رہتا ہوں؟''

یہ سوال ایک دراز قد، خوش مزاج نوجوان نے کیا تھا۔ نوجوان آنکھوں میں شرارت لیے، جیب ہاتھ میں ڈالے بوڑھے مصور کو دیکھ رہا تھا۔

تصدق سہیل نے ذہن پر زور ڈالا، وہ جانتا تھا کہ نوجوان کا نام عرفان جاوید ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ بہت اچھا نثر نگار ہے، افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے، ایک موقر روزنامے کے لیے اس کی شخصیت پر خاکہ بھی لکھ چکا ہے مگر یہ تو خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں رہتا ہے، کس ادارے سے منسلک ہے۔

کچھ دیر درویش صفت تصدق سہیل گہری سوچ میں غرق رہا۔ پھر ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ بولا۔ ''واقعی میں نے آج تک آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں رہتے ہیں کیا کرتے ہیں، تو اب بتائیے آپ کیا کرتے ہیں؟''

یہ سن کر عرفان جاوید نے ایک قہقہہ لگایا۔

عرفان جاوید ہی نے اپنے خاکوں کے مجموعے ''سرخاب'' میں تصدق سہیل سے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ درج کیا جس کے مطابق ایک دفعہ اُنھیں ایک بڑا آرڈر ملا۔ ایڈوانس میں 32 لاکھ دیے گئے۔

وہ بینک کے جھنجھٹ نہیں پالتے تھے۔ کہا، بھئی، مجھے رقم کیش دے دیں۔

ان کی خواہش پوری ہوئی۔ البتہ جب اگلے روز چند احباب پہنچے کہ صاحب، آج کی دعوت آپ کی طرف سے ہوگی کہ تو خبر ہوئی کہ وہ خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔

پوچھنے پر بتایا کہ ایک ضرورت مند عورت آئی تھی، اس نے اپنے شوہر کی بے روزگاری اور بچوں کی بیماری کی داستان اتنے کرب ناک انداز میں سنائی کہ انہوں نے پورے 32 لاکھ اس خاتون کو تھما دیے۔

یہ عرفان جاوید ہی تھا جس کے ذریعے تصدق سہیل کو اُس بھولی بسری انگریٹ کی خبر ملی، جس سے چالیس برس قبل لندن کے موسم خزاں میں اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی جو ان دنوں ڈپریشن کے شدید دورے کی وجہ سے اسپتال میں زیر علاج تھی۔

اس روز تصدق نے اُسے اپنا ایک فن پارہ تحفے میں دیا تھا جس کا ٹائٹل الوداع تھا۔ انگریٹ نے اُسے پھاڑ کر اسپتال کے فرش پر پھینک دیا۔

عرفان جاوید نے ایک انگریزی رسالے کے لیے تصدق سہیل پر مضمون لکھا تو اس میں برطانوی لڑکی کا بھی ذکر کیا۔ کچھ عرصے بعد عرفان کو ایک صاحب کی ای میل موصول ہوئی، جنھوں نے انکشاف کیا کہ انگریٹ نے بڑھاپے میں خودکشی کر لی تھی۔

جب عرفان جاوید نے یہ خبر تصدق سہیل کو سنائی تو بوڑھے مصور نے گہرا سانس لیا۔ ''اُسے تو پہلے ہی خودکشی کر لینی چاہی تھی، اسے ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔''

بہ ظاہر اس نے انگریٹ کی موت کو اہمیت نہیں دی تھی مگر آنے والے کئی روز تک وہ افسردہ اور خاموش رہا۔

☆......☆

وہ ستمبر 2017 کی صبح تھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو اچانک ایک عجیب احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے مزید جینے کی خواہش نے دم توڑ دیا ہے۔ اس نے سر جھٹک کر کھڑکی کی سمت دیکھا جہاں روز پنچھی اترا کرتے تھے مگر آج کوئی پرندہ نہیں تھا۔ اسے لگا جیسے کھڑکی کے پار سے دو آنکھیں اُسے گھور رہی ہیں۔ ٹھیک ویسی ہی آنکھیں جیسی اس نے بچپن میں نیم کے درخت کی شاخوں کے بیچ دیکھی تھیں۔

تنہائی نے اسے آن لیا۔ اس نے اپنے رشتے داروں کو یاد کیا، جن میں سے اکثر کے چہرے وہ بھول گیا تھا۔ وہ ایک عرصے سے ان سے نہیں ملا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ خاندانی معاملات اور الجھنیں اس کی یکسوئی کو متاثر کرتی ہیں۔ مگر ٹھیک اس لمحے... ستمبر کی اس صبح، جب وہ بستر پر لیٹا تھا، وہ اپنی یکسوئی کھو چکا تھا۔

اس نے اپنی تینوں بہنوں کو یاد کیا۔ دو بہنیں معاشی طور پر خوشحال تھیں۔ ایک لاہور میں مقیم تھی، دوسری اسلام آباد میں۔ دونوں ہی اپنی اولاد کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھیں۔ البتہ ان میں سے ایک کو بیوگی نے آن لیا تھا۔ وہ شیخوپورہ میں زندگی کے مصائب کا مقابلہ کر رہی تھی۔

وہ لوگ جو ہر ہفتے تصدق سے ملتے تھے اس کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں آرٹ پر گفتگو کرتے، ہنسی مذاق کرتے، پیتے پلاتے، انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ تصدق سہیل ہر ماہ خاموشی

کے ساتھ اپنی بیوہ بہن کو ایک مناسب رقم بھیجا کرتا تھا۔
اس سے ملنے والے تو اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ زندگی کے آخری برسوں میں بھی اس نے ایک محبت کی تھی۔ وہ ایک غیر معروف ٹی وی چینل کی اینکر تھی۔ بات شادی تک پہنچ گئی تھی مگر پھر وہی فرسودہ سماج بیچ میں آ گیا جس سے تصدق عشروں سے لڑ رہا تھا۔
البتہ اس پل...... اس پُراسرار صبح...... نہ تو وہ اس اینکر کے بارے میں سوچ رہا تھا نہ ہی انگریٹ کے بارے میں جس نے خودکشی کر لی تھی، وہ تو زندگی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا مگر نہ جانے زندہ رہنے کی خواہش کہاں جا چھپی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ روٹھ گئی ہو اور ایسے کٹھن لمحے میں دو آنکھیں کھڑکی کے پار سے اسے گھور رہی تھیں۔
اس صبح تصدق سہیل پر ایک حملہ ہوا تھا مگر حملہ آور نہ تو ڈکیت تھا نہ ہی آرٹ ڈیلر اور نہ ہی کوئی مطلب پرست عورت...... یہ تو اجل تھی۔
وہ زمان و مکان کا ادراک کھو بیٹھا۔ ایک دن بے ہوش رہا یا ایک ہفتے...... اسے یاد نہیں.... جب کچھ ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک اسپتال میں پایا۔ یہ اسلام آباد کا پی این ایس شفا اسپتال تھا۔
''میں یہاں کیسے پہنچا؟'' اس نے نرس سے پوچھنا چاہا۔ ''میں تو کراچی میں تھا؟''
مگر نرس اسے سننے سے قاصر رہی۔ شاید اس کے الفاظ اپنی آواز کھو چکے تھے۔ اس نے سوچا شاید کسی نے اس کے رشتے داروں کو خبر کر دی ہو جو اسے اسلام آباد لے آئے ہوں مگر کس نے اطلاع کی؟ اور اس صبح آخر ہوا کیا تھا؟
اور جب دوبارہ ہوش آیا تو وہ اسپتال ہی میں تھا مگر وہ اسپتال اسلام آباد کا نہیں کراچی کا تھا۔ مغالطے نے اسے اسلام آباد پہنچا دیا تھا۔ وہ زیادہ نہیں سوچ پایا۔ کمرا دھند سے بھر گیا تھا۔ وہ پھر غنودگی میں اتر گیا۔

☆......☆

''ملک کے نامور مصور اور افسانہ نگار تصدق سہیل کو شدید علالت کے باعث سول اسپتال کراچی کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔''
19 ستمبر 2017 کی دوپہر تمام بڑے ٹی وی چینلز نے یہ خبر نشر کی اور ساتھ یہ اطلاع بھی اپنے ناظرین تک پہنچانا لازم جانا کہ تصدق سہیل کے خاندان کا کوئی فرد اسپتال میں موجود نہیں۔
انہیں خبر نہیں تھی کہ اس کا کوئی خاندان نہیں تھا وہ تو عالمی دنیا کا شہری تھا۔
تصدق سہیل کو شفا انٹرنیشنل اسلام آباد سے کراچی لایا گیا لیکن یہاں موجود ڈاکٹرز کے پاس اس کی میڈیکل ہسٹری موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔
ادھر ٹی وی چینلز سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ اُس کا سن پیدائش، لاہور اور کراچی کا زمانہ، مصوری کے ساتھ افسانہ نگاری کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔ ایک رپورٹر بیپر دے رہا تھا۔
''انہوں نے 1955 میں اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ ان کے ابتدائی افسانے نیم کمرشل رسالوں میں شائع ہوئے لیکن بعد میں تخلیقات معتبر ادبی جرائد کا بھی حصہ بنیں۔''
صحافیوں کو خبر تھی کہ چند روز میں یہ منفرد مگر گوشہ نشین مصور دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو وہ اس سے متعلق معلومات کی کھوج میں نکل کھڑے ہوئے تاکہ ایک بھرپور پیکیج بنا سکیں۔
اور تب انہیں خبر ہوئی کہ جس زمانے میں ن م راشد حلقہ ارباب ذوق کے سیکریٹری تھے، تصدق سہیل نے حلقے کے جوائنٹ سیکریٹری کا عہدہ سنبھال رکھا تھا۔
تب انہیں پتا چلا کہ تصدق کے افسانوں کا مجموعہ ''تنہائی کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس کے کچھ افسانوں کا معروف مترجم عمر میمن نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا اور تب انہیں اندازہ ہوا کہ تصدق اپنی آپ بیتی ''مہ رخوں کے لیے'' پر بھی کام کر رہا تھا۔
البتہ پیکیج تیار کرنے والے صحافی اس کے فن پاروں سے جھلکتے برہنہ وجود کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے، وہ یہ نہیں جان سکے کہ یہ فقط علامتیں ہیں، جن کے پیچھے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔
صحافیوں کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ 2 اکتوبر 2017 کو جب انہوں نے 86 سالہ بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ کے انتقال کی خبر نشر کی تو تمام تفصیلات بار بار دہرائیں تاکہ وہ ناظرین کے ذہنوں میں نقش ہو جائیں۔
اور جب وہ یہ تفصیلات دہراتے ہوئے اپنے الفاظ کو مصنوعی جذبات سے رنگنے کی کوشش کر رہے تھے، رنگوں کا جادوگر اس نیم کے گھنے درخت کی سمت جا رہا تھا جس کی شاخوں پر پنچھیوں کا بسیرا تھا۔

فلم نگری

گولڈن گرل

انور فرہاد

گلیمر سے بھری دنیا ہمیشہ سے ایک کشش رکھتی ہے۔ اس میدان میں وہی کامیاب ٹھہرے جن کے اندر فن کی چاہت بدرجہ اتم موجود تھی۔ پاکستان کا فلمی نگر بھی خود کفیل رہا۔ ایک سے ایک ہنرمند موجود رہے۔ اداکاری کے شعبہ میں بھی نابغۂ روزگار افراد پیچھے نہ رہے۔ محمد علی ہوں یا سلطان راہی، ادیب ہوں یا علاؤ الدین، صبیحہ ہوں یا شمیم آرا و زیبا۔ ہر ایک نے اپنے فن سے ناظرین کو مسخر کیے رکھا۔ انھی میں ایک اور ایسی اداکارہ بھی ہے جس کا چہرہ معصومیت کا پرتو رہا۔ اسی کی داستان ہے یہ۔

فلم نگری سے دلچسپی رکھنے والے فلم بینوں کے لیے اس ماہ کی سوغات




آج کی تحریر ایک ایسی اداکارہ کے بارے میں ہے جس نے پاکستانی شوبز کی دنیا میں ایسی دھوم مچائی کہ فن اداکاری کے بڑے بڑے پنڈتوں نے اس کی تعریف کی جس نے نہ صرف اپنی بے پناہ اداکارانہ صلاحیتوں سے فلم بینوں کو متاثر کیا بلکہ اپنے ظاہری حسن و شباب سے بھی دلوں کو مسخر کیا۔ ایسا رنگ روپ کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔ ایسی شگفتگی، ایسی تازگی کہ نگاہوں کو ذہنوں کو تراوٹ بخشے جس کی پہچان اس کا وقار، جس کی شناخت اس کی نفاست، اس کا مرصع حسن، اس کا دلنواز انداز جس کے دیدار سے نگاہوں سے دل کی وادی تک نور و سرور میں نہا

جائے۔

وہ جب پاکستانی فلمی صنعت کے افق پر نمودار ہوئی اس وقت شبنم، رانی، زیبا، ممتاز اور فردوس جیسی اداکاراؤں کے عروج کا دور تھا، پاکستانی فلموں میں ان کی اجارہ داری تھی۔ فلم ساز، ہدایت کار اپنی ہر نئی فلم کے لیے ان ہی ہیروئنوں میں سے کسی کو منتخب کرتے تھے۔ ان فنکاراؤں کا بھی یہ انداز تھا کہ کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

اس دور میں جب اس نے پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیمرامین (ساوک مستری) نے فلم کے ہدایت کار سے کہا۔ ''صوفی صاحب! یہ اسکول کی بچی آپ کہاں سے لے آئے؟''

''یہ میری فلم کی ہیروئن ہے۔'' نذیر صوفی نے جواب دیا۔

''میں نے اپنے پورے فلمی کیریئر میں اتنی کمسن اور اس قدر عام سی ہیروئن آج تک نہیں دیکھی۔'' ساوک مستری پرانے اور تجربہ کار عکاس تھے جو بمبئی کی فلم انڈسٹری سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ وہ کہنا تو غالباً یہ چاہتے تھے کہ یہ بچی کیا اداکاری کرے گی؟ مگر مروتاً وہ ہدایت کار سے نہ کہہ سکے۔

یہ گانے کی فلم بندی تھی۔ اس نے جب اپنا پہلا شاٹ دیا تو ساوک مستری ہی نہیں، سیٹ پر موجود سارے فلمی لوگ حیران رہ گئے۔ اس نے اس اعتماد کے ساتھ اداکاری کی تھی کہ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہوگیا۔

اس کا یہی اعتماد تھا، اپنی فنی صلاحیتوں پر بھروسا تھا کہ اس نے اس دور کی ٹاپ ہیروئنوں کا مقابلہ کیا اور اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

وہ کون تھی؟

وہ ''جیٹ واشنگ گرل'' تھی۔ جی ہاں بابرہ شریف۔ جس نے اپنے فنی سفر کا آغاز ماڈلنگ سے کیا تھا اور پہلے ہی اشتہار سے ماڈلنگ کی دنیا میں سپر ماڈل بن گئی تھی۔

ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی ایک دم ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔ مہندی کے سبز پتے جب تک سل بٹے میں پس نہیں جاتے اس وقت تک رنگ نہیں بکھیر سکتے۔ قطرے کو گہر بننے تک بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بابرہ شریف کو بھی سپر، ڈپر ہیروئن بننے سے پہلے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا جس میں اس نے اپنی محنت، لگن اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور اللہ رب العزت نے اسے عزت، شہرت، مقبولیت اور دولت سے مالا مال کیا۔

میری نئی نسل کے شہزادوں شہزادیوں نے تو بابرہ شریف کو بڑی اسکرین پر بڑی اداکارہ کی حیثیت سے دیکھا ہوگا۔ میں آج آپ کو اس وقت کی بابرہ شریف سے ملاؤں گا جب وہ ٹی وی کی چھوٹی اسکرین پر آتی تھی اور ناظرین سے کہتی تھی۔ ''چمکیلی دھلائی کے لیے سب سے بہتر جیٹ واشنگ پاؤڈر۔''

اور...... ''رنگ سنہرا گلاب جیسا چہرہ نکھارے تبت ٹوائلٹ سوپ۔''

اس سے پہلے بھی مختلف پروڈکٹس کے اشتہاروں میں ماڈلز، اپنا جلوہ دکھاتی تھیں۔ اس شعبے میں خاصے حسین و جمیل چہرے موجود تھے مگر ماڈلنگ کی دنیا کا یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ جب ٹی وی کی اسکرین پر وہ پہلی بار نظر آئی تو ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے۔ اس زمانے میں اخبارات و رسائل اور بڑے سائن بورڈز پر اس کی تصاویر سے سجے اشتہارات نے ماڈلنگ کی دنیا میں دھوم مچا دی۔ پورے پاکستان میں وہ ''جیٹ واشنگ گرل'' کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ اس کے پہلے ہی اشتہار نے اسے اس دور کی نوجوان نسل میں رول ماڈل بنا دیا۔ اس اشتہار میں اس کے چہرے پر گہری سیاہ زلف کی بل کھاتی ہوئی لٹ نے اس نوخیز ماڈل کے سراپے کو لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا دیا۔ نوجوان لڑکیوں نے تو اس لٹ کو اپنے لیے بطور فیشن اپنا لیا۔ یہ لٹ اس دور میں خواتین کی اوّلین ترجیح بنی۔ اپنے ہیئر ڈریسر سے خاص طور پر بابرہ شریف والی لٹ بنانے کی فرمائش کرتی تھیں۔

بابرہ ایک ایسی ماڈل ہیں جو فلموں میں آنے سے پہلے ہی رول ماڈل کے طور پر اپنائی گئیں۔ جیٹ واشنگ پاؤڈر کے اشتہار کی مقبولیت کو دیکھ کر تبت سنو والوں نے بھی جیٹ گرل کو لے کر اپنا اشتہار بنوایا جس میں اس سے کہلوایا گیا۔ ''رنگ سنہرا گلاب جیسا چہرہ نکھارے تبت ٹوائلٹ سوپ۔''

اس دوسرے اشتہار کے بعد ایک بار پھر اس حسین ماڈل کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ ان ہی دنوں سوفینی کا کپڑا ہائی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھا، خواتین و حضرات اس کپڑے کے سوٹ پہن کر اپنی شخصیت کو نمایاں کرتے تھے۔ کریم سلک مل کی اس برانڈ میں جب بابرہ شریف نے ماڈلنگ کی تو گویا اس برانڈ کو ہائی سوسائٹی کے عوام میں بھی

بے حد پذیرائی ملی۔ اس کپڑے سوفینی نے ہر خاص و عام کو اپنی جانب مبذول کرایا۔ بابرہ شریف کی ماڈلنگ سے پہلے سوفینی صرف امراء کی پہنچ تک تھا۔

بابرہ کا چہرہ جب پہلی بار لکس سوپ کے اشتہار میں نظر آیا تو اس کمرشل کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ لکس سوپ اور فلمی ستاروں کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تقریباً تمام مایہ ناز اور خوب صورت اداکاراؤں نے لکس سوپ کو اپنے حسین چہرے کی حفاظت کا ضامن بتایا ہے۔ لکس سوپ کا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔ لکس سوپ کے پچاس سالہ جشن کی تقریب کے موقع پر اس وقت کی بڑی بڑی ماڈلز کے ساتھ جب بابرہ کو خصوصی دعوت پر بلایا گیا تو ہر طرف اس کے حسین چہرے کی تازگی باقی تمام چہروں کے مقابلے میں نمایاں نظر آرہی تھی جس کی گواہ لکس ایوارڈ کی وہ تقریب ہے جس میں بابرہ شریف براجمان تھیں۔ لوگوں کی نگاہیں بڑی بڑی ماڈلز اور نامور اداکاراؤں کی بجائے اس نئی ماڈل بابرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ گویا اس وقت یہ کیفیت تھی۔

یہ محفل جو آج سجی ہے
اس محفل میں ہے کوئی ہم سا۔
ہم سا ہو تو سامنے آئے

دیکھنے والے یوں محسوس کررہے تھے جیسے ستاروں کی جھرمٹ میں چاند اتر آیا ہو۔

اللہ بہت بڑا ہے۔ اس کی بخشش بھی بڑی ہے۔ بابرہ شریف کو بھی اس نے دل کھول کر نوازا تھا۔ بظاہر وہ ایک چھوٹے قد کی عام سی لڑکی تھی مگر جب وہ ماڈل کے روپ میں نمودار ہوئی تو خوشبو کی طرح اس کی پذیرائی ہوئی۔ بابرہ شریف وہ واحد اداکارہ ہیں جن کی مارکیٹ ویلیو فلم، ٹی وی، ماڈلنگ اور فیشن کی دنیا میں اس دور سے آج تک برقرار ہے۔ فیشن کی دنیا میں انٹرنیشنل اور مقامی شاید ہی کوئی ایسا میگزین ہو جس کے ٹائٹل بابرہ شریف کے بغیر چھپے ہوں۔ ان کی چمکدار فریش اسکن، کاسمو پولیٹن، فرنچ، اٹالین، ٹائپ کے میگزین کی ہمیشہ ضرورت بنی رہی۔ اللہ نے انہیں جو حسن کی دولت دی، اسے نکھارنے اور سنوارنے کا ان کو ڈھنگ اور سلیقہ بھی عطا کیا۔ مولا کریم کی اس دین سے نہ صرف انہوں نے خود فائدہ اٹھایا بلکہ ہمیشہ اپنی جونیئر آرٹسٹوں کو بھی فیض یاب کیا۔ شاید یہ بات عام لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے جونیئر اداکاراؤں سے ملتی جلتی رہیں بلکہ فنی حوالے سے ان کی رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ لباس اور میک اپ کے انتخاب میں بھی انہیں ٹپس دیتی ہیں۔

لباس کے معاملے میں بابرہ شریف شروع ہی سے بہت محتاط رہی ہیں انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ لباس انسانی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان کی بڑی بہن فاخرہ شریف کو فیشن کی دنیا میں بوتیک چلانے کا وسیع تجربہ حاصل رہا۔ ایک زمانے میں فلم اور ماڈلنگ کی دنیا میں ان کے تیار کردہ ملبوسات کی بے حد مانگ تھی۔ لباس کی تیاری اور جدت ونکھار میں بابرہ کو فاخرہ سے بہت رہنمائی ملی۔

بابرہ شریف جب بھی کسی فلم یا ماڈلنگ یا فوٹو سیشن میں نظر آئیں تو ان کی شخصیت اور لباس دونوں کو بڑی اہمیت ملی۔ فیشن اور فلم میں ان کے اپنائے ہوئے ملبوسات زیادہ تر دیگر اداکاراؤں نے بھی اپنائے۔ ہر گزرے ہوئے دن میں ان کی حسین اور پُرکشش شخصیت میں اضافہ دکھائی دیتا رہا۔ شاید اسی وجہ سے انہیں سدا بہار حسن کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔

ماڈلنگ کی دنیا میں بابرہ شریف جب اپنی فتوحات کے پرچم لہرا رہی تھیں تو ٹی وی سے وابستہ کچھ دیدہ وروں کی نظریں اس حسن کی ملکہ پر جا کر جم گئیں۔

''یہ تو وہی موتی ہے جو ہماری سیپ سے برآمد ہوئی ہے۔''

ان کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ ٹی وی پر چلنے والے اشتہار سے ہی تو اس کے جلوے عام ہوئے تھے۔

''پھر ہم اسے اپنے پروڈکشن کے لیے کیوں نہ استعمال کریں۔''

اور کمال احمد رضوی نے اس پری وش ماڈل کو اپنے سیٹ .... میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ ''اشتہاروں کی ماڈلنگ ہی کرتی رہوگی یا اس سے آگے بھی بڑھوگی۔''

''میرا تو مشن ہی آگے...... آگے...... اور آگے بڑھنا ہے۔''

''گڈ، میرے سیٹ ... میں کام کروگی؟''

''ہاں کروں گی۔''

کمال احمد رضوی نے اس سیٹ کام کا نام Miss 4,0 clock رکھا اور جب اس ابھرتی ہوئی ماڈل نے اس ڈرامے میں اداکاری کی تو سب کو حیران کردیا۔ ''اس کا تو صرف رنگ روپ اور چھب ہی دل موہ لینے والا نہیں۔ یہ تو پرفارمنگ آرٹ میں بھی جادو جگا سکتی ہے۔''

اور ماڈل اداکارہ بن گئی۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے

ہوئے ایک بڑے ٹی وی ڈرامے میں بھی اسے پیش کیا گیا، ایک پلے ''کرن کہانی'' تھا۔ ''کرن کہانی'' میں بھی اس نے اپنی اداکاری کی ایسی جولانی دکھائی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ دوسرے ٹی وی پروڈیوسرز بھی اس کی اداکاری سے اپنے ڈراموں میں چار چاند لگانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے بڑی اسکرین کے لیے فلم بنانے والوں نے اسے اچک لیا۔ ''تم جیسی خداداد صلاحیتوں کی اداکارہ چھوٹی اسکرین میں قید ہوکر کہاں رہ گئی؟''

''جناب! ہم تو مزدور لوگ ہیں جو ہمیں دہاڑی کے لیے بلائے گا ہم حاضر ہو جائیں گے۔''

''ہماری فلم میں کام کروگی؟''

''ضرور کروں گی۔ کیا نام ہے آپ کی فلم کا؟''

''کاغذ کے پھول۔''

اور پھر 16 مئی 1973ء کے دن کراچی کے ماڈرن اسٹوڈیو میں وہ پہلی بار کسی فلمی کیمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس فلم کی مہورت ایک گانے کی فلم بندی سے ہو رہی تھی اس نئی ہیروئن کے ساتھ ایک نیا ہیرو تنویر گانے کی پکچرائزیشن میں حصہ لے رہا تھا۔ اس گانے کے بول تھے ''کس اناڑی سے تجھے ہوا پیار اللہ رے توبہ''۔ یہ گیت موج لکھنوی نے لکھا تھا جب کہ اسے احمد رشدی اور رونا لیلیٰ کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ موسیقی کی دھنیں غلام علی نے ترتیب دی تھیں۔ فلم کے ہدایت کار نذیر صوفی تھے۔ سیٹ پر موجود یونٹ کے لوگوں کے علاوہ مہمان بھی دم بخود تھے اور آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ''یہ صوفی صاحب کو کیا ہو گیا ہے! یہ تو کوئی اسکول گرل لگتی ہے۔ سیدھی سادی، کمسن سی، اسے کہاں سے پکڑ کر لے آئے؟ یہ کیا اداکاری کرے گی؟''

جب کہ اس منظر کو عکس بند کرنے والے کیمرا مین ساوک مستری سے چپ رہا نہ گیا اور انہوں نے بھی ہدایت کار کو ٹوک دیا اور اسی قسم کی بات کہی۔ نذیر صوفی صاحب نہ صرف اپنی ہیروئن کے انتخاب پر مطمئن تھے بلکہ انہیں بھرپور اعتماد تھا کہ یہ اسکول کی طالبہ نظر آنے والی نئی ہیروئن انہیں مایوس نہیں کرے گی اور جب مذکرہ گانے کی فلم بندی شروع ہوئی تو سیٹ پر موجود سارے لوگوں پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اتنے اعتماد کے ساتھ اس نے اپنا کام فلم بند کروایا کہ جاگتی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ نذیر صوفی صاحب یوں فخر سے سب کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''بتاؤ میرا انتخاب اور میرا اعتماد غلط ہے یا درست؟''

وہاں موجود لوگوں کا خیال تھا کہ اس نئی ہیروئن کی یہ فلم زبردست طور پر کامیاب ہوگی مگر افسوس صد افسوس کہ ایسا ممکن نہ ہوسکا کیونکہ یہ فلم ناگزیر وجوہ کی بنا پر مکمل نہ ہو سکی۔ صرف اس کے گانے ہی ریکارڈ ہو سکے تھے کہ یہ فلم التواء کا شکار ہوگئی۔ اس فلم کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کی تکمیل کے دوران اس کا نام بدل کر ''ایک اور ایک گیارہ'' رکھ دیا گیا تھا۔ اس کی کاسٹ میں صاعقہ، شہناز، ننھا اور کمال ایرانی بھی شامل تھے۔

ہدایت کار نذیر صوفی کو بڑا ملال تھا کہ وہ ایسی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کی لڑکی کو ایک کامیاب اداکارہ نہ بنا سکے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ایک اور فلم شروع کی تو اس کے لیے بھی بابرہ شریف کو ہیروئن کاسٹ کیا۔ اس فلم کا نام ''کہاں سے کہاں تک'' تھا۔ اس کی شوٹنگ ابھی تھوڑی ہی ہوئی تھی کہ یہ بھی شومئی قسمت سے نامکمل رہ گئی۔ نذیر صوفی کے علاوہ بابرہ شریف کو بھی اس بات کا دکھ تھا کہ اس کی دوسری فلم بھی التواء کا شکار ہوگئی مگر وہ ابتداء ہی سے صابر و شاکر تھی۔ اس نے سوچا۔ ''شاید قدرت میرا امتحان لے رہی ہے۔''

اس نے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی۔ حالات کی اس ستم ظریفی کا رونا نہیں رویا۔ اس کی تو بس یہی سوچ تھی کہ جب مولا کریم کو منظور ہوگا میرے راستے کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد شمیم آراء کی جوہر شناس نگاہوں نے اس کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر اسے اپنی نئی فلم ''بھول'' کے لیے کاسٹ کرلیا۔ اس فلم کے ہدایت کار ایس سلیمان تھے جب کہ مرکزی کردار ندیم اور ممتاز کر رہے تھے۔ بابرہ شریف کو شمیم آراء نے منور ظریف کے ساتھ سیکنڈ پیئر کے طور پر پیش کیا تھا۔ منور ظریف اس فلم میں ہپی کے روپ میں پیش ہوا تھا۔ ان دنوں ہپیوں کا دور تھا۔ نوجوان نشے کے عادی ہوکر اپنے بال بڑھا کر اور گندے لباس زیب تن کر کے اپنی زندگی تباہ کر رہے تھے۔ شمیم آراء نے اپنی اس فلم میں ہپی کا ایک ایسا ہی کردار پیش کیا تھا۔ بابرہ شریف جب ''بھول'' کی پہلی فلمبندی کے لیے شاہ نور اسٹوڈیو کے فلور نمبر ایک پر آئیں تو یہاں بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے کراچی کی فلموں کی پہلی

شوٹنگ کے دوران ہوا تھا۔ ان کی سادگی اور کمسنی کو دیکھ کر سیٹ پر موجود لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ علی جان جو اس فلم کے کیمرا مین تھے، ان کا کہنا ہے کہ میرا تجربہ اور مشاہدہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اداکاری اس لڑکی کے بس کی بات نہیں۔ منور ظریف جس کے ساتھ اسے اداکاری کرنی تھی، اس نے عکاس کو سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''جان صاحب! یہ لڑکی کیا اداکاری کرے گی؟ یہ تو محض اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرے گی۔ یہ مشکل کام ہے۔ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔''

علی جان کیا جواب دیتے۔ وہ تو پہلے ہی سے یہی سوچ بیٹھے تھے۔ بہرحال انہوں نے شاٹ لینے کے لیے کیمرا آن کیا تو منور ظریف نے اسے تنگ کرنا شروع کردیا۔ بابرہ نے اس وقت پیلے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ منور ظریف نے اس پر جملہ کسا ''اے کتھوں آئی اے زردے دی پلیٹ؟'' (یہ زردے کی پلیٹ کہاں سے آگئی)

بابرہ شریف کے لیے یہ نئی جگہ تھی۔ نئے لوگ تھے۔ نیا ماحول تھا۔ ایسا ماحول جو اس کے ہول دل کا سبب بن سکتا تھا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ افزائی کی بجائے سینئر اداکار، جس کے ساتھ اسے پرفارم کرنا تھا، اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اس کے ہاتھ پیر پھول جاتے۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوتی کہ ایسے ماحول میں، میں اداکاری نہیں کرسکتی مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ وہ بابرہ شریف تھی۔ انتہائی مضبوط اعصاب کی لڑکی۔ اس نے منور ظریف کے تضحیک آمیز رویے کا ذرا بھی اثر نہیں لیا اور ڈائریکٹر نے جو کچھ اسے بتایا اور سمجھایا تھا اس کے مطابق اس نے اپنا پہلا شاٹ بڑے اعتماد کے ساتھ اوکے کروایا۔

سیٹ پر موجود لوگ حیران رہ گئے۔ ''ارے یہ تو...... یہ تو...... کمال کردیا اس لڑکی نے۔''

ہر شخص کی کم وبیش یہی سوچ تھی۔ سب سے زیادہ حیرانی بلکہ پریشانی منور ظریف کو ہوئی۔ وہ بابرہ شریف کا منہ تکتا رہ گیا کیونکہ اس کے بارے میں سب سے زیادہ منفی خیال اسی کا تھا جو شاٹ لیا گیا تھا وہ کچھ یوں تھا۔

منور ظریف جو ہپی بنا ہوا تھا اس کے بالوں سے وہ (بابرہ) جوئیں نکالتی ہے۔ جب اسے گھنے بالوں میں جوئیں نہ ملیں تو پریشان ہوکر وہ قینچی سے اس کے بال کاٹ دیتی ہے۔ یہ بابرہ شریف کا ''بھول'' کے لیے پہلا شاٹ تھا جسے اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ فلم بند کروایا تھا۔

ایسا بھی ہوتا ہے

بابرہ شریف نے بطور ہیروئن پہلی فلم جو سائن کی اس کا نام ''کاغذ کے پھول'' تھا جو کراچی میں 1973ء میں بننا شروع ہوئی۔ یہ ہدایت کار نذیر صوفی کی فلم تھی بعد میں اس کا نام بدل کر ''ایک اور ایک گیارہ'' رکھ دیا گیا مگر یہ فلم مکمل نہ ہوسکی۔ 1974ء میں شمیم آراء نے بابرہ شریف کو اپنی فلم ''بھول'' میں اداکاری کے لیے کراچی سے لاہور بلایا۔ ''بھول'' کے بعد لاہور میں بابرہ کی دوسری فلم ایس سلیمان کی انتظار تھی۔

بابرہ شریف کی پہلی فلم

ہدایت کار شمیم آراء نے بابرہ شریف کو ٹی وی سیریل ''کرن کہانی'' میں اداکاری کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی اداکاری سے بے حد متاثر ہوئیں۔ یہ 1973ء کی بات ہے۔ ان دنوں ان کی ذاتی فلم ''بھول'' بنائی جاری تھی جس کے ہدایت کار ایس سلیمان تھے۔ شمیم آراء نے بابرہ کو ''بھول'' کے لیے کاسٹ کرلیا۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی ایس سلیمان نے اپنی فلم ''انتظار'' کے لیے سائن کرلیا اور انتظار، بھول سے پہلے یعنی 8 اگست 1974ء کو ریلیز ہوگئی اور بابرہ شریف کی پہلی فلم قرار پائی۔

بابرہ شریف نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے جن لوگوں کو متاثر کیا تھا ان میں سرفہرست ایس سلیمان بھی تھے جو اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ وہ جو کہتے ہیں۔

وہ تجزیہ کار اور جہاندیدہ ہدایت کار تھے اس لیے ''بھول'' میں بابرہ کے کام کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ اس لڑکی میں بے پناہ فنی خوبیاں ہیں۔ ''بھول'' کی تکمیل کے دوران ہی ایس سلیمان نے ایک دوسری فلم ''انتظار'' شروع کی تو اس میں بابرہ کو بھی کاسٹ کرلیا۔ یہ بھی ایک ثانوی کردار تھا۔ اس فلم میں اسے ندیم کی بہن اور قوی کی بیوی کا کردار دیا گیا تھا۔ بابرہ نے یہ کردار بھی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ ان دو فلموں کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلی فلم ''بھول'' کے مقابلے میں دوسری فلم ''انتظار'' پہلے ریلیز ہوگئی اور ''بھول'' کی نمائش

بعد میں ہوئی۔ ''انتظار'' 9 اگست 1974ء کے دن ریلیز ہوئی جب کہ ''بھول'' یکم نومبر 1974ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ اس طرح بابرہ شریف کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''انتظار'' شمار کی گئی اور ''بھول'' دوسری فلم۔ دونوں فلموں میں اگرچہ بابرہ کے رول ثانوی تھے مگر جوہر شناس لوگوں کا خیال تھا کہ اتنی زبردست صلاحیتوں کی اداکارہ کا مقام ثانوی کردار نہیں مگر وقت اور حالات نے مزید کچھ دنوں تک اسے سیکنڈ کریکٹرز کی آزمائش پر مجبور کیا۔ ''شمع'' میں بھی بابرہ کو ثانوی کردار میں کاسٹ کیا گیا جو ملٹی اسٹار کاسٹ کی فلم تھی اور 27 دسمبر 1974ء کو ریلیز ہوئی اور اس کے بعد پنجابی فلم ''میرا ناں پاٹے خان'' میں بھی وہ سیکنڈ کریکٹر میں پیش کی گئی۔ اس وقت قابل اجمیری کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جس بریک تھرو کے لیے وقت نے اتنے دنوں مناسب حالات کا انتظار کیا تھا، وہ وقت آخر آ ہی گیا۔ شباب کیرانوی جو پاکستانی فلمی صنعت میں کنگ میکر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نظر انتخاب بابرہ پر جم گئی۔ وہ ایک فلم کا اسکرپٹ تیار کر چکے تھے اور اس کے مرکزی کرداروں کے لیے انہوں نے جب دیبا اور ندیم کو کاسٹ کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے بڑے ادب کے ساتھ معذرت کرلی۔

''شباب صاحب! آپ کی فلم میں کام کرنا ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے مگر ان دنوں ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم بے حد مصروف ہیں۔ آپ کی مرضی کے مطابق آپ کو وقت نہیں دے سکیں گے۔''

شباب پروڈکشن کی فلمیں ریکارڈ ٹائم میں تیار کی جاتی تھیں اس لیے ان میں کام کرنے والوں کے لیے اولین شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ فلم ساز کی مرضی کے مطابق وقت دیں گے۔ شباب صاحب اور ان کے دونوں صاحبزادوں نذر شباب اور ظفر شباب سال بھر میں کم از کم تین فلمیں ضرور پروڈیوس کرتے تھے۔

ندیم اور دیبا کے انکار کے بعد شباب صاحب نے سوچا کیوں نہ نئے چہروں کو لے کر فلم بنائی جائے۔ عام طور پر فلم ساز نئے چہروں کا رسک نہیں لیتے مگر شباب صاحب اور ان کے فلم ساز ادارے کی نیک نامی کی وجہ سے ان کی ایسی فلمیں بھی فلم ٹریڈ اور فلم بینوں کو قابل قبول ہوتی تھیں جن میں نئے چہرے ہوتے تھے۔ دیبا اور ندیم کے انکار کے بعد انہوں نے سوچا کراچی کی یہ نئی لڑکی بابرہ بطور ہیروئن کیسی رہے گی؟ اس نے ''انتظار'' اور ''بھول'' میں تو ثانوی کردار بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ اسکرپٹ کے لحاظ سے میری فلم کی ہیروئن کا کردار بہت پاور فلم ہے۔ میرا تو دل کہتا ہے اس لڑکی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اس کیریکٹر کی ڈیمانڈ پر پوری اترے گی۔ تو پھر ٹھیک ہے، ہیروئن کے لیے بابرہ شریف ڈن۔

اس کے مقابل ہیرو کون ہونا چاہیے؟ انہوں نے خود سے سوال کیا۔

پھر کچھ سوچ بچار کے بعد اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا۔ کراچی ہی کا لڑکا غلام محی الدین کیسا رہے گا؟ اس نے پی ٹی وی کے ڈرامے ''کتنے خواب کتنی آنکھیں'' میں تو زبردست اداکاری کی ہے۔ کیا اس کی اس اداکاری کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ میری فلم کے ہیرو کے معیار پر بھی پورا اترے گا؟ ضرور اترے گا۔ اچھے کردار ہی اچھے پرفارمر کو اچھا اور بڑا اداکار بناتے ہیں۔

اس موقع پر انہیں محمد علی کی یاد آئی۔ وہ محمد علی جو مختلف قسم کے غیر موثر کرداروں کی ادائیگی میں ذلیل و خوار ہو رہا تھا۔ وہی محمد علی ''خاموش رہو'' کا کردار ادا کر کے محمد علی بن گیا۔

یہ اور ایسی ہی باتیں سوچ کر شباب کیرانوی صاحب نے غلام محی الدین کو کراچی سے لاہور بلایا اور شباب اسٹوڈیو میں اس کے قیام وطعام کا بندوبست کیا پھر جب ان کی فلم ''میرا نام ہے محبت'' کی فلم بندی شروع ہوئی تو دونوں نوآموز آرٹسٹوں نے اپنے کردار اس طرح پرفارم کیے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کسی زاویے سے بھی یہ نئے نہیں لگتے تھے۔ اتنی جاندار اداکاری کی توقع تو تجربہ کار اور سینئر فنکاروں سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس میں ان کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے کیریکٹرز کا بھی حصہ تھا۔ ان کے کرداروں نے ان کو اداکاری کا جو موقع فراہم کیا تھا اس پر وہ مکمل طور پر پورے اترے تھے۔

اچھی کہانی، اچھی ہدایت کاری، اچھی موسیقی، اچھے گیتوں کے ساتھ ہیرو ہیروئن کی سپر کلاس اداکاری نے اس فلم کو فقید المثال کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ''میرا نام ہے محبت'' ایک بڑی دل گداز رومانوی داستان پر مبنی فلم تھی۔ اس کی

ہیروئن کو کینسر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بیماری کو ہیرو سے چھپاتی ہے۔ لیکن ہیرو اس سے باخبر ہوتا ہے اور ہر طرح اس کی دلجوئی کا سامان کرتا ہے۔ بابرہ شریف نے اس فلم میں کینسر کی ایسی مریضہ کا کردار ادا کیا تھا جسے یہ معلوم تھا کہ وہ جس مرض میں مبتلا ہے اس میں موت یقینی ہے۔ اس نے ایسی مریضہ کی کردار نگاری اس قدر جاندار انداز میں ادا کی کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھے۔ ایسی جذباتی اداکاری اور ایسے فیس ایکسپریشنز پہلی بار پاکستانی سینما اسکرین پر نظر آئے تھے۔

''میرا نام ہے محبت'' اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے ٹرینڈ سیٹر ثابت ہوئی۔ تسلیم فاضلی کی شاعری اور ایم اشرف کی موسیقی نے اس فلم کو چار چاند لگا دیے تھے۔

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم
کہانی محبت کی زندہ رہے گی
☆ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے
اور میں ہوں محبت کا پیاسا
☆ تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے

جیسے گیتوں نے اس فلم کی مقبولیت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان گیتوں سے بھارتی بھی اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے چربے بنانے پر مجبور ہو گئے۔ کوئی بھی اچھی چیز ہو اس کی پذیرائی ضرور ہوتی ہے۔ اپنے پرائے سب اسے پسند کرتے ہیں۔ اس پاکستانی فلم کی بھی پسندیدگی ہر جگہ خوشبو کی طرح پھیل گئی۔ اندرونِ ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی جہاں کہیں اس کی نمائش ہوئی اُسے زبردست شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی جب کہ چین میں تو اس کی مقبولیت کا ایک نیا ہی ریکارڈ قائم ہوا۔ اس سے پہلے کہ چین جیسے عظیم ملک میں اس فلم کی عظیم الشان کامیابی کی داستان رقم کروں۔ اس فلم سے متعلق یہ دلچسپ بات گوش گزار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب پاکستان میں اس کی پہلی نمائش ہوئی تو اسے تماشائیوں نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اسے دیکھا جائے۔ یہ کوئی گپ بازی نہیں۔ حقیقت ہے۔ بڑی تلخ حقیقت۔ اس فلم کا ڈسٹری بیوٹر مجبوراً اسے سینما گھر سے اتار کر ڈبے میں بند کر دینے کا ارادہ کر رہا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ''میرا نام ہے محبت'' جن دنوں لاہور میں ریلیز کی گئی تھی وہ رمضان شریف سے ایک دو ہفتے پہلے کا وقت تھا۔ یہ فلم سینما گھروں کی زینت بنی تو تماشائیوں کے اکثریتی طبقے نے یہ سوچ کر اس پر کوئی توجہ نہیں دی کہ اس کے ہیرو ہیروئن نئے تھے۔

''یہ کیا اداکاری کریں گے؟''

''شباب صاحب بھی محض پیسا بچانے کے لیے کیا کیا تماشا نہیں کرتے۔''

''چھوٹے موٹے آرٹسٹوں کو چھوٹے موٹے کرداروں میں تو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ فلم کے مرکزی کردار کروا کر انہوں نے بڑی زیادتی کی ہے۔''

''ہم پر ہی نہیں۔ اپنے آپ پر بھی بڑا ظلم کیا ہے۔''

یہ اور ایسے ہی تاثرات تھے جس کے تحت فلم بین نئے ہیرو ہیروئن کی نئی فلم کو نظر انداز کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں فلم کی نمائش جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر تقسیم کار نے یہی فیصلہ کر لیا کہ جب فلم دیکھنے والے نہ ہوں تو سینما کا کرایہ دینے کا کوئی تک نہیں بنتا لیکن جب ڈسٹری بیوٹر نے اس فیصلے کا اظہار کیا تو مین تھیٹر کے مالک نے ان سے کہا۔ ''رمضان شریف کی آمد آمد ہے۔ رمضان میں ہم تمام سینما والے پرانی فلمیں دکھاتے ہیں کیونکہ رمضان میں فلم دیکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے اس لیے میں آپ سے عرض کروں گا کہ اسے ڈبے میں بند کرنے کی بجائے سینما گھر میں لگا رہنے دیں۔ شاید پرانی فلموں کے مقابلے میں یہ نئی فلم کچھ زیادہ چل جائے۔''

''آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی سہی۔''

اور تقسیم کار نے اس کی نمائش روکنے کی بجائے جاری رکھی۔ رمضان شروع ہوتے ہی سارے سینما گھروں میں پرانی فلموں کی نمائش شروع ہو گئی۔ ان فلموں کے درمیان ''میرا نام ہے محبت'' ہی ایک نئی فلم تھی جو لوگ روزے بہلانے کے لیے فلم دیکھتے ہیں وہ سینما گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے فلم بینوں میں سے کچھ نے یہ سوچ کر اس فلم کا ٹکٹ خریدا کہ پرانی تو دیکھی ہوئی ہیں، کیوں نہ یہ نئی فلم دیکھی جائے۔

اور جب وہ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو انہوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

''ارے یار! کیا زبردست فلم ہے۔ زبردست کہانی، لاجواب ہدایت کاری اور نئے ہیرو ہیروئن نے تو ایسی کمال کی اداکاری کی ہے کہ......''

ایک دو نہیں، ہر تماشائی اس نئی فلم کے گن گانے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تمام شو فل ہونے لگے اور سینما مالک کے علاوہ تقسیم کار نے بھی یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ رمضان کا مہینا بڑی برکتوں کا ہے۔ شاید اس کی

برکتوں نے ہی اس فلم کی اور ہماری تقدیر بدل دی۔ رمضان کے دوسرے ہفتے کئی دوسرے سینماؤں نے بھی یہ نئی فلم چلانا شروع کردیں پھر نہ صرف پورے رمضان اس کی کامیاب نمائش جاری رہی بلکہ عیدالفطر کی آمد پر نئی اور بڑی فلموں کے مقابلے میں بھی ''میرا نام ہے محبت'' کامیاب بزنس کرتی رہی۔

جس طرح عشق اور مشک کو چھپانا مشکل ہوتا ہے اسی طرح اچھی فلم کی شہرت اور مقبولیت کو بھی رکاوٹیں روک نہیں سکتیں، بابرہ شریف اور غلام محی الدین نئی ہیروئن اور نئے ہیرو تھے مگر ان کی بے مثال کردار نگاری کی وجہ سے انہیں نہ صرف ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ بیرون ملک بھی۔ ان کی سپر پرفارمنس کو جس نے بھی دیکھا، ان کا گرویدہ ہو گیا۔ چین کے فلم بینوں نے تو اپنی محبت اور پسندیدگی کا زبردست مظاہرہ کیا جس زمانے میں ''میرا نام ہے محبت'' چین کے طول وعرض میں ریلیز کی گئی۔ اس دور میں بیجنگ میں پاکستانی سفیر محمد یونس کے سیکریٹری اطلاعات میجر جنرل مجیب الرحمن تعینات تھے۔ ان کے پاس چینی عوام کی ایک انجمن کی جانب سے ایک خط آیا جس میں اس پاکستانی فلم ''میرا نام ہے محبت'' کے بارے میں چینی عوام کے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس خط میں لکھا گیا تھا۔ ''اب تک جو غیر ملکی فلمیں چینی زبان میں ڈب کر کے دکھائی گئی ہیں ان سب میں ''میرا نام ہے محبت'' بہترین فلم ہے۔ اس فلم کے مرکزی کردار نوشی (بابرہ شریف) اور حامد (غلام محی الدین) کو ہم چینی عوام زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ چینی زبان میں ہمارے یہاں ایک مشہور ضرب المثل ہے ''سچے اور گہرے جذبات کو اگر خلوص اور فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کیا جائے تو اسے دیکھ کر زمین اور آسمان بھی لرز جاتے ہیں۔'' اس بات کا ثبوت فلم میں ہیرو کے سنگدل باپ نے بھی دیا ہے جو فلم کے آخری منظر میں نوشی کا خط پڑھ کر بلک بلک کر رو پڑتا ہے۔ سچی اور پرخلوص محبت اپنی ذات میں ایک حسن ہی نہیں، بلکہ اس سے معاشرے کی کثافتوں کی تطہیری عمل بھی جاری ہوتا ہے۔ ایسی محبت انسانی شخصیت کی تشکیل تو بھی کرتی ہے اور انسانوں کی زندگی کے بارے میں بنائے ہوئے غلط نظریات سے بھی نجات دلاتی ہے۔

یہ فلم صحیح معنوں میں حیرت انگیز اور بے حد کامیاب کوشش ہے۔ یہ اس حد تک متاثر کن فلم ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس فلم نے بلاشبہ ہمیں بے حد اچھی نظریاتی تعلیم دی ہے۔ فلم دیکھتے ہوئے ہماری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے تھے اور ہمارے دل کے گداز کا وہی عالم تھا جو فلم کے ہیرو حامد اور ہیروئن نوشی کا تھا۔ ان دونوں کے درمیان محبت سے پرُنوخیز جذبات نے ہمارے نوجوان چینی دوستوں کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑا ہے۔ ہمیں اس فلم کے ذریعے یہ پتا چلا ہے کہ پاکستانی نوجوان نسل کس قدر پاکیزہ محبت کرتی ہے۔ یہ فلم ہم اپنے تمام فیملی ممبران کے ساتھ بنا کسی جھجک اور خوف کے دیکھ رہے ہیں۔

ہمیں یہ جان کر فخر کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں اس طرح کی سادہ اور پاکیزہ فلمیں بھی بنتی ہیں۔ یہ فلم دیکھنے کے بعد نوشی اور حامد کا عکس ہمارے ذہنوں میں جم کر رہ گیا ہے۔ ان کے نقوش کا رنگ اترنے کا نام نہیں لیتا۔ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ یہ کردار ہمارے خوابوں کا جز بن کر رہ گئے ہیں۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس فلم کے اسکرپٹ رائٹر، ہدایت کار اور خصوصی طور پر فلم کی ہیروئن اور ہیرو تک ہمارے دلی جذبات پہنچا دیجیے۔ انہیں ہماری طرف سے پرجوش مبارک باد پیش کریں اور ان سے کہیں کہ نوشی اور حامد کی محبت چینی نوجوان نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی جس کی روشنی میں وہ مادر وطن کی تعمیر نو کا عہد کرے گی اور چین اور پاکستان کی دوستی کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔''

چینی نوجوانوں کے جذبات کی عکاس یہ خط شباب پروڈکشن میں پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد پاکستانی فلمی صنعت کے لیجنڈ فنکار محمد علی چین گئے تھے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد انہوں نے بتایا۔ ''میں جب چین گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے چوک اور چوراہوں میں بابرہ شریف اور غلام محی الدین کے مجسمے ایستادہ ہیں۔''

میں نے اپنے چینی گائیڈ سے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

گائیڈ مسکرایا۔ ''سر! یہ آپ کے پاکستانی فنکار ہیں۔ کیا آپ انہیں نہیں پہچانتے۔''

''جانتا بھی ہوں اور پہچانتا بھی ہوں مگر ان کے ان مجسموں کی موجودگی، چہ معنی دارد؟''

''سر! ان کی فلم ''میرا نام ہے محبت'' یہاں چینی زبان میں ڈب ہو کر ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم نے اور اس کے ان فنکاروں نے چینی عوام کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اپنی

پسندیدگی اور محبت کا اس طرح اظہار کیا ہے۔“

محمد علی نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے چاہنے والوں سے کہا۔ ”ان دونوں (بابرہ اور غلام محی الدین) کے لیے یہ وہ اعزاز ہے جو پاکستان کے کسی بھی فنکار کو حاصل نہیں ہوا۔“

”میرا نام ہے محبت“ 8 اگست 1975ء کے دن ریلیز ہوئی۔ اس فلم کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش تھا وہ اس فلم کے ساتھ اسی دن ریلیز ہونے والی فلم ”وحشی جٹ“ کا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اردو فلم ”پروفیسر“ بھی اسی دن ریلیز ہوئی تھی جس میں محمد علی اور نیلو نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ بڑے فنکاروں کی دو بڑی فلموں کے مقابلے میں ”میرا نام ہے محبت“ نئے چہروں کی فلم تھی اس لیے اس کے لیے سخت آزمائشی مرحلہ تھا مگر ان نئے آرٹسٹوں کی سپر پرفارمنس اور زبردست کہانی، ہدایت کاری اور موسیقی نے اس آزمائش میں انہیں سرخرو کیا اور اسی فلم کے حوالے سے بابرہ شریف صف اول کی اداکارہ تسلیم کی گئیں اردو فلموں کو اس نوخیز اداکارہ کی ضرورت میں ایک نئی بنائی ہیروئن مل گئی۔ ایک ایسی اداکارہ جو ہر کردار میں ڈھل جانے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔

کبھی کبھی انسان کی کچھ خوبیاں بھی اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ بابرہ شریف کی یہ خوبی کہ وہ ہر کردار ادا کرسکتی ہے۔ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ فلم ساز و ہدایت کار اسے سیکنڈ ہیروئن یا ایسے ہی دیگر ثانوی کرداروں میں پیش کرتے رہے۔ ایسی فلموں میں ”نوکر“ جس کے مرکزی کردار زیبا اور محمد علی تھے اس فلم میں بابرہ کو ایک امیر زادی (جو چھوٹی موٹی سی شوخ لڑکی ہے) کے کردار میں کاسٹ کیا گیا تھا۔ ہدایت کار اسلم ڈار نے اپنی فلم ”زبیدہ“ میں بابرہ کو منفی کردار میں پیش کیا۔ اسی طرح ہدایت کار پرویز ملک نے بھی اپنی فلم ”تلاش“ میں شاہد کے ساتھ مختصر کردار میں اسے پیش کیا۔ البتہ شباب کیرانوی نے اپنی 12 مارچ 1976ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”دیوار“ میں بابرہ کو سولو ہیروئن کے طور پر غلام محی الدین کے مقابل پیش کیا۔ ”میرا نام ہے محبت“ کے بعد بابرہ شریف کی بطور سولو ہیروئن یہ دوسری فلم تھی۔ اس فلم کے یہ گیت بہت مقبول ہوئے تھے۔

☆ دیوانہ کہیں تم کو نہ دیوانہ بنا دے

☆ نہ جانے کیوں مجھے بھولی کہانی یاد آتی ہے

پروفیشن سے محبت

بابرہ اپنے پروفیشن سے جنوں کی حد تک محبت کرنے والی اداکارہ ہیں۔ کردار کتنا ہی مشکل ہو، اس کی ادائیگی کتنی ہی دشوار ہو وہ کسی حال میں گھبراتی یا دامن نہیں بچاتی تھیں۔ فلم ”وقت“ کا گیت دل توڑ کے مت جیو سخت سردیوں کے دنوں میں فلمایا گیا جس میں ٹھنڈے پانی سے مصنوعی برسات کی گئی تھی۔ سخت سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہوئے انہوں نے پورا گانا عکس بند کروایا جس کی سب نے داد دی اور ان کے جذبے کو سراہا۔

قدردان

بابرہ شریف کی فنکارانہ صلاحیتوں کی خوشبو بالی ووڈ تک جا پہنچی تھی۔ ممبئی کے کئی فلم سازوں نے انہیں اپنی فلم میں کام کرنے کی دعوت دی جن میں بی آر چوپڑا اور مظفر حسین کے نام بھی شامل ہیں۔ جب پاکستانی فلم ”مہربانی“ کی کاپی ”الگ الگ“ کے نام سے بنائی جا رہی تھی تو ایک دن اداکار راجیش کھنہ نے بابرہ کو فون کر کے فلم ”الگ الگ“ میں ہیروئن کے لیے مشورہ طلب کیا۔ بابرہ نے انہیں پدمنی کولہا پوری کو کاسٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ فن کو جاننے اور سمجھنے والے فنکار اور فلم میکر بابرہ کی فنی عظمت سے واقف تھے۔ ممبئی فلم انڈسٹری میں بھی بابرہ کے قدردان بہت تھے۔

”دیوار“ کے ساتھ دو ایکشن پنجابی فلمیں ”الٹی میٹم“ اور ”دہشت خان“ ریلیز ہوئیں تو ان کے درمیان یہ ہلکی پھلکی لو اسٹوری فلم ”دیوار“ دب کر رہ گئی اور اس نے متوقع کامیابی حاصل نہیں کی۔

”دیوار“ کی غیر متوقع ناکامی کے بعد بابرہ شریف کی اگلی دو فلمیں بھی ثانوی کرداری والی تھیں۔ جن میں ایک ہدایت کار علی سفیان آفاقی کی فلم ”آگ اور آنسو“ اور دوسری ہدایت کار جمیل اختر کی ”چورتوں موڑ“ ہے۔

ہدایت کار وحید ڈار کی پنجابی فلم ”انجام“ میں ایک بار پھر بابرہ شریف، منور ظریف کے مقابل پیش کی گئیں۔ جب کہ آسیہ اور شاہد بھی اس فلم کا حصہ تھے۔ یہ فلم 30 اپریل 1976ء کے دن ریلیز کی گئی تھی۔ یہاں سے بابرہ شریف کے کیریئر میں ایک ٹرننگ پوائنٹ آتا ہے جب ہدایت کار

جان محمد نے اپنی ذاتی پروڈکشن کی فلم ''دیکھا جائے گا'' میں بابرہ شریف کو شاہد کے مقابل سولو ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا تو ہدایت کار شباب کیرانوی نے بابرہ شریف کو محمد علی کے مدِمقابل اپنی فلم ''نشیمن'' میں کاسٹ کر کے یہ نیا تجربہ کیا کہ دراز قد محمد علی کے سامنے پستہ قد بابرہ شریف کو ہیروئن بنایا۔ اگرچہ دونوں کے قد کاٹھ میں نمایاں فرق تھا مگر بابرہ نے محمد علی کے ساتھ جم کر اداکاری کی اور کسی طرح بھی ان سے کمتر ثابت نہیں ہوئی۔ ''نشیمن'' ایک کامیڈی فلم تھی۔ محمد علی نے مزاحیہ کردار ادا کیا تھا اور اس روپ میں بھی پسند کیے گئے تھے۔ اس فلم کی ایک خاص بات اس کی ایک قوالی تھی جسے مہدی حسن، مالا اور احمد رشدی کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ مہدی حسن اور احمد رشدی نے پہلی بار ایک ساتھ اپنی آواز کا جادو جگایا تھا۔ قوالی کے بول تھے ☆اب چھوڑ کے در تیرا دیوانے کہاں جائیں

دیگر گیت بھی پسند کیے گئے۔

☆محبوب کے جلوؤں میں تصویر نظر آئی

☆یار کی گلیوں میں کیونکر یار جانا چھوڑ دے

☆پہلی بار دھک دھک کر کے

جب دل دل سے ملتا ہے

ان گیتوں کی مسحور کن دھنیں موسیقار ایم اشرف نے بنائی تھیں۔ یہ فلم 26 ستمبر 1976ء کے دن عیدالفطر کے موقع پر نمائش پذیر ہوئی تھی اور کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

''نشیمن'' کی کامیابی کے فوراً بعد ہدایت کار ایس سلیمان نے اپنی فلم ''انسانیت'' میں بابرہ شریف کو ٹی وی اداکار راحت کاظمی کے مقابل کاسٹ کیا۔ یہ فلم 29 اکتوبر 1976ء کو ریلیز کی گئی۔ نئے ہیرو کے ساتھ بھی بابرہ نے اچھا پیئر بنایا اور لوگوں نے اس جوڑی کو بھی پسند کیا۔

اس سال (1976ء) کی بابرہ شریف کی آخری فلم ''شبانہ'' تھی جس کے ہدایت کار نذر شباب تھے جب کہ وحید مراد کو بابرہ کے ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا۔ سپر ہیرو وحید مراد کے ساتھ بابرہ نے ایسی سپر پرفارمنس دی کہ سال کی بہترین ہیروئن کا نگار ایوارڈ حاصل کیا۔ یہ بابرہ کے کیریئر کے آغاز کا دور تھا۔ اس ابتدائی دور میں اس نے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کر کے ناقدین اور مبصرین کو حیران کر دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستانی فلمی صنعت کی اردو فلموں پر محمد علی، وحید مراد، ندیم اور شاہد کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس سال بابرہ شریف نے ان میں سے تین سپر اسٹارز شاہد، محمد علی اور وحید مراد کی کامیاب ہیروئن بن کر ثابت کر دیا تھا کہ اب اس کی سپر پرفارمنس بھی فن کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ یہ کسی نئی اداکارہ کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا کہ اس نے اپنے کیریئر کے آغاز میں ہی یہ سنگ میل عبور کر لیا تھا۔

نیا سال 1977ء شروع ہوا تو بابرہ شریف کی اس برس کی پہلی فلم ''بیٹی'' 14 جنوری 1977ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ ہدایت کار ظفر شباب کی فلم تھی جس میں ان کے ہیرو شاہد تھے۔ جب کہ اس سال ان کی دوسری فلم ''عاشی'' تھی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار علی سفیان آفاقی تھے۔ اس فلم کے کئی گیتوں نے مقبولیت حاصل کی جن میں

☆جان تمنا کب تک تم نہ پیار مرا پہچانو گے

☆مرجائے گی تیری عاشی

☆آپ کو ہم پسند کرتے ہیں

شامل ہیں۔ یہ فلم درمیانے درجے کی کامیابی حاصل کر سکی مگر بابرہ کی اگلی فلم نے پچھلی فلم کا حساب چکتا کر دیا۔ ''درد'' نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ یہ ہدایت کار اقبال اختر کی فلم تھی جنھوں نے پہلی بار بابرہ کو ندیم کے مقابلے میں سولو ہیروئن کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس نئے پیئر نے بھی شائقین فلم کو بہت متاثر کیا۔ اس فلم کی کامیابی اس لحاظ سے بھی قابل ستائش تھی کہ اسی دن (16 ستمبر 1977ء بروز عیدالفطر) بھروسا، میرے حضور، جبرو، چور سپاہی اور قانون بھی ریلیز ہوئی۔ جب مدِمقابل ایک سے زیادہ بڑے فلم سازوں کی بڑی فلمیں ہوں تو مقابلہ بہت سخت ہوتا ہے۔ اس سخت امتحان میں ''درد'' کا سرخرو ہونا اور فلم بینوں کو اپنی جانب متوجہ کرنا بڑی بات ہوتی ہے اور بابرہ شریف اور ندیم کی نئی فلم ''درد'' نے اتنے ''پہلوانوں'' میں یہ معرکہ سر کر لیا تھا۔ ہاں ''بھروسا'' نے کامیابی کے لحاظ سے اپنے آپ کو کسی قدر قابل بھروسا ثابت کیا تھا۔

ندیم جیسے سپر پرفارمر کے ساتھ اتنی زبردست کردار نگاری کرنے پر بابرہ شریف فلم میکرز کے لیے قابل بھروسا سمجھی جانے لگی۔ بابرہ کے متعلق ان کے اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ کامیابی کی ضمانت تصور کی جانے لگی۔

''درد'' کی شاندار کامیابی کے بعد بابرہ شریف کی یکے بعد دیگرے کئی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ جن میں ہدایت کار جان محمد کی ''جوانی دیوانی'' ہدایت کار اسلم ڈار کی ''پہلی نظر'' ہدایت کار مسعود پرویز کی فلم ''انسان'' ہدایت کار ایس سلیمان کی فلم

"پیار کا وعدہ" اور اس سال کے آخری مہینے (دسمبر) میں ریلیز ہونے والی فلم "سلاخیں" قابل ذکر ہیں۔

"جوانی دیوانی" 29 ستمبر 1977ء کے دن ریلیز ہوئی۔ ایک بار پھر شاہد اس فلم میں بابرہ کے ہیرو تھے۔ 16 اکتوبر 1977ء کو ریلیز ہونے والی فلم "پہلی نظر" میں ندیم اور محمد علی کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں جب کہ 21 اکتوبر 1977ء کی ریلیز شدہ فلم "انسان" تھی۔ 4 نومبر 1977ء کو نمائش پذیر ہونے والی فلم "پیار کا وعدہ" تھی جس کے بعد حسن عسکری کی فلم "سلاخیں" 23 دسمبر 1977ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے پاکستان سمیت کئی ممالک میں بڑے چرچے ہوئے۔ یہ وہی فلم ہے جس میں بابرہ شریف کی مضبوط ترین کردار نگاری دیکھ کر دلیپ کمار نے بابرہ شریف کے ساتھ کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یہ پڑھ کر اگر آپ چونک پڑے ہیں تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوگی۔ دلیپ کمار جیسے مہان فنکار کا بابرہ شریف جیسی نوآموز اداکارہ کے ساتھ کام کرنے کی خواہش کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ کوئی افسانوی قصہ کہانی بھی نہیں۔ بہت سے لوگوں کو اس حقیقت کا علم نہیں اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کو سیاق وسباق کے ساتھ تحریر کروں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مادام شمیم آرا اپنی فلم "مس سنگاپور" کی شوٹنگ کے لیے بابرہ شریف کے ساتھ سنگاپور میں تھیں۔ انہی دنوں بھارتی اداکار رندھیر کپور بھی سنگاپور میں موجود تھے۔ ان کی ملاقات بابرہ شریف سے ہوئی تو انہوں نے انہیں اپنی فلم کی ہیروئن بنانے کی دعوت دی۔ بابرہ شریف نے نہایت اخلاق سے کہا۔ "اس آفر کا بہت شکریہ۔ آج کل تو میں بہت مصروف ہوں۔ موقع ملا تو آپ سے رابطہ کروں گی۔"

کسی بھارتی فلم میں کام کرنے کی یہ بہت بڑی آفر تھی مگر بابرہ شریف نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انکار کر دیا۔

اس انکار کے بعد ایک بھارتی فلم ساز نے انہیں اپنی فلم "راستہ" میں کام کرنے کی دعوت دی اور کہا۔ "اس فلم میں دلیپ کمار صاحب کو بھی کاسٹ کرنا چاہتا ہوں مگر ان کی شرط ہے کہ اگر پاکستانی اداکارہ بابرہ شریف میرے ساتھ کام کرے گی تو میں تمہاری فلم سائن کرلوں گا۔"

یہ بابرہ شریف کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ برصغیر پاک وہند کے سب سے بڑے فلم اسٹار نے کسی فلم میں کام کرنے کی یہ شرط رکھی ہے کہ اگر بابرہ ان کے مدمقابل ہوگی تو وہ اس فلم میں کام کریں گے۔ اس کے باوجود بابرہ شریف نے "راستہ" کے فلم ساز کو بھی وہی جواب دیا جو رندھیر کپور کو دیا تھا۔

"سرجی! میں فی الحال بہت مصروف ہوں۔ جن فلم میکرز کو میں نے جو ٹائم دیا ہے، اس میں کوئی ردوبدل کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔"

بابرہ کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو ان کی فلم کے لیے جو وقت دیتی تھیں۔ اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرتی تھیں۔ ان کی دیگر خوبیوں میں یہ خوبی بھی انہیں دیگر اداکاراؤں میں ممتاز کرتی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد بابرہ شریف زیارت کے لیے اجمیر شریف گئیں تو انہوں نے سوچا جب یہاں تک آئی ہوں تو ممبئی کا بھی ایک پھیرا لگا لوں۔

ان کی ممبئی آمد کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تو دلیپ صاحب کا پیغام انہیں ملا۔ "میری بڑی عزت افزائی ہوگی اگر آپ نے مجھے ملاقات کا شرف بخشا۔"

بابرہ خود بھی ان سے ملنے کی خواہش مند تھیں۔ دلیپ صاحب نے بلایا تو گویا سر کے بل چل کر ان کے گھر پہنچ گئیں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ دلیپ کمار ایک لیجنڈ شخصیت ہونے کے باوجود بابرہ سے اس خلوص، اس محبت اور اپنائیت کے ساتھ ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ساتھی سے مل رہے ہوں، اس موقع پر انہوں نے بڑی پُرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔

"یوسف بھائی! آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا ہی میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ یہ اتنے تکلف کا اہتمام آپ نے کیوں کیا؟"

دلیپ کمار صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے۔ "بات دراصل یہ ہے بابرہ جی کہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ میں ملاقات کے وقت چائے بسکٹ کو کافی نہیں سمجھتا اور جب کوئی پاکستان سے آتا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہتی اور آپ تو پاکستان کی سپر......"

"خدارا! مجھے گناہ گار نہ کریں۔" بابرہ شریف نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو...... میں تو......"

"نہیں آپ بہت بڑی اداکارہ ہیں۔ پاکستانی فلموں کی قابل فخر فنکارہ ہیں۔"

اس ضیافت میں کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ جن میں کچھ انڈین تھے اور کچھ پاکستانی۔ بابرہ کے ساتھ بھارت یاترا میں شریک۔ یوسف بھائی ہر ایک کے سامنے گویا بچھے جاتے تھے۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بابرہ شریف نے ایک پرانی یاد تازہ کی۔

"یوسف بھائی! میں گزشتہ دنوں اپنی ایک فلم "مس سنگاپور" کی شوٹنگ سنگاپور میں کروا رہی تھی۔ وہاں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی انہوں نے مجھے بتایا۔ "میں ایک فلم "راستہ" بنا رہا ہوں جس میں دلیپ صاحب کو سائن کرنا چاہتا ہوں مگر انہوں نے یہ شرط عاید کردی ہے کہ اگر میرے مقابل بابرہ شریف کام کرے تو میں آپ کی اس فلم کا یہ رول پلے کروں گا۔"

بابرہ شریف اتنا کہہ کر ذرا رکیں تو دلیپ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں جو کچھ اس نے آپ سے کہا وہ سچ ہے۔ میں نے فلم ساز پر یہی شرط لگائی تھی۔"

"مجھ ناچیز میں..." بابرہ ایک دم پوچھ بیٹھیں۔ "آپ کو ایسی کیا بات نظر آئی کہ آپ نے یہ شرط لگا دی؟ حالانکہ آپ کی انڈسٹری میں بہت بڑی بڑی اداکارائیں موجود ہیں۔"

"ہیں، بہت بڑی بڑی اداکارائیں ہیں۔ آپ کی اس بات سے میں انکار نہیں کروں گا لیکن فلم "راستہ" کی کہانی میں میرا کردار جتنی شدت سے تبدیل ہوتا ہے۔ اس بات سے میں ٹیکٹیو ہوتا ہوں وہ چیز بھی جاندار ہونی چاہیے، بابرہ! آپ میں مجھے وہ معصومیت، خوب صورتی اور صلاحیتیں نظر آئیں جو اس کردار اور خاص طور پر متعلقہ سچویشن کی ڈیمانڈ تھیں۔"

اتنے بڑے فلم اسٹار کی زبان سے ان کے جذبات و احساسات سن کر بابرہ شریف پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ پاکستان میں تو اب تک کسی نے ان کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ یہ بابرہ شریف جیسی ابھرتی ہوئی پاکستانی اداکارہ کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

یہ ذکر جس فلم کے حوالے سے آگیا تھا وہ حسن عسکری صاحب کی فلم "سلاخیں" تھی جس کی کردار نگاری کو دیکھ کر دلیپ کمار جیسے مہان کلاکار بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔

"سلاخیں" میں محمد علی کے مقابل میں بابرہ شریف فن کی ان بلندیوں پر نظر آئیں کہ فلم بین بار بار یہ فلم دیکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس فلم کی موسیقی نے بھی اس کی کامیابی میں اہم

رسمِ آمین

بابرہ شریف کو مذہب سے بھی بڑا لگاؤ ہے۔ انہوں نے قرآن پاک بھی ایک جید عالم سے پڑھا تھا۔ یہ وہی قاری تھے جنہوں نے ہدایت کار ایس سلیمان کو بھی قرآن پڑھایا تھا۔ بابرہ کی رسم آمین نومبر 1978ء میں ہوئی تھی۔

فلمیں

بابرہ شریف کی ریلیز شدہ فلموں کی تعداد 145 ہے جن میں پنجابی فلموں کی تعداد 20 اور ڈبل ورژن کی تعداد 8 ہے۔ ان کی 5 اردو فلموں کے پشتو ورژن بھی ریلیز ہوئے۔ انہوں نے کبھی کسی پشتو فلم میں کام نہیں کیا۔

کردار ادا کیا۔ اس کے گیت بھی مقبول ہوئے۔ جن میں سرفہرست "تیرے میرے پیار کا ایسا ناتا ہے۔"

"سلاخیں" کی بے مثال کامیابی کا بابرہ شریف کے کیریئر پر شاندار اثر ہوا۔ آنے والے دو برسوں میں وہ پاکستان فلم انڈسٹری کی ضرورت بن گئیں۔ 1978ء میں وہ تقریباً اپنی تمام فلموں میں سولو ہیروئن کے طور پر پیش کی گئیں۔ اس سال انہوں نے محمد علی، شاہد، ندیم اور راحت کاظمی کے ساتھ کامیاب فلموں میں سپرہٹ پرفارمنس کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان فلم انڈسٹری کے جس سنہرے دور کا تذکرہ ہے بابرہ شریف اس دور کی معروف ترین اور بے حد ٹیلنٹڈ اداکارہ ثابت ہوئیں۔

1978ء کے آغاز میں ہدایت کار ایس اے حافظ کی فلم "بارات" زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ یہ فلم 14 اپریل 1978ء کو ریلیز ہوئی تھی جب کہ سال کے وسط یعنی 30 جون 1978ء کو سینما گھروں کی زینت بننے والی فلمیں "مہمان" (ہدایت کار پرویز ملک) اور "پرنس" (ہدایت کار ایس سلیمان) نے بھی زبردست کامیابیاں سمیٹ کر بابرہ شریف کو سپر پرفارمر ثابت کیا۔ "مہمان" میں اگر راحت کاظمی کے ساتھ بابرہ شریف کو بے حد پسند کیا گیا تھا تو "پرنس" میں انہیں ندیم کے مدمقابل بھی شاندار پذیرائی حاصل ہوئی۔ "مہمان" نے شاندار گولڈن جوبلی بھی کی۔

بابرہ شریف کے کیریئر کے اس زبردست سال میں کامیابیوں نے مزید پیش قدمی فلم ''پلے بوائے'' اور فلم ''زندگی'' کی صورت میں کی۔ یہ دونوں فلمیں یکے بعد دیگرے ریلیز ہوئیں۔ ان دونوں فلموں میں بابرہ شریف کے ہیرو ندیم تھے۔ یہ دونوں فلمیں دو بڑے فلم میکرز کی تھیں۔ ''پلے بوائے'' میڈم شمیم آراء کی فلم تھی تو ''زندگی'' بنگالی ہدایت کار نذرالاسلام کی شاہکار فلم تھی۔ ''پلے بوائے'' 5 ستمبر 1978ء کو عیدالفطر کے دن ریلیز ہوئی جب کہ ''زندگی'' 29 نومبر 1978ء کو نمائش پذیر ہوئی۔

دونوں فلمیں زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ ان دونوں میں اگر مقابلہ کیا جائے تو ''زندگی'' دو قدم آگے ثابت ہوگی۔ ''زندگی'' میں بابرہ شریف کا ینگ ٹو اولڈ تین مختلف اور منفرد گٹ اپ میں کردار اس قدر جاندار کردار نگاری سے آراستہ ہے کہ عام فلم بینوں سے لے کر فن اداکاری کے ماہرین نے بھی بابرہ کی وراسٹائلٹی کی تعریف کی۔ اچھی فلم کو اگر اچھے گیتوں کی سپورٹ حاصل ہو تو اس کی کامیابی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس تناظر میں ''زندگی'' کے گیتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ''زندگی'' کے مسحور کن گیت آج بھی شائقین موسیقی کی اوّلین پسند ہیں۔

☆ نکلو کتابوں سے الجھے سوالوں سے

اس قدر خوب صورتی سے فلمایا گیا اور بابرہ شریف نے ایسی شوخ و چنچل پرفارمنس دی کہ دیکھنے والے مبہوت ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اس گیت کے علاوہ

☆ جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے

آج بھی سالگرہ کی تقریبات میں پہلے دن کی طرح گونجتا ہے۔

☆ تجھے دل میں بسالوں۔ دھڑکن میں چھپالوں

☆ تیرے سنگ دوستی ہم نہ چھوڑیں گے کبھی

☆ جانے کیا ہوگیا ہے

بھی زبان زد عام ہوئے۔ مہناز، مہدی حسن، اے نیر اور غلام عباس کی مسرور کن گائیکی اور موسیقار ایم اشرف کی لاجواب دھنوں نے اس فلم کو چار چاند لگا دیے جب کہ دوسری طرف بابرہ شریف کی المیہ کردار نگاری نے فلم دیکھنے والوں کو رلا دیا۔ بلاشبہ ''زندگی'' پاکستانی فلمی صنعت کی ایک کلاسک فلم کا درجہ رکھتی ہے۔

ان کامیابیوں کے بعد بابرہ شریف فلمی دنیا کے آسمان پر چاند سورج بن کر چمکنے لگی تھیں۔ ماضی حال اور مستقبل، خدا اور محبت، دشمن کی تلاش، موسم ہے عاشقانہ، نئی تہذیب، شہید، کس نام سے پکاروں، جوش اور مس ہیریز کی پہلی فلم مس ہانگ کانگ وہ فلمیں تھیں جن میں بابرہ شریف نے اپنی جاندار کردار نگاری کی وجہ سے بڑی اسکرین پر راج کیا۔ وہ پورے ملک کی پسندیدہ اداکارہ بن چکی تھیں اور کامیابیوں کی ان بلندیوں پر تھیں جہاں بہت کم ہیروئن پہنچ پاتی ہیں۔ 80 کی دہائی میں بابرہ شریف نے جذباتی، رومانوی اور ایکشن ہر طرح کے کردار ادا کر کے پاکستانی فلمی صنعت میں اپنی وراسٹائلٹی کا لوہا منوالیا۔ اس دہائی کے آغاز میں مقابلے کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ اردو فلموں کو بہت سے چیلنج درپیش تھے۔ ایک طرف سقوط ڈھاکا کے بعد اردو فلموں کا سرکٹ محدود ہو گیا تھا تو دوسری طرف پنجابی ایکشن فلموں نے چار سو کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ ایسے میں بابرہ شریف جیسی منجھی ہوئی اداکارہ کی یکے بعد دیگرے سپرہٹ فلموں نے اردو فلموں کا سحر قائم رکھا تھا۔ اس دہائی کے آغاز میں ہدایت کار جاوید فاضل کے ساتھ بابرہ شریف کی پہلی فلم ''صائمہ'' ریلیز ہوئی تو زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ندیم اور بابرہ شریف کی لاجواب کردار نگاری سے آراستہ یہ فلم 2 مئی 1980ء کے دن نمائش پذیر ہوئی۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ فلم ''صائمہ'' ماضی کی دو فلموں کا ری میک تھی۔ 1960ء کی اردو فلم ''سہیلی'' اور 1974ء کی پنجابی فلم ''بھولا سجن'' سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ ان فلموں میں بہار اور آسیہ نے جو ٹائٹل کردار ادا کیا تھا بابرہ نے وہی کردار نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر کے بے پناہ داد سمیٹی۔ نثار بزمی کی موسیقی اور تسلیم فاضلی کی شاعری نے بھی ''صائمہ'' کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے گیتوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔

☆ جانے وہ کہاں ہوگا

☆ زندگی ہے کیا

☆ مجھے تم سے صرف تم سے محبت ہے

جیسے گیت آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

اگرچہ اس فلم ''صائمہ'' کی کامیابی سے پہلے اسی سال فلم ''دامن'' اور ''چھوٹے نواب'' بھی پسندیدگی حاصل کر چکی تھی۔ ''صائمہ'' کی بے مثال کامیابی کے بعد ہدایت کار شباب کیرانوی کی فلم ''لاجواب'' 13 فروری 1981ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں بابرہ، ندیم کی ہیروئن تھیں۔ دونوں

کی لاجواب کردار نگاری سے سجی اس فلم نے باکس آفس پر دھما کا خیز کامیابی حاصل کی اور سندھ سرکٹ میں شاندار ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ یہ فلم کراچی کے سینما گھروں میں بہت دنوں تک نمائش پذیر رہی۔

☆ آئی ملن کی رات۔ سجناں بجنی دونوں ساتھ
☆ کہاں ہے تو میرے سپنوں کی رانی
☆ بدل گئی دنیا بدل گئے لوگ

جیسے شاہکار گیتوں سے آراستہ اس فلم نے کھڑکی توڑ رش لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس فلم کی نمائش کے دو ماہ بعد ہی بابرہ شریف کی محمد علی کے ساتھ ہدایت کار نرگس چوہدری کی فلم ''بڑا آدمی'' بھی بڑی فلم ثابت ہوئی۔ یہ فلم 3 اپریل 1981ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ یوں بیک وقت ''لاجواب'' اور ''بڑا آدمی'' کامیابی سے نمائش پذیر رہیں اور بابرہ شریف کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ ''لاجواب'' اور ''بڑا آدمی'' مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنا رہی تھیں کہ اسی اثناء میں ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم ''گن مین'' ریلیز ہوئی۔ ''گن مین'' ایک ملٹی اسٹار کاسٹ کی فلم تھی جس میں بابرہ شریف، رانی، وحید مراد، محمد علی اور ممتاز نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ یہ فلم 8 مئی 1981ء کے دن ریلیز ہوئی تھی۔

2 اگست 1981ء عیدالفطر کا دن تھا اور اس عید پر بھی روایتی طور پر بیک وقت کئی بڑی فلمیں سینما گھروں کی زینت بنائی گئیں۔ ان میں پنجابی فلمیں شیر خان، سالا صاحب، چن وریام اور ملے گا ظلم دا بدلہ کے ساتھ واحد اردو فلم ''الہ دین'' بھی۔ یہ بابرہ شریف اور فیصل الرحمٰن کی فلم تھی۔ متذکرہ ساری پنجابی فلمیں ریکارڈ ساز تھیں اس لیے پنجاب سرکٹ میں انہیں زبردست پذیرائی ملی۔ کامیابیوں کے نئے ریکارڈ قائم کرنے والی ان پنجابی فلموں کی موجودگی میں بابرہ شریف کی فلم ''الہ دین'' کوئی خاص رنگ نہ جما سکی مگر کراچی سرکٹ میں ''الہ دین'' نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس دن کراچی میں بابرہ شریف کی فلم ''الہ دین'' ریلیز ہو رہی تھی اسی دن بابرہ شریف کی فلم ''لاجواب'' کراچی کے لیرک سینما میں اپنے سو ہفتے پورے کر کے ڈائمنڈ جوبلی منا رہی تھی۔

بابرہ شریف کی متعدد خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر ہیرو کے ساتھ پرفیکٹ ہیروئن نظر آتی تھیں۔ وحید مراد، محمد علی، ندیم، شاہد، راحت کاظمی، غلام محی الدین اور منور ظریف کے ساتھ ہی شائقین فلم نے بابرہ کو بھی پسند کیا بلکہ ان کے نئے ہیرو فیصل الرحمٰن کو بھی پسند کیا۔ غالباً اسی پسندیدگی کی وجہ تھی کہ شباب کیرانوی نے اپنی نئی فلم ''یہ زمانہ اور ہے'' میں بابرہ کے ساتھ فیصل الرحمٰن کو کاسٹ کیا۔ یہ فلم عیدالاضحٰی کے دن 9 اکتوبر 1981ء کو نمائش پذیر ہوئی اور ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔

''یہ زمانہ اور ہے'' کے بعد بابرہ شریف کی اگلی فلم ''کھوٹے سکے'' تھی جس کے ہدایت کار عزیز تبسم تھے۔ جب کہ غلام محی الدین نے بابرہ کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم نے درمیانے درجے کی کامیابی حاصل کی تھی۔

اس کے بعد ریلیز ہونے والی فلم بابرہ شریف کی بلاک بسٹر فلم تھی۔ یہ ہدایت کار حسن طارق کی فلم ''سنگدل'' تھی۔ ریو نیو پکچرز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے ہیرو ندیم تھے جنھوں نے اپنے ڈبل رول میں زبردست پرفارمنس دی تھی۔ بابرہ شریف نے بھی اس فلم کی کامیابی کو اپنی بے مثال کردار نگاری سے تقویت پہنچائی تھی۔ اس فلم کی اداکاری پر انہیں سال کی بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔ سنگدل نے دونوں سرکٹ (پنجاب اور سندھ) میں شاندار بزنس کیا۔ موسیقار ایم اشرف کی دھنوں پر گیتوں نے بھی اس فلم کی کامیابی میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ یہ فلم 2 اپریل 1982ء کے دن ریلیز ہوئی تھی۔

21 مئی 1982ء کو ریلیز ہونے والی بابرہ شریف کی فلم ''آس پاس'' تھی جس کے ہدایت کار اطہر شاہ خان تھے۔ یہ فلم بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔

بابرہ شریف کی اگلی فلم ''ایک دن بہو کا'' تھی۔ اس کے ہیرو ایاز تھے۔ فلم بینوں نے ایاز کے ساتھ بھی بابرہ شریف کو پسند کیا تھا۔ 22 جون 1982ء کو ریلیز ہونے والی یہ فلم بہت پسند کی گئی۔

ایاز نائک کے علاوہ بابرہ شریف نے ایک اور نئے ہیرو منصور کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ یہ پنجابی فلم ''اج دی تازہ خبر'' تھی مگر یہ بہت پرانی بات ہے۔ یہ 23 جنوری 1976ء کی بات ہے۔ ''اج دی تازہ خبر'' ناکام ہونے کی صورت میں جلد ہی باسی خبر بن گئی تھی لیکن اس فلم کی شوٹنگ کے دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا تھا کہ اداکار منصور اس حوالے سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک دن ''اج دی تازہ خبر'' کی عکس بندی ہو رہی تھی۔ بابرہ شریف اور منصور کا کام فلمایا جا رہا تھا کہ اس سیٹ پر منور

ظریف پہنچ گیا۔ منور ظریف کی ابتداء ہی سے چھیڑ چھاڑ اور جملے بازی کی عادت تھی۔ اس سلسلے میں بابرہ شریف کے ساتھ اس کی جگت بازی کی بات بھی غالباً منصور کو یاد تھی۔ جب منور ظریف نے شمیم آراء کی فلم ''بھول'' کے سیٹ پر بابرہ کو پہلی بار پیلے رنگ کے سوٹ میں دیکھ کر کہا تھا۔ ''یہ زردے کی پلیٹ کہاں سے آ گئی؟''

منصور نے منور ظریف کو سیٹ پر دیکھ کر اسے بابرہ سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے روکا اور دونوں میں مار پیٹ کی نوبت آ گئی۔

منور ظریف کے مقابلے میں منصور زیادہ طاقت ور اور تگڑا تھا اس لیے اس نے منور ظریف کو سنبھلنے نہیں دیا۔ لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر منور ظریف سیٹ سے چلا گیا تو ہدایت کار اور دوسرے لوگوں نے منصور سے کہا۔ ''تمہیں کیا ضرورت تھی اسے چھیڑنے کی؟''

بابرہ شریف بھی بولیں۔ ''جب وہ خاموش تماشائی بنا ہوا تھا تو اسے ٹوکنا نہیں چاہیے تھا۔ آپ نے تو اس بے چارے کا بھرکس نکال دیا۔''

''آپ اسے بے چارہ کہہ رہی ہیں؟'' منصور نے بابرہ شریف کو دیکھ کر کچھ اس انداز میں کہا کہ دیکھنے والے کچھ لوگ بھانپ گئے کہ اس نے کس جذبے کے تحت یہ سارا کھڑاگ کیا۔ ان کے ایکسپریشن سے صاف پتا چل رہا تھا کہ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہوں۔ موصوف واقعی بابرہ شریف کی چاہت میں گرفتار تھے۔ بابرہ شریف چونکہ اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے سب سے ہنس کر مسکرا کر بات کرتی تھیں (اور اب بھی کرتی ہیں) اس لیے اکثر اگلا اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتا تھا کہ یہ حسن کی ملکہ مجھے پسند کرتی ہے۔

منور ظریف اس روز اس فلم کے سیٹ پر اس نیت سے آیا تھا کہ بابرہ کو ایک نظر دیکھے گا۔ ''بھول'' کی تکمیل کے دوران ہی وہ بھی اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ ''بھول'' کی پہلی شوٹنگ کے وقت اس نے اپنی جگت بازی سے اسے تنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے کسی منفی رویے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی سادگی اور معصومیت پر اسے اسی وقت پیار آ گیا تھا اور پھر وہ دھڑکن بن کر اس کے دل میں دھڑکنے لگی تھی۔ ایسے کتنے ہی دل والے تھے جو اپنے طور پر اسے دل دے بیٹھے تھے۔

بابرہ شریف ایک باشعور اور پروفیشنل اداکارہ تھیں، اس لیے صرف اپنی کارکردگی پر توجہ دیتی تھیں۔ انہیں اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ ان کی شخصیت دوسروں کو متاثر کرتی ہے۔ خاص طور پر ان کے ساتھ کام کرنے والے نوجوان اداکار کچھ اور بھی آگے بڑھ جاتے ہیں مگر وہ کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی تھیں اور اپنے کام سے کام رکھتی تھیں۔ آپ میں سے بہت سے دوستوں کو اس بات کا علم ہو گا کہ بابرہ اور شاہد کا ایک اسکینڈل بھی رونما ہو چکا ہے۔ اس کا تذکرہ آگے چل کر کروں گا۔ اس وقت میں ان دنوں کا تذکرہ کر رہا ہوں جب وہ نئی یا نو آموز تھیں۔ انہیں صرف اور صرف اس بات کی فکر تھی کہ اپنی محنت، لگن اور بہترین کارکردگی سے اپنے لیے فلم انڈسٹری میں اپنا قدم جمائیں۔ بڑی اداکارہ بننے سے پہلے ہی ان کے رنگ ڈھنگ بڑے کلاکاروں جیسے تھے۔ ایسی دیگر خوبیوں میں ایک خوبی ان کی رحم دلی بھی تھی۔ اپنے ابتدائی دور ہی سے وہ ضرورت مندوں کی مقدور بھر مدد ضرور کرتی تھیں مگر اس طرح کہ اس میں تشہیر کا کوئی پہلو نہ ہو۔ یہ کام وہ بڑی خاموشی سے کرتی تھیں۔ ان کی یہ ''عادت'' آج بھی برقرار ہے۔ اس سلسلے میں ان کی رحم دلی کا ایک واقعہ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ جو کسی طرح لک آؤٹ ہو کر ہم صحافیوں تک پہنچا۔

یہ واقعہ اس دور کا ہے جب پاکستانی فلمی صنعت شدید بحران کا شکار تھی جس کے سب سے زیادہ شکار ہنر مند اور تکنیک کار تھے۔ بے چاروں کے چولہے ٹھنڈے پڑ گئے۔ بال بچوں کا پیٹ پالنا دشوار ہو گیا۔ انہی دنوں ایک بڑا اور نامور تکنیک کار بے کاری اور بے روزگاری کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان نظر آیا۔ بابرہ شریف نے اسے اپنے گھر بلایا اور کہا۔ ''کیا بات ہے بھائی! تم دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ پریشان ہو؟''

''جی ہاں میڈم! میں دوسروں کے مقابلے میں کچھ نہیں، بہت زیادہ پریشان ہوں کیونکہ میرا مسئلہ دوسروں سے مختلف ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے۔ مجھے بتایئے۔''

''میں نے کئی مہینے سے گھر کا کرایہ ادا نہیں کیا ہے۔ مالک مکان کی طرف سے گھر خالی کرنے کی ڈیڈ لائن پوری ہو گئی ہے اور اب وہ مجھے اور میرے بال بچوں کو اپنے گھر سے نکالنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے بڑی منت کی کہ چند مہینوں کی اور مہلت دے دو۔ اس طرح تم گھر سے نکال دو گے تو ہم سڑک پر آ جائیں گے۔''

وہ بولا۔ ”یہ میرا مسئلہ نہیں۔ تم تمام بقیہ کرایہ ادا کر دیا گھر خالی کرو۔“
بابرہ شریف نے اس کی یہ دکھ بھری کہانی سن کر اس سے پوچھا۔ ”اب تک کے کرائے کی رقم کتنی ہے؟“
”ایک لاکھ روپے۔“
اسی وقت چائے آ گئی تھی۔ بابرہ بولیں۔ ”آپ چائے پیجیے میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔“
اور ذرا دیر بعد جب وہ واپس آئیں تو انہوں نے ایک لفافہ پریشان حال تیکنیک کار کو تھما دیا۔ اس غریب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چائے پی کر واپس ہوا۔
اس ہنر مند کا کہنا ہے کہ گھر واپس آتے وقت مجھے جیب میں پڑے لفافے کا وزن ہلکا محسوس ہوا۔ میں سوچنے لگا۔ میں نے تو کرائے کی رقم ایک لاکھ بتائی تھی۔ میڈم کے دیئے ہوئے لفافے میں نوٹ تو کم لگ رہے ہیں۔
لیکن جب گھر جا کر میں نے قدرے بے دلی سے لفافہ کھولا تو اس میں پانچ پانچ ہزار کے چالیس نوٹ تھے۔ یعنی دو لاکھ روپے۔ ان نوٹوں کو دیکھ کر اظہار تشکر کے طور پر میرے آنسو ٹپک پڑے۔ ذرا دیر بعد میں نے بابرہ شریف کو فون کیا۔ ”میڈم! مجھے تو ایک لاکھ روپے کی ضرورت تھی آپ نے......“
”آگے کچھ نہ کہیے گا۔“ دوسری طرف سے قطع کلامی کے انداز میں آواز آئی۔ ”کرائے کے علاوہ بھی تو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنی عزت نفس کی وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ چپ رہ کر اپنی ضرورت پوری کریں اور دعا کریں کہ مولا کریم اپنی قدرت کاملہ سے یہ بحرانی دور ختم کریں۔“
بابرہ شریف ایک بڑی فنکارہ تھیں اور ان کی باتیں بھی بڑی تھیں۔ انسانوں ہی سے نہیں جانوروں سے بھی بہت محبت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر میں ہمیشہ کئی طرح کے پالتو جانور نظر آتے رہے ہیں۔
بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ بات ہو رہی تھی ”ایک دن بہو کا“ جو بابرہ شریف کی کامیابیوں کا ایک زینہ تھی۔ اس کے بعد ان کی فلم ”آنگن“ منظر عام پر آئی۔ اس فلم نے بھی کامیابی کے جھنڈے لہرائے اور بابرہ شریف کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔ یہ ہدایت کار نذر الاسلام کی فلم تھی جو کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ ندیم اس فلم کے ہیرو تھے انہوں نے بھی اپنی خوب صورت کردار نگاری سے فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم 3 ستمبر 1982ء کے دن ریلیز ہوئی تھی۔ ”آنگن“ کے بعد بابرہ شریف کی فلم ”تیرے بنا کیا جینا“ اور ”جان من“ نمائش پذیر ہوئیں۔ جب کہ اسی سال 3 دسمبر 1982ء کو بابرہ شریف کی فلم ”مہربانی“ ریلیز ہوئی جس نے اسے فن کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس فلم کے ہدایت کار پرویز ملک تھے جنہوں نے اپنی بہترین فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا اس میوزیکل فلم کی کہانی بڑی حد تک ندیم اور گلوکار اخلاق احمد کی حقیقی زندگیوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ ان دونوں (ندیم اور اخلاق احمد) نے کڑی محنت کے بعد ہی فلم انڈسٹری میں اپنے لیے نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ اس فلم میں جس کردار نے کردار نگاری کی ایک نئی مثال قائم کی وہ محمد علی تھے۔ علی بھائی جس منظر میں بھی آئے اور جو بھی مکالمہ ادا کیا۔ جو بھی فیس ایکسپریشن دیا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اکیڈمی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب تک کم از کم ہمارے ہاں کسی اور نے اس سے بہتر اداکاری نہیں کی۔ بابرہ شریف نے ان کے مدمقابل جو اداکاری کی اسے بھی ناقدین اور مبصرین نے سپر کردار نگاری قرار دیا۔ ”مہربانی“ کی موسیقی نے بھی اس فلم کی کامیابی میں احسن کردار ادا کیا۔ ایم اشرف نے بھی اپنی دلکش دھنوں سے فلم دیکھنے والوں کو اپنے جادو میں جکڑے رکھا۔

☆ تیرے بنا جی سکیں گے نہ ہم
☆ چھوٹے جو تیرا ساتھ
☆ کبھی خواہشوں نے لوٹا

جیسے مقبول عام گیت آج بھی اسی ذوق و شوق سے سنے جاتے ہیں جیسے فلم کی نمائش کے دنوں میں سنے جاتے تھے۔
بابرہ شریف کی اگلی فلم ”بارڈر بولیٹ“ تھی۔ یہ ہدایت کار انور کمال پاشا کی فلم تھی جو 18 ستمبر 1983ء کو عیدالاضحیٰ کے دن نمائش پذیر ہوئی تھی اور جس میں بابرہ شریف کے ساتھ یوسف خان اور محمد علی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے لیکن یہ فلم باکس آفس پر متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔
”بارڈر بولیٹ“ سے چند ہفتے پہلے ریلیز ہونے والی فلم ”اک دوجے کے لیے“ نے زبردست بزنس کیا۔ یہ فلم اگرچہ عید قرباں سے پہلے ریلیز ہوئی تھی اس کے باوجود اس نے عید پر ریلیز ہونے والی فلموں کا بھی بڑی کامیابی کے

ساتھ مقابلہ کیا اور کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اس کے ہدایت کار حسن عسکری نے ایک بار پھر بابرہ شریف کو ایاز کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس سے پہلے ''ایک دن بہو کا'' میں بھی ایاز نے بابرہ کے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا اور عوامی مقبولیت حاصل کی تھی۔ ''اک دوجے کے لیے'' میں بھی ایاز نے بابرہ کے ساتھ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا کردار ادا کیا۔ ایک بار پھر اس جوڑی کو فلم بینوں نے پسندیدگی اور پذیرائی سے نوازا۔ ایاز کی اس کامیابی کو فلمی پنڈتوں نے ایاز سے زیادہ بابرہ کا کمال بتایا۔ ان کا یہ کہنا غلط بھی نہیں تھا۔ بابرہ ایسی ہیروئن تھیں جو ہر انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہو جاتی تھیں۔ ہیرو منجھا ہوا پختہ کار ہو یا نیا اداکار ہو بابرہ شریف کی سنگت اسے پسندیدہ بنا دیتی تھی۔ یہ خصوصیت بہت کم اداکاراؤں میں ہوتی ہے۔ بابرہ اس سلسلے میں سرفہرست تھیں۔ جہاں انہوں نے اپنے سے سینئر ہیروز کے ساتھ جم کر اور پُر اعتماد انداز میں اپنی فنکارانہ خوبیوں کا مظاہرہ کیا وہاں نئے ہیروؤں کے ساتھ بھی ایسی کردار نگاری کی کہ ان کی پرفارمنس کو بھی یادگار بنا دیا۔ فلم ساز و ہدایت کار بابرہ کی اس خداداد خوبی سے بخوبی واقف تھے اس لیے اس کے مقابل نئے ہیروز کو بھی کاسٹ کر لیتے تھے۔

ہدایت کار جان محمد کی فلم ''ٹینا'' 11 نومبر 1983ء کو سنیماؤں کی زینت بنائی گئی۔ اس فلم میں بابرہ کے مقابل فیصل الرحمٰن ان کے ہیرو تھے۔ جونیئر ہیرو ہونے کے باوجود اس فلم نے بھی شاندار کامیابی حاصل کی۔

''ٹینا'' کی نمائش کے چند ہفتے بعد 23 دسمبر 1983ء کو ہدایت کار شمس چوہدری کی فلم ''بدلتے رشتے'' ریلیز ہوئی مگر کمزور کہانی اور غیر معیاری ہدایت کاری کی وجہ سے متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اگلے برس عیدالفطر کے موقع پر 30 جون 1984ء کے دن لاہور کے رتن سنیما میں بابرہ شریف کی نئی فلم ''مس کولمبو'' ریلیز ہوئی۔ یہ میڈم شمیم آراء کی مس سیریز کی نئی فلم تھی۔ اس فلم میں بھی فیصل، بابرہ کے ہیرو تھے۔ بابرہ شریف نے اس فلم میں ہر طرح کی کردار نگاری کر کے مقبولیت کا نیا سنگ میل عبور کیا۔ بابرہ شریف ورسٹائل اداکارہ کے طور پر تو پہلے ہی تسلیم کی جا چکی تھیں۔ اس فلم میں انہوں نے اپنی اداکاری کا کچھ نیا رنگ روپ بھی دکھا کر اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ جس کے نتیجے میں بابرہ کو اس فلم میں سال کی بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا تھا۔ جاوید شیخ اور کویتا نے ''مس کولمبو'' میں ثانوی کردار ادا کیے تھے مگر یہ بھی بہت اہم کردار تھے۔ ایم اشرف کی دھنوں میں کمپوز کیے ہوئے گیتوں نے بھی اس فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس فلم کے بعد بابرہ شریف کی فلمیں ہیرو، مہک اور پروانہ نمائش کے لیے پیش کی گئیں لیکن جس فلم نے ایک بار پھر دھوم مچائی وہ مس سیریز کی اگلی فلم ''مس سنگاپور'' تھی۔ اس فلم میں بھی فیصل بابرہ کے ساتھ بطور ہیرو پیش ہوئے تھے۔ ایک بار پھر عوام کا وہی رش تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ زمانہ صرف اور صرف بابرہ شریف کا تھا۔ یہ فلم عیدالفطر کے دن 30 جون 1985ء کو ریلیز ہو کر سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس کی موسیقی بھی ایم اشرف کی تھی جسے بہت پسندیدگی حاصل ہوئی تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ اسی عید کے دن بابرہ شریف کی ایک اور کامیاب ترین فلم ''ہانگ کانگ کے شعلے'' بھی ریلیز ہوئی۔ یہ ہدایت کار جان محمد کی فلم تھی۔ جان محمد عام طور پر عید بقرعید کے موقع پر اپنی نئی فلم پیش کرنے کے حوالے سے بہت مشہور تھے۔ ایک ہی دن بابرہ شریف کی دو فلمیں زیرِ نمائش ہوئیں اور دونوں نے کامیابی کے پرچم لہرائے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ''ہانگ کانگ کے شعلے'' میں جاوید شیخ نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس فلم کو بابرہ شریف کے فنی کیریئر کی ایک یادگار فلم تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں فلمیں نمائش پذیر تھیں کہ عیدالاضحیٰ کے دن 27 اگست 1985ء کو ہدایت کار نذرالاسلام دادا کی نئی فلم ''دیوانے دو'' ریلیز ہوئی۔ ندیم اور بابرہ نے اس میں مرکزی رومانوی کردار اس خوبی کے ساتھ ادا کیے تھے کہ دیکھنے والے ان کے دیوانے ہو گئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دادا کے بھی یہ دونوں پسندیدہ فنکار تھے۔ ''دیوانے دو'' نذرالاسلام کی شاندار ہدایت کاری کا نمونہ تھی جس میں ایک بار پھر ندیم اور بابرہ شریف فن کی بلندیوں پر نظر آئے۔ ایم اشرف کی نغمہ بار موسیقی نے بھی فلم بینوں کی دیوانگی میں اضافہ کیا۔

☆ او ساتھی رے پیار کریں گے

☆ بچ بچ کے میں کہاں جاؤں گا

☆ بھیگی بھیگی برسات آئی

☆ جو پیار کرتے ہیں

جیسے گیتوں نے اس دور میں بھی مقبولیت حاصل کی اور آج بھی ان کی پسندیدگی میں کمی نہیں آئی ہے۔

کامیابی کا یہ سفر پلکوں کی چھاؤں میں، خون اور پانی، حق مہر، بے قرار، قاتل کی تلاش، مس بنکاک (جس میں بابرہ کو بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا)، ایک ہی راستہ، قسم منے کی، مس قلوپطرہ، گریبان، کندن (نگار ایوارڈ برائے بہترین اداکارہ)، دنیا، دیوار، سن آف ان داتا، لیڈی اسمگلر، لو ان لندن، میرا انصاف، چکر، ڈاکو کی لڑکی اور باغی حسینہ کی صورت میں جاری و ساری رہا اور بابرہ شریف مقبولیت کے نئے زینے طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

ندیم نے جب ذاتی پروڈکشن میں فلم بنانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے پنجابی فلم کا انتخاب کیا۔ فلم کا نام ''مکھڑا'' رکھا اور ہدایت کاری کی ذمہ داری اقبال کاشمیری کو سونپی۔ اس فلم کے لیے بھی ندیم نے بطور ہیروئن بابرہ شریف ہی کو سائن کیا کیونکہ اب وہ ان کی اوّلین پسند تھیں۔ اس فلم میں بابرہ شریف کا کردار ایک انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کا تھا۔ ''مکھڑا'' میں بابرہ شریف نے جہاں ایک رومانوی ہیروئن کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا وہاں وہ کچھ مناظر میں مار دھاڑ سے بھرپور ایکشن میں بھی نظر آئیں۔ یہ سب کچھ فلم ساز و ہدایت کار نے پنجابی فلم بینوں کے موڈ اور مزاج کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا۔ بابرہ شریف نے زبردست ایکشن کا مظاہرہ کر کے پنجابی فلمیں دیکھنے والوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ''مکھڑا'' عیدالاضحیٰ کے دن 25 جولائی 1988ء کو ریلیز ہونے والی سپرہٹ فلم ثابت ہوئی اور پنجابی سینما پر بھی بابرہ شریف کے چرچے ہونے لگے۔ وہ اردو فلموں کی ایسی ہیروئن تھیں جنھیں پنجابی فلموں میں بھی زبردست کامیابی حاصل ہونے لگی۔

بابرہ شریف کو ان کی شاندار فنی خوبیوں کی وجہ سے ہند و پاکستان کی پہلی سائنس فکشن فلم ''شانی'' میں بھی اداکاری کے جوہر دکھانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سعید رضوی برصغیر کی اس پہلی سائنس فکشن فلم کے ہدایت کار، کیمرا مین اور وژول ایفکٹس کے خالق بتاتے ہیں کہ فلم میکنگ کے دوران بابرہ شریف نہایت انہماک اور دلچسپی کے ساتھ نئی تیکنیک کا مشاہدہ کرتیں۔ اس فلم سے ان کو جذباتی وابستگی تھی۔ عام ڈگر سے ہٹی ہوئی اس فلم میں بھی بابرہ شریف کی کردار نگاری قابلِ ستائش تھی۔ شیری ملک اور محمد علی کے ساتھ انہوں نے شاندار اداکاری کی۔

سعید رضوی کہتے ہیں۔ ''شانی'' کے پوسٹ پروڈکشن کے دوران اکثر اوقات لیبارٹری میں آکر بابرہ شریف اسپیشل ایفکٹس کا مشاہدہ کرتیں۔

یہ فلم ہر ایک کی توقعات پر پوری اتری اور زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

''شانی'' کے بعد ریلیز ہونے والی بابرہ شریف کی فلم ''کرائے کے قاتل'' باکس آفس پر کامیابی سے محروم رہی۔ اس کے بعد ہدایت کار شمیم آراء کے ساتھ بابرہ شریف کی ایک اور فلم ''لیڈی کمانڈو'' منظر عام پر آئی۔ یہ فلم 15 ستمبر 1989ء کے دن ریلیز ہوئی اور بابرہ شریف اور شمیم آراء کی ایک ساتھ آخری فلم ثابت ہوئی۔ یوں ''بھول'' سے شمیم آراء کے ساتھ بابرہ شریف کا جو فنی سفر شروع ہوا تھا وہ لیڈی کمانڈو پر آکر اختتام پذیر ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بابرہ شریف کے کیریئر میں شمیم آراء نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

''لیڈی کمانڈو'' کے بعد بابرہ شریف ایک بار پھر جس فلم میں فن کی بلندیوں پر نظر آئیں وہ ہدایت کار محمد جاوید فاضل کی ''ضد'' تھی۔ ندیم اور غلام محی الدین کے ساتھ بابرہ شریف نے کردار نگاری کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ دیکھنے والی نگاہیں حیران رہ گئیں۔ اس ٹرائی اینگل نے اس فلم کو بے حد شہرت بخشی۔ تینوں کی سپر پرفارمنس نے ''ضد'' کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا جب کہ بابرہ شریف کے کیریئر میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔

بیس سال سے جاری مسلسل عروج کی یہ داستان راز، خواہش، سرکٹا انسان، پیاسا ساون، گھائل پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

اردو فلموں کے ساتھ ساتھ بابرہ شریف نے کچھ پنجابی فلموں میں بھی اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ''میرا ناں پاٹے خاں'' جس میں ان کے ہیرو منور ظریف تھے۔ بابرہ جتنی بڑی فنکارہ ہیں اتنا ہی ان کا دل بڑا ہے۔ ایک پنجابی فلم ''زیاٹا'' کی آمدنی فلموں میں ایکسٹرا اداکاروں کی حیثیت سے کام کرنے والوں اور فائٹرز کی امداد کے لیے وقف کردی گئی تھی۔ بابرہ شریف نے اس فلم میں بغیر کسی معاوضے کے اداکاری کے جوہر دکھا کر فلم نگری کے تمام لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ یہ اور ایسے کئی واقعات ہیں جو اس بڑی اداکارہ کی اعلیٰ ظرفی کے ثبوت ہیں۔

بابرہ شریف نے مختلف فلموں میں جو کردار ادا کیے

ہیں اگر ان کے بارے میں قارئین کو نہ بتایا جائے کہ وہ کیسے کردار تھے اور بابرہ نے انہیں کس فنی مہارت اور خوبی سے ادا کیے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

"میرا نام ہے محبت" میں انہوں نے نوشی کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ محبت اور قربانی کے جذبے سے سرشار ایک معصوم اور پاکیزہ لڑکی کا کردار تھا جسے انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں اس خوش اسلوبی سے نبھایا تھا جو ان کے فنی کیریئر کا سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کردار میں جب وہ اسکرین پر اداکاری کرتے ہوئے نظر آئیں تو دیکھنے والی بے شمار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس فلم میں انہوں نے حزن و ملال کی عکاسی، جذبات اور احساسات کی دل میں اتر جانے والی نقشہ کشی، مکالموں کی ادائیگی، آنکھوں اور چہرے کے ایسے تاثرات پیش کیے جنہیں لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

بابرہ شریف نے نوشی کے کردار سے ملتا جلتا ایک کردار شفق کا بھی ادا کیا تھا۔ یہ شفق فلم "مہمان" کا کردار تھی۔ بابرہ شریف نے شفق کے کردار کو اپنی فنکارانہ مہارت سے کچھ اس طرح سے ادا کیا کہ دونوں کرداروں میں مماثلت ہونے کے باوجود ان میں مختلف رنگ بھرنے میں کامیاب رہیں۔ ان کی اداکاری میں یہی وہ عنصر ہے جس نے انہیں ایک بڑی اور سچی فنکارہ کا امیج دیا۔ "میرا نام ہے محبت" کی نوشی نے وفا اور محبت کو اس پاکیزگی کا رنگ دیا جو اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کردار میں وہ محبت کی عظمت اور بلندیوں کو چھوتی ہوئی بلند تر نظر آتی ہیں جب کہ "مہمان" کی شفق کے حسن میں ایک نیا اضافہ ہے۔

اسی طرح فلم "شمع" کی ماڈرن عشرت اور فلم "نوکر" کی آزاد خیال فری کے کرداروں میں یکسانیت کے باوجود بابرہ کی عمدہ اور دلکش اداکاری کی وجہ سے جداگانہ رنگ میں نظر آتے ہیں۔

اور پھر فلم "تلاش" کی پروین کے بارے میں غور کیجیے جو ایک حادثے کے نتیجے میں اپنے والدین اور بہنوں سے بچھڑ گئی تھی اور ایک قوال گھرانے میں پرورش پا کر جوان ہوتی ہے تو وہ اپنے مشرقی حسن اور ترنم خیز آواز سے فلم دیکھنے والوں کو متاثر کرتی نظر آتی ہے۔ دیکھنے والے پروین قوالن کے جلوؤں کی تاب نہ لا کر دل تھام کر رہ جاتے تھے۔ یہ ایک سنجیدہ کیریکٹر تھا جس کے وقار کو آخر وقت تک بابرہ نے احسن طریقے پر ادا کیا لیکن جب وہ فلم "وقت" میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو ان کا کردار بالکل مختلف ہوتا ہے۔

اس فلم کی ثریا ایک شوخ اور چنچل روپ میں سامنے آتی ہے اس کی شوخیوں اور شرارتوں سے پورا محلہ تنگ رہتا ہے۔ جن لوگوں نے "تلاش" کی پروین قوالن کے روپ میں بابرہ کو دیکھا تھا انہیں بابرہ کو "وقت" کی ثریا کے روپ میں دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی اداکارہ ہے۔ بظاہر یہ عام سا اور روایتی کردار تھا مگر بابرہ نے اسے نہایت عمدگی سے ادا کر کے اپنی ورسٹائلٹی کا ثبوت دیا تھا۔

اگر فلم "دیکھا جائے گا" میں بابرہ کے کردار عاشی کا تجزیہ کیا جائے تو اس رول میں بھی وہ ایک نئے رنگ میں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک دولت مند باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ہیں۔ ایک پُراعتماد ماڈرن لڑکی ہیں جو بڑی ذہین ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے اچھے برے کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر زبان کے ساتھ ہاتھ پیروں کا استعمال بھی بڑی مہارت سے کرتی ہیں۔ وہ جوڈو کراٹے کی بھی ماہر ہیں۔ مردوں کے خلاف بننے والی ایک انجمن کی وہ سرگرم رکن ہیں لیکن ایک دن جب اس کا دل محبت سے آشنا ہوا تو انہوں نے اپنے محبوب سے برملا اس محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

☆ پیار کبھی کرنا نہ کم مرجائے گی تیری عاشی

عاشی کے اس مختلف النوع کردار کو بابرہ شریف نے ایسی فنکارانہ مہارت کے ساتھ ادا کیا کہ اسی نام عاشی سے ایک فلم بنائی گئی اور اس کے لیے بھی بابرہ شریف ہی کا انتخاب کیا گیا مگر یہ عاشی "دیکھا جائے گا" کی عاشی سے قدرے مختلف تھی۔ "عاشی" کی عاشی بھی ایک امیر گھرانے کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی ہے مگر بچکانہ ذہنیت کی مالک ہے۔ اس کی شرارتوں سے سارا خاندان تنگ رہتا ہے۔ یہ عاشی جوان ہونے کے باوجود بچی تھی۔ اس کی حرکتوں کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے تو یہ کہنا شروع کر دیا۔

"اس لڑکی پر تو کسی جن بھوت کا سایہ ہے۔"

اس کے والدین اس کی شادی کی فکر کر رہے تھے کہ شاید شادی کے بعد وہ سدھر جائے مگر وہ تو شادی کے معنی سے بھی ناآشنا تھی۔

"دیکھا جائے گا" اور "عاشی" دو مختلف فلمیں تھیں۔ دونوں کی ہیروئن دو مختلف موڈ مزاج اور عادتوں کی مالک تھیں۔ مگر یہ دونوں کردار ایک ہی بابرہ شریف نے ادا کیے تھے اور اس طرح ان کی ادائیگی کی تھی کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں تھے۔

وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں One and only تو بابرہ شریف اس کی مکمل تصویر ہیں۔ ان کی ایسی خوبیوں کی اگر مکمل تصویر کشی کی جائے تو ایک کتاب اس کی متقاضی ہوگی اسی لیے ہم ان کی چند فلموں کا ہی ذکر کریں گے۔

فلم ''نشیمن'' میں بابرہ کا کردار ایک مظلوم لڑکی ثمینہ کا تھا۔ وہ اپنے نانا کی لاڈلی تھی۔ ثمینہ کو نانا کی نسبت سے ایک بہت بڑی جایداد ملی تھی اور یہی جایداد اس کی بربادی اور خرابی کا ذریعہ بننے والی تھی۔ اس کے ظالم چچا اور سوتیلی چچی نے دولت کے لالچ میں اسے طرح طرح سے اذیتیں دیں۔ اپنے پاگل بیٹے سے اس کی شادی کا منصوبہ بنایا تو ثمینہ نے اس عذاب سے بچنے کا ایک ہی راستہ سمجھا، گھر سے فرار ہونے کا راستہ۔ گھر سے فرار ہوکر وہ حیدر آباد پہنچی مگر ثمینہ کے روپ میں نہیں شمشاد چشتی کے بھیس میں۔ اسے علم تھا کہ تنہا لڑکی کے ساتھ ہمارے معاشرے میں کیا سلوک کیا جاتا ہے اس لیے وہ لڑکے کے بھیس میں حیدر آباد پہنچی اور ایک ہمدرد کا سہارا لیا۔ ''نشیمن'' میں بابرہ کے یہ دو متضاد کردار اپنی اپنی جگہ اس قدر جاندار تھے کہ جس نے بھی دیکھا داد دیے بغیر نہ رہا۔ ایک مظلوم اور بے بس لڑکی کا کردار اور ایک لڑکے کا پُراعتماد کردار۔ بابرہ شریف نے دونوں کی کردار نگاری میں جس فنی مہارت کا ثبوت دیا وہ بلاشبہ قابلِ ستائش ہے۔

ڈبل رول کی بابرہ کی ایک فلم ''شبانہ'' بھی تھی جس میں اس نے دو بہنوں شبانہ اور فرزانہ کے کردار کیے تھے۔ بڑی بہن فرزانہ اپنے گھر والوں کی کفالت کے لیے ملازمت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس دوران اسے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کے لیے مردوں کے معاشرے میں روزی روٹی کمانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ قدم قدم پر چمکتے چہروں کے پیچھے سیاہ کرتوت کے سیاہ لوگ موجود ہوتے ہیں۔ ایسوں سے وہ اپنے آپ کو بہت بچاتی ہے مگر ایک موقع پر دھوکا کھا جاتی ہے۔ ایک دھوکا باز شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اسے (فرزانہ کو) دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ ہوس پرست اس کی زندگی تباہ کر کے اس کی ناموس کا لٹیرا ثابت ہوتا ہے۔ چھوٹی بہن شبانہ کو جب بہن کی بربادی کا علم ہوتا ہے تو وہ دھوکے باز ہوس کے پجاری سے انتقام لینے کی ٹھانتی ہے اور فرزانہ بن کر اس ظالم سے اپنی بے گناہ بہن کا انتقام لیتی ہے۔ یہ کردار نیا تھا مگر زندگی سے قریب تر تھا۔

بابرہ جہاں فرزانہ کے کردار میں مظلوم نظر آتی ہے وہیں شبانہ کے روپ میں ایک ایسی قوت بن کر سامنے آتی ہے جس میں ظلم سے ٹکرانے کا حوصلہ تھا۔ ان دونوں کرداروں میں بابرہ شریف فن کی ان بلندیوں پر نظر آئیں جہاں تک بہت کم فنکار پہنچ پاتے ہیں۔ شبانہ کا روپ بابرہ کا ایک ایسا تعارف ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فلم ''شبانہ'' میں دو بہنوں کی سپر پرفارمنس سے متاثر ہوکر انہیں (بابرہ کو) ایک اور فلم ''بیٹی'' میں بھی ان کو دو بہنوں کے ڈبل رول میں پیش کیا گیا۔ یہ دو کردار عائشہ اور شائستہ دو بہنوں کے تھے۔ فلم ''بیٹی'' کی کہانی میں یہ دونوں کردار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں کرداروں میں بابرہ بہت دلکش نظر آئیں۔ دو مختلف طبیعت کی لڑکیوں

حافظ شیرازی کا گلزار منقبت

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی عرف عالم میں حافظ شیرازی اور ''لسان الغیب'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت 726ھ مطابق 1326ء میں شیراز (ایران میں ہوئی۔ فارسی شاعری میں ان کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ غزل کی وادی میں حافظ شیرازی منفرد نظر آتے ہیں۔ آج تک کوئی شاعر غزل گوئی میں ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا۔ آپ حافظ قرآن بھی تھے، اکثر فرصت کے اوقات میں رموزِ قرآنی بیان کرتے تھے۔ ''تفسیر کشاف'' کا حاشیہ آپ نے لکھا ہے۔ دیوانِ حافظ آپ کی یادگار ہے۔ ذی علم حضرات آپ کے دیوان سے امور دینی اور دنیوی میں فال نکالتے ہیں اور کافی جواب پاتے ہیں۔ آپ پر علم ظاہر و باطن کھلا ہوا تھا خصوصاً علم قرآن میں آپ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ نے 791ھ مطابق 1389ء میں بعہد شاہ منصور بن شاہ مظفر وفات پائی۔ ''خاک مصلیٰ'' آپ کی تاریخ وفات کا مادہ ہے۔ آپ کا مزار شیراز (ایران) میں ہے۔ حافظ شیرازی کا دیوان فرانس، جرمنی، انگلینڈ، ترکی، ہندوستان تقریباً دنیا کے تمام ملکوں میں مقبول ہے اور دنیا کی مشہور زبانوں میں دیوان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مرسلہ: حشمت شیرازی، ملتان

کی کردار نگاری میں حیران کن مظاہرہ کیا۔
بابرہ کی کردار نگاری کی ایک اور شاہکار فلم ''پہلی نظر'' تھی جس میں انہوں نے سلمٰی کا کردار پلے کیا تھا۔ اس کردار پر پہلی نظر پڑتے ہی تہذیب و تمدن کا وہ رنگ نظر آتا ہے جو تحریکِ پاکستان کے دور کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ سلمٰی دہلی کی رہنے والی ایک ایسی دوشیزہ ہے جو مشرق کی اس ثقافت کی نمائندہ ہے جس پر کبھی مسلم گھرانے فخر کیا کرتے تھے۔ اپنے اس کردار میں بابرہ نے اپنی ذہانت اور صلاحیت سے ایسا مشاق مظاہرہ کیا کہ وہ فلم کے ہر منظر میں خالص دہلی والی لگیں۔ خاص طور پر اس کردار میں ان کا کلچرل لباس اور اندازِ تکلم، اس قدر نستعلیق تھا کہ ہم گویا انہیں دیکھتے وقت اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جب ہندوستان میں مسلم گھرانے اور ان کی تہذیب ایک مثال تھی جس کی ایک جھلک سلمٰی کے کردار میں نظر آتی ہے۔ ''پہلی نظر'' کی مسلم گھرانے کی نمائندہ تہذیب، برقع پوش سلمٰی سے ملنے کے بعد آپ کی ملاقات فلم ''پیار کا وعدہ'' کی کرسچن فیملی سے تعلق رکھنے والی ڈمپل سے کرواتے ہیں۔ ڈمپل خوب صورت سیاہ اور گھنے بالوں والی لڑکی ہے۔ اس کردار میں بابرہ ایثار و قربانی کے مجسم پیکر نظر آتی ہیں پیار کا وعدہ نبھانے میں وہ جن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرتی ہیں وہ بہت تکلیف دہ ہیں۔ ایک عیاش سوداگر کے ہاتھوں اپنے خوب صورت بالوں کی کٹنگ کروا دیتی ہیں۔ یہ سودا وہ اپنے محبوب کی جان بچانے کے لیے کرتی ہیں۔ اس چویشن میں ان کی اداکارانہ مہارت، چہرے کے تاثرات اور قلبی احساسات قابلِ دید ہیں۔
ڈمپل کی طرح انگریز لڑکی کا کردار بابرہ شریف نے فلم ''خدا اور محبت'' میں بھی کیا ہے۔ اس فلم میں ان کا کردار ریٹا کا ہے جو مغربی تہذیب اور ماحول میں پیدا ہوئی ہے جو پاکستان آنے کے بعد اسلام کے آفاقی پیغام سے متاثر ہو کر اس مذہب کی طرف راغب ہوتی ہے۔ ان حالات میں وہ ہر زاویے سے پروقار اور آئیڈیل نظر آتی ہے۔ ریٹا کے کردار میں بھی بابرہ شریف نے اس کردار کو یادگار بنا دیا ہے۔
ان کی فنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے ایک اور فلم ''ماضی حال مستقبل'' بنائی گئی جس میں انہیں ''جینا'' کے کردار میں پیش کیا گیا۔ یہ فلم ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کو تقدیر والدین سے دور کر کے ایک ایسے ماحول میں پہنچا دیتی ہے جہاں عورت کو ایک کھلونا سمجھا جاتا ہے۔

گناہوں کی دلدل میں پھنسی جینا مرنا چاہتی ہے شاید وہ اپنے اجلے جسم پر لگے ہوئے داغ دھونا چاہتی ہے۔ یہ وہ کردار تھا جس کی گہرائی اس کھوکھلے معاشرے کو جھنجوڑنے کے لیے کافی تھا۔ بابرہ اس کردار میں کنول کے پھول کی طرح نظر آئیں جس کی جڑیں معاشرے نے ہوس پرستی کے کیچڑ اور گندے پانی میں ڈبودی ہوں۔ اس کے باوجود جینا کا سر مقدس، شفاف، عصمت اور پاک بازی کا ایک چراغ بن کر گناہوں کے ماحول میں روشنی کا مینار ہے۔ فلم کی کہانی اگر جاندار ہو، اس کے کردار پاورفل ہوں تو فلم کی کامیابی یقینی ہوتی ہے اور اگر ان کرداروں کو پرفارم کرنے والے فنکار بابرہ شریف جیسے ماہر اور باصلاحیت ہوں تو فلم یادگار بن جاتی ہے۔
بابرہ شریف نے فلم ''پلے بوائے'' میں ساحرہ کا کردار بھی اسی انداز میں پلے کیا ہے کہ یہ فلم بھی یادگار بن گئی ہے۔ ساحرہ کا یہ کردار بھی بھرپور مشرقی رنگ میں اپنی کشش برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ساحرہ کی معصومیت اور پاکیزگی نے یورپ کے مغرب زدہ ماحول میں رہنے والے خاوند کو بالآخر سچا اور سیدھا راستہ دکھا دیا۔ ساحرہ کے مشرقی کردار کی مغربی کرداروں پر برتری نے اس کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اسے بے نظیر بنا دیا ہے۔
فلم سازوں نے بابرہ شریف کو زیادہ تر مشکل اور دشوار کرداروں میں آزمایا۔ ایسا ہی ایک مشکل کردار فلم ''سلاخیں'' میں اسے دیا گیا۔ اس فلم میں اس کا کردار ایک ایسے باپ کی بیٹی کا ہے جس کا مقدر سلاخیں (جیل) ہے۔ اس فلم کی کہانی میں اس کا کردار کرن کا ہے مگر وہ ایسی کرن ہے جو اندھیروں میں بھٹکتی رہی ہے تقدیر کی ستم ظریفی۔ لوگوں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی کرب ناک داستان سناتی ہے۔ کرن اپنے باپ کی لاڈلی ہے جس سے پیار کا ایسا ناتہ ہے کہ صورت دیکھ کر دل کو چین آتا ہے۔ باپ کا مقدر سلاخیں کیا بنیں کہ کرن طوفانوں کے بھنور میں پھنس گئی۔ وقت گزرتا گیا باپ کی سزا میں اضافہ ہوتا گیا۔ باپ سے جدائی کے بعد ایک حادثے میں اس کا مزدور اور محنت کش شوہر بھی اس سے چھن گیا جس کے بعد وہ اپنی ننھی بچی عابدہ کو لے کر عزت کی روٹی کمانے کے لیے فیکٹری ورکر بن کر محنت کرتی رہی کہ اسی دوران ایک ہوس پرست نے اس کی عصمت کو داغدار کر کے اسے ہوٹلوں کی زینت بنا دیا۔ جہاں پہنچ کر وہ کرب سے چیخ پڑی۔

☆میں بھی ایک شریف تھی۔ ہاں مگر غریب تھی

غربت اس کا جرم تھا جس کی سزا اس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کی لیکن جب اس کی معصوم بیٹی پر ظالموں نے ظلم کرنا شروع کیا تو وہ ان ظالموں کے خلاف فولاد کی دیوار بن گئی۔ قدرت کو کرن اور عابدہ کی حالت پر رحم آیا کرن کو اس کا بچھڑا ہوا باپ مل گیا اور عابدہ کو نانا جان۔

بابرہ شریف نے اس فلم میں بیٹی، بیوی اور ماں کے تین مختلف کردار بے حد اداکارانہ مہارت سے ادا کیے اور عورت کے وقار کو نہ صرف بلند کیا بلکہ ایک بڑے مقصد کی ادائیگی کی راہ دکھائی۔ یاد رہے کہ یہ وہی فلم ہے جس میں بابرہ شریف کو اداکاری کرتے دیکھ کر برصغیر کے لیجنڈ فنکار دلیپ کمار نے ان کے ساتھ اداکاری کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مشکل کرداروں کی ادائیگی اس کی ڈیمانڈ کے مطابق کرنا ہی کیا کم دشوار ہوتا ہے کہ ان میں اس قدر جان ڈال دینا کہ وہ امر ہو جائیں یادگار بن جائیں۔ عظیم فنکاروں ہی کا کارنامہ ہوتا ہے۔ بابرہ ایسی ہی ایک مہان فنکارہ تھیں اور آج بھی ہیں۔

''سلاخیں'' کی طرح بابرہ شریف نے ایک فلم ''زندگی'' میں بھی عورت کے خوب صورت روپ کی بڑی خوب صورت عکاسی کی ہے اور فن اداکاری کے جید نقادوں سے خراج حاصل کیا ہے۔ ''زندگی'' میں بابرہ کا پہلا روپ ایک کمسن اور نادان حسینہ کا ہے جو سنگاپور کی حسین لوکیشن میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہے یہاں تک کہ جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تب بھی وہ کمسن ہی رہتی ہے۔ اس کردار کو انہوں نے کمال فن سے ادا کیا ہے۔ لڑکی سے عورت اور عورت سے ماں کا سفر طے کرنے میں جن فنی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کردار میں انہوں نے عمدہ کردار نگاری کے انمٹ نقوش قائم کیے۔ ان کا اثر آج بھی ذہنوں پر موجود ہے۔ ماں بننے کے بعد وہ ایک گھریلو عورت کے روپ میں اپنے گلشن کی آبیاری کرتی نظر آئیں۔ پھر ایک موقع پر ایک ظالم اور سفاک درندے نے اس گلشن پر غم کی بجلی گرادی۔ ایک ماں سے اس کا بیٹا چھین کر اسے موت کی وادیوں میں پہنچا دیا۔ ماں کی تو جیسے دنیا ہی اجڑ گئی۔ اسے دفنانے کے منظر میں جس فطری اداکاری کا مظاہرہ بابرہ نے کیا اسے دیکھ کر ہر ماں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ بابرہ اپنے اس کردار میں بیٹے کی جدائی میں ذہنی دکھوں اور غموں کا ایسا تاثر دیتے ہوئے نظر آئیں کہ خود وہ کردار ایک سراپا المیہ بن کر اور زیادہ نمایاں ہو کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اقرار اور علامت بن جاتا ہے۔ ناقدین اور مبصرین کا خیال ہے کہ ''زندگی'' کے اس کردار کو بابرہ شریف کے علاوہ کوئی دوسری اداکارہ نہیں کر سکتی تھی۔ دادا نذرالاسلام کو بابرہ کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا جبھی انہوں نے یہ دشوار ترین کردار بابرہ سے کرایا تھا۔

''صائمہ'' بھی بابرہ شریف کی فنی عظمت سے مرصع ایک فلم ہے۔ اس فلم میں وہ فکر و دانش، علم و فہم، انسانی مساوات کی علمبردار کے روپ میں نظر آتی ہیں اور عوامی امنگوں پر پوری اترتی ہیں۔ اس فلم میں ان کا نام صائمہ ہے اور وہ ایک فلاحی خدمت گار اور عوام دوست کے آفاقی جذبات کی غمازی کرتی نظر آتی ہیں۔ فلم بینوں نے انہیں ان کے اس روپ میں بھی پسند کیا اور ان کی کامیاب کردار نگاری کی وجہ سے فلم کو بھی کامیابی کا اعزاز حاصل ہوا۔

فلم ''مہربانی'' میں بابرہ شریف کو ایک شوخ و چنچل لڑکی کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے جو اپنے خوابوں کے شہزادے کی تلاش میں گھر سے نکلتی ہے۔ اس فلم میں ان کا نام شبانہ ہے۔ اس کردار میں بابرہ نے ایک بار پھر دل موہ لینے والی اداکاری کر کے شائقین کے دل مسخر کیے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بابرہ شریف کو جس اعتماد کے ساتھ کاسٹ کیا گیا تھا اس پر وہ پوری نہ اترتیں؟ اور فلم کی کامیابی کا سبب نہ بنتیں۔

''لاجواب'' بھی بابرہ کی اداکاری کے حوالے سے ایک لاجواب فلم تھی جس میں انہوں نے ایک امیر گھرانے کی دو بیٹیوں کا ڈبل کردار ادا کیا تھا اور دو مختلف موڈ مزاج اور عادتوں کے کردار کو اس مشاقی سے ادا کیا تھا کہ دیکھنے والے حیران پریشان ہو گئے کہ یہ کیسی جادوگری ہے کہ دونوں کرداروں کو اس خوبی کے ساتھ ادا کیا۔ روبیا اور عذرا کے دو متضاد لڑکیوں کی کردار نگاری جس خوبی سے بابرہ شریف نے کی اس تناظر میں فلم کا نام ''لاجواب'' سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

بابرہ شریف کے عروج کا دور ہماری فلم انڈسٹری کے عروج کا بھی دور تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک فلم میکرز منفرد کہانیوں پر اچھوتی فلمیں بنانے کی کوشش کرتے تھے اور اپنے دور کے باصلاحیت فنکاروں سے نت نئے اچھوتے کرداروں پر اداکاری کرواتے تھے۔ اسی دور کی ایک فلم ''سنگدل'' بھی ہے جس میں بابرہ شریف کو بھی ایک چیلنجنگ

کردار میں پیش کیا گیا۔ یہ کردار روشنی کا ہے جو ایک کلب ڈانسر ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہر کوئی بے چین تھا۔ جب وہ مغربی لباس میں کلب میں جلوہ گر ہو کر، ڈسکو دیوانے کی دھن پر محو رقص ہوتی تو فضا رنگین اور سنگین ہو جاتی۔ ایسے میں جہاں جوان جذبات میں ہلچل مچ جاتی تھی وہاں ایک دن ایک انوکھی بات دیکھنے میں آئی۔ دو معصوم بچے بھی اس پر فریفتہ ہو گئے۔ بچے جو خود پیارے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جب ایسے بچے کسی بڑے کو دل دے بیٹھیں تو ذرا سوچیے یہ مسئلہ کتنا گھمبیر ہو سکتا ہے۔ دو پیارے پیارے بچے جب ڈسکو ڈانسر روشنی کی چاہت میں بری طرح مبتلا ہو گئے تو وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے بچے جذبات سے آگاہ کر دیا۔ اپنانے کا اظہار کر دیا۔

''ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

''بس آپ ہماری ممی بن کر ہمارے گھر آ جائیں۔''

روشنی کی طرح ان کے پپا بھی حیران اور پریشان تھے کہ ان بچوں کی یہ کیسی ضد ہے؟ کیسی خواہش ہے؟ دونوں بڑوں نے دونوں چھوٹوں کو بہت سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر بچوں کی ضد کے آگے آخر کار دونوں بڑوں کو مجبوراً ہار ماننی پڑی۔ بالک ہٹ کی فتح ہو گئی اور کلب میں ناچنے والی رقاصہ ان بچوں کی ماں بن کر ان بچوں کی محبت پر قربان ہو گئی۔ یہ بڑی مشکل اور پیچیدہ چویشن تھی۔ ایک طرف ہنگامہ خیز زندگی۔ دوسری طرف ایک عام گھریلو عورت بن کر بچوں اور ان کے باپ کو خوش رکھنا۔ بابرہ شریف نے اس الجھے ہوئے کیریکٹر کو جس طرح پرفارم کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ وہ دونوں مناظر میں دیکھنے والوں کو اپنی اداکاری سے متاثر کرتی ہے۔ کلب میں ڈانسر کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریوں میں کوئی کمی آنے نہیں دیتی اور گھر میں بیوی اور بچوں کی ماں بن کر بھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی۔

بابرہ کا ایک منفرد روپ ''ایک دن بہو کا'' میں بھی نظر آتا ہے۔ اس فلم میں ان کا کردار نشاط بیگم کا ہے۔ جس میں وہ ایک ایسے گھر کی بہو بنتی ہیں جہاں ساس، نند اور خاندان کی دیگر عورتوں کا ظلم اپنی انتہا پر ہوتا ہے۔ گھر کی بڑی بہو کو ان لوگوں نے نوکرانی بنا رکھا ہے۔ جب یہی سلوک چھوٹی بہو نشاط کے ساتھ کرنا چاہا تو نشاط نے انہیں ایسا سبق سکھایا کہ گھر کے تمام لوگ انسان بن گئے اور رشتوں کو اہمیت دینے لگے۔

بابرہ شریف کے کچھ کردار ایسے بھی ہیں جن میں وہ بے باک، نڈر اور دلیر لڑکی کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی مس سیریز کی فلمیں قابل ذکر ہیں۔ ''مس ہانگ کانگ'' کی جوڈو کراٹے اور فائٹ کی ماہر ٹینا جو ایک جانباز اور محب وطن بہادر لڑکی ہے جو اپنے ملک کے دشمنوں کے لیے موت ہے تو دوسری طرف ایک سہمی سہمی سی شرمیلی لڑکی بینا ہے جو اپنی بہن کی ہمشکل ہے۔

''مس کولمبو'' کی پنکی، ''مس ہانگ کانگ'' کی ٹینا کی طرح بہادر اور جانباز لڑکی ہے۔ اسی طرح ''مس سنگاپور'' کی مونا جس سے جنگل کے ہاتھی، بندر اور دوسرے جانور بہت مانوس ہیں۔ ''مس بینکاک'' کی روزی کو بھی کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ پاکستانی فلموں میں اس قدر ورسٹائل کردار کرنے والی اب تک کی وہ پہلی فنکارہ ہیں جن کے کام میں ورائٹی ہی ورائٹی ملتی ہے۔ بابرہ شریف کے ایسے بہت سے ناقابل فراموش کردار ہیں جو قابل ستائش ہیں مگر اس مختصر تحریر میں ان کا تذکرہ ممکن نہیں۔

مس سیریز کی بات چلی ہے تو ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ ایک بار ان سے پوچھا گیا۔ ''آپ کی زندگی میں یہ ''مس'' اتنا اہم کیوں ہے؟''

اب یہ ذکر چھڑ گیا ہے تو بغیر سیاق و سباق کے اس سوال کا جواب بتانے کا لطف نہیں آئے گا۔ بابرہ سے یہ سوال معین اختر نے کیا تھا اور یونہی چلتے پھرتے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ایک ٹی وی پروگرام جو NTM سے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا تھا اور بہت مقبول تھا۔ لوگ اسے بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اس شو میں شوبز، اسپورٹس اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے نامور افراد شرکت کرتے تھے۔ معین اختر ان سے دلچسپ سوالات کرتے ہوئے ایک ایسا سماں باندھ دیتے تھے کہ ناظرین بہت انجوائے کرتے تھے۔ NTM پاکستان کا پہلا پرائیویٹ چینل تھا جس کے اس پروگرام کا ٹی وی دیکھنے والے شدت سے انتظار کرتے تھے۔

ایک ایسے ہی پروگرام میں ورلڈ کپ کے چمپئن کپتان اور پاکستان کے موجودہ وزیراعظم عمران خان مہمان تھے۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں بین الاقوامی شہرت یافتہ سپر اسٹار بابرہ شریف بھی شریک ہوئی تھیں۔ معین اختر نے ان سے دلچسپ سوال کیے جن کے جواب بھی بابرہ شریف نے برجستہ اور لاجواب دیے۔

معین اختر: ایک بات بتائیے آپ کی زندگی میں یہ

''مس'' اتنا اہم کیوں ہے؟ آپ نے ٹیلی ویژن پر پہلا پروگرام کیا تو اس ڈرامے کا نام ''مس فوراوکلاک'' تھا، اس کے بعد آپ کی فلمیں آئیں مس کولمبو، مس سنگاپور، مس ہانگ کانگ یہ سلسلہ کہاں تک چلے گا؟ اور اس کے بعد ایک سلسلہ اور آیا لیڈی کمانڈو، لیڈی اسمگلر یہ سلسلہ ٹوٹے گا کہاں؟

بابرہ شریف (برجستہ جواب دیتے ہوئے) اب تو آنٹی جوڈو اور آنٹی کراٹے ہی رہ گیا ہے۔

معین اختر: ذرا سا نزدیک آجائیں مائیک کے نہیں۔

بابرہ شریف: (عمران خان برابر ہی بیٹھے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آپ کس کے نزدیک کہہ رہے ہیں۔ مائیک کے یا...... (بابرہ کا جواب سن کر شو میں بیٹھے ناظرین نے زبردست تالیاں بجائیں)

معین اختر: اچھا ایک گانا ہے میرے دل میں خواہش ہے کہ ہم وہ گانا آپ کے گھر میں سنیں۔ کب سنیں گے وہ گانا؟

بابرہ شریف: کون سا گانا؟

معین اختر: میرے نیہر سے آج مجھے آیا یہ پیلا جوڑا یہ ہری ہری چوڑیاں۔

بابرہ شریف (شرارتی انداز میں) آپ راضی تو ہوں۔

معین اختر: یہ آپ نے کچھ معیوب سی بات نہیں کروی۔ اس طرح ٹیلی ویژن پر ڈائریکٹ۔

بابرہ شریف: (برجستہ جواب دیتے ہوئے) دیکھیں بھائیوں ہی کو فکر ہوتی ہے بہنوں کی اس لیے میں نے آپ سے کہا۔ (بابرہ کے اس جواب پر بھی پورا شو تالیوں سے گونج اٹھا)۔

بابرہ شریف ایک باصلاحیت اداکارہ ہی نہیں، ایک ذہین اور حسین شخصیت کی مالک بھی ہیں۔ کس موقع پر کہاں کون سی بات کہنی چاہیے، یہ وہ بخوبی جانتی اور اس کا مظاہرہ بھی کرتی تھیں اسی طرح کہاں انہیں کیسا اقدام کرنا چاہیے اس سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں۔

ایک بار یوں ہوا کہ وہ ایک سنسان علاقے میں چار اوباش اور شرارتی لڑکوں کے نرغے میں پھنس گئیں۔ وہ چار اور یہ تنہا۔ اس موقع پر گھبرانے یا ہمت ہارنے کی بجائے کیسے انہوں نے ان کو نانی یاد دلائی یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہدایت کار ایس سلیمان کی فلم ''منزل'' کی آؤٹ ڈور شوٹنگ بلوچستان کے علاقے گڈانی میں ہو رہی تھی۔ وہ اکیلی لوکیشن پر جانے کے لیے کار چلاتے ہوئے چوکی (بلوچستان) کی حدود میں جیسے ہی داخل ہوئیں تو ایک کار میں سوار چار لڑکوں نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ ایک اکیلی لڑکی کو کار میں دیکھ کر کبھی اپنی کار ان کے آگے اور کبھی پیچھے کر کے انہیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کبھی بابرہ کے قریب آکر جملہ بازی کرتے۔ کبھی ان کی گاڑی کو سائیڈ مارتے۔ بابرہ انہیں طرح دیتی رہیں۔ اطمینان سے اپنا سفر طے کرتی رہیں۔ مگر لڑکوں نے ایک مقام پر بابرہ کی گاڑی کے قریب آکر اپنی گاڑی کے شیشے نیچے کر کے کیلے کے چھلکے ان کی طرف پھینکے تو بابرہ کو غصہ آگیا۔ وہ کیلے کے چھلکے پھینک کر تیزی سے آگے بڑھ گئے تھے۔

''اب تو انہیں سبق سکھانا ہی پڑے گا۔''

یہ سوچ کر بابرہ نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی اور لڑکوں کی گاڑی کے آگے جا کر اپنی کار روک لی اور گاڑی سے باہر نکلیں۔ دور دور تک سنسان سڑک تھی۔ لڑکوں نے انہیں اپنے سامنے دیکھا تو چہکے۔ ''اے حسینہ! تمہاری تشریف آوری کا شکریہ۔ بتاؤ ہم تمہاری کیا خدمت کریں؟''

اتنا کہہ کر وہ چاروں لڑکے اپنی کار سے باہر آگئے اور بابرہ کی طرف قدم بڑھانے لگے تو بابرہ نے تیزی سے جھپٹ کر اپنی کار سے پستول نکالا اور ان پر تان کر کہا۔ ''اچھا تو پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ۔''

جس حسینہ کو وہ تنہا سمجھ کر شیر بنے ہوئے تھے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ان کے پسینے چھوٹ گئے اور لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔ ''نہیں...... نہیں...... ہم پر فائر نہ کرنا۔''

بابرہ نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''میں تم لوگوں کو ایک منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔ دفع ہو جاؤ اگر بھاگنے میں ایک منٹ سے زیادہ دیر لگائی تو فائر کھول دوں گی۔''

یہ سنتے ہی لڑکوں نے بھاگنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ گرتے پڑتے گاڑی میں بیٹھے اور غائب ہو گئے۔ بابرہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور لوکیشن پر پہنچ گئیں اور یونٹ کے لوگوں کو یہ واقعہ مزے لے لے کر سنایا۔

''اگر وہ لونڈے نہ بھاگتے تو کیا آپ سچ مچ فائر کھول دیتیں؟''

"جھوٹ موٹ (نقلی) پستول سے اصلی فائر کیسے کرتی؟ مگر پستول، پستول ہوتا ہے اصلی ہو یا نقلی۔ اسے دیکھ کر ہی اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔"

بابرہ شریف نے اپنے دور کے تمام ہی بڑے چھوٹے ہیروز کی ہیروئن کے طور پر کام کیا۔ اللہ نے ان میں یہ خوبی عطا کی تھی کہ ہر اداکار کے ساتھ پرفکٹ ہیروئن لگتی تھیں۔ تماشائی انہیں سب کے ساتھ پسند کرتے تھے۔ وہ ایک کامیاب اداکارہ ہی نہیں تھیں ایک کامیاب شخصیت کی مالک بھی تھیں اور اب بھی ہیں جس طرح موٹر بائیک آپ ہزار احتیاط ہو کر چلائیں، حادثے کا شکار ہونا ضروری ہے آپ کی ساری احتیاط دھری رہ جاتی ہے کوئی اور موٹر سائیکل سوار اپنے ساتھ آپ کو بھی حادثے سے دوچار کر دیتا ہے۔ بالکل اس طرح ایک بار بابرہ شریف کے ساتھ بھی ہوا۔ بے حد محتاط رہنے کے باوجود دھوکا کھا گئیں۔ فلموں کے سیٹ پر پیار محبت کا سوانگ رچاتے رچاتے انہیں سچ مچ کی محبت میں گرفتار کر لیا۔ ان دنوں وہ کمسن تھیں، کچی تھیں، اس چال باز کی چال میں آگئیں، اس کے جال میں پھنس گئیں اور ایک دن اس کے کہنے پر اس کے ساتھ ایک فلم کے سیٹ سے اچانک غائب ہو گئیں۔ فلم والے انتظار کرتے رہے کہ فلم کے ہیرو ہیروئن واپس آئیں تو فلم کی شوٹنگ آگے بڑھائیں، وہ واپس تو آئے مگر کوئی ایک ہفتہ بعد۔

"کہاں چلے گئے تھے تم دونوں؟"

"اپنی شادی رچانے۔"

"کیا مطلب!!"

"نقلی شادیاں کرتے کرتے ہمارا دل چاہا کیوں نہ ہم......"

لوگوں نے اپنا سر پیٹ لینے کا ارادہ کیا مگر پتا نہیں کہ اب سر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چند دنوں بعد یہ دھوکا کھانے والی لڑکی خود اپنا سر پیٹے گی شاید بھلا کسی کا ہوا ہے کہ اس کا بن کر رہے گا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ بھنورا صفت ہے اور وہی ہوا جس کا امکان تھا۔ جلد ہی دونوں ندی کے دو کناروں کی طرح الگ الگ اپنے اپنے جیون دھارے میں بہنے لگے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ بابرہ شریف نے پھر حقیقی بیاہ رچانے کی بھول نہیں کی۔ آج وہ اپنی عمر کی چھٹی دہائی میں ہیں خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہیں شاد و آباد ہیں۔

ان کے ساتھ "مس" یا "گرل" کا جو لاحقہ لگا تھا وہ اب تک قائم ہے۔ "میرا نام ہے محبت" میں ان کی ناقابل فراموش اداکاری دیکھ کر لوگوں نے انہیں "ونڈرفل گرل" کا خطاب دیا تھا۔ اس سے پہلے جیٹ واشنگ پاؤڈر کے اشتہار کی ماڈلنگ کرنے کے بعد "جیٹ گرل" کہلائی تھیں۔ پھر جب ان کی ہر فلم جوبلیاں منانے لگیں تو ان کے پرستاروں نے انہیں "گولڈن گرل" کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ آج بھی وہ نمبر ون فنکارہ تسلیم کی جاتی ہیں حالانکہ وہ ایک طویل عرصے سے اداکاری نہیں کر رہی ہیں۔ ان کا شمار ان ہیروئنز میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی اداکاری کے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

بابرہ شریف کی پسندیدہ اداکارہ صبیحہ خانم ہیں۔ بڑی اداکارہ کی پسند بھی بہت بڑی تھی۔ رنگ ڈھنگ طور طریقے بھی بہت بڑے تھے۔ اخلاق و اطوار بھی بہت بڑے تھے۔ بابرہ شریف کے فن کے ساتھ ان کی شخصیت کے بارے میں بھی کئی نامور شخصیات نے اپنے تاثرات دیے ہیں ایسے ہی لوگوں میں ایک مسٹر دتہ بھی ہیں۔ جو فلم اسٹوڈیو کے سینئر الیکٹریشن ہوا کرتے تھے جو اس شعبہ میں متحدہ ہندوستان کے زمانے سے وابستہ تھے۔ پنچولی آرٹ اسٹوڈیو کے دور کے وہ ٹیکنیشین تھے۔ صبیحہ خانم سے لے کر انہوں نے صائمہ تک ہیروئنز کے سیٹ پر روشنیوں کا انتظام کیا۔ انہی دتہ صاحب نے ایک بار کہا۔

"میں نے فلمی صنعت میں ایک طویل وقت گزارا ہے۔ پاکستان اور بھارت کی کئی نامور ہیروئنوں کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا مگر بابرہ شریف جیسی بااخلاق، ملنسار، باادب اور بہترین اداکارہ میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔"

دتہ صاحب کے یہ تعریفی کلمات کسی طرح بابرہ شریف کے کانوں تک پہنچے تو بابرہ خصوصی طور پر دتہ صاحب کے پاس گئیں اور ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں اپنے نیک خیالات کا اظہار کیا اور مجھے یہ عزت بخشی۔"

اتنی بڑی فلم اسٹار کا یہ اخلاق اور عجز و انکسار!! سچ کہا ہے بڑوں نے جو جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی جھک کر ملتا ہے۔ بابرہ شریف کو اللہ تعالیٰ نے جو عزت، شہرت اور مقبولیت دی تھی اس کا شکر انہوں نے اللہ کے بندوں کو ہمیشہ خوش رکھ کر کیا ہماری دعا ہے مولا کریم انہیں بھی ہمیشہ خوش رکھیں، آمین!!



لختِ جگر

سید احتشام

بے باک، بے حجاب و بے لگام، امریکی معاشرے کی ایک دلدوز روداد جس نے پورے ملک میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس واقعے پر ناول لکھے گئے۔ فلمیں اور ڈرامے بنے، یہ مشہور واقعہ اپنے اندر بہت کچھ سموئے ہوئے ہے کیونکہ ماں یورپ کی ہو یا امریکا و ایشیا کی، ہر ماں کا دل ایک ہی تال پر دھڑکتا ہے، یہ تحریر اسی جذبے کی عکاس ہے۔

امریکی معاشرے سے درآمد ایک دلچسپ کتھا

دونوں میاں بیوی دس بجے کے بعد سونے چلے گئے تھے۔ کرسٹی فوراً سو گئی تھی لیکن اچانک ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بج کر چھبیس منٹ ہو رہے تھے۔ اسے اپنے شیرخوار کو دودھ پلائے ہوئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے پھر بھی وہ چیخ نہیں رہا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ بِلی وقت پر دودھ نہ پلائے جانے پر ہمیشہ رونا شروع کر دیتا تھا۔ کرسٹی اچھل کر بیڈ سے اتری اور بھاگ کر بِلی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ننھا سو رہا تھا۔ کرسٹی نے اس کے گال کو چھوا۔ نخ...... اس نے اسے نرمی سے ہلایا۔ بِلی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

کرسٹی نے اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ بے جان تھا۔ بالکل بے
جان۔
''بیلی!'' بے اختیار وہ چیخ اٹھی اور بچے کے کھلے
ہوئے منہ سے اپنا منہ ملا کر مصنوعی عملِ تنفس کے ذریعے اس
کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی ناکام سعی کرنے لگی۔ تب
تک بیکر اس کی چیخ سن کر بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچ چکا
تھا۔ ''کرسٹی کیا ہوا؟'' وہ چیخا۔
''بیکر، یہ سانس نہیں لے رہا ہے۔''
''مجھے دو۔'' بیکر نے شیرخوار بیلی کو اس سے جھپٹ لیا
اور کرسٹی کے عمل کو دہرانے لگا۔
''اسپتال۔'' کرسٹی بوکھلا کر چیخی۔
دونوں بھاگتے ہوئے، نیچے گیراج میں پہنچے اور کار
میں بیٹھ کر آندھی کی رفتار سے روانہ ہوگئے۔ سات منٹ کے
اندر وہ اسپتال میں تھے۔
''ڈاکٹر...... ہمیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'' کرسٹی،
ایمرجنسی روم کے شیشے کے دروازے کو دھکیلتی ہوئی چیخی۔
ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی۔ چند ساعتوں کے بعد
ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس نے بچے کو بیکر سے لے لیا اور
اس کا معائنہ کرنے لگا پھر روتے ہوئے ماں اور باپ پر نظر
ڈالی۔ ''مجھے افسوس ہے، آپ کا بچہ مر چکا ہے۔'' اس نے
کہا۔
''یہ ناممکن ہے۔'' کرسٹی چیخ پڑی اور اس نے بچے کو
پھر گود میں لے لیا۔ ''مجھے دوسرا ڈاکٹر چاہیے۔''
اس کے ساتھ ہی وہ لہرانے لگی۔ بیکر نے جلدی سے
بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ اس نے بچے کو نرمی سے اس سے جدا
کر کے نرس کے حوالے کر دیا۔

☆......☆

پانچ ماہ گزر گئے لیکن کرسٹی کو اب تک دوسرا حمل نہیں
ٹھہرا تھا۔ تب انہیں شبہ ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ واقع ہوگئی
ہے۔ کرسٹی کو لیڈی ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ وہ مزید چند ماہ
دیکھ لیں۔ اس دوران کرسٹی کی ملازمت نے اسے تھوڑی
بہت ذہنی آسودگی فراہم کی۔ وہ بروقت کڑھنے اور آنسو
بہانے کی بجائے مصروف رہنے لگی۔ اس طرح مزید چند ماہ
گزر گئے۔ بیکر ایک بار پھر ڈاکٹر سے مشورہ کرنے پہنچ گیا۔
''لیکن کرسٹی کے دوبارہ حاملہ ہونے کی کوئی اور
صورت نہیں ہوسکتی؟'' اس نے پوچھا۔ ''کوئی میڈیسن، کوئی
علاج، کوئی مصنوعی طریقہ؟''

''صبر اور صرف صبر۔'' ڈاکٹر نے زور دے کر کہا۔
''تم دونوں ہر طرح سے صحت مند ہو۔ مزید وقت دو۔''
''کتنا وقت؟''
''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔'' ڈاکٹر نے
نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی کے بھی پاس اس کا کوئی جواب نہیں
ہے۔''

☆......☆

وہ اس وسیع و عریض ریستوران کے ایک پُرسکون
گوشے میں تنہا بیٹھی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی
زلفیں سنہری تھیں۔ وہ بہت حسین اور پُرکشش تھی، نوخیز تھی۔
بیس سال کی رہی ہوگی لیکن اٹھارہ سال کی لگتی تھی۔ جسم
سیڈول اور قد کشیدہ تھا۔ چہرے سے بلا کی معصومیت ٹپکتی
تھی۔ اس کا نام لوری ایڈمز تھا۔
''ہنی کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟'' بریٹ اس
کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔
''تمہیں فرصت کیسے مل گئی؟'' لوری نے پوچھا۔
''ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا لیکن جب میری
باری آئی تو مجھے بتایا گیا کہ فلم کی کاسٹ مکمل ہوگئی ہے۔''
بریٹ نے بتایا۔
لوری نے اپنے محبوب کی آنکھوں میں جھانکا۔
''بریٹ، میں حاملہ ہوگئی ہوں۔'' اس کا لہجہ نرم تھا۔
دونوں بے اختیار ایک دوسرے کی آنکھوں میں
جھانکتے چلے گئے۔ لوری نے بریٹ کی آنکھوں میں
ہمدردی، حوصلہ افزائی، اپنائیت کا عکس ڈھونڈنے کی کوشش
کی لیکن اسے بریٹ کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں ملا۔ وہاں تو
صرف خوف تھا۔ بریٹ خاموش تھا۔ لوری اس ڈر سے
خاموش تھی کہ اگر بولی تو رو پڑے گی۔
''لوری ڈارلنگ، ہمیں...... ہمیں اس بارے میں
سوچنا پڑے گا۔'' تھوڑی دیر کے بعد بریٹ بولا۔ ''میرا
مطلب ہے، ہمیں عجلت میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے
جس پر بعد میں پشیمانی ہو۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔
''چلو، باہر چلتے ہیں۔ یہاں دم گھٹ رہا ہے۔''
دونوں ریستوران سے نکل کر نیویارک کی وسیع و
عریض شاہراہ کے چوڑے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ یہاں
تھیٹروں کا طویل سلسلہ تھا۔ بریٹ کی طرح لوری بھی تھیٹر
اور فلم انڈسٹری میں اپنی قسمت آزمانے کی سخت جدوجہد کرتی
رہی تھی لیکن اسے کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی اور اب

وہ تھک گئی تھی۔ وہ نہ صرف حسین تھی بلکہ اس میں صلاحیت بھی تھی۔ وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہو سکتی تھی، خاص طور سے کسی فلم اسٹار کی جسے اس طرح کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب وہ بہت اداس اور اجڑی اجڑی سی لگ رہی تھی۔ دونوں پارک میں پہنچے اور ایک بینچ منتخب کر کے بیٹھ گئے۔

"دیکھو، بریٹ، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......!" لوری نے کچھ کہنا چاہا۔

"لوری یہ صرف تمہاری ہی نہیں، میری بھی ذمہ داری ہے۔" بریٹ بول پڑا۔ "اس کے علاوہ آج میں گھنٹوں اپنی باری کا انتظار کرنے کے باوجود چانس نہ ملنے پر کچھ سوچتا رہا ہوں۔ میں نے سوچا، ہم کیا کر رہے ہیں۔ جھوٹے وعدوں پر اپنے آپ کو اذیت دے رہے ہیں۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صرف اہلیت، صلاحیت اور ثابت قدمی ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ انسان کو حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوری، تمہیں میرا کزن ایڈنا یاد ہے؟"

"ہاں، جو نیو برگ میں ٹائر ایجنسی چلاتا ہے۔"

"ہاں وہی وہ چاہتا ہے کہ میں فلم اور تھیٹر کے چکر سے نکل کر اس کے کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں اپنی وجاہت اور سحر انگیز شخصیت کے سبب ریکارڈ توڑ ٹائر فروخت کر سکتا ہوں۔"

"میں تمہیں ہرگز یہ کام نہیں کرنے دوں گی۔" لوری نے مداخلت کی۔ "تم اپنے کیریئر کو ترک نہیں کر سکتے۔"

"لیکن تم پہلے میری پوری بات تو سن لو۔ میں وہاں کام کرنے کے ساتھ ساتھ تھیٹر میں قسمت آزمائی بھی کرتا رہوں گا۔ وہ ٹائر ایجنسی براڈوے سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ میں ڈرائیو کر کے براڈوے پہنچ جایا کروں گا۔"

"میں جانتی ہوں کہ تمہاری ساری باتیں بہت اچھی ہیں لیکن اتنی محنت مت کرو۔" لوری نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا؟"

"میں واپس اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

"گھر؟ واپس مڈویسٹ؟" بریٹ بھونچکا رہ گیا۔ "لیکن اپنے ڈیڈ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ کیا کہیں گے؟"

"میں ساری رات اسی پر غور کرتی رہی ہوں۔"

لوری نے ایک گہری سانس لی۔ "اگر میں اسقاط کرا لوں تو ساری عمر تمہیں طعنے دیتی رہوں گی۔ اگر تمہیں اپنا کیریئر ترک کرنے پر مجبور کرتی ہوں تو تم ساری عمر مجھے معاف نہیں کرو گے۔ تم ٹائر سیلز مین نہیں ہو بلکہ ایک ایکٹر ہو۔ ایک وقت آئے گا جب کوئی جوہر شناس تمہارے اندر چھپے ہوئے فن کو پہچانے گا اور تمہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچائے گا۔"

"اور تم؟"

"میں واپس گھر جا رہی ہوں اگر میرے ڈیڈی نے مجھے اس حالت میں قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میں کسی خیراتی ادارے میں پناہ لے لوں گی جہاں ہم جیسی لڑکیوں کو رکھا جاتا ہے۔"

"ایسا مت کہو، تم ان لڑکیوں میں سے نہیں ہو۔" بریٹ بولا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

اس کے دو دن کے بعد لوری نے اپنے گھر فون کر کے بتایا کہ وہ واپس گھر آ رہی ہے۔ بریٹ اسے چھوڑنے بس ٹرمینل گیا۔ "تم مجھے خط لکھا کرو گی نا؟"

"اگر تم چاہو تو۔"

"ہاں، میں چاہتا ہوں۔" بریٹ نے زور دے کر کہا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ ہم شادی کر سکتے تھے۔"

"اور نیو برگ جا کر ٹائر بیچ سکتے تھے۔" لوری بول پڑی۔ "تاکہ تم ساری عمر مجھے اور بچے کو موردِ الزام ٹھہراتے رہو۔"

بریٹ نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "میں قسم کھاتا ہوں جیسے ہی مجھے چانس ملا، میں تمہیں لینے آؤں گا اور ہم شادی کر لیں گے۔"

لوری اس کے بازوؤں کے حصار سے نکلی، کار سے اتری اور بس میں سوار ہو گئی۔ بس روانہ ہو گئی۔ بریٹ اپنی کار میں بیٹھا دور ہوتی ہوئی بس کو دیکھتا رہا اور پھر کار اسٹارٹ کر دی۔

☆......☆

وہ کیری ویل پہنچی تو بارش ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں بیگ اٹھا کر جیسے تیسے بس سے اتری اور شیڈ کے نیچے کھڑی ہو کر متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کا باپ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مایوس نظر آنے لگی۔ اب وہ کیا کرے؟

''لوری۔'' اچانک ایک سمت سے آواز آئی۔ قریب پہنچ کر اس کے باپ نے کار روک دی اور اتر پڑا۔ لوری نے باپ کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس کے باپ نے ایک لفظ کہے بغیر اس کا سامان اٹھا لیا۔ کار روانہ ہوگئی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔

''وہ کون تھا؟'' اچانک اس کا باپ پوچھ بیٹھا۔ ''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''بریٹ۔'' اس نے جواب دیا۔

اس کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ سارے مناظر جانے پہچانے تھے۔ وہی سڑکیں، وہی گلیاں، وہی بلاک۔

''بائیس، تئیس سال کا صحت مند نوجوان۔'' اس کے باپ نے پھر کہا۔ ''کیا تمہارے خیال میں وہ اپنی ذمہ داری اٹھا سکتا تھا؟''

''وہ شادی کی پیشکش کر رہا تھا۔'' لوری بولی۔ ''لیکن میں اس کا کیریئر تباہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔''

''اس نے تمہارے کیریئر کی پروا نہیں کی۔ کیا کی؟''

''میں اس سے محض اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں کہ حاملہ ہوگئی ہوں۔''

اس کے باپ نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لوری بھی خاموش ہوگئی۔ وہ گھر پہنچ گئے۔ اس کی ماں نے اسے سینے سے لگا لیا لیکن لوری نے فوراً محسوس کر لیا کہ اس میں گرمجوشی مفقود تھی۔ ''اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔'' اس کی ماں سارا نے کہا۔ ''میں آتی ہوں۔''

وہ بالائی منزل پر واقع اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سارا بھی وہاں پہنچ گئی۔ ''میں تمہارا سامان کھول دوں۔ تم آرام کرو۔''

''نہیں ماما۔'' لوری نے کہا۔ ''میرا سامان نہیں کھلے گا۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''میں یہاں بھی نہیں رہ سکتی۔ میں سات مہینے تک ڈیڈی کی خاموشی برداشت نہیں کر سکوں گی۔''

''لیکن تم کہاں جاؤ گی؟ کیا کرو گی؟''

''میں نہیں جانتی لیکن میں یہ ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

☆......☆

اس نے کیری ویل میڈیکل سینٹر میں رضاکارانہ جاب کے لیے درخواست دے دی۔ وہاں کم از کم کام کے اوقات کے دوران پیٹ بھر کر عمدہ کھانا تو ملے گا۔ دوسرے ہفتے کے آغاز سے اسے بریٹ کی طرف سے خطوط اور اس کے ساتھ ہی تھوڑی بہت رقم موصول ہونے لگی۔ لوری نے وہ رقم خرچ نہیں کی۔ بریٹ اس سے منہ نہیں چھپا رہا تھا جیسا کہ عام طور سے نوجوان ان حالات میں کیا کرتے تھے۔ لوری کو میڈیکل سینٹر میں کام کرتے ہوئے تقریباً پانچ ہفتے ہوگئے تھے۔ ایک دن سینٹر کے منتظم اعلیٰ نے اسے طلب کر لیا۔

''مس ایڈمز، میں شروع سے آپ کا کام دیکھ رہا ہوں۔'' وہ گویا ہوا۔ ''میں آپ کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا آپ آٹھ گھنٹے کی شفٹ کرنا چاہیں گی؟ ہفتے میں چھ دن؟ تنخواہ بہت اچھی تو نہیں لیکن یہی بڑی بات ہے کہ آپ کو کچھ نہ کچھ ملے گا۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں؟'' لوری نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''میں بڑے شوق سے کروں گی۔''

☆......☆

''میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ......'' ڈاکٹر نے باری باری بیکر اور کرسٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آپ اپنی کوششیں جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ کسی بچے کو گود لینے پر بھی غور کریں۔ ایسے بہت سے صحت مند شیر خوار ہیں جنہیں آپ جیسے جوڑے کی محبت اور شفقت کی ضرورت ہے۔''

''ہم......ہم نے اس پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔'' کرسٹی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''پھر؟''

''میں ڈرتی ہوں۔''

''تمہیں یہ ڈر ہے کہ تم ایک شیر خوار کی اچھی دیکھ بھال نہیں کر سکو گی؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' کرسٹی نے جواب دیا۔ ''بلکہ میں یہ سوچ کر ڈرتی ہوں کہ شاید ہم ان لوگوں کو مطمئن نہ کر سکیں۔''

''کن لوگوں کو؟''

''ان ایجنسیوں کو ان لوگوں کو جن کے پاس دینے کے لیے بچے ہوتے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں دھوکا دے کر کسی بچے کو گود نہیں لینا چاہتی۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔''

''تمہیں ان سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت

ہے؟“
”ہمیں انہیں کھل کر ساری بات بتانی پڑے گی۔“
”کیا بات بتانی پڑے گی؟“ لیڈی ڈاکٹر کا لہجہ الجھن آمیز تھا۔
”بیلی کے بارے میں......!“
”ہاں بے شک۔“ ڈاکٹر نے اتفاق کیا۔
”تب وہ یہی کہیں گے کہ اس نے ایک بچے کو ہلاک کردیا اور اب دوسرے کو ہلاک کرنے چلی ہے۔“
”کرسٹی۔“ ڈاکٹر نے تحمل سے جواب دیا۔ ”سوائے تمہارے کوئی بھی تمہیں الزام نہیں دے رہا۔ ایجنسیاں یہ باتیں اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ تم پہلی ماں نہیں ہو جس کا بچہ اچانک فوت ہو گیا ہو۔ یہ ایک سینڈروم ہے۔ میڈیکل سائنس اس امر کی تحقیق کررہا ہے کہ بچے اچانک کیوں فوت ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کہ وہ لوگ تم پر کوئی الزام لگائیں گے، تم دونوں کو دوسروں پر ترجیح دیں گے کیونکہ وہ یہی سوچیں گے کہ ایک بچے کو کھونے کے بعد تم اس کی بہت اچھی دیکھ بھال کرسکو گی۔“
کرسٹی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ بل کی آنکھوں میں چمک تھی اور وہ اسے حوصلہ دیتا ہوا لگ رہا تھا۔ کرسٹی نے اطمینان کی سانس لی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

لیڈی ڈاکٹر واہل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے انتظار گاہ میں بیٹھی ہوئی لوری کو کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ لوری اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ ”کیا تم ورزشیں کررہی ہو؟“ لیڈی ڈاکٹر نے اسے میز پر لٹا کر معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں ڈاکٹر، کیوں کیا کوئی گڑبڑ ہوگئی؟“
”نہیں نہیں بالکل نہیں۔“ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا۔ ”یہ تمہارا آٹھواں مہینا ہے۔ تمہاری حالت بہت ہی اچھی ہے۔ اب صرف ایک ماہ رہ گیا ہے۔ کیا گھر واپسی کا کوئی امکان ہے؟“
”ہاں، میری ماں ہے لیکن!“
”لیکن باپ بہت ناراض ہے۔ پھر تم کیا کرو گی؟“
”میں...... میں بہت سوچتی رہی ہوں۔“
”ڈھائی سو ڈالر ہفتہ میں کیا بنتا ہے؟ شیر خوار کی پرورش ادویات، خوراک، یہ صورتِ حال خاصی مایوس کن ہے۔“
”ڈاکٹر پھر میں کیا کروں؟“
”لوری، میں اپنے مریضوں کو ہر طرح کے مشورے دیتی ہوں لیکن میں نے آج تک کسی عورت کو اپنا بچہ کسی کو گود دینے کے بارے میں مشورہ نہیں دیا۔ مشورہ دینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن حالات کا مقابلہ کرنا بہت مشکل۔ یہ فیصلہ خود تمہیں کرنا ہوگا۔“
اس کے گیارہ دن کے بعد لوری نے ڈاکٹر واہل کو فون کیا۔ ”ڈاکٹر! میں یہ نہیں کہتی کہ میں یہ کروں گی لیکن اگر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنا بچہ کسی کو گود دینا چاہتی ہوں تو مجھے کس سے بات کرنی ہوگی؟“
”سوشل سروس کی کونسلر مس ہیلنگو سے۔“ ڈاکٹر واہل نے جواب دیا۔

☆......☆

”کیوں نہ ہم آرام سے باتیں کریں۔“ مس روز ہیلنگز نے لوری کی پریشانی بھانپ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، یہ بتاؤ آٹھواں مہینا ہے یا......!“
”نویں مہینے کا آغاز۔“ لوری اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بول پڑی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ روز بالکل نوجوان تھی۔ مشکل سے تیس سال کی رہی ہوگی۔
”تم چونکہ مجھ سے ملنے آئی ہو، لہٰذا میں یہ فرض کیے لیتی ہوں کہ تم بچے کو گود دینے میں سنجیدگی سے غور کررہی ہو۔“ روز نے کہا۔
”میں...... میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ لوری نے تسلیم کیا۔
”کیا تم نے دیگر امکانات پر بھی غور کیا ہے؟ ان تمام لوگوں کے بارے میں جن پر تم ایسے کڑے وقت میں بھروسا کرسکو؟“
”ہاں۔“
”اور تمہارا کوئی نہیں ہے؟ تمہاری فیملی بھی نہیں جس پر تم بھروسا کرسکو؟ بچے کا باپ بھی نہیں؟“
”نہیں، کوئی نہیں۔“
”کیا تم یہ بات سمجھتی ہو کہ اگر تم نے اپنا بچہ کسی کو گود دینے کا فیصلہ کیا تو بچے کے باپ کو مطلع کیا جانا ضروری ہوگا؟“ مس روز نے نکتہ بیان کیا۔ ”بچے کے باپ کو خاص نوعیت کے جائز حقوق حاصل ہیں۔“
لوری نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ ”میرے خیال میں تمہیں اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ مس روز نے یوں کہا

گویا وہ اس وقت تک کے لیے یہ انٹرویو ختم کررہی ہو۔
''کیا..... کیا حکام اسے کچھ کرنے پر مجبور کرسکیں گے؟'' لوری نے جاننا چاہا۔
''اسے بچے کو سپورٹ کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔''
''لیکن بچہ میرا ہے۔'' لوری نے احتجاج کیا۔
''قانون پھر قانون ہے۔''
''اگر حکام میرے شوہر کو ڈھونڈ نہ سکے پھر کیا ہوگا؟''
''پھر اس ریاست کے قانون کے تحت ماں کی اجازت کافی ہوگی۔'' مس روز نے جواب دیا۔
''کک..... کیا یہ ممکن ہے کہ..... میرا مطلب ہے..... کیا کسی ماں کو اس کے بچے سے ملنے کی یا اسے دیکھنے کی اجازت ہوتی ہے؟'' لوری نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''کیونکہ میں یہ نہیں چاہتی کہ میرا بچہ سوشل سروس یا کسی ایجنسی کے ہاتھوں میں ایک فائل یا محض ایک کیس بن کر رہ جائے۔ مجھے اپنے بچے کے لیے بہترین لوگ چاہئیں۔''
''بے شک۔'' مس روز نے جواب دیا۔ ''اور اگر ہمیں بہترین لوگ مل گئے تو اس سے تمہاری تسلی ہو جائے گی؟''
''میں خود ان سے ملوں گی۔'' لوری بولی۔ ''اس طرح میری تسلی ہو جائے گی۔ خاص طور سے میں اس عورت سے ملنا چاہوں گی تاکہ یہ جان سکوں کہ کیا وہ ایسی عورت ہے جس پر میں بھروسا کرسکوں۔''
''ایجنسیاں یہ پسند نہیں کرتیں کہ ماں کو یہ معلوم ہو کہ اس کا بچہ کس جوڑے نے گود لیا ہے۔ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے۔''
''ہاں..... لیکن میں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنے بچے کو کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کروں گی۔'' لوری نے جواب دیا۔ ''میں صرف اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہوں۔''
''لوری، اگر میں تمہیں ایک ایسے جوڑے سے ملوا دوں جو کسی کے بچے کو گود لینے کے آرزومند ہیں اور تم ان سے سوائے دو سوالات کے جو چاہے پوچھ سکتی ہو، تو کیا خیال ہے؟ تم ان سے ان کے نام اور شہر کے بارے میں نہیں پوچھو گی جہاں وہ رہتے ہیں۔''
لوری جواب دینا چاہتی تھی لیکن مس روز نے اسے روک دیا۔ ''ابھی جواب مت دو۔ اس پر غور کرلو۔ ایک دو دن کے بعد آکر مجھے بتا دینا۔''

☆..... ☆

مس روز کے پرائیویٹ آفس سے ملحقہ استقبالیہ میں کرٹی اور بیکر بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ ملاقات دو بجے طے تھی لیکن بیس منٹ اوپر ہو گئے تھے اور لوری کا کوئی پتا نہیں تھا۔ کرٹی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ''آخر، وہ کیوں نہیں آئی؟'' اس نے مضطرب لہجے میں بیکر سے پوچھا۔
''میں نہیں جانتا۔''
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ کرٹی اپنی جگہ شل ہو گئی۔ بیکر اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں دروازے کو تکنے لگے جو آہستہ سے کھل گیا تھا۔ مس روز نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے پہلو میں زرد رنگت اور سنہری زلفوں کی مالک ایک بہت ہی خوش رو لڑکی کھڑی تھی جو پورے دنوں سے تھی۔ مس روز نے ایک طرف ہٹ کر لوری ایڈمز کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر ان سے مخاطب ہوئی۔ ''میں آپ لوگوں کو تنہا چھوڑ رہی ہوں۔ آپ لوگ جی بھر کے باتیں کرلیں پھر جانے سے پہلے مجھے بتا دیجیے گا۔'' اس نے دروازہ خاموشی سے بند کردیا۔
لوری اور کرٹی ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ان کے ذہنوں میں نہ جانے کتنے سوالات تھے جو وہ ایک دوسرے سے پوچھنا چاہتے تھے لیکن جس کی اجازت نہیں تھی۔ بیکر نے پہلے لڑکی کو اور پھر اپنی بیوی کو دیکھا اور پھر ہچکچا کر مخاطب ہوا۔
''کیا ہم..... کیا ہم بیٹھ نہ جائیں؟''
لوری خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ دونوں میاں بیوی نے اس کے سامنے کی نشست سنبھال لی۔
''میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں جانتی ہوں تم کیسا محسوس کررہی ہو۔'' کرٹی نے تناؤ دور کرنے کی خاطر لب کشائی کی۔
''تم نہیں جان سکتیں۔'' لوری نے اختلاف کیا۔
''کیا ان لوگوں نے تمہیں ہمارے بارے میں بتایا تھا؟'' بیکر بول پڑا۔
''صرف یہی کہ تم لوگ بہت شائستہ اور معزز ہو۔'' لوری نے جواب دیا۔ ''تمہارا گھر بہت خوش نما ہے اور تم لوگ کوئی بچہ گود لینے کی شدید خواہش مند ہو۔''
''کیا ان لوگوں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ.....'' کرٹی نے کچھ کہنا چاہا۔
''کرٹی۔'' بے اختیار بیکر کے منہ سے نکل گیا اور اگلے ہی لمحے اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے کرٹی کا نام لے

کر ایک قانون توڑ دیا تھا۔

''میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ......'' کرسٹی نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''ہمارا ایک بچہ تھا۔ تین ماہ کا اور ہم نے اچانک اسے کھو دیا۔ وہ اچانک موت کے منہ میں چلا گیا۔ کوئی وجہ نہیں کوئی سبب نہیں۔''

''اوہ، مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔'' لوری دکھ سے بولی۔ ''ان لوگوں نے مجھے بالکل نہیں بتایا تھا۔ یہ تو بہت المناک سانحہ ہوگا۔''

''ہاں بے حد المناک۔'' کرسٹی نے اتفاق کیا۔ ''لیکن میں تمہیں یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ ہمارے بچے کی بہترین پرورش ہو رہی تھی۔ دنیا میں کسی بچے کو اتنی محبت نہیں دی گئی ہوگی جتنی ہم اپنے بچے......!'' کرسٹی کی آواز بھرا گئی۔

''میری بیوی جو کچھ کہہ رہی ہے سچ ہے۔'' بیکر بول پڑا۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے ذہن میں کس قسم کے خیالات گردش کر رہے ہیں۔'' کرسٹی نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا میں خود تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''ہمارا تعلق اعلیٰ متوسط طبقے سے ہے۔ ہمارا ذاتی مکان ہے۔ ہم ایک پُرسکون قصبے میں رہتے ہیں جہاں بہترین ڈاکٹر موجود ہیں اور بہترین اسپتال واقع ہے۔ لہٰذا تمہارے بچے کی بہترین پرورش ہوگی۔ ہم ایک خاموش اور پُرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے اسکول، ریاست میں واقع دس بہترین اسکولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔'' کرسٹی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ''تم جو بھی پوچھنا چاہتی ہو، پوچھ سکتی ہو۔ ہمارے پاس چھپانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''کیا تم میرے بچے کو یہ بتا دو گی کہ وہ لے پالک ہے؟'' لوری نے پوچھا۔

''ہمیں بتانا پڑے گا۔'' کرسٹی نے جواب دیا۔ ''آخر ہماری فیملی کو اور سارے احباب کے علم میں یہ بات ہوگی لہٰذا بچے سے اس حقیقت کو چھپانا بہت خطرناک ہوگا کیونکہ اگر اسے اتفاقاً اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا اور اہم راز معلوم ہو گیا تو یہ بہت برا ہوگا۔''

''بالکل!'' لوری نے اتفاق کیا۔ ''لیکن کیا تم اسے میرے بارے میں بتاؤ گی؟''

''اگر تم پسند کرو تو۔''

''اس کے لیے یہ جاننا اور یہ یقین کرنا بے حد ضروری ہے کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ چونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اس لیے اسے گود دے رہی ہوں۔ یہ اسی کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔'' لوری رونے لگی۔

''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ بچہ جب سمجھ دار ہو جائے گا تو ہم اسے بتا دیں گے۔'' کرسٹی نے یقین دلایا۔

''مس، کیا تم ہمارے بارے میں اور کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟'' بیکر پوچھ بیٹھا۔

''ہاں۔'' لوری نے کہا۔ ''بعض لوگ بہت سخت گیر ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ خوف کے سائے میں پلے۔''

''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے بچے کے ساتھ کبھی برا سلوک نہیں ہوگا۔'' کرسٹی نے یقین دلایا۔ ''اسے بہت پیار سے رکھا جائے گا۔ اس کی بہت اچھی دیکھ بھال ہو جائے گی۔ اس کے احساسات کو مجروح نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ہم خوف کے سائے میں زندگی نہیں گزارتے۔''

''شکریہ!'' لوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں بھی اٹھ گئے۔ لوری کو ان دونوں کے قریب سے گزرنا تھا اور پھر بیکر نے دیکھا کہ ان دونوں ماؤں نے کچھ کہے بغیر ایک دوسرے کو سینے سے لگا لیا تھا گویا بچہ ایک ماں سے دوسری ماں کو منتقل ہو گیا ہو۔

☆......☆

''کیا میں بچے کو دیکھ سکتی ہوں؟'' لوری نے نرمی سے پوچھا۔ اس نے ابھی ابھی بچے کو جنم دیا تھا۔

نرس نے بچے کو ڈاکٹر کے ہاتھوں سے لے کر ماں کو دکھانے کے لیے اوپر اٹھایا۔ وہ بالکل سرخ و سفید تھا۔ لوری نے اسے چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اسے اپنی گود میں لینا چاہتی تھی لیکن اس نے اس کی فرمائش نہیں کی۔

تیسرے دن سہ پہر میں بیکر اور کرسٹی بچے کو لینے اسپتال پہنچ گئے۔ کرسٹی نے پالنے پر جھک کر خوابیدہ بچے کو دیکھا۔ ''بچہ بہت پیارا ہے۔'' وہ دھیرے سے بیکر سے بولی۔ ''سب لوگ یہی کہیں گے کہ یہ تمہاری طرح ہے۔'' اس نے نرس کی طرف دیکھا۔

نرس اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔ ''بچے کو اٹھا لیں۔'' وہ بولی۔

کرسٹی نے جھک کر بے حد احتیاط سے بچے کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش نظر آرہے تھے۔ انہوں نے بچے کو خوب اچھی طرح ایک سفید کمبل میں لپیٹا اور واپس گھر روانہ ہوگئے جو وہاں سے اسّی میل کے فاصلے پر تھا۔

☆......☆

لوری کو بچے کے کاغذات پر دستخط کیے دس ماہ بیت چکے تھے۔ ایک دن اسے اسپتال کے ڈائریکٹر نے اپنے دفتر میں طلب کیا۔

''لوری۔'' وہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ہم اپنے تمام ملازمین کے ریکارڈ کا جائزہ لیتے رہے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تم اپنی تربیت کے حدود میں رہتے ہوئے، بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتی ہو لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں نرسنگ کے چار سالہ کورس کے لیے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی بھیج دیا جائے۔ تمہیں وظیفہ دیا جائے گا۔ اگر تم اس موقع سے استفادہ کرنا چاہو تو یہاں واپس آکر پانچ سال تک بطور چیف نرس خدمات انجام دے سکتی ہو۔''

''ڈاکٹر، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔''

''ابھی جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پیشکش پر غور کرلو۔ ایسے مواقع ہر کسی کو نہیں ملا کرتے۔ تمہارا کیریئر بن جائے گا اور مستقبل بھی محفوظ ہوجائے گا۔''

اس رات لوری دیر تک ڈاکٹر کی اس پیشکش پر غور کرتی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی تھیٹر کو پسند کرتی تھی اور اسی میں شہرت اور کامیابی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ نیویارک کے علاوہ بھی بہت سے تھیٹر کے سرگرم مراکز تھے۔ ان میں شکاگو قریب ترین تھا۔ شکاگو سے بہت سے ایکٹرز نیویارک گئے تھے اور انہوں نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔

جب لوری نے ڈاکٹر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اسے یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی لیکن وہ اس کے شوق کو سمجھتا بھی تھا۔ ''لوری اگر تمہیں تھیٹر میں کام کرنے کا شوق ہے تو وہی کرو جو کرنا چاہتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اگر حالات ساتھ نہ دیں تو جب تک میں یہاں ڈاکٹر ہوں، یہ پیشکش برقرار رہے گی۔''

''شکریہ! میں یاد رکھوں گی۔'' لوری نے وعدہ کیا۔

☆......☆

اس کے شکاگو روانہ ہوتے ہوتے بریٹ کی طرف سے اسے تین لفافے موصول ہوئے اور وہ تینوں لفافے اس نے واپس کردیئے۔ جب تیسرا لفافہ بھی بریٹ کو واپس مل گیا تو اس نے کیری ویل میڈیکل سینٹر کو فون کیا لیکن اسے بتایا گیا کہ اب وہ وہاں کام نہیں کرتی۔ بریٹ کو یقین تھا کہ لوری بچے کو واپس اپنے گھر لے گئی ہوگی۔ جب اس نے اس کے والدین کو فون کیا تو اس کے باپ نے فون اٹھالیا۔

''لوری؟ اب وہ یہاں نہیں ہے۔''

''لیکن آپ کو معلوم تو ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔'' بریٹ نے پوچھا۔

''ہمیں نہیں معلوم۔''

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ لوری کہیں چلی گئی تھی۔ غائب ہوگئی تھی۔ بچہ سمیت بریٹ کا مارے غصے کے خون کھول اٹھا۔ لوری کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ اس نے سوچا لیکن جب اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا تو وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا کہ جب لوری کو اس کی ضرورت تھی تب اس نے لوری کے لیے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ صرف محبت کا اظہار کیا تھا جو فی زمانہ عنقا ہو چلی تھی۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا جب کہ لوری کو اس کا حق پہنچتا تھا۔ اب وہ گمنام نہیں تھا۔ اس کی جدوجہد رنگ لائی تھی اور وہ بہت تیزی سے ابھرا تھا اور شوبز پر چھا گیا تھا۔ اس کی اس کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ اس کی ایجنٹ سیلی براؤن کا تھا جس نے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا اور فیٹ ورک سے بریٹ کا معاہدہ بھی اس کے ذریعے ہوا تھا۔ بریٹ کی پرفارمنس نے فیٹ ورک پر دھوم مچا رکھی تھی اور وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اب سیلی کا اگلا قدم اسے فلم انڈسٹری سے متعارف کرانا تھا۔

اس دن وہ جونہی شوٹنگ سے فارغ ہوکر ڈریسنگ روم میں داخل ہوا، اس نے سیلی کو اپنا منتظر پایا۔ سیلی نے ایئر لائن کا ایک لفافہ اسے تھما دیا۔ ''تمہارے ٹکٹ۔'' وہ بولی۔ ''شکاگو کے لیے۔''

''یہ تم کیوں لے آئیں؟ میں نے تو تمہاری سیکریٹری کو اس کام کے لیے کہا تھا۔'' بریٹ بولا۔

''بریٹ، یہ لوری ایڈمز کون ہے؟'' سیلی پوچھ بیٹھی۔

''لوری......؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟'' بریٹ بھونچکا رہ گیا۔

''کئی ہفتے پہلے میری سیکریٹری نے تمہارے ایک

ایسے بل کی ادائیگی کی تھی جو کسی پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے اس ایجنسی کو ادائیگی کروائی تھی کیونکہ انہوں نے لوری کا سراغ لگا لیا تھا۔ اب میں اس سے ملنے شکاگو جا رہا ہوں۔"

"کیا وہ جانتی ہے کہ تم اس سے ملنے پہنچ رہے ہو؟"

"نہیں، میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے تمہارا سرپرائز دیا جانا پسند نہ آئے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اور کی ہو چکی ہو۔"

"ایجنسی کو ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔" بریٹ آئینے میں اپنا میک اپ اتارتا ہوا بولا۔ "اس کے علاوہ...... پچھلی مرتبہ جب ہم ملے تھے تو وہ حاملہ تھی۔"

"اوہ؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس نے مجھے کبھی کوئی خط نہیں لکھا، کبھی فون نہیں کیا۔ میں نے جو خطوط اسے بھیجے وہ واپس آ گئے۔"

"اس سے تو بالکل واضح ہے کہ وہ تم سے مزید کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔"

"مجھے اس کو ڈھونڈنا ہے۔" بریٹ نے زور دے کر کہا۔

"تم جو کچھ بھی کرو۔" سلی بولی۔ "لیکن بدنامی مت مول لو۔ اپنے کیریئر کو خطرے میں مت ڈالو بریٹ!"

"میں یاد رکھوں گا۔"

سلی مڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆

بریٹ، شکاگو ایئرپورٹ سے ٹیکسی کے ذریعے اس ٹھکانے پر پہنچ گیا جس کا پتا سراغ رساں ایجنسی نے اسے فراہم کیا تھا۔ یہ ایک تھیٹر کی عمارت تھی۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں چار ایکٹر اور ڈائریکٹر کسی پلے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ جب ڈائریکٹر پلیٹ فارم سے ابھری تو وہ لوری تھی۔ "او کے پندرہ منٹ کا وقفہ۔" اس نے اعلان کیا۔

اداکاروں نے اپنا اپنا اسکرپٹ ایک طرف رکھ دیا۔ لوری پلیٹ فارم سے اتر گئی۔

"لوری۔" تاریک گوشے سے کسی نے اسے دھیرے سے پکارا۔ وہ آواز کی سمت مڑی اور منجمد ہو گئی۔

"اوہ خدایا۔"

بریٹ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے سینے سے لگانا چاہا۔

"نہیں بریٹ، یہاں نہیں۔ میں تم سے بعد میں ملوں گی ریہرسل کے بعد۔"

"کس وقت؟ بچہ کہاں ہے؟"

"پانچ بجے ڈریک کے کاک ٹیل لاؤنج میں۔"

"ٹھیک ہے لیکن وہاں پہنچنا ضرور۔"

"میں ضرور پہنچوں گی۔"

☆......☆

لوری مقررہ وقت سے بیس منٹ کے بعد لاؤنج پہنچی۔ بریٹ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پہنچنے پر دونوں نے اپنی اپنی نشست سنبھال لی۔ "لوری۔" بریٹ مخاطب ہوا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں حیران کر دیا۔ مجھے پہلے تمہیں خط لکھنا یا فون کرنا......"

"تم نیویارک سے یہاں اتنی دور کیوں آئے ہو؟" لوری نے اس کا جملہ اچک لیا۔

"کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"تم یہ بات خط میں بھی لکھ سکتے تھے اور فون بھی کر سکتے تھے۔" لوری سرد لہجے میں بولی۔

"میرے سارے خطوط واپس آ گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ میرے پاس تمہارا فون نمبر نہیں تھا۔ میں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں ایجنسی کو تمہارا سراغ لگانے کے عوض بھاری رقم ادا کی ہے۔" بریٹ نے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا بچہ اب دو سال کا ہو گیا ہوگا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تم اس سے نہیں مل سکتے۔"

"لوری، میں تمہیں شادی کی پیشکش کرنے آیا ہوں تاکہ اب ہم ایک فیملی بن سکیں۔ میں اس سے کیوں نہیں مل سکتا؟ کیا اسے کچھ ہو گیا ہے؟"

"بریٹ، اسے کسی نے گود لے لیا ہے۔"

"گود لے لیا ہے؟" بریٹ بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں؟ کیسے؟ کس نے گود لیا ہے؟"

"میں ان کے نام نہیں جانتی۔ نہ ہی یہ جانتی ہوں کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ مجھے اس کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ بہت مہذب اور اچھے لوگ تھے۔"

"مجھے بتائے بغیر؟ میری اجازت کے بغیر؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

''میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔'' لوری نے جواب دیا۔ ''نہ کوئی گھر، نہ کوئی ٹھکانا، میں نے وہی کیا جو میرے بیٹے کے حق میں بہتر تھا۔''

''وہ میرا بھی بیٹا ہے۔'' بریٹ نے احتجاج کیا۔

''میں جانتی ہوں۔'' لوری نے دھیمے لہجے میں اقرار کیا۔ ''تمہیں یقیناً مجھ سے نفرت ہو رہی ہوگی۔''

''میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔''

''مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہوگئی ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ مجھے اس کی یاد نہ آتی ہو۔ میرے سینے میں ہر وقت درد کی ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔''

''لوری، اب میں بہت پیسے کماتا ہوں۔ میں نیویارک یا کہیں کے بھی بہترین وکیل کی خدمات حاصل کر سکتا ہوں۔ میں اپنے بیٹے کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے قانونی کارروائی کروں گا پھر کیا تم مجھ سے شادی کرلوگی؟''

''ہاں۔'' لوری نے اس سے وعدہ کیا۔

☆......☆

کرسٹی آٹھ ماہ کی حاملہ تھی۔ اس دن اس کے لے پالک اسکائی کی دوسری سالگرہ تھی۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی لیکن بیکری سے کیک ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ ''کیک آگیا۔'' کرسٹی اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''تم ٹھہرو، میں جاتا ہوں۔'' بیکر نے کہا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ باہر ایک اجنبی کھڑا تھا۔ ''مسٹر بیکر؟''

''ہاں، کیا بات ہے؟''

اس شخص نے اپنی جیب سے ایک دستاویز نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''سوری، سر میرا کام صرف ڈیلیور کرنا ہے۔'' وہ مڑا اور چلا گیا۔

بیکر حیرت سے دستاویز کو گھورنے لگا جس پر اس کا اور کرسٹی کا نام تحریر تھا۔ اس نے دستاویز کو کھولا اور ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔ ''بچہ اس کے فطری والدین کو واپس کیا جائے۔'' بیکر کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اسے فوری فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کرسٹی کو یہ دستاویز ابھی دکھائے یا پارٹی ختم ہونے کے بعد؟ پھر اچانک کچھ سوچ کر اس نے دستاویز کو جیب میں ٹھونس لیا۔ ''ہنی، وہ بیکری والا نہیں تھا بلکہ کوئی اجنبی تھا، راستہ پوچھ رہا تھا۔''

اسی وقت دوبارہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ اس مرتبہ بیکری والا تھا۔ پارٹی کے دوران بیکر بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کاغذ کو چھوتا اور الجھتا رہا۔ جب پارٹی ختم ہوگئی اور سارے مہمان رخصت ہوگئے تو اس نے ایک بار پھر کرسٹی کو بتانا چاہا لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کل صبح وہ اپنے دوست اور وکیل پال سے مشورہ کرے گا۔ اگلی صبح وہ پال کے دفتر پہنچ گیا اور وہ دستاویز اس نے پال کو دکھائی۔ پال نے دستاویز پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر بیکر کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم نے کرسٹی کو بتایا؟''

''نہیں، ابھی نہیں بتایا۔''

''اب بتادو۔''

''کیا معاملہ اتنا گھمبیر ہے؟''

''ہاں، اتنا ہی گھمبیر ہے۔''

☆......☆

''کرسٹی، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' بیکر مخاطب ہوا۔ وہ بیوی کی صحت کے بارے میں انتہائی فکر مند تھا۔ وہ حاملہ تھی اس وجہ سے بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ خبر سنائے۔ اس خبر کو سنتے ہی اسے شاک سا لگتا اور یہ شاک اس بچے پر جو ابھی دنیا میں آیا ہی نہیں اس پر غلط اثر ڈال سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لیے اس نے کرسٹی کے سامنے وہ دستاویز لانے کا فیصلہ کرلیا۔

''کیا کہنا ہے؟''

''کل ایک شخص یہ دستاویز دے کر گیا تھا۔'' بل نے کہا۔ ''اسکائی کے بارے میں......!''

''اسکائی کے بارے میں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''وہ لوگ ہم پر مقدمہ کر رہے ہیں۔''

''وہ لوگ اسکائی کو ہم سے چھیننا چاہتے ہیں؟ نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ اسکائی ہمارا ہے۔ ہم نے ساری قانونی شرائط پوری کی تھیں۔'' اچانک اس کے پیٹ میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ ''اسپتال۔'' وہ کراہی۔ ''مجھے اسپتال لے چلو۔''

اس کے تقریباً چھ گھنٹے کے بعد اس نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ اس کی اچانک ڈیلیوری نے بیکر کے قانونی مشیر پال کو بریٹ کے وکیل ہنری کلے مینٹس سے رابطہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

''ہنری کیا جواب دعویٰ دائر کرنے کے لیے ہمیں تھوڑی بہت مہلت مل سکتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرے

موکل نے ابھی ابھی ایک بچے کو جنم دیا ہے، لہٰذا وہ اس قابل نہیں کہ وہ میرے سوالوں کا جواب دے سکے۔‘‘
’’پال، تم بے شک مزید پندرہ دن لے سکتے ہو۔‘‘ ہنری نے جواب دیا۔
’’شکریہ ہنری۔‘‘ پال نے ریسیور رکھ دیا۔

☆......☆

کرسٹی اپنے نومولود بیٹے کے ہمراہ اسپتال سے واپس آچکی تھی۔ چند دنوں کے بعد پال نے اسے فون کیا۔
’’کرسٹی ایک بات ہوگئی ہے۔ بریٹ کے اٹارنی ہنری کلے مینٹ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے تمہارا حلفیہ بیان لینا چاہتا ہے۔ یہ ضابطے کے عین مطابق ہے۔‘‘
’’وہ کیا بیان لینا چاہتا ہے؟‘‘ کرسٹی نے پوچھا۔
’’یہ اس نے مجھے نہیں بتایا۔‘‘ پال نے جواب دیا۔ ’’لیکن میں بھی وہاں موجود رہوں گا اگر اس نے ایسا کوئی سوال کیا جو میرے خیال میں مناسب نہ ہو تو تم جواب دینے سے انکار کردینا۔‘‘
’’اگر میں پیش ہونے سے انکار کردوں تو؟‘‘
’’تو وہ جج ہارٹ سے کہہ کر اس کا آرڈر جاری کرادے گا۔‘‘
’’مجھے کب اور کہاں پیش ہونا پڑے گا اور اس میں کتنا وقت لگے گا؟ میں ایک ماں ہوں، میرا وقت میرا اپنا نہیں ہے۔‘‘
’’میں خیال رکھوں گا کہ تمہارا حرج نہ ہو۔‘‘ پال نے کہا۔ ’’سوموار کو صبح دس بجے اس کے آفس پہنچ جاؤ۔‘‘

☆......☆

’’گود لینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے تم کب سے بے اولاد تھیں؟‘‘ اٹارنی ہنری نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی کرسٹی سے حلف لینے کے بعد پوچھا۔
’’میں......میرا پہلے سے ایک بچہ تھا۔‘‘ کرسٹی نے جواب دیا۔
’’مسٹر بیکر جب تم نے بچہ گود لینے کی درخواست دی تھی تو تم نے بیان کیا تھا کہ تمہارا کوئی بچہ نہیں تھا۔ تو کیا تم نے بچہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا؟‘‘
’’یہ جھوٹ نہیں تھا۔‘‘ کرسٹی نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ’’میرا ایک بچہ تھا......وہ......وہ اچانک ہی فوت ہوگیا تھا۔‘‘
’’یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔‘‘ ہنری نے رسمی طور پر

کہا۔ ”میری ولی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔“ لیکن دل ہی دل میں وہ اتنا خوش ہوا تھا کہ جیسے اس کے مکان کے پچھواڑے تیل کا کنواں نکل آیا ہو۔ ”اوہ، مسٹر بیکر میں معذرت چاہتا ہوں۔“ وہ اچانک گویا ہوا۔ ”تمہیں گھر پہنچنے کی جلدی ہوگی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆

اس کے ایک ہفتے کے بعد ایک دن صبح سویرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بیکر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے پال بول رہا تھا۔ ”بیکر، کرسٹی سے کہو محتاط رہے۔ بریٹ ایک مقبول ٹی وی اسٹار ہے۔ اٹارنی ہنری اس واقعے کی تشہیر چاہے گا تاکہ عوامی رائے اس کے حق میں ہو جائے۔ کرسٹی سے کہو کہ وہ کسی بھی اخباری نمائندے سے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کیمرا اور ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ ہو یا خالی ہاتھ، کوئی بات نہ کرے۔“

”میں اسے بتا دوں گا۔“ بیکر نے وعدہ کیا۔

پال کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ دو مختلف ٹیلی ویژن کا عملہ ان کے لان میں آ دھمکا اور اپنے آلات سیٹ کرنے لگا۔ کرسٹی نے یہ دیکھ کر مقامی پولیس کو طلب کر لیا۔ چنانچہ پندرہ منٹ کے اندر اندر عملہ اپنا ساز و سامان اٹھا کر رخصت ہو گیا لیکن فیٹ ورک پھر بھی باز نہ آیا۔ اس نے بریٹ کا انٹرویو نشر کر دیا جس میں بریٹ نے اعلان کیا کہ وہ صرف اور صرف انصاف اور اپنے بیٹے کی واپسی چاہتا ہے۔ انٹرویو کے آخر میں رپورٹر نے بیکر اور کرسٹی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور ان پر الزام عائد کیا کہ وہ متنازعہ بچے کو اس کے فطری والدین سے الگ رکھے ہوئے ہیں اور اس کے والدین کے حوالے کرنے پر قطعی رضامند نہیں ہیں۔

اگلے چند دنوں میں اس واقعے کی پبلسٹی اتنے عروج پر پہنچ گئی کہ کرسٹی اور اسکائی کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دن ایک نوجوان لڑکی ان کے ہاں آئی۔ کرسٹی نے محتاط ہو کر دروازہ کھولا۔

”مسز بیکر؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”میں پٹریشیا ہوں۔ سوشل سیکیورٹی سروسز کی طرف سے آئی ہوں۔“

”سوشل سروسز؟“

”ہاں حالیہ پبلسٹی نے سوشل سیکیورٹی کی بھی توجہ اس واقعے کی طرف مبذول کر لی ہے۔“ وہ بولی۔ ”لہٰذا ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ بچہ جو دو سال پہلے آپ کے حوالے کیا گیا تھا، وہ محفوظ ہے اور اس کی صحیح نگہداشت ہو رہی ہے۔ مجھے ریکارڈ کے لیے آپ کے ماحول کا جائزہ لینا اور اس بچے سے چند سوال کرنے ہیں۔“

”چھپانے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“ کرسٹی نے کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

وہ اندر آ گئی اور پورے گھر کا معائنہ کرنے لگی۔ ”اچھا اب اسکائی کے بارے میں بتائیں۔ وہ کہاں ہوتا ہے؟“

”اس کا اپنا کمرا ہے اور اپنے کھلونے ہیں۔“

”کیا میں دیکھ سکتی ہوں؟“

”ہاں، بالکل۔“ کرسٹی بولی۔ ”بالائی منزل پر۔“

وہ بالائی منزل پر پہنچ گئی اور ناقدانہ نظروں سے کمرے کا سروے کرنے لگی۔ ”بہت خوب۔“ وہ تعریفی لہجے میں بولی۔ ”لیکن کیا میں کچھ تصویریں کھینچ سکتی ہوں؟ مجھے یقین ہے کہ میرے افسران اس طرح مطمئن ہو جائیں گے۔“

”بڑی خوشی سے۔“

اس نے ایک پولورائڈ کیمرا برآمد کیا اور تصویریں اتارنے لگی۔ ”میرے پاس اس وقت سے اب تک کی تصویریں ہیں جب وہ صرف تین دن کا تھا۔“ کرسٹی نے کہا اور ایک البم اٹھا کر اس خاتون کو اس کی تصویریں دکھانے لگی۔

”کیا میں چند تصویریں لے سکتی ہوں؟“ خاتون بولی۔ ”اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ کتنی اچھی طرح پروان چڑھ رہا ہے۔“

”میرے پاس چند فالتو کاپیاں ہیں۔“

”شکریہ۔“ خاتون نے تصویریں لے کر اپنے بریف کیس میں رکھ لیں۔

اگلے دن وہ ساری تصویریں اخبار کی زینت بنی ہوئی تھیں اور اس کا عنوان تھا۔ ”بے بی بریٹ۔“

”یہ سب کیا ہے؟“ بیکر چیخ اٹھا۔

کرسٹی بھاگی بھاگی آئی۔ بیکر نے اخبار اس کے سامنے کر دیا۔ ”یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ چیخا۔

”وہ......وہ عورت......!“ کرسٹی مارے حیرت کے ہکلائی۔

”کون عورت؟“

''وہ سوشل سروسز والی۔'' وہ اچانک رو پڑی اور پھر اس نے پورا واقعہ بیکر کے گوش گزار کر دیا۔
''کوئی بات نہیں۔'' بیکر اسے دلاسہ دینے لگا۔ ''آئندہ کے لیے محتاط ہو جاؤ لیکن بے بی بریٹ...... یہ کس ذہن کی اختراع ہے؟''

☆......☆

''اور یہ رہی لوری اور بریٹ میٹنگ کی شادی کے موقع پر لی گئی تصویر۔'' ڈوبنی شو کے میزبان وک ڈوبنی نے وہ تصویر بلند کر کے ناظرین کو دکھاتے ہوئے کہا اور پوری قوم وہ تصویر ٹی وی اسکرین پر دیکھنے لگی۔ ''اب لوری میٹنگ ایک مہمان کی حیثیت سے ہمارے اس شو میں شریک ہونے آرہی ہیں جس کا عنوان ہے۔ ''وہ مائیں جنہوں نے اپنے بچے گود دے دیے۔''
لوری اسٹیج پر نمودار ہوئی اور تالیوں کے بے پناہ شور میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ وہاں دیگر تین عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔
''لوری، میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈوبنی ایک زہر خند کے ساتھ گویا ہوا۔ ''اپنا بچہ...... اکلوتا بچہ، دو اجنبیوں کے حوالے کرنے کے بعد تم نے یہاں حاضرین کے درمیان آنے اور اپنا دفاع کرنے کی ہمت کیسے کی؟''
''مسٹر ڈوبنی، تم میرے اس فعل کو بے رحمانہ اور خود غرضانہ کہہ سکتے ہو۔'' لوری سنبھل کر بولی۔ ''لیکن تم نہ تو عورت ہو اور نہ ہی ماں ہو۔ تمہارے سامنے کبھی بھیانک مستقبل نہیں رہا ہوگا۔ تمہیں کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھنا پڑا ہوگا کہ تم اپنے بچے کو کیسی زندگی دینا چاہتے ہو؟ غربت اور افلاس؟ ساری عمر ویلفیئر کی خیرات پر گزارا؟ میں تنہا بے یار و مددگار تھی۔ مجھے وہی کرنا تھا جو میں اپنے بچے کے لیے بہتر سمجھتی تھی۔ جہاں تک بچے کو اجنبیوں کے حوالے کرنے کا تعلق ہے، میں نے کاغذات پر دستخط کرنے سے پہلے ان لوگوں سے ملنے پر زور دیا تھا۔''
''تم اس جوڑے سے ملیں، وہ تمہیں بہت اچھے لگے۔ وہ تمہارے بچے کو ایک عمدہ گھر دے سکتے تھے پھر دو سال کے بعد تم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ دو نیک اور اچھے لوگ بہت بھیانک ہو گئے۔ یہ کیسے ہوا؟''
''میں نے آج تک اس جوڑے کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ میں صرف اپنا بچہ دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانا اور نہلانا چاہتی ہوں۔ اسے لوری دے کر سلانا چاہتی ہوں۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پروان چڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ رو پڑی۔
شو کے اختتام پر ڈوبنی، لوری کو ایک طرف لے گیا۔
''تم نے زبردست پرفارمنس کا مظاہرہ کیا ہے۔'' وہ چہک کر بولا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ تم ایکٹریس کے طور پر ناکام کیوں رہی...... تمہارے آنسو......؟''
''حرامزادے۔'' لوری نے جواب دیا۔ ''تم اتنے عرصے سے لوگوں کے جذبات سے کھیلتے آرہے ہو کہ تمہارے اندر سے اصل اور جعلی جذبات کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہارے شو میں پرفارم کرنے نہیں آئی تھی بلکہ اس لیے آئی تھی کہ میں اپنے بچے کو واپس لینا چاہتی ہوں اور اٹارنی نے کہا تھا کہ اس سے مدد ملے گی۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں یہاں کیوں آئی۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اسٹوڈیو سے نکل گئی۔

☆......☆

''معزز حضرات۔'' جج ہارٹ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اٹارنی ہنری کلے مینٹ اور پال ہینڈرسن کو مخاطب کیا۔ ''مقدمے کی تاریخ قریب آرہی ہے۔ ایسے کیسوں میں عوام کے لیے بڑی جذباتی کشش ہوتی ہے، لہٰذا اسے میڈیا سے جتنی دور رکھا جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔''
''بے شک۔'' ہنری نے دل سے تسلیم کیا۔
جج ہارٹ نے اپنی دراز میں سے ایک کیسٹ نکال لی۔ ''مسٹر کلے مینٹ، پھر تم اس کی وضاحت کیسے کرو گے؟''
ہنری نے کیسٹ پر ایک نظر ڈالی اور سمجھ گیا کہ یہ ڈوبنی کے شو کا کیسٹ تھا۔ ''میری مؤکلہ کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔'' وہ بولا۔ ''اور اس نے دعوت قبول کر لی تھی۔''
''تمہارا مطلب ہے تمہاری مؤکلہ نے تم سے یہ بات صاف نہیں کی تھی؟''
''اس نے ذکر تو کیا تھا لیکن مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔ مجھے افسوس ہے۔''
''اگر تم تاسف کا صحیح مفہوم سمجھتے ہو تو ایک بار پھر ایسا ہونے دو۔ میں تمہیں توہین عدالت کے جرم میں پکڑ لوں گا۔ سمجھ گئے؟''
''جی سمجھ گیا۔'' ہنری کی جان میں جان آئی۔
اب جج پال کی طرف مڑا۔ ''مسٹر ہینڈرسن، کاش میں تمہاری مؤکلہ کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کر

سکتا۔‘‘

’’یور آنر، اگر آپ کا اشارہ اخبار میں شائع ہونے والی اسکائی کی باتصویر کہانی کی طرف ہے تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس میں شریک نہیں بلکہ ایک شکار تھی۔ اس خاتون اخباری نمائندے نے خود کو سوشل سیکیورٹی سروسز کی نمائندہ ظاہر کیا تھا۔‘‘

’’اپنی موکلہ کو ہدایت کرو کہ آئندہ محتاط رہے۔‘‘ جج نے کہا۔ ’’آپ دونوں میں سے کوئی بھی آئندہ کوئی بیان بازی نہیں کرے گا۔ آپ کے مؤکلوں کے لیے بھی یہی ہدایت ہے۔‘‘

☆......☆

کمرائے عدالت تماشائیوں، صحافیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا شور تھا۔ اٹارنی پال ہینڈرسن اور ہنری کلےمینٹ اپنی اپنی نشست پر بیٹھے اپنے نوٹس اور فائل کا مطالعہ کررہے تھے۔ ان کے پہلوؤں میں ان کے موکل بیٹھے تھے اور نروس نظر آرہے تھے۔ جلد ہی جج ہارٹ نمودار ہوا اور اپنی نشست پر بیٹھتے ہی وارننگ دی۔

’’مقدمے کی سماعت کے دوران اگر کسی بھی میڈیا کی طرف سے مداخلت ہوئی تو میں سارے میڈیا پر پابندی عائد کردوں گا پھر تم مجھ پر آزادیٔ صحافت پر قدغن لگانے کا الزام عائد کرتے رہنا۔ یہ مقدمہ بالکل غیر جانبداری سے چلایا جائے گا کیونکہ یہ ایک بچے کی زندگی کا معاملہ ہے۔‘‘ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ’’کیا استغاثہ کے وکیل اپنا بیان دیں گے؟‘‘

ہنری کلےمینٹ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے نوٹس اٹھا کر مخاطب ہوا۔ ’’یور آنر، میرا موکل بچے کا فطری باپ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا بچہ اسے واپس کیا جائے۔ اس کیس میں گود دینے کا جو معاملہ طے ہوا تھا، وہ خلاف ضابطہ اور غیر قانونی تھا جسے ہم ثابت کردیں گے۔ دوسرے یہ کہ یہ تحریری قانون کا بھی معاملہ ہے۔ اس ریاست کا قانون بھی یہی کہتا ہے کہ ہر بچہ اپنے خونی والدین سے تعلق رکھتا ہے جسے ہم ثابت کردیں گے۔ بہت سی معقول وجوہات ہیں جو اس بچے کے حق میں جاتی ہیں۔ شکریہ، یور آنر۔‘‘

جج ہارٹ نے اٹارنی پال کی طرف اشارہ کیا، پال اٹھا اور کھنکار کر مخاطب ہوا۔ ’’یور آنر، میرے موکل کی حیثیت بالکل واضح ہے۔ اسکائی بیکر ان کا قانونی لے پالک بیٹا ہے۔ وہ ان کا خون نہیں ہے لیکن وہ اس وقت سے ان کے پاس ہے جب وہ صرف تین دن کا تھا۔ موجودہ حالات میں تبدیلی اسے اور اس فیملی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی جسے وہ سدا سے اپنا سمجھتا آیا ہے۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

’’مسٹر کلےمینٹ، آپ کا پہلا گواہ۔‘‘ جج نے کہا۔

’’میں بریٹ کو گواہ کے کٹہرے میں طلب کرتا ہوں۔‘‘ ہنری نے اعلان کیا۔

بریٹ اپنی جگہ سے اٹھا اور میڈیا والوں میں کھلبلی مچ گئی۔ خواتین اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سامنے کی طرف جھک گئیں۔ بریٹ نے حلف اٹھایا اور بیٹھ گیا۔

’’بریٹ، اس عدالت کو بتاؤ کہ جس دن لوری نے تمہیں بتایا کہ وہ حاملہ ہے تو کیا ہوا تھا؟‘‘ اٹارنی ہنری نے پوچھا۔

’’جی......جی...... میں ایمانداری سے کام لوں گا۔‘‘ بریٹ نے جواب دیا۔ ’’میں ڈر گیا تھا۔ ہمارا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ بہت مشکل سے گزارا ہورہا تھا اور اچانک ہی پتا چلا کہ ایک بچہ بھی ہونے والا ہے۔‘‘

’’تو کیا تم دم دبا کر بھاگ گئے؟‘‘

’’نہیں، میں نے شادی کی پیشکش کی۔ نیویارک چھوڑنے، اداکاری ترک کرنے اور باقاعدہ ملازمت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں لوری سے عشق کرتا ہوں اور سدا کرتا رہوں گا۔ میں کیوں بھاگنے لگا؟‘‘

’’پھر بھی تم نے اس سے شادی نہیں کی، یا کی؟‘‘

’’نہیں، لیکن یہ فیصلہ میرا نہیں تھا بلکہ لوری کا تھا۔ میں تھیٹر چھوڑ کر ٹائر فروخت کرنے کی جاب کرنے پر رضامند تھا لیکن لوری نے واپس اپنے گھر جانے پر اصرار کیا تاکہ میرے کیریئر میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔‘‘

’’بریٹ، اس دوران جب لوری اپنے مڈویسٹ میں تھی تو تم نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی؟‘‘

’’مسلسل جناب۔ میں اسے پابندی سے خط لکھتا تھا اور تھوڑی بہت رقم بھی بھیجتا رہتا تھا۔ میں اس پر یہ جتانا چاہتا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا تھا اور ہر طرح سے اس کی مدد کرنے کا خواہاں تھا پھر اچانک ہی میرے خطوط واپس آنے لگے۔‘‘

’’پھر تم نے کیا کیا؟‘‘

’’میرے کرنے کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں جونہی مالی طور پر مستحکم ہوا، میں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی مدد سے اسے ڈھونڈ نکالا۔‘‘

''پھر تم نے کیا کیا؟''
''میں شکاگو پہنچا۔ میں لوری سے اور اپنے بچے سے ملنا چاہتا تھا۔''
''اس وقت تمہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ تمہارا بچہ بیٹا ہے یا بیٹی؟ یا یہ کہ اسے گود دے دیا گیا ہے؟''
''نہیں سر۔''
''بریٹ، خوب احتیاط سے جواب دینا۔ کیا تمہیں کسی بھی ذریعے سے بچے کو گود دیے جانے کی اطلاع دی گئی تھی؟''
''نہیں جناب۔ کسی بھی ذریعہ سے کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ بالکل نہیں۔''
''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ شکاگو میں لوری سے ملنے سے پہلے تمہیں اس کا علم نہیں تھا کہ تمہارا بچہ گود دے دیا گیا تھا؟''
''نہیں، جناب، کوئی علم نہیں تھا۔''
''شکریہ بریٹ...... مسٹر ہینڈرسن، آپ کا گواہ۔''
پال ہینڈرسن کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف ایک لمحہ تھا۔ یہ گواہ نہ صرف دل موہ لینے والا تھا بلکہ سچ بھی بول رہا تھا۔ ''یور آنر، مجھے کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''مسٹر کلے میٹ آپ کا دوسرا گواہ۔'' جج ہارٹ نے حکم دیا۔
''میں مس روز کو گواہ کے کٹہرے میں طلب کرتا ہوں۔'' اٹارنی نے اعلان کیا۔
مس روز نے آکر حلف لیا اور پھر مسکرا کر لوری کو دیکھا۔
''مس روز۔'' ہنری نے جرح شروع کی۔ ''آپ یور آنر کو بتائیں کہ لوری بریٹ سے آپ کی شناسائی کیسے ہوئی تھی؟''
مس روز نے عدالت کو تفصیل سے بتایا۔ ''مس روز۔'' ہنری نے سوال کیا۔ ''جب لوری حاملہ تھی تو کیا آپ دونوں کے درمیان کبھی اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا تھا کہ جب بچہ پیدا ہوگا تو وہ اس بچے کا کیا کرے گی؟''
''اوہ، ہاں! لوری بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ وہ خود اس کی پرورش کرنے کی شدید آرزومند تھی لیکن وہ سوچتی تھی کہ اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ بچے کو کسی ایسی فیملی کو دے دے گی جس سے اس کی طبیعت ملے گی۔''

''مس روز، کیا ایک ماں کے لیے یہ ایک معمول کی بات ہے کہ وہ اس جوڑے کا انتخاب خود کرے جسے وہ اپنا بچہ گود دینا چاہتی ہو؟''
''نہیں ہرگز نہیں۔''
''تو کیا تم یہ کہو گی کہ لوری کسی غیر بیاہتا ماں کی بہ نسبت اپنے بچے کے متعلق بہت زیادہ فکر مند تھی؟''
''جی ہاں، بہت زیادہ فکر مند تھی۔ اس نے ان خواہش مند جوڑوں سے خود ملنے اور ان سے گفتگو کرنے پر اصرار کیا تھا۔ وہ بیکر فیملی کو منتخب کرنے سے پہلے تین جوڑوں کو مسترد کر چکی تھی۔''
''کیا یہ ممکن ہے کہ بیکر کو بچہ حوالہ کرنے کی وجہ یہ رہی ہو کہ لوری ان پچھلی تین ملاقاتوں سے تھک گئی ہو، بے جان ہو گئی ہو یا جذباتی اعتبار سے بالکل پژمردہ ہو گئی ہو؟''
''مسٹر کلے میٹ۔'' جج ہارٹ نے مداخلت کی۔ ''اس عدالت کے صبر کو مت آزماؤ اور گواہ کے منہ میں اپنے الفاظ مت دو۔''
''آپ کا گواہ۔'' ہنری نے اپنے حریف کو اشارہ کیا۔
پال ہینڈرسن، مس روز کی طرف بڑھا۔ ''مس......!'' اس نے اس کا نام جاننے کے لیے اپنے نوٹس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں، مس روز، آپ نے یہ گواہی دی ہے کہ لوری اس فیملی کے انتخاب میں بے حد محتاط تھی جسے وہ اپنا بچہ گود دینا چاہتی تھی۔''
''جب کہ میں نے کہا ہے کہ وہ چار فیملی سے ملی تھی۔'' مس روز نے کہا۔
''پھر وہ بیکر فیملی کے بارے میں نہایت عمدہ خیالات رکھتی ہوگی۔ مس روز جب کوئی عورت چار چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتی ہے تو اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟''
''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے وہ تھک گئی ہو اور تھکن کے باعث اس نے فیصلہ کیا ہو۔'' مس روز نے جواب دیا۔
اس کے جواب نے پال کو حیران کر دیا۔ ''کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نے چوتھی فیملی کو ان تین سے اعلیٰ پایا ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''یہ ضروری نہیں۔'' مس روز نے اختلاف کیا۔ ''تھکن، پژمردگی، اضطراب یا متبادل کا خوف بھی عناصر ہو سکتے ہیں۔''

لکھنو کا تمدن اور مذہب

لکھنو ہندوستان کا عروس البلاد ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کا جیتا جاگتا شاہکار جو اپنے گنگا جمنی نقوشِ تمدن کے اعتبار سے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک تہذیب و ثقافت کے میدان میں ہندوستان کی سربراہی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ دنیا کا یہ عظیم ترین شہر لکھنو، میر تقی میر، سودا، میر حسن، مصحفی، انشا، جرائت، ناسخ، آتش، میر انیس، مرزا دبیر جیسے عظیم شاعروں کا مدفن ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کا لکھنو، مجاہدوں اور شجاعوں کا لکھنو، حسین عمارتوں اور باغوں کا لکھنو، مشاعروں اور مجلسوں کا لکھنو، عاشقان حیدر کرار کا لکھنو مختصر یہ کہ لکھنو اپنی تمام تر تہذیبی اور اخلاقی عظمتوں کے ساتھ ہندوستان میں مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ اور ہندو مسلم تہذیب کا روشن منارہ ہے۔ لکھنو آج بھی تاریخ ہندوستان کے صفحات پر ہشت پہلو ہیرے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ اودھ کے دارالحکومت کی حیثیت سے لکھنو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ پہلے اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا جو سعادت خان برہان الملک، ابوالمنصور خاں صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے عہد تک رہا مگر آصف الدولہ نے فیض آباد کی بجائے لکھنو کو دارالحکومت بنایا، آصف الدولہ کے بعد وزیر علی، سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ جیسے رعایا پرور علم دوست بادشاہوں نے لکھنو کو دنیا کا عظیم ترین شہر بنا دیا، ہندوستان کے گوشے گوشے

''بہرحال مس روز یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ لوری نے بیکر فیملی سے ملنے کے بعد انہیں معقول سمجھتے ہوئے اپنا بچہ ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''یہ اس کا فیصلہ تھا۔''

پال اپنی میز کی طرف مڑ گیا جہاں بیکر اور کرٹی بیٹھے اسے گھور رہے تھے۔ ان کے چہرے سے سخت مایوسی جھلک رہی تھی۔ پال نے پھر اپنے نوٹس کی طرف دیکھا۔ ''مس روز، اب آخری سوال...... مسز بریٹ سے گفتگو کے دوران کیا کبھی بچے کے باپ سے شادی کا سوال ابھرا تھا؟''

''ہاں!'' مس روز نے تسلیم کیا۔ ''لوری اسے شادی پر مجبور کرنا نہیں چاہتی تھی جس کے نتیجے میں اسے اپنا کیریئر ترک کرنا پڑتا۔''

''تو کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ لوری اپنے بوائے فرینڈ کے کیریئر کے بدلے اپنے بچے سے دستبردار ہوگئی؟''

''آبجیکشن۔'' کلےمینٹ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''اعتراض درست ہے۔'' جج ہارٹ نے ہنری کو پریشانی سے بچالیا۔

''مجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا۔'' پال اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔ کرٹی کے چہرے نے گویا خوف کی تصویر کھینچ لی تھی۔

اب اٹارنی ہنری کی جرح کرنے کی باری تھی۔

''مس روز، کیا تمہیں لوری میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی کہ وہ کسی ماں کی بہ نسبت اپنے بچے سے کم محبت کرتی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں، جناب۔'' مس روز نے جواب دیا۔

''شکریہ، مس روز۔''

☆......☆

''مس ڈین، آپ کا تعلق ایجنسی سے ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''آپ بچے کو گود دیئے جانے کے کس مرحلے میں اس کیس میں ملوث ہوئیں؟''

''جونہی اسپتال نے ہماری ایجنسی کو مطلع کیا کہ لوری نے بچے کو گود دینے کا فیصلہ کرلیا ہے، میں نے اس کیس کا چارج لے لیا۔''

''مس ڈین، کیا آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ مس لوری ایڈمز اپنا بچہ ایسے لوگوں کو گود دینے کے خیال سے خوش تھی جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھے؟''

''آبجیکشن، می لارڈ۔'' پال نے مداخلت کی۔ ''گواہ کوئی ماہر نفسیات نہیں ہے بلکہ محض سوشل سروسز کیس ورکر ہے، لہٰذا وہ فیصلہ کن لمحات میں لوری کی ذہنی کیفیت کے سلسلے میں اپنی کوئی رائے دینے کی اہل نہیں ہے۔''

جج نے ایک لمحہ غور کیا۔ پھر رولنگ دی۔ ''گواہ سوال کا جواب دے سکتی ہے۔''

''لوری اپنے بچے کو گود دینے کے خیال کی حامی نہیں تھی لیکن ان حالات میں اس نے فیصلہ کیا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کے پاس نہیں تھا۔'' مس ڈین نے جواب دیا۔ ''یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ لوری نے باولِ نخواستہ

سے شعرا ، ، ادیب اور علما ، فنکار سمٹ کر لکھنو آ گئے۔ واجد علی شاہ اودھ کے آخری تاجدار تھے ان کے عہد میں لکھنو کا تمدن آسمانِ ہند پر چودھویں کے چاند کی طرح جگمگا رہا تھا، ظالم فرنگی للچائی ہوئی نظروں سے اودھ کو دیکھ رہا تھا آخر سازشوں اور مکارانہ سیاسی ہتھکنڈوں سے 7 فروری 1856ء کو اودھ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا اور آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ انگریزوں کے قیدی بنا لیے گئے۔ نیک سرشت، وفا کیش اور محب وطن بادشاہ نے لکھنو سے رخصت ہوتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔: ''درودیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہیں۔ خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں'' بادشاہ واجد علی شاہ تو مٹیا برج کلکتہ میں قید کردیئے گئے لیکن اودھ کی رعایا ان کی معزولی پر برسوں ماتم کرتی رہی۔ بادشاہ کی وطن واپسی کے لیے دعائیں کی جاتی رہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ہزاروں غزلیں، نظمیں اور گیت اودھ کے اس مظلوم بادشاہ پر لکھے گئے جو آج بھی محفوظ ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں لکھنو نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دہلی کے محاذ پر تو ہتھیار جلد ڈال دیئے گئے مگر لکھنو کا مورچہ لمبا کھنچا، کہیں 1858ء میں جا کر یہاں مجاہدوں کو پسپائی ہوئی اور اس طرح کہ آخر وقت تک مجاہد لکھنو میں لڑتے رہے اور مجاہدوں کی قائد واجد علی شاہ کی بیوی نواب حضرت محل نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا۔ وہ لکھنو سے نکلیں اور نیپال کی طرف گئیں جہاں کی سرزمین پر وہ محوِ خواب ہیں۔

مرسلہ: قائم مہدی، کراچی

ایسا کیا۔''

''شکریہ، مس ڈین۔ آپ کا گواہ۔'' ہنری نے پال کو اشارہ کیا۔

''مس ڈین۔'' پال گواہ کے قریب پہنچ کر مخاطب ہوا۔ ''کیا آپ یہ کہیں گی کہ جب لوری نے فیصلہ کیا تو اس نے بے ہوش و حواس ایسا کیا؟''

''جی ہاں، میں یہی کہوں گی۔''

''مس ڈین، بچے کو گود دیئے جانے کے کیس میں کیا باپ سے رابطہ کرنا آپ کی ایجنسی کی پالیسی ہے؟''

''ہم سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ آخر باپ کو اس کا قانونی حق حاصل ہے۔ بشرطیکہ باپ اپنا حق استعمال کرنا چاہے۔''

''لہٰذا ہم یقیناً یہ فرض کر سکتے ہیں کہ مسٹر بریٹ نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔'' پال نے کہا۔

''اوہ نہیں سر۔'' مس ڈین نے جواب دیا۔ ''اسے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''کیا؟'' پال نے سخت تعجب کا اظہار کیا۔ ''کیا آپ اس عدالت کو بتانا چاہ رہی ہیں کہ آپ کی ایجنسی کی غفلت اور کوتاہی اس ناخوشگوار صورتِ حال کی ذمے دار ہے؟''

''نہیں جناب۔''

''اگر بچے کے باپ کو اپنا قانونی حق استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اگر آپ نے اسے مطلع کرنے کا فرض ادا نہیں کیا تھا تو اور کون اس کا ذمے دار ہو سکتا تھا؟''

مس ڈین نے جواب دینے سے پہلے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''بچے کے باپ کو مطلع نہ کرنے کا سبب ہماری غفلت یا کوتاہی نہیں تھی بلکہ یہ حقیقت تھی کہ ہم اس کا سراغ لگانے سے قاصر تھے۔''

''مطلب یہ ہے کہ آپ کی ایجنسی نے کوشش کی تھی لیکن اس تک پہنچنے میں ناکام رہی تھی؟'' پال نے پوچھا۔

''ایک نوجوان نیویارک میں رہتا تھا جس کا نام مین ہیٹن کی فون بک میں موجود تھا اور جو ایکٹرز ایکویٹی کی فہرست میں شامل تھا، اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ آپ کے سامنے نہیں تھا؟''

''ہمیں جس نام کے شخص کی تلاش تھی وہ بریٹ میٹنگ نہیں تھا۔''

''پھر آپ کو کس نام کے شخص کی تلاش تھی؟'' پال نے سوال کیا۔

''بچے کی پیدائش کی سرٹیفکیٹ میں جو نام درج تھا و[illegible] ہکیو تھا۔''

''نیویارک میں ہکیو ایک عام نام ہے۔ آپ [illegible] کتنے ہکیو سے رابطہ قائم کیا تھا؟''

''بیالیس۔''

''لیکن یقیناً نیویارک میں بیالیس سے زیادہ ہکیو ہوں گے، پھر آپ بیالیس پر کیوں رک گئیں؟''

''کیونکہ ہمارے آفس کے کسی اہلکار کے مطاب[illegible] ہنری ہکیو ایک ڈراما مائی فیئر لیڈی کا ایک کردار تھا۔''

''اچھا، یہ جاننے کے بعد آپ نے یقیناً لوری ایڈمز سے یہ مطالبہ کیا ہوگا کہ وہ بچے کے باپ کا اصلی نام بتائے؟''

''نہیں جناب۔''

''نہیں؟ وہ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ ہم قانوناً کسی ماں کو بچے کے باپ کا نام ظاہر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔''

''آہا! تو لوری ایڈمز نے یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی اسے اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتا، ایک فرضی نام استعمال کیا اور یوں تمہیں اور تمام لوگوں کو گمراہ کیا اور اب وہ اپنے اس جھوٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچے کو اس عورت کی گود سے چھیننا چاہتی ہے جسے بچہ اپنی ماں سمجھتا ہے۔''

عدالت کے کمرے میں ایک شور بپا ہو گیا۔ جج نے سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ پھر مخاطب ہوا۔ ''مسٹر ہینڈرسن، کیا آپ گواہ سے مزید سوال کرنا چاہتے ہیں؟''

''یور آنر، میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے۔'' پال نے جواب دیا۔

''مسٹر کلے مینٹ، آپ کا اگلا گواہ۔'' جج نے کہا۔

''میں لوری بریٹ کو گواہ کے کٹہرے میں طلب کرتا ہوں۔'' ہنری کلے مینٹ نے اعلان کیا۔

لوری بریٹ اپنی جگہ سے اٹھی۔ بریٹ نے حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کا ہاتھ دبایا۔ لوری گواہ کے کٹہرے میں پہنچ گئی۔

''لوری، جج ہارٹ کو اپنے الفاظ میں بریٹ سے اپنے رشتے کے بارے میں بتاؤ، جو اب تمہارا شوہر ہے۔'' ہنری نے کہا۔

''ہم نیویارک میں ایکٹنگ کلاسز میں ساتھ تھے اور اپنے کیریئر کا آغاز کر رہے تھے۔'' لوری بتانے لگی۔ ''ہم ایک طرح سے......!''

''محبت میں گرفتار ہو گئے؟'' ہنری نے لقمہ دیا۔

''ہاں، ہمارے پاس قلیل رقم ہوا کرتی تھی چنانچہ ہم نے اخراجات سے بچنے کے لیے ساتھ رہنا مناسب تصور کیا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہمیں ساتھ رہتے ہوئے ساڑھے پانچ ماہ گزرے تھے کہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں حاملہ ہو گئی تھی۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے بریٹ کو بتایا۔ وہ اسی وقت شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔''

''لیکن تم نے شادی نہیں کی۔ کیوں نہیں کی؟''

''اگر ہماری شادی ہو جاتی اور میرے بچہ ہو جاتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ بریٹ ٹائر فروخت کرنے کی جاب کر لیتا۔''

''ان حالات میں، کیا تم نے اسقاط کرانے پر غور کیا تھا؟''

''ہم......ہم نے اس پر گفتگو کی تھی لیکن میں یہ نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا تو بریٹ پر بوجھ بننا اس کے کیریئر میں رکاوٹ بننا پسند نہیں کیا، لہٰذا واپس اپنے گھر چلی گئی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر؟ میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا۔''

''تو یہ تم تھیں، ایک نوجوان لڑکی، حاملہ، تنہا، بے سہارا، پریشان حال!''

''مسٹر کلے مینٹ عدالت تمہارے ڈرامائی تاثر کے بغیر بھی واقعات کا ادراک کر سکتی ہے۔'' جج نے مداخلت کی۔ ''گواہ اپنا بیان جاری رکھے۔''

''لوری، ہز آنر کو بتاؤ کہ تم نے اپنا بچہ گود دینے کا فیصلہ کیسے کیا؟''

''یہ آسان نہیں تھا۔'' لوری نے کہا۔ ''لیکن مجھے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا اگر میں اسے اپنے پاس رکھتی تو جاب کیسے کرتی اور جاب نہ کرتی تو اس کی پرورش کیسے کرتی۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اسے خیرات پر پلنے نہیں دوں گی۔ میں چاہتی تھی کہ اسے ایک اچھی زندگی گزارنے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیے۔ میں بہت پریشان اور ڈری ہوئی تھی تاہم میں جانتی تھی کہ مجھے کچھ کرنا چاہیے تھا ورنہ میں بھی کچھ کرنے کے قابل نہ ہو پاتی۔ چنانچہ میں نے اپنے بچے کی بہتری کے لیے وہی کیا جو مجھے کرنا تھا۔ سب سے پہلے میں نے یہ طے کیا کہ میں اپنا بچہ کسی ایسے ویسے کو گود نہیں دوں گی۔ میں خود پہلے ان سے ملوں گی۔''

''اور کیا تم نے واقعی ایسی کسی فیملی کا انٹرویو لیا؟''

''ہاں جناب۔'' لوری نے جواب دیا۔ ''میں نے تین فیملی کا انٹرویو لیا لیکن ان سے مطمئن نہ ہو سکی لیکن چوتھا جوڑا!''

''یہی جوڑا، جو یہاں میز پر بیٹھا ہوا ہے؟'' کلے

منٹ نے بیکر اور کرسٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا ہم یہ کہیں کہ تم نے انہیں قبول کرلیا؟''

''ہاں سر۔''

''پھر تم نے ان کے بارے میں اپنی رائے کیوں بدل دی؟''

''میری اور ان کی ملاقات صرف ایک گھنٹے کی تھی۔ یہ لوگ مجھے اچھے لگے تھے لیکن میں وثوق سے کیسے کہہ سکتی تھی کہ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ کون لوگ تھے۔ میرے پاس ان کے بارے میں جاننے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ یہ میرے بچے کے ساتھ جو سلوک چاہتے کرتے۔ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہ سوچ کر میرے دل میں خوف جنم لینے لگا۔ میں اس قدر پریشان ہوگئی کہ بھیانک خواب دیکھنے لگی۔ میں سوچتی کہیں میرے بچے کے ساتھ بھی ظالمانہ سلوک نہ ہو رہا ہو اور یہ کہ جب تک میرا بچہ مجھے واپس نہیں مل جاتا، مجھے چین نہیں آسکتا۔ میں سوچتی کہ اگر میرے بچے کو کوئی ایسا مرض لاحق ہوگیا جس میں صرف والدین یا قریب ترین خونی رشتے دار ہی اسے خون یا ہڈی کا گودا دے سکتے ہیں تو کیا ہوگا۔ ہمارے سوا اسے کون بچا سکے گا۔ ایک ماں کے سوا کون اس سے اتنی محبت کرسکتا ہے یا اس کی مدد کرسکتا ہے۔ وہ میرا خون ہے۔ قانون بھی یہی کہتا ہے کہ وہ میرا بچہ ہے۔ میں اسے واپس چاہتی ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مسٹر ہینڈرسن آپ کا گواہ۔'' ہنری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''یور آنر۔'' پال اینڈرسن نے جج کو مخاطب کیا۔ ''گواہ کی جذباتی کیفیت کے پیش نظر کیا ہم سماعت پندرہ منٹ کے لیے ملتوی کرسکتے ہیں؟''

''یہ عدالت گواہ کو اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لیے آدھے گھنٹے کی مہلت دیتی ہے۔'' جج ہارٹ نے اعلان کیا۔

☆......☆

آدھے گھنٹے کے بعد مقدمے کی سماعت پھر شروع ہوگئی۔ لوری پھر گواہ کے کٹہرے میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ اب سنبھل چکی تھی۔ پال آگے بڑھا اور مخاطب ہوا۔ ''مسز بریٹ، آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ کیوں یہ باور کرنے پر آمادہ تھیں کہ... بیکر اور کرسٹی آپ کے نومولود کے لیے ایک مہربان اور شفیق لے پالک ثابت ہوں گے؟''

''یہ لوگ دیکھنے میں بہت مہذب اور شائستہ نظر آئے تھے۔ بہت نفیس اور خوش لباس تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر اور نرسری کے بارے میں بتایا تھا۔ ان چیزوں نے مجھے احساس دلایا کہ یہ لوگ بہت اچھے لے پالک والدین ثابت ہوں گے۔''

''مسز بریٹ، کیا پچھلے ڈھائی سالوں میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا جس نے تمہیں یہ باور کرنے پر مجبور کردیا ہو کہ یہ لوگ مہذب اور شائستہ، بہت نفیس اور خوش لباس نہیں ہیں۔ ان کے گھر میں بچے کا کوئی مخصوص کمرا نہیں ہے۔ ان کے ذہن میں بچے کے لیے مستقبل کا کوئی منصوبہ نہیں ہے؟ کیا یہ لوگ اس دن سے مختلف نظر آئے جس دن تمہاری ان سے ملاقات ہوئی تھی؟''

لوری ہچکچائی پھر اس نے تسلیم کیا۔ ''نہیں جناب ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو کیا تم اب اس عدالت کو یہ بتانے آئی ہو کہ یہ نیک اور شریف لوگ جنہوں نے اپنا وعدہ نبھایا، اس قابل نہیں کہ بچے کے والدین بن سکیں؟''

''بچہ میرا ہے۔ وہ ہمیشہ سے میرا تھا۔ بھلے وہ کہیں بھی رہے، وہ ہمارا ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی۔'' لوری نے احتجاج کیا۔

''اور ہمارے اس عدالت میں اکٹھا ہونے کا واحد

حیدر بخش حیدری، فورٹ ولیم کالج کے ممتاز مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ انہوں نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ حیدری کے آباؤ اجداد نجف اشرف سے ہندوستان آئے، دہلی میں سکونت اختیار کی، ان کے والد کا نام سید ابوالحسن ہے۔ حیدری دہلی میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ بنارس چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ نواب علی ابراہیم خان خلیل و مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم کی سرپرستی میں علم و ادب کا ذوق پیدا ہوا۔ غلام حسین شہید غازی پوری کے شاگرد ہوئے۔ حیدری نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، سلام اور منقبت میں زور طبع دکھایا ہے۔ دس سے زیادہ نثری کتابیں انہوں نے تالیف کی ہیں۔ چند برس کلکتہ میں قیام کرنے کے بعد 1814ء میں بنارس میں واپس آئے اور بنارس ہی میں 1238ھ/1823ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: قائم مہدی، کراچی

سبب یہی ہے نا؟''
''ہاں۔''
''کیا میں ایک مختلف بات کہوں؟ تمہیں یہ شریف لوگ مل گئے جن کے پاس ایک عمدہ گھر تھا اور جو کسی بچے کو پانے اور اس پر اپنی محبت نچھاور کرنے کو بے چین تھے۔ تم نے سوچا کہ اپنے بچے کا ان کے عمدہ گھر میں رہنے کا کتنا اچھا موقع ہے۔ بچہ محفوظ رہے گا جب کہ میں اور میرا بوائے فرینڈ اپنی زندگی گزارتے رہیں گے پھر جب کسی قابل ہو جائیں گے تو آکر اپنے بچے کو واپس لے لیں گے۔ مسز بربٹ کیا یہ سچ نہیں ہے؟'' پال گرجا۔
''یہ جھوٹ ہے۔'' لوری بولی اور رونے لگی۔
''مسز بربٹ، کیا تم لفظ فراڈ کا مطلب سمجھتی ہو؟''
''فراڈ؟''
''ہاں، دھوکا، دغا!''
''یور آنر۔'' ہنری احتجاج کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''یہ ایک غیر متعلق سوال ہے۔''
''یور آنر، یہ سوال غیر متعلق نہیں ہے۔ میں اپنی جرح جاری رکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' پال نے جواب دیا۔
''تم جاری رکھ سکتے ہو۔'' جج نے رولنگ دی۔
''لوری، دھوکا اور فریب اسے کہتے ہیں جو حقیقت کو چھپانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ کیا تم اس کا مطلب سمجھتی ہو؟''
لوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔
''فراڈ'' پال چیخا۔ ''حقیقت کو چھپانے کے لیے غلط نمائندگی۔ بچے کے باپ کی حیثیت سے ہنری بگیز کا نام لینا، حقیقت کو چھپانے کے لیے جھوٹی نمائندگی، ان شریف لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش جو تمہارے بچے کو اپنے گھر لے گئے اور اب تم ڈھائی سال کے بعد ان کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کے لیے اس عدالت میں آئی ہو؟''
لوری زور زور سے رونے لگی تھی۔ پال نے چند لمحے توقف کیا تاکہ وہ پُرسکون ہو جائے پھر دوبارہ جرح شروع کی۔ ''مسز بربٹ ایک عورت جو اتنی جھوٹی نمائندگی کی مرتکب ہو، جو اتنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چال چل سکتی ہو۔''
''یور آنر۔'' ہنری نے مداخلت کی۔ ''گواہ پر کوئی چال چلنے کا الزام عائد کرنے کی کوئی بنیاد نہیں۔''

''معزز حضرات۔'' جج ہارٹ نے مداخلت کی۔ ''آپ دونوں اس قسم کی جرح سے پرہیز کریں جن سے انسانی جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال ہو۔'' مسٹر ہینڈرسن کیا آپ گواہ سے مزید سوالات کرنا چاہتے ہیں؟''
''نہیں یور آنر۔''
''مسٹر کلے میٹ؟''
''صرف ایک سوال۔'' ہنری نے کہا اور اپنی گواہ کی طرف مڑ گیا۔ ''لوری جب تم نے اپنے بچے کے باپ کے لیے فرضی نام استعمال کیا تھا تو کیا تمہیں اس قانون کا علم تھا جس کے تحت تمہارا شوہر بعد میں اپنے بچے کی واپسی کا دعویٰ دائر کر سکتا تھا؟''
''نہیں جناب، میں یہ نہیں جانتی تھی۔''

☆......☆

''یور آنر، آپ نے مجھے طلب کیا تھا؟'' نوجوان خاتون وکیل نینسی بروک نے جج ہارٹ کے چیمبر میں داخل ہو کر پوچھا۔
''ہاں نینسی، میں ایک موکل کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں جسے بہت ہی مضبوط اور دلیر اٹارنی کی ضرورت ہے کیونکہ وہ خود اپنی نمائندگی نہیں کر سکتا۔'' جج ہارٹ نے کہا۔
''کیا وہ کسی قسم کا معذور ہے؟''
''ہاں۔'' جج نے جواب دیا۔ ''وہ محض ڈھائی سال کا ایک بچہ ہے اور قانون اسے ایسی کوئی مراعات نہیں دیتا کہ کوئی اٹارنی اس کی زندگی کی سب سے اہم قانونی پیش رفت میں اس کی پیروی کرے۔''
''اور آپ چاہتے ہیں کہ میں......!''
''ہاں۔''
''میں سمجھ گئی یور آنر۔''
''میں کورٹ کے بجٹ سے تمہاری فیس کا اہتمام کر دوں گا۔''

☆......☆

اگرچہ پال ہینڈرسن اور ہنری کلے میٹ میں سے کسی نے بھی اس کیس میں کسی تیسرے اٹارنی کی مداخلت کی پذیرائی نہیں کی تاہم انہوں نے اعتراض کرنا بھی درست نہیں سمجھا اور پال کو اپنے موکلوں کو صورتِ حال کی وضاحت کرنی پڑی۔ ''لیکن ہم اسکائی کے حقوق کا تحفظ تو کر ہی رہے ہیں۔'' کرسٹی نے احتجاج کیا۔

''کرسٹی میں تمہارا وکیل ہوں۔ بیکر کا وکیل ہوں۔ اب اسکائی کا بھی ایک وکیل ہوگیا ہے، اگر جج ہارٹ کہتا ہے کہ اس کا بھی ایک وکیل ہونا چاہیے تو ہم اس کے حکم سے روگردانی نہیں کر سکتے۔'' پال نے جواب دیا۔ ''اگر گینسی بروک یہاں آئے تو اس کا استقبال کرنا۔''

سوموار کی صبح جج ہارٹ نے مقدمے کی سماعت پھر شروع کردی۔ ''مسٹر ہینڈرسن، آپ اپنے گواہ کو طلب کریں۔'' اس نے حکم دیا۔

پال نے بیکر کو گواہ کے کٹہرے میں طلب کرلیا۔ بیکر نے پہلے حلف اٹھایا اور پھر پال نے اس سے پوچھا۔ ''مسٹر بیکر کیا یہ درست ہے کہ 24 جون کو اسی عدالت کے ایک جج نے اس حکم نامے پر دستخط کیے تھے جس کے مطابق اسکائی قانونی طور پر تمہارا بیٹا قرار دیا گیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''شکریہ۔'' پال نے کہا۔ پھر ہنری سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کا گواہ۔''

''مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔'' ہنری نے اپنے حق سے دستبرداری کا اعلان کردیا۔

''اب میں مسز کرسٹی بیکر کو گواہ کے کٹہرے میں طلب کرتا ہوں۔'' پال نے بہ آواز بلند کہا۔

کرسٹی نے آکر حلف اٹھایا۔ ایسے میں ہنری کلے میٹ اسے بغور گھورتا رہا تھا۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا کرسٹی اسے توقع سے بڑھ کر سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''مسز بیکر آپ کے کتنے بچے ہیں؟'' پال نے پوچھنا شروع کیا۔

''دو بیٹے ہیں، اسکائی اور ڈیوڈ۔''

''اسکائی کب سے تمہارا بیٹا ہے؟''

''جب وہ تین دن کا تھا، تب سے۔''

''ہز آنر کو بتاؤ کیا تم اور تمہارا شوہر اسکائی کو اتنا ہی چاہتے ہیں گویا وہ تمہارا سگا بیٹا ہو؟''

''ہاں، جناب۔''

''کرسٹی، عدالت کو بتاؤ، کیا تم نے بچے کی سگی ماں لوری ایڈمز پر بھروسا کیا تھا؟''

''جی، جناب لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ دو ہی سال کے بعد اپنا بیٹا واپس لینے کے لیے ہم پر مقدمہ دائر کردے گی۔''

''لوری، اگر تمہیں یہ علم ہوتا تو کیا تم اور بیکر اس بچے کو گود لیتے؟''

''ہرگز نہیں۔'' کرسٹی نے جواب دیا۔ ''کیونکہ ہمیں جس کرب سے گزرنا پڑ رہا ہے اس کے پیشِ نظر ہم کبھی اسے گود نہ لیتے۔''

''کیا اسکائی پر بھی اس کا کوئی اثر ہوا ہے؟''

''ہاں وہ ان باتوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے یہ خوف لاحق ہے کہ کوئی اسے اس کے گھر سے چھین کر لے جانا چاہتا ہے۔''

''شکریہ، کرسٹی۔'' پال نے کہا۔ پھر ہنری سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کا گواہ۔''

ہنری کلے میٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کرسٹی، ہمیں یہ بتاؤ کیا اسکائی نے تم سے کبھی یہ کہا کہ ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ وہ لوگ مجھے لے جائیں گے؟''

''نہیں، مگر......''

''کرسٹائن کیا تمہارا جواب نفی میں ہے؟''

''ہاں مگر......!''

کرسٹائن عدالت کے قواعد و ضوابط میں اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اب ہمیں یہ بتاؤ کہ SIDS کی اصطلاح تمہارے لیے کیا معنی رکھتی ہے؟''

''آبجکشن می لارڈ۔'' پال اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ سوال غیر ضروری اور غیر متعلق ہے۔''

''یور آنر، یہ سوال نہ تو غیر ضروری ہے اور نہ ہی غیر متعلق ہے۔ کیا میں اپنی جرح جاری رکھ سکتا ہوں؟''

''جاری رکھ سکتے ہو۔'' جج ہارٹ نے ایک لمحہ غور کرنے کے بعد کہا۔

''ہاں تو کرسٹی؟''

''یہ کسی بچے کی اچانک موت کی اصطلاح ہے۔'' کرسٹی نے جواب دیا۔

''کیا تمہارا بچہ اسی سنڈروم کا شکار ہوا تھا؟''

''ہاں جناب۔''

''وہ بہت روتی ہے اور خود سے بار بار یہ سوال کرتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا، کیسے ہوا، میرے احساسات بھی یہی تھے پھر میں نے اور بیکر نے فیصلہ کیا کہ دوسرا بچہ ہی اس......!''

''لیکن اس میں دشواری ہوئی؟''

''ہاں ڈاکٹر کے مطابق یہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا۔''

''اور کیا تمہارے ماہر نفسیات نے یہ بھی کہا تھا کہ

جب کوئی عورت حاملہ ہونے کی اہل نہیں ہوتی تو کوئی بچہ گود لینے کے بعد اس کی اہل ہو جاتی ہے؟"

"ہاں، اس نے کہا تھا۔"

"اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس شیر خوار کو گود لینے کے بعد تم واقعی حاملہ ہوگئیں اور اب تم ایک صحت مند بچے کی ماں ہو؟"

"ہاں۔" کرسٹی نے جواب دیا۔

"گویا لوری اور بریٹ کے بچے کو گود لینا ایک طرح کا نفسیاتی علاج تھا؟"

"آبجکشن یو لارڈ۔" پال چیخا۔ "مسٹر کلے میٹ جرح کی حدود پار کر رہے ہیں۔ یہ لوگ نہایت نیک ارادے سے ایک تین دن کے بچے کو اپنے گھر لے گئے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے گھر میں اور دل میں جگہ دی اور ویسی ہی محبت اور شفقت اس پر نچھاور کی، جو سگے والدین اپنے بچوں پر کرتے ہیں۔"

"اور میں کہتا ہوں۔" ہنری نے کہا۔ "جب بچے نے ان کا مقصد پورا کر دیا تو اب یہ بچے کو ان کے جائز والدین کے حوالے کر دیں جیسا کہ اس ریاست کا قانون کہتا ہے۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔ یہ سچ نہیں ہے۔" کرسٹی روتی ہوئی بولی۔ "ہم اسکائی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔"

"سماعت کل صبح دس بجے تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔" جج ہارٹ نے رولنگ دی۔

☆......☆

کرسٹی نے گھر پہنچتے ہی اپنے اٹارنی پال کو فون کیا۔ "پال، کیا مسٹر کلے میٹ کا یہ کہنا درست تھا کہ ریاست کا قانون بچے کو اس کے والدین کے حوالے کرنے پر زور دیتا ہے؟"

"کرسٹی میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہمارا کام ثبوت اور گواہ کی مدد سے اس قانون پر غالب آنا ہے۔"

"لیکن قانون تو اس کا طرف دار ہے۔"

"ہاں۔" پال نے تسلیم کیا۔

"کیا ساری ریاستوں میں بھی یہی قانون ہے؟"

"اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں کہ دیگر ریاستوں میں کیا قانون ہے۔ ہمیں تو اپنی ریاست کے قانون سے سروکار ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" کرسٹی نے جواب دیا اور ریسیور رکھ کر بیکر کی طرف مڑی۔ "یہی قانون ہے۔"

"پال نے ہمیں پہلے ہی یہ بتا دیا تھا۔" بیکر نے کہا۔ "اور یہ کہ ہمیں اس پر غالب آنا ہے۔"

☆......☆

علی الصباح بیکر کی آنکھ کھلی۔ بیڈ پر نہ تو کرسٹی تھی اور نہ ہی اسکائی تھا۔ وہ اٹھ کر ڈیوڈ کے کمرے میں گیا۔ وہاں ڈیوڈ بھی نہیں تھا۔ وہ نیچے بھاگا۔ کچن خالی تھا۔ میز پر صرف ایک پرچی رکھی ہوئی تھی۔ "ڈارلنگ ہمارے بارے میں پریشان مت ہو۔ ہم خیریت سے ہیں اور اس قانون سے بھی محفوظ ہیں جو اسکائی کو ہم سے چھیننا چاہتا ہے۔ میں بعد میں تمہیں کال کروں گی کرسٹی۔"

بیکر کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر پال کو فون کیا۔ "پال۔" وہ پھٹ پڑا۔ "کرسٹی گھر میں نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وہ چلی گئی۔ دونوں بچے بھی اس کے ہمراہ ہیں۔"

"چلی گئی؟" فرط حیرت سے پال کی آواز بازگشت میں ڈھل گئی۔

"ہاں۔" بیکر نے کہا اور پھر اس کا پیغام پڑھ کر سنایا۔

"احمق......احمق عورت۔" پال خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "کیا وہ سمجھتی ہے کہ اس طرح وہ عدالت کی پہنچ سے دور ہو سکتی ہے؟"

"پال اب ہم کیا کریں؟" بیکر نے گھبرا کر پوچھا۔

"پہلا کام یہ کرنا ہے کہ کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کریں۔ ایک لفظ بھی نہیں۔" پال نے ہدایت کی۔ "کسی کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنی چاہیے۔"

"لیکن آج ہی صبح اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔"

"میں اس کے لیے کوئی راستہ نکال لوں گا۔ اس دوران تم ان کے سارے اعزہ و اقارب سے رابطہ قائم کرو، جن کے ہاں اس کے پناہ لینے کا امکان ہو۔ انہیں رازداری کی قسم دو، پتا کرو کہ وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے اور مجھے بتاؤ میں کورٹ روانہ ہونے تک گھر ہی میں ہوں۔"

اگلے تین گھنٹوں کے دوران بیکر اپنے ان تمام رشتے داروں کو کال کر چکا تھا جو ریاست کے باہر رہتے تھے اور جہاں کرسٹی کے پناہ لینے کا امکان تھا۔ سب کے سب یہ سن کر دنگ رہ گئے تھے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کریں گے لیکن کسی کو بھی کرسٹی کے بارے میں

کوئی علم نہیں تھا پھر جب اس نے دوبارہ پال کو فون کیا تو وہ کورٹ روانہ ہو چکا تھا اور ایک پیغام چھوڑ گیا تھا۔ ''مجھ سے کورٹ میں ملو۔''

بیکر کورٹ پہنچ گیا۔ پال وہاں اپنی میز پر بیٹھا نوٹس تیار کر رہا تھا۔ ''کیا رہا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں چل سکا۔'' بیکر نے سرگوشی کی۔

''ہمیں ہر قیمت پر اسے ڈھونڈنا ہے۔'' پال نے کہا۔ ''اور اس سے پہلے کہ کسی کو معلوم ہو سکے کہ وہ لاپتا ہے۔''

''اس نے بوکھلاہٹ میں یہ حرکت کی ہے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کی گواہی نے یہ مقدمہ ہار دیا ہے۔''

''اگر اس کی گواہی نے مقدمہ نہیں ہارا تو اس کی یہ حرکت مقدمہ ضرور ہرا دے گی۔'' پال نے کہا۔ ''ہنری بالکل یہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی جذباتی لغزش...... اگر وہ اسکائی کو عدالت کی دسترس سے دور رکھنے کے خیال سے بچوں کے ہمراہ بھاگ گئی ہے تو جج نہ صرف اسے توہین عدالت تصور کرے گا بلکہ یہ بھی کہ ایسی عورت ماں بننے کے قابل نہیں ہو سکتی۔''

''اگر جج نے اسے گواہ کے کٹہرے میں طلب کیا اور وہ موجود نہ ہوئی تو پھر تم کیا کرو گے؟'' بیکر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

پال کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جج سے کوئی بہانہ بھی تراش نہیں سکتا تھا۔

☆......☆

جج ہارٹ چند ہی منٹ کے بعد عدالت کے کمرے میں داخل ہوا۔ سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ جج نے اپنی نشست سنبھال لی اور دونوں وکیلوں سے مخاطب ہوا۔ ''کل جب ہم نے سماعت ملتوی کی تھی......!'' وہ اچانک رک گیا۔ ''مسٹر ہینڈرسن کیا تمہاری موکلہ کو آج دیر ہو گئی ہے؟''

''یور آنر۔'' پال مخاطب ہوا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میری موکلہ آج صبح دستیاب نہیں ہو سکے گی۔''

''دیکھیں مسٹر ہینڈرسن اگر یہ کوئی چال ہے تو......'' ہنری کلیمنٹ بول پڑا۔ پھر رک گیا۔ ''میں آپ کی موکلہ سے اپنی جرح مکمل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کونسلر۔'' جج نے کلیمنٹ کو مخاطب کیا۔ ''گزشتہ کل آپ نے گواہ سے جو غیر ضروری سخت رویہ اپنایا تھا اس کے پیشِ نظر یہ ممکن ہے کہ وہ آج آرام کرنا چاہتی ہو۔'' پھر وہ پال سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر ہینڈرسن اگر آپ کی موکلہ کل صبح گواہی دینے کے لیے دستیاب نہ ہوئی تو میں اس کی ساری گواہی اٹھا کر پھینک دوں گا۔''

''بے شک یور آنر۔'' پال نے اتفاق کیا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔

اسے کرسٹی کو ڈھونڈنے کے لیے چوبیس گھنٹے کی مہلت مل گئی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ کرسٹی کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا؟ چونکہ وہ اپنے مقدمے کا دفاع کر رہا تھا۔ اسے انسانی گواہوں کے ذریعے وہ دن پورا کرنا تھا۔ لہٰذا وہ مختلف گواہوں کو طلب کرتا رہا جو یہ گواہی دیتے رہے کہ کرسٹی اور بیکر بہت اچھے لوگ تھے۔ عدالت کے کمرے میں میڈیا کے نمائندوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ ان کے درمیان پٹریشیا بھی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ بیکر آج اکیلے ہی عدالت میں آیا تھا اور اپنے وکیل سے مل کر واپس چلا گیا تھا پھر یہ کہ پال عدالت کے کمرے سے بار بار نکل کر کسی کو کال کرنے جاتا تھا اور واپس آ جاتا تھا۔ اسے شبہہ ہوا اور وہ چپکے سے عدالت کے کمرے سے نکل گئی۔ ایک ٹیکسی پکڑی اور بیکر کے پاس پہنچ گئی۔ گھر کے باہر خیابان میں ایک کار کھڑی تھی۔ وہ ٹیکسی سے اتر آئی اور کھڑکیوں سے اندر جھانکنے لگی۔ اندر سناٹا تھا۔ بیکر کچن میں میز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں پورٹیبل فون تھا۔ وہ بار بار مختلف نمبر آزماتا ہوا لگ رہا تھا۔ گھر میں اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ کرسٹی نہ بچے۔ وہ خاموشی سے واپس آ گئی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پال کو عدالت کے باہر گھیر لیا۔ ''مسٹر ہینڈرسن آپ کے موکل اب تک بڑی پابندی سے عدالت میں پیش ہوتے رہے ہیں لیکن آج کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''گزشتہ کل مسز بیکر نے ایک سخت دن گزارا تھا۔'' پال نے جواب دیا۔ ''اس لیے میں نے سوچا بہتر ہے کہ آج وہ آرام کریں۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ جلدی سے بوتھ میں گھس گیا اور بیکر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ''بیکر۔'' اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''کچھ پتا چلا؟''

''نہیں اب تک تو نہیں۔'' بیکر کی آواز سنائی دی۔

''کوشش جاری رکھو۔'' پال نے پریشان ہو کر کہا۔

لنچ کے بعد جب وہ عدالت کے کمرے میں واپس آیا تو اسے اپنی میز پر ایک پرچی ملی۔ ''مسٹر ہینڈرسن فوراً میرے چیمبر میں پہنچو۔''

پال بھاگتا ہوا جج کے چیمبر میں داخل ہوا۔ وہاں

ہنری کلیمنٹ پہلے سے موجود تھا۔ ”کونسلر۔“ جج نے پال کو مخاطب کیا۔ ”تمہارے حریف نے مجھے ایک نہایت ہی پریشان کن واقعے کی اطلاع دی ہے۔“ اس کے لہجے سے برہمی ٹپک رہی تھی۔ ”کیا تم نے لنچ کے وقفے میں چینل آٹھ کو انٹرویو دیا تھا؟“

”ایک ٹی وی رپورٹر نے مجھے گھیر لیا تھا۔“ پال نے جواب دیا۔ ”لیکن اس میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔“

”مسٹر ہینڈرسن، اس خاتون رپورٹر نے کہا ہے کہ کرسٹی گھر میں نہیں ہے۔ بچے بھی نہیں ہیں۔ تم نے اس کی تردید یا تصدیق کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ میرے خیال میں مجھے یہ جاننے کا حق ہے کہ حقیقت کیا ہے۔“ ہنری کلے مینٹ نے کہا۔

”اور عدالت کو بھی یہ جاننے کا حق ہے۔“ جج نے اضافہ کیا۔

”یور آنر، میں اپنے موکل کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے بغیر اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”کیا تم بتانے سے انکار کر رہے ہو؟“ جج نے پوچھا۔

”میں جواب دینے سے قاصر ہوں۔“ پال نے جواب دیا۔

”اوہ کیا واقعی؟“ کلے مینٹ پھٹ پڑا۔ ”یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ جب کوئی عورت کسی بچے کو عدالت کے دائرۂ اختیار سے دور رکھنے کے لیے اسے لے کر بھاگ گئی ہو۔“

”کونسلر وہ بچہ اس مقدمے کا مدعا علیہ ہے۔“ جج نے کہا۔ ”چونکہ مسز بیکر نے اسے اس عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر لے جانے کی کوشش کی ہے، لہٰذا وہ توہین عدالت کی مرتکب ہوئی ہے اگر وہ اور بچہ کل صبح عدالت میں حاضر نہ ہوئے تو میں اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دوں گا۔“

☆......☆

”جب تک اس کی خبر نہ ملے، اپنے گھر سے ہلنا بھی مت۔“ پال نے فون پر چیخ کر بیکر سے کہا۔

”ہاں، ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔“ بیکر نے جواب دیا۔

”اگر وہ کل صبح بچے کے ساتھ عدالت میں پیش نہ ہوئی تو جج کھڑے کھڑے ہمارے خلاف فیصلہ سنا دے گا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ پال نے کہا۔ ”اور اب لائن چھوڑ دو، مبادا وہ کہیں سے فون کرے۔“

پال نے فوراً فون بند کر دیا۔ بیکر نے اپنی پیالی میں کافی انڈیلی ہی تھی کہ یکایک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ”بیکر۔“ وہ کرسٹی کی آواز تھی۔

”کرسٹی، تم کہاں ہو؟“ بیکر ماؤتھ پیس میں چیخا۔ ”مجھے بتاؤ میں وہاں پہنچتا ہوں۔“

”اوہ نہیں۔ ہم یہاں ہیں۔ میں ایک ہوٹل سے بول رہی ہوں۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔“

”کرسٹی۔“ بیکر نے منت کی۔ ”میری بات سنو۔ جج کو پتا چل گیا ہے۔ وہ کل صبح تم دونوں کو عدالت میں دیکھنا چاہتا ہے ورنہ وہ اسکائی کو ہم سے چھین لے گا۔“

”وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم ریاست سے باہر ہیں۔ اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔“

”وہ ایسا کر سکتا ہے۔ دوسری ریاستوں کی عدالتیں اس کی رولنگ کو موثر بنائیں گی۔“ بیکر نے جواب دیا۔

”یہ محض گیدڑ بھبکی ہے تاکہ ہم واپس آجائیں۔“

”کرسٹی تم عمر بھر قانون سے نہیں بھاگ سکتیں تم کہاں ہو؟“

”ہم قانون سے محفوظ ہیں۔“ کرسٹی کا جواب ملا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

بیکر مردہ ریسیور کو ہاتھ میں تھامے پریشانی کے عالم میں گھورنے لگا پھر اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ ”ہیلو کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“ دوسری طرف سے ایک شیریں آواز سنائی دی۔

”آپریٹر ابھی ابھی مجھے طویل فاصلے سے ایک کال موصول ہوئی تھی۔ وہ کال کہاں سے آئی تھی؟“ بیکر نے پوچھا۔

”سوری سر، اس کے لیے آپ کو میرے سپروائزر سے بات کرنا ہوگی۔“

”تو اپنے سپروائزر سے بات کراؤ۔“ بیکر نے اصرار کیا۔

چند ہی لمحوں کے بعد ایک مردانہ آواز سمع برگوش ہوئی۔ ”سر آپ کا کیا مسئلہ ہے؟“

بیکر نے اپنا وہی مدعا بیان کیا۔ ”مسٹر کیا یہ میڈیکل ایمرجنسی ہے؟“ سپروائزر نے پوچھا۔

”یہ قانونی ایمرجنسی ہے۔“ بیکر نے واضح کیا۔

”سوری سر، ہم اجازت کے بغیر کسی کو کوئی نمبر بتانے

سے قاصر ہیں۔" اس کے ساتھ ہی کلک کی آواز کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

بیکر نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر پال کا نمبر ڈائل کیا۔ "ہیلو۔" دوسری طرف سے پال کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"پال اس نے ابھی ابھی فون کیا تھا۔" بیکر بولا۔

"وہ بھلے ہی کہیں ہو، اسے واپس لاؤ۔ جاؤ جا کر اسے واپس لاؤ۔" پال برہمی سے بولا۔

بیکر نے اسے پوری بات بتا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ فون کمپنی نے اسے نمبر دینے سے انکار کر دیا تھا۔

"لعنت ہو، اس سے کیا خاک مسئلہ حل ہوگا۔" پال دہاڑا۔ "اجازت! انہیں اجازت چاہیے۔ اب صرف ایک ہی راستہ ہے۔ ہم جج ہارٹ کے ہاں چلتے ہیں اور سارے حقائق اس کے سامنے رکھتے ہیں۔ صرف وہی فون کمپنی کو نمبر بتانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔"

☆......☆

"ہیلو۔" جج ہارٹ کی بیوی نے فون اٹھا کر پوچھا۔ "کون بول رہا ہے؟"

جواب سن کر اس نے ریسیور اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیا۔ "ہینڈرسن۔"

"ہینڈرسن؟" جج کا لہجہ سرد تھا۔

پال نے شروع سے آخر تک ساری باتیں تفصیل سے اس کے گوش گزار کر دیں۔ "ایک منٹ مجھے ذرا سمجھنے دو۔" جج الجھ کر بولا۔ "کیا تم اس بات کا اقرار کر رہے ہو کہ تمہاری موکلہ میری عدالت کے دائرۂ اختیار سے بچنے کے لیے قصداً بچے کو لے کر ریاست کی حدود پار کر گئی؟"

"یور آنر مجھے افسوس ہے کہ یہ سچ ہے۔"

"ٹھیک ہے تم نے مجھے ذرا تاخیر سے یہ بات بتائی۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"فون کمپنی کو حکم دیں کہ وہ نمبر بتا دے تاکہ ہم کرسٹی کو ڈھونڈ کر اسے واپس لا سکیں۔" پال نے منت کی۔

"اس سے پہلے کہ میں حرکت میں آؤں، مجھے اس کیس کے دیگر وکلاء کو مطلع کرنا پڑے گا۔ تم ایک گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جاؤ۔"

رات کے دس بجے پال اور بیکر، جج کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہنری کلے جینٹ اور نینسی بروک بھی آ گئے۔ جج نے مختصر الفاظ میں صورت حال ان

جامی اور ثنائے علی

نورالدین عبدالرحمن، عرف عام میں ملا جامی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت 817ھ مطابق 7 نومبر 1414ء میں موضع جام (ہرات) میں ہوئی۔ اسی مناسبت سے اپنا تخلص جامی رکھا آپ مابعد دور تیموریہ کے شاعر ہیں۔ ان کے فضل و کمال اور علم و ادب کی تعریف ایرانی مصنفین کے علاوہ یورپین دانشوروں نے بھی کی ہے۔ آپ نے نثر اور نظم دونوں کی خدمت کی ہے، آپ تقریباً نوے کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی غزلوں کے تین دیوان ہیں، نظموں میں ان کی مثنویاں بہت مشہور ہیں۔ نفحات الانس، تحفۃ الاحرار جامی، شواہد النبوۃ، طبقات الصوفیہ، مثنوی یوسف زلیخا ان کی مقبول تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں۔ آپ نہایت خوش خلق اور شریف الطبع انسان تھے۔ آپ کی وسعتِ معلومات کا یہ حال تھا کہ اس زمانے کا کوئی دوسرا عالم ان کا ہم پلہ نہ سمجھا جاتا تھا اپنے زمانے میں آپ عالم یگانہ مانے جاتے تھے۔ 898ھ مطابق 9 نومبر 1442ء میں تقریباً اکیاسی برس کی عمر میں آپ نے مدینہ منورہ کے راستے میں انتقال کیا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقراشی

تاج محل کے سامنے دریا جمنا کے دوسری طرف آگرہ کا معروف قلعہ ہے۔ آگرہ فورٹ جسے اکبر اعظم نے 1685ء میں بنوایا تھا۔ آگرہ کا قلعہ دلی کے لال قلعے سے زیادہ بڑا اور خوب صورت ہے۔ اس کی فصیل بہت چوڑی ہے جیسا کہ قلعوں کی ہوتی ہے تاکہ کوئی آسانی سے اندر نہ آنے پائے۔ فصیل کے ساتھ گہری کھائیاں بھی تھیں جن میں پانی بھرا ہوتا تھا۔ آگرہ شہر کی بنیاد سکندر لودھی نے اپنے عہد حکمرانی میں رکھی تھی، اس سے قبل یہ ایک گاؤں تھا۔ سکندر لودھی کو یہ اس قدر پسند آیا کہ اس نے اسے دارالحکومت کا درجہ دے دیا اور دریا کے کنارے شہر کی حفاظت کے لیے قلعہ کی بنیاد رکھی۔ اکبر نے اپنے عہد حکمرانی میں اسے دوبارہ سرخ پتھر سے بنوایا۔ سات سال میں تعمیر ہونے والا یہ قلعہ اس دور میں بیس لاکھ روپے کی رقم سے بنا تھا اور شہر کو اکبر آباد کا نام دیا گیا جو بعد میں آگرہ کے نام سے موسوم ہوا۔

مرسلہ: حشمت شیرازی، ملتان

کے سامنے رکھ دی۔ ''یور آنر، میرے خیال میں میرے موکل کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ اسے جلد از جلد واپس لایا جائے۔'' نینسی نے کہا۔

''میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ بچے کو اس دائرۂ اختیار میں واپس لایا جانا ہی ہم سب کے مفاد میں ہو گا۔'' ہنری نے تائید کی۔

''پھر میں فون کمپنی کو کال کرتا ہوں۔'' جج نے کہا۔

اس نے فون کمپنی کو فون کر کے سپروائزر سے بات کی اور اسے حکم دیا کہ وہ اس ہوٹل کا جائے وقوع اور فون نمبر بتائے ورنہ اسے توہین عدالت کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے مطلوبہ اطلاعات بیکر کے حوالے کر دیں اور پھر مخاطب ہوا۔ ''میں کل صبح دس بجے آپ سب کو عدالت میں دیکھنا چاہوں گا۔''

☆......☆

رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے تھے۔ بیکر اپنی ریاست کے حدود سے 76 میل دور واقع اس ہوٹل کے باہر اپنی کار روک کر اتر پڑا۔ ہوٹل کا دفتر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دروازے پر مکے برسانے لگا۔ ایک عورت بھاگی بھاگی آئی۔ بیکر نے اسے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''روم نمبر 21۔'' اس نے بیکر کے سوال کے جواب میں کہا۔

بیکر نے روم نمبر 21 کے دروازے پر پہنچ کر نرمی سے دستک دی۔

''کون ہے؟'' اندر سے کرسٹی کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہنی یہ میں ہوں۔'' بیکر نے جواب دیا۔ ''دروازہ کھولو۔''

☆......☆

''مسٹر کلے مینٹ کیا آپ پہلے خلاصہ بیان کرنے کو تیار ہیں؟'' جج نے سماعت شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

''یور آنر ہم تیار ہیں۔'' ہنری نے جواب دیا۔ اس نے اپنے نوٹس کا سرسری جائزہ لیا اور پھر عدالت سے مخاطب ہوا۔ ''میں عدالت کی توجہ مدعی بریٹ، اس کی بیوی اور بچے کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو اسکائی نامی اس بچے کے سگے والدین ہیں جس کی عمر صرف ڈھائی سال ہے۔ بریٹ مالی اور جذباتی اعتبار سے بھی بچے کا شفیق باپ بننے کا اہل ہے۔ وہ اپنے اخلاقی فرائض انجام دینے کے لیے بے چین ہے اور اسی عدالت سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس امر کو ممکن بنا دے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''آیئے، ہم ان حقائق کا جائزہ لیں جو مقدمے کی سماعت کے دوران ابھرے ہیں۔ مدعی علیہان اپنے بچے کی اچانک موت کے المیے سے گزرے ہیں۔ ہمیں کرسٹی بیکر سے ہمدردی ہے جسے اپنے بچے کی موت کا سانحہ برداشت کرنا پڑا اور جو ماہر نفسیات کے زیر علاج رہنے پر مجبور ہو گئی۔ کرسٹی کے سائیکا ٹرسٹ نے اسے یہ مشورہ دیا کہ اس کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ وہ پھر سے حاملہ ہو جائے لیکن کرسٹی کئی ماہ تک حاملہ نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس کے سائیکاٹرسٹ نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ کسی کا بچہ گود لے لے۔ یور آنر، اسکائی کو گود لینے کے بعد کرسٹی حاملہ ہوئی اور اس نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ دوسرے لفظوں میں گود لیے جانے والے بچے اسکائی نے اس کا یہ مسئلہ حل کر دیا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' کرسٹی چیخ پڑی۔

''جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، اسکائی نے اس کا مقصد حل کر دیا۔'' ہنری دوبارہ گویا ہوا۔'' اس نے کرسٹی کے ذہن میں لگ جانے والی گرہ کھول دی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ بچے کو اس کی سگی ماں کی نرم و گداز آغوش میں دے دیا جائے جہاں اسے ممتا بھی ملے گی اور تحفظ بھی حاصل ہو گا۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کاش مسز بیکر اپنے دل میں لوری کے لیے وہی جذبات چاہتی جو لوری کے دل میں ان کے لیے تھے۔''

اس کے اس عجیب و غریب جملے نے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انہوں نے درست سنا تھا یا ہنری غلط بول گیا تھا۔ ہنری چند لمحوں تک اپنے جملے کے ردعمل کو طول دیتا رہا پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''یور آنر، میں اس عدالت کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کئی دن پہلے لوری کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔''

عدالت کے کمرے میں ایک شور بپا ہو گیا۔ سب لوگ یہ سن کر دنگ رہ گئے۔ جج نے سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا پھر برہمی سے ہنری سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر کلے مینٹ میں آپ کی ڈرامائی چال سے خوب واقف ہوں لیکن کیا اس پریشان اطلاع کا کوئی گواہ بھی ہے؟ اس کی کوئی بنیاد بھی ہے؟''

''یور آنر۔'' ہنری نے جواب دیا۔ ''مجھے کل ہی مسز بریٹ کی اجازت ملی ہے کہ میں اس المناک حقیقت کا پردہ چاک کر دوں۔''

''آپ اپنا بیان جاری رکھ سکتے ہیں۔'' جج نے رولنگ دی۔

ہنری نے لوری کی طرف اشارہ کیا لیکن کرسٹی سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کے پاس اب اپنا ایک بچہ ہے۔ کیا لوری بھی اس کی مستحق نہیں ہے؟ کیا آپ اپنے دل کو ٹٹول کر یہ کہہ سکتی ہیں کہ یہ لو اپنا بچہ لے لو۔ میں اسے تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ اسے اپنے سینے سے لگا لو۔''

کرسٹی نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لیے کرسی کے ہتھے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ''یور آنر۔'' ہنری کہہ رہا تھا۔ ''اس حقیقت پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے کہ لوری نے بچے کے باپ کا غلط نام بتا کر حکام کو گمراہ کیا لیکن میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ایک تنہا اور پریشان حال نوجوان خاتون کے حالات پر غور کریں جس کے سامنے یہ مسئلہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اگر وہ بچے کے باپ کا صحیح نام بتا دیتی تو اس شخص کا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ افواہ سازوں کو اس ابھرتے ہوئے اسٹار پر گندگی اچھالنے کا موقع مل جاتا جو ہر وقت ایسے موقعوں کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ وہ یہی کہتے کہ اس ابھرتے ہوئے اسٹار نے اپنی محبوبہ سے اس وقت بے وفائی کی جب اسے اس کی شدید ضرورت تھی۔ میں اپنے موکل کے بارے میں یہی کہوں گا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اس کے ہاتھ صاف ہیں۔ یور آنر، میں اس عدالت سے درخواست کروں گا کہ عدالت بچے کو اس کے والدین کے حوالے کر دے جو اس کے علم میں لائے بغیر غیر قانونی طور پر گود دے دیا گیا تھا۔ اس کے حقوق برقرار ہیں۔ میں اس عدالت سے اس کے حقوق برقرار رکھنے کی درخواست کرتا ہوں شکریہ۔''

جج نے پال ہینڈرسن کی طرف اشارہ کیا۔ ''یور آنر۔'' پال نے کہنا شروع کیا۔ ''ہمارا مقصد لوری پر بہتان باندھنا نہیں ہے۔ اس کے اس فیصلے پر بھلا یا برا جو بھی کہا جائے، عدالت صرف قانونی نتیجے کو مدنظر رکھنے پر مجبور ہے۔ ایک نومولود کو ایک نہایت عمدہ جوڑے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ہاں، میری موکلہ انتہائی بے بسی اور پریشانی کے عالم میں بچہ بچے کو لے کر ریاست کی حدود سے نکل گئی تھی لیکن وہ رضاکارانہ طور پر واپس آ گئی۔ اس عدالت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ لوری سے ہمدردی کا اظہار کرے جس نے بچے کے باپ کی ساکھ کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے اس کا فرضی نام بتایا تھا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ عدالت ایک ایسی ماں سے کتنی ہمدردی ظاہر کرتی ہے جسے یہ خوف تھا کہ یہ عدالت کہیں اس سے وہ بچہ نہ چھین لے جسے وہ اس وقت سے پالتی آ رہی ہے جب وہ صرف تین دن کا تھا۔ ہم اس عدالت سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ غور کرے کہ کون فریق معصوم ہے؟ اگر دونوں ہی مساوی ہیں تو کون ترجیح کا حقدار ہے؟ وہ معصوم اور شریف لوگ جنہوں نے اس قانونی دستاویز پر نیک نیتی سے عمل کیا جس کی بنیاد ہی جھوٹ پر تھی یا وہ فریق جس نے حکام کو گمراہ کر کے یہ تنازعہ پیدا کیا؟

جج ہارٹ نے میز پر انگلیاں کھٹکھٹاتے، نینسی بروک کی جانب دیکھا۔ ''مس بروک، آپ کا خلاصہ۔''

''یور آنر میں جو کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں وہ معمول کے خلاف ہے۔'' نینسی نے کہا۔ ''میں اپنا خلاصہ آپ کے چیمبر میں بیان کروں گی۔''

جج نے ایک لمحہ غور کیا۔ پھر رولنگ دی۔ ''درخواست منظور کی جاتی ہے۔''

''اس موقع پر نہ تو مسٹر کلے مینٹ اور نہ ہی مسٹر ہینڈرسن موجود ہوں۔'' نینسی نے مزید کہا۔ ''میں یور آنر سے گزارش کروں گی کہ سوائے کرسٹی، لوری اور بچے کے کوئی بھی وہاں موجود نہ ہو۔''

''کونسلر، تم کیا ثابت کرنے کی اُمید رکھتی ہو؟''

''یور آنر، میں ایک بہت ہی مشکل پوزیشن میں ہوں۔'' نینسی نے جواب دیا۔ ''مجھے ایک ایسے موکل کی پیروی کرنے کو کہا گیا ہے، جس کا کوئی گواہ نہیں ہے لہٰذا میں آپ سے ایک خلاف معمول درخواست کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں ورنہ میرے موکل کے حقوق پامال ہوں گے۔''

''میں کونسل کی یہ درخواست منظور کرتا ہوں۔'' جج نے کچھ سوچ کر رولنگ دی۔ ''یہ کارروائی کل صبح ہو گی۔''

☆......☆

اگلی صبح کرسٹی، اسکائی کے ساتھ جج کے چیمبر میں پہنچی۔ اس کے دس منٹ کے بعد نینسی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے اپنے ننھے موکل کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک کر اسے پیار کیا پھر اٹھ کر کرسٹی کی طرف دیکھا۔ ''مسز بیکر آپ یقین کریں اسکائی کی خاطر یہ میٹنگ اشد ضروری تھی۔'' اس نے کرسٹی کے تاثرات بدلتے ہوئے دیکھے۔ وہ دروازے کی طرف مڑی وہاں لوری بریٹ کھڑی ہوئی تھی۔

''میرے وکیل نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ یہ یہاں ہو گی۔'' کرسٹی بولی۔

’’میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، یہ میرا آئیڈیا نہیں تھا۔‘‘ لوری نے جواب دیا۔
’’مسز بیکر اور مسز بریٹ یہ میرا آئیڈیا تھا۔‘‘ نینسی نے باری باری دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’آپ دونوں اپنے اپنے جذبات پر قابو پائیں ورنہ جج ہارٹ کے فیصلے پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔‘‘
اس کی یہ دھمکی کارگر ہوئی۔ اس نے ننھے اسکائی کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’تم اسے کہاں لے جارہی ہو؟‘‘ کرسٹی پوچھ بیٹھی۔
’’جج سے ملانے۔‘‘ نینسی نے جواب دیا اور وہ دونوں دروازے کے پیچھے جج کے چیمبر میں غائب ہوگئے۔
جج نے اپنا سیاہ لبادہ اتارا اور نینسی کے ہمراہ اسکائی کو بڑھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ’’آگے بڑھو، اسکائی جج ہارٹ کو ہیلو کہو۔‘‘
’’ہیلو اسکائی۔‘‘ جج نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔
’’آپ وہی جج ہیں جس کا ممی ذکر کرتی رہتی ہیں؟‘‘ اسکائی نے پوچھا۔
’’ہاں بالکل۔‘‘ جج مسکرایا۔ ’’اچھا کونسلر یہ بتاؤ تم نے اس میٹنگ کی درخواست کی تھی تو تمہارے ذہن میں کیا تھا؟‘‘
نینسی جواب دینے کے بجائے دروازے تک گئی۔
’’مسز بریٹ۔‘‘ اس نے پکارا۔
لوری بے تابی سے بڑھی اور چیمبر میں داخل ہوگئی۔ نینسی نے دروازہ اندر سے بند کردیا۔ لوری، اسکائی کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل اس نے اپنی بانہیں پھیلادیں۔ ’’اسکائی۔‘‘ وہ مسکرا کر بولی۔
اسکائی پیچھے ہٹ گیا اور جج کی وسیع میز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ ’’اسے پھسلاؤ۔‘‘ نینسی نے نرمی سے کہا۔
’’اسکائی میں تمہاری......‘‘ لوری یکایک رک گئی۔ مبادا لفظ ماں بچے کو متنفر نہ کردے۔ ’’میں تمہاری دوست ہوں۔‘‘
جج اور نینسی دونوں ہی اس کرب کو محسوس کرسکتے تھے جس سے لوری اس وقت گزر رہی تھی۔ ’’اس کی طرف اپنی بانہیں پھیلاؤ۔‘‘ جج نے سرگوشی کی۔
لوری نے ویسا ہی کیا لیکن بچے نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ لوری کو گھورتا رہا۔ لوری نے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ بچہ مچلنے لگا۔ آخر کار لوری کو اسے آزاد کرنا پڑا۔ وہ بھاگ کر نینسی کے پاس پہنچ گیا۔
’’ابھی یہ مجھے پہچانتا نہیں ہے۔‘‘ لوری جج سے بولی۔ ’’جب وہ جان جائے گا تو مجھ سے محبت کرنے لگے گا۔ آپ دیکھیے گا۔‘‘ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
جج کو اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ’’کونسلر، تمہیں کچھ کہنا ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’مسز بریٹ، مجھے بے حد افسوس ہے۔‘‘ نینسی بولی۔ ’’آپ جاسکتی ہیں۔‘‘
جب لوری آنسو بہاتی ہوئی وہاں سے نکلی تو کرسٹی کو بھی اس پر ترس آنے لگا پھر وہ اپنا نام پکارے جانے پر جیسے ہی چیمبر میں داخل ہوئی۔ سہما ہوا اسکائی اسے ممی ممی پکارتا ہوا اس کی طرف لپکا اور اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما گیا۔ جج ہارٹ یہ منظر دیکھ کر برہم ہوگیا۔
’’کونسلر۔‘‘ اس نے مضطرب ہوکر پوچھا۔
نینسی اس کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ اس کا سامنا کرنے کو تیار تھی۔ ’’مسز بیکر آپ اور اسکائی باہر انتظار کریں۔‘‘ وہ بولی۔
دونوں باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی جج نینسی پر برس پڑا۔ ’’مسز بروک تم نے تو میرے چیمبر میں اپنے کیس کا خلاصہ بیان کرنے کی درخواست کی تھی جو میں نے قبول کرلی تھی لیکن تم یہ مظاہرہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟ یہ تو کوئی احمق بھی سمجھ سکتا ہے کہ بچہ ایک اجنبی عورت کے مقابلے میں اسی عورت کو ترجیح دے گا جسے وہ ساری عمر ماں سمجھتا آیا ہے۔ تم نے لوری کو بے حد ذہنی اذیت دی ہے۔ مجھے تمہاری اس حرکت پر بے حد حیرت ہوئی ہے اور شاک پہنچا ہے۔‘‘
’’یور آنر۔‘‘ نینسی نے وضاحت کرنا چاہی لیکن جج کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھا۔ ’’اس کیس کے جذباتی عناصر مجھ پر بے حد اثر انداز ہوئے ہیں۔‘‘ وہ بولا۔ ’’لیکن ججوں کو جذبات کی رو میں نہیں بہنا چاہیے۔ ہم قانون کے ترجمان اور محافظ ہیں اور یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ اس ریاست کا قانون سگے والدین کے حقوق کی حمایت کرتا ہے۔ کونسلر تم قانون کو اتنی ہی اچھی طرح سمجھتی ہو جتنی اچھی طرح میں سمجھتا ہوں۔‘‘
’’جی ہاں لیکن اسکائی نہیں سمجھتا۔‘‘ نینسی نے دفاع کیا۔
’’یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟‘‘
’’میں نے اسے قانون سمجھانے کی کوشش کی تھی۔‘‘ نینسی نے جواب دیا۔ ’’لیکن وہ نہیں سمجھ سکا۔ اب وہ ایک

سمجھدار لڑکا ہے۔ اگر وہ نہیں سمجھ سکا تو اس میں شاید میرا ہی قصور ہو۔ مجھے اسے یہ سمجھانے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے کہ آج اس کی ایک ماں ہے اور کل کوئی اور ہو گی اور وہ ساری عمر یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہے گا کہ اس کی پہلی ماں کہاں گئی جس سے وہ اتنا پیار کرتا تھا اور جب رات کی تاریکی میں وہ اس کے لیے روئے گا تو کون اسے قانون سمجھائے گا؟ کون اسے تسلی دے گا اور کون اسے یہ قانونی سرجری کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرے گا؟ جس دن آپ فیصلہ لکھنے بیٹھیں اس دن اس کی وضاحت ضرور کر دیں، یہی میرا خلاصہ ہے۔''

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جج نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکی تھی اور اب جج کو تنہا اس مقدمے کا فیصلہ کرنا تھا۔

☆......☆

اگلی صبح جج ہارٹ کے چیمبر میں کرسیاں دو گروپوں میں بچھائی گئی تھیں۔ ایک گروپ کے لیے دائیں طرف اور دوسرے گروپ کے لیے بائیں طرف۔ جب دونوں فریق اور ان کے وکلاء بیٹھ گئے تو جج ہارٹ چیمبر میں داخل ہوا۔ سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ''سب لوگ بیٹھ جائیں۔'' جج نے اشارہ کیا اور پھر اپنی نشست سنبھال کر اپنا فون اٹھالیا۔ ''اب بھیج دو۔'' وہ اپنی سیکریٹری سے بولا۔

دروازہ کھلا اور نینسی، اسکائی کا ہاتھ تھامے ہوئے، چیمبر میں داخل ہوئی اور پھر وہ دونوں جج کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

''مسٹر کلیمنٹ، مسٹر ہینڈرسن، مسٹر اور مسز بریٹ اور مسٹر اور مسز بیکر۔'' جج نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے آپ لوگوں کو میڈیا کے مجنونانہ جوش وخروش سے بچانے کے لیے اپنا فیصلہ عدالت کے کمرے میں سنانے کے بجائے اپنے چیمبر میں سنانے کو ترجیح دی۔ اس فیصلے تک پہنچتے ہوئے، مجھ پر بہت ساری چیزیں اثر انداز ہوئیں۔ سب سے زیادہ اس ریاست کا قانون اثر انداز ہوا۔''

بیکر نے کرسٹی کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا تاکہ وہ کہیں رو نہ پڑے۔ بریٹ نے تسلی آمیز نظروں سے لوری کی طرف دیکھا۔ نینسی بروک نے اپنے مؤکل کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے۔

جج کہہ رہا تھا۔ ''میں نے انسانیت کے عناصر پر بھی مناسب وزن ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی آسان کام ثابت نہیں ہوا۔'' اتنا کہہ کر جج نے دو صفحے اٹھائے جس پر اس نے اپنا فیصلہ تحریر کیا تھا اور پڑھنے لگا۔ ''اس مقدمے میں عدالت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہی قانون لاگو ہوگا جس کا مدعی نے حوالہ دیا ہے۔ یہ اس ریاست کا قانون ہے کہ جہاں تک ممکن ہوگا قرابت داری غلبہ پائے گی۔ بجز ایسے کیس کے جس میں عدالت یہ محسوس کرے کہ بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی یا وہ درد و کرب میں مبتلا ہو جائے گا۔ وکلاء کی بحث اور گواہوں کے بیانات کی بنیاد پر یہ عدالت سمجھتی ہے کہ اگر اسکائی نامی اس بچے کو اس فیملی سے جسے وہ اپنی فیملی سمجھتا آیا ہے، اچانک جدا کر دیا جائے تو وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو جائے گا۔ لہٰذا عدالت مدعا علیہ بیکر اور کرسٹی...... کے حق میں فیصلہ دیتی ہے اور یہ امید کرتی ہے کہ مدعی اس فیصلے کے خلاف اپیل کر کے سب کے کرب کو طوالت نہیں بخشے گا۔''

لوری یہ فیصلہ سن کر رونے لگی۔ بریٹ نے تسلی دینے کے لیے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔

''مسٹر کلیمنٹ۔'' جج ہارٹ مخاطب ہوا۔ ''میں نے آپ کے مؤکلوں کو میڈیا سے بچانے کے لیے ججوں کی گزرگاہ سے نکالنے کا انتظام کیا ہے۔''

بریٹ اور لوری یہ سن کر بوجھل قدموں سے وہاں سے نکل گئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی کرسٹی بھاگ کر اپنے بیٹے کے پاس گئی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''ممی، آپ رو رہی ہیں؟'' اسکائی نے حیرت اور معصومیت سے پوچھا۔

کرسٹی روتے روتے ہنس پڑی۔ ''ہاں، ڈارلنگ، ممی رو رہی ہے۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔''

''ممی، اب ہم گھر چلیں؟''

''ہاں، اب ہم گھر چلیں گے۔''

''بیٹے، سب سے پہلے جج ہارٹ کا شکریہ ادا کرو۔'' بیکر نے اسکائی سے کہا۔

''شکریہ، جج۔'' اسکائی کچھ سمجھے بوجھے بغیر بولا۔

وہ تینوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اچانک اسکائی رک کر مڑا۔ ''بائے بائے نینسی۔'' اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ ہلایا۔

''بائے، اسکائی۔'' نینسی نے بھی ہاتھ لہرایا۔ ''خدا کرے کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔''



قسط نمبر: 23

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات نے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنر بیس پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلو خلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغواء کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون کر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں... کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا، ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھابھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہو گیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہو گیا۔ مجھے

انداز ہو چکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آ گیا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، میں اور کالیا رانا بشیر کے ہاں پہنچے تو اسے شاہ میر کے آدمیوں نے کور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بشیر نے پولیس بلوالی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر کو نہیں جانتے۔ ہم وہاں سے نکلے تو فوزیہ کا فون آ گیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکر مندی کا انداز اختیار کیا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نکل پڑے راستے میں بولے کہ عطا محمد انکار کر سکتا ہے کیونکہ یہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے ہیں گھر پہنچ کر میں نے عاصمہ کو بتایا اسی وقت دستک ہوئی۔ باہر پولیس والے تھے۔ وہ بولے کہ تمہیں ثمیر کے اغواء کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ مجھے تھانے لایا گیا۔ وہاں انسپکٹر رجب علی تھا۔ زنیرہ نے ضمانت کرائی کالیا کے ساتھ آ رہا تھا کہ راکا سے ڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے ہمیں گھیرنے کی کوشش، فائرنگ کی آواز پر بھیڑ جمع ہو گئی ہم کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ عاصمہ کی ضد پر اگلے دن رشتہ مانگنے عطا محمد کے گھر گئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ہم گھر آئے۔ اگلے دن کالیا پہنچا ہی تھا کہ جمی کا فون آ گیا۔ اسے ہم نے ثمیر کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو جمی نے بتایا ثمیر مر چکا ہے۔ شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اغوا کر کے کالیا نے جہاں رکھا تھا وہاں اس کی نگرانی کے لیے جمی کو بٹھایا گیا تھا اس نے فرار کی کوشش کرنے کی وجہ سے ثمیر کو گولی ماردی۔ اس حادثے پر ہم سب پریشان ہو اٹھے تھے لیکن لاش کو چھپانا بھی ضروری تھا، اسے لے جا کر میں نے ہاکس بے پر پھینکا۔ ادھر رانا بشیر اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھا کیونکہ وہ شاہ میر کے قبضے میں تھی۔ تھانے سے انسپکٹر دلشاد کا فون آ گیا کہ فوراً آ کر مجھ سے ملو۔ اس سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ بھی میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لاری اڈے کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ رانا بشیر نے مجھے اپنی کمپنی میں عہدہ دے کر بحرین بھیجنے کا کہا۔ بحرین پہنچتے ہی میرا ٹکراؤ راکا سے ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو بحرین میں میرا اکلوتا ہمدرد ہاشم بھی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اب میری مددگار صرف شہزادی نیلم ہو سکتی تھی۔ شہزادی نیلم کی وادی کا پانی اس کے مخالفین نے بند کر دیا تھا۔ کالیا بھی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ ہم صرائفہ کی شہزادی کی خاطر دشمنوں سے ٹکرائے۔ پانی کا پہرہ توڑ دیا تو صرائفہ میں پانی آ گیا۔ صرائفہ سے نکلے پہاڑی سلسلہ کو عبور کر رہے تھے کہ ایک مسلح دستے نے ہمیں گھیر لیا، ان میں راکا بھی تھا مگر ہم نے راستہ نکال لیا۔ شاہ میر کے آدمیوں نے راکا کو گولی ماردی۔ ہم نے بن رائد کو اغوا کر لیا۔ ہم گلنارا کے گھر میں بیٹھے تھے کہ گیٹ کے چوکیدار نے انٹر کام کیا۔

(اب آگے پڑھیں)

”کیا ہوا منصور بھائی ؟ کون آیا ہے باہر؟“ گلنارا نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے پریشانی سے پوچھا۔ ہماری یک ٹک نظریں بھی اس کے بھائی منصور کے چہرے پر جمی رہی تھیں۔

”پولیس آئی ہے باہر۔“ منصور نے جیسے ہماری سماعتوں میں دھماکا کیا۔

ریسیور اس نے دوبارہ انٹر کام پر اٹکا دیا تھا۔

”انہیں اندر لانا پڑے گا۔ وہ کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتی ہے۔“ اس نے بات مکمل کی۔

”مگر پولیس یہاں کیوں آئی ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ بہن گلنارا سے کچھ تفتیش وغیرہ کے سلسلے میں آئی ہے۔“ منصور نے جواب میں کہا اور بے اختیار میرے سینے میں اٹکی ہوئی سانس خارج ہوئی تھی۔ ورنہ تو مجھے یہی خدشہ لاحق ہو چلا تھا کہ کہیں شاہ میر والی ”بھاگا دوڑی“ میں پولیس کو مجھ پر شبہ تو نہیں ہو گیا تھا۔

تاہم میں نے کسی خیال سے سوال کیا۔ ”انہوں نے تفتیش کی نوعیت نہیں بتائی ؟“

”نہیں۔“

”انہیں لے آؤ اندر، باقی ہم سب دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔“ محمود الحسن نے کہا۔ ”باقی ہمارے بارے میں پولیس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سب نے اس کے مشورے پر صاد کرتے ہوئے وہ کمرا چھوڑ دیا۔ گلنارا ہی ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔

ذرا دیر بعد منصور نے آخر الذکر کمرے میں آ کر ہمیں پولیس کے اندر آ جانے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی اپنی بہن سے کہا۔ ”ہمشیرہ! آپ آ جائیں میرے ساتھ.....“

منصور اپنی بہن کے ساتھ نشست گاہ میں چلا گیا۔ شاہ میر کے منہ میں ہم نے کپڑا ٹھونس کر اسے ایک اور اسٹور نما کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔

منصور کے مطابق پولیس کے تین اہلکار تھے۔ ایک انسپکٹر تھا اور باقی دو اس کے ماتحت تھے۔

ہم سب دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے تو میں نے اپنی نشست چھوڑی اور ان کی گفتگو سننے کے لیے دروازے کے پاس جا کر کان لگا کے کھڑا ہو گیا، ساتھ ہی میں نے

دروازے کی درمیانی متوازی جھری سے انہیں دیکھنے کی بھی کوشش چاہی تھی۔

بحرین پولیس اپنی مخصوص وردی میں تھی۔ ایک بھاری بھرکم، دراز قامت اور چوڑے شانوں والا شخص اپنی وردی اور ان پر سجے ہوئے پھولوں سے انسپکٹر رینک کا ہی معلوم ہوتا تھا۔ باقی دونوں درمیانی قامت کے تھے۔

گلنار امقامی نہیں تھی، اسی لیے وہ اس سے انگریزی میں ہی باتیں کررہے تھے۔ رسمی کلمات کے بعد انسپکٹر نے اصل بات کی ابتداء کرڈالی۔ اس نے گلنارا کا بیان لیتے ہوئے بتایا کہ "حدی" والوں نے اپنے سلطان، بن رائد کی گمشدگی اور اغوا کی رپورٹ اس کے خلاف (گلنارا کے) دی ہے۔

اس کے جواب میں گلنارا نے انسپکٹر کے سامنے اپنے سخت ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، میرے شوہر کو دن دھاڑے قتل کردیا گیا اور قاتلوں کا تعلق جس گروپ سے تھا ان میں بن رائد کا نام بھی شامل ہے۔ وہ اس سلسلے میں ربع الخالی کی پولیس کو ثبوت بھی دے چکی ہے مگر پولیس نے ابھی تک ان پر ہاتھ نہیں ڈالا ہے۔

گلنارا کی اس بات پر انسپکٹر نے جواب میں بتایا کہ بہرام خان مرڈر کیس کا معاملہ سینٹرل پولیس ڈپارٹمنٹ کے سپرد کیا جا چکا ہے لہٰذا قاتلوں کی کھوج اور تفتیش وغیرہ، اب مشترکہ طور پر عمل میں لائی جارہی ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ پانی اور تیل کے تنازعے میں حدی اور صرائفہ والوں کی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ بھی ہوئی ہے۔

گلنارا اور منصور کو مجھ سے ان ساری باتوں کا علم تھا لیکن ان دونوں بہن بھائیوں، بالخصوص گلنارا نے اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بتادیا کہ ان کے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اس پر انسپکٹر نے کہا کہ جو لوگ حدی والوں کے دشمن ہیں یا جنہوں نے بن رائد کو اغوا اور یرغمال بنارکھا ہے ان کا تعلق گلنارا کے قریبی دوستوں میں سے ہے۔

میں دروازے کے پیچھے ہونٹ بھینچے یہ سب سن رہا تھا۔ اس الزام پر گلنارا نے بڑی جرأت اور بہادری کے ساتھ انسپکٹر کو سخت جواب سے نوازدیا کہ، یہ اس پر الزام ہے۔ قاتل اپنے گھناؤنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ چال چل رہے ہیں۔ آپ پہلے میرے شوہر کے قاتلوں کو گرفتار کریں تاکہ اُلٹا مجھ سے ہی پوچھ گچھ کرنے آگئے۔

انسپکٹر کچھ لاجواب سا ہونے لگا۔ تب اس نے دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔ مناوا کے ساحلی علاقے میں بن رائد کے بنگلے پر "مارا ماری" کے بارے میں گلنارا سے دریافت کرنا چاہا مگر گلنارا نے اس سے بھی یکسر لاعلمی کا اظہار کردیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ اپنے دونوں ماتحت ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوگیا۔

پولیس کے جاتے ہی ہم سب نے سکون کی سانس لی تھی کیونکہ ان کا ایک مجرم شاہ میر یہاں موجود تھا۔

ان ساری باتوں کے تناظر میں سب کی سوالیہ نظریں میری طرف اُٹھ گئیں۔ "اگر پولیس شاہ میر کے پیچھے لگی ہوئی تھی تو اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ پولیس کے ہتھے چڑھا دینا چاہیے تھا۔ منصور نے کہا تھا۔"

"میرے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی۔" میں نے پوری تسلی سے جواب دیا۔ "اوّل تو شاہ میر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی اور وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہی تھی۔ خود میں شاہ میر کی انٹرکولر گاڑی کے تعاقب میں تھا۔ ایک موقع پر شاہ میر اپنی گاڑی چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں تھا اگر میں اسے دبوچ نہ لیتا تو وہ نکل چکا ہوتا۔ اب کم از کم وہ میری گرفت میں تو ہے نا..... ! فرحانہ کا بیان اب نہ صرف شاہ میر بلکہ بن رائد کو بھی قانون کے شکنجے میں جکڑ سکتا ہے۔"

"فرحانہ زندہ بچے گی تب ناں؟" منصور نے کہا۔

"شاہ میر یہاں سے جاتے ہی سیدھا پولیس اسٹیشن کا رخ کرے گا اور ہم سب پر الزام تھوپ دے گا کہ ہم نے اسے یہاں غیر قانونی طور پر یرغمال بنائے رکھا تھا۔"

اس کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے کہا۔ "شاہ میر میرا شکار ہے۔ میں اس سے خود ہی نمٹ لوں گا مگر یہ مت بھولو منصور بھائی کہ اس کا تعلق تمہارے بہنوئی کے قاتلوں سے بھی رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہمیں الہدیٰ اسپتال فون کرکے فرحانہ کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔" گلنارا نے یک دم مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اپنے بھائی اور میرے درمیان ہونے والی بحث کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔

ابھی ہم یہی باتیں کررہے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی بیل گنگنائی۔

"سسٹر آسیہ کا ہوگا۔" گلنارا نے فوراً کہا۔ یہ نرس

تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جلد فرحانہ کی حالت سے متعلق انہیں بتائے گی۔

لہٰذا یہ کہتے ہوئے گلنارا فون کی جانب لپکی۔ ہم سب کی دھڑکتی سی نظریں اس پر جم گئیں۔ میں دل ہی دل میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے فرحانہ بچ گئی ہو۔

''یس، سسٹر آسیہ! کیا ہوا فرحانہ کا؟ وہ بچ گئی؟'' گلنارا نے بڑی بے چینی سے دریافت کیا۔

''کیا......!'' دوسری جانب سے کچھ سن کر فرحانہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ہم سب کے دل یکبارگی اندیشے سے دھڑک اُٹھے۔

''اوہ...... اللہ کا شکر ہے۔'' گلنارا کے منہ سے دعائیہ کلمات ادا ہوتے ہی ہم سب نے سکون کی سانس لی تھی۔

''کک...... کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟'' گلنارا نے جلدی سے پوچھا۔ پھر دوسری طرف سے کچھ سنتی رہی اس کے بعد ریسیور رکھ دیا اور ایک گہری سانس حلق سے خارج کرتے ہوئے ہمیں گویا یہ مژدہ جانفزا سنایا کہ وہ بچ گئی ہے اور اس کی حالت بھی خطرے سے باہر ہے۔ پیٹ میں گولی لگی تھی جو ایک بڑے آپریشن کے بعد ڈاکٹروں کی ٹیم نے نکال لی ہے۔ اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا ہے اور ابھی کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

''لیکن پولیس کو انفارم کرتے ہوئے اسپتال میں اس کے لیے سیکیورٹی کا بندوبست کرنا چاہیے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیونکہ شاہ میر یا بن رائد کے آدمی اسے اسپتال میں ہی ہلاک کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''وہ انتظام کیا جا چکا ہے۔'' گلنارا نے ایک تھکی تھکی سی سانس لے کر کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ہمیں پولیس کے ان انتظامات کا خود جائزہ لے کر تسلی کرنا ہوگی۔'' کالیا نے کہا۔

''یہ کام کم از کم تم دونوں نہیں کر سکتے۔'' منصور نے میری اور کالیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو محمود الحسن فوراً بولا۔

''یہ کام میرے ذمے چھوڑ دو۔ میں اپنے دو بہترین آدمیوں کے ساتھ خود بھی وہاں موجود ہوں گا لیکن یہ سوچو کہ اب شاہ میر کا کیا کرنا ہے؟ میرا نہیں خیال کہ اسے زیادہ دیر تک ہمشیرہ گلنارا کے مکان میں رکھ سکیں۔''

''میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔'' میں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا اور کالیا بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تت...... تم اس موذی کو ان حالات میں کہاں کہاں لیے پھرو گے؟'' گلنارا کو فکر ہوئی۔ میں نے اسے دکھانے کے لیے دانستہ ایک تلخ سی نگاہ اس کے بھائی منصور پر ڈالی اور بولا:

''یہ میرا درد سر ہے، آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔'' پھر کالیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''چلو یار! اُٹھاؤ شاہ میر کو اور کار میں ڈالو۔ فرحانہ کے بیان دینے سے پہلے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔''

کالیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ محمود بولا۔ ''لیکن...... میرا خیال ہے کہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور کن انکھیوں سے قریب خاموش کھڑے منصور کی طرف دیکھا۔

چند ثانیے متوقف ہوا پھر وہ بولا۔ ''نومی بیٹا! تم ایسا کرو میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں انکل! آپ نے جس کام کا ذمہ اُٹھایا ہے آپ وہی انجام دیں، وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔'' میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے محمود الحسن سے کہا۔ ''میں اور کالیا اپنے معاملے کو بہ خوبی ہینڈل کر لیں گے۔''

شہزادی نیلم نے مجھے اپنے ساتھ صرائفہ چلنے کا مشورہ دیا تو میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ ہم اور کہاں جا سکتے ہیں وہیں آئیں گے مگر ابھی نہیں، پہلے ہم ربع الخالی پہنچیں گے، اس کے بعد ہی فیصلہ کریں گے۔

تاہم شہزادی نیلم نے اس آڑے وقت میں یہی کہا تھا کہ ان دونوں یرغمالیوں یہ شمول بن رائد اور شاہ میر کو صرائفہ لیے چلتے ہیں۔ میں نے پہلوتہی کرتے ہوئے کہا کہ فی الحال آپ اور راشد جلد از جلد صرائفہ پہنچنے کی تیاری کرو۔

اس دوران گلنارا نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر شاید بھائی کی موجودگی کے سبب کھل کر نہ کہہ سکی تاہم آخر میں یہ ضرور کہا۔

''سوری نعمان صاحب! آپ نے تو اپنی جان پر کھیل کر میری اور میرے بچوں کی جان بچائی تھی مگر میں آپ کے کسی کام نہ آسکی جس کا مجھے بے حد افسوس رہے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے مختصراً کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم او برائے گرانٹ کی کار میں منادا سے ربع الخالی کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

''یہ سالا منصور تو ایک دم زنخا ثابت ہوا۔'' کالیا نے راستے میں گلنارا کے بھائی پر تبصرہ کیا۔ ''میرا تو خیال یہی

تھا کہ شاہ میر کو ابھی وہیں رکھنا چاہیے تھا۔فرحانہ آج یا کل تک پولیس کو بیان دینے کے قابل ہو جاتی، تو پھر ہم......"

"ہم......" میں نے کار کے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے گومگو سے انداز میں کہا۔میری نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔"میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ شاہ میر کو ابھی وہیں رکھنا چاہیے تھا۔"

"لیکن یار! یہ ساری باتیں اپنی جگہ، سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اب فرحانہ کے بیان کے بعد شاہ میر کو پولیس کے حوالے بھی کیا جائے تو کیسے؟ سب سے پہلے تو ہم پر اغوا کا کیس بن جائے گا۔"

"اسی اُڑچن نے مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا ہے یار! تو ہی بتا کوئی طریقہ، یہ سالا شاہ میر تو چھچھوندر بن گیا ہے، نہ نگلنے کا نہ اُگلنے کا۔"

"سوچ لیتے ہیں، پہلے اس شہرِ خرابہ سے تو خیریت سے نکل جائیں۔" کالیا بولا۔

شاہ میر سے ہونے والی گفتگو اور اس کی دھمکیوں پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے کالیا نے بھی اسی طرح کی تشویش کا اظہار کیا تھا جو میرے اندر کوڑیالے ناگ کی طرح کلبلا رہے تھے کہ دبئی میں فہیم اور فوزیہ کی جان خطرے میں ہو سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے کالیا! تم اگلی صبح دبئی نکل جاؤ۔"

"ابے لے! یہاں اتنے ہنگامے منتظر ہیں تیرے۔ تجھے اکیلا چھوڑ کر میں کیسے دبئی چلا جاؤں۔" وہ بولا۔"بے فکر رہ جگری! جب تک یہ دونوں موذی بن رائد اور شاہ میر ہمارے قبضے میں ہیں فہیم بھائی اور فوزیہ کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔" کالیا کی بات پر مجھے کسی حد تک تسلی ہوئی تھی۔

ہم شام سے پہلے شہر کی حدود سے بخیریت نکل گئے تھے اور اب ربع الخالی کے صحراؤں میں گامزن تھے۔رائفل ہم نے کار گرانٹ کی کار کے خفیہ خانے میں ہی چھپا رکھی تھی۔باقی بن رائد کی جاجر سے چھینا ہوا ریوالور اور کالیا کی رائفل گرانٹ کے ہی سپرد کر آئے تھے۔

اوبرائے گرانٹ کے تہہ خانے والے مکان میں پہنچے تو گرانٹ وہاں موجود تھا، بن رائد طیش اور غضب ناک انداز میں ہمیں دیکھ کر غرانے لگا۔

ہم نے اسے ساری بات بتا کر کہا کہ شاہ میر نے اس کے ساتھ (بن رائد کے ساتھ) دوستی کی آڑ میں راکا کو ہلاک کر ڈالا ہے۔

بن رائد کو میری بات کا پہلے تو یقین نہ آیا لیکن جب شاہ میر سے اس نے میری بات کی تصدیق چاہی تو شاہ میر کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش نہ رہی تھی، کیونکہ فرحانہ اور شاہ میر کے بیٹے ثمیر والے معاملے کی اسے بھی خبر تھی۔

"تت......تم نے راکا کو ہلاک کر دیا شاہ میر؟" بن رائد اس پر پھٹ پڑا۔"جانتے ہو تم کہ راکا کی ہم دونوں کے بیچ کیا حیثیت تھی؟ اُوف......یہ کیا کر دیا تم نے شاہ میر؟ ...بن رائد نے جیسے اپنا سر پکڑ لیا۔"تم اب اپنے ساتھ مجھے مرواؤ گے، پولیس کے ہاتھوں بھی اور......اور......اُس کالے شیطان کے ہاتھوں بھی۔"

میں اس کی بات پر چونکا تھا، تاہم دل ہی دل میں ان دونوں شیطان کے چیلوں کو پریشان اور ہراساں دیکھ کر خوش بھی ہوا۔

"میں کیا کرتا پھر۔ان ظالموں نے پاکستان میں میرے بیٹے کو جان سے مار ڈالا۔میں انتقام کی آگ میں اندھا ہو گیا تھا۔" شاہ میر بوجھل سے لہجے میں بن رائد سے بولا۔اس مردود کا اشارہ میرے اور کالیا کی جانب تھا۔

"کچھ بھی تھا، تمہیں تھوڑا صبر سے کام لینا چاہیے تھا، فرحانہ ہمارے ہی قبضے میں تھی۔اس سے بعد میں بھی حساب چکتا کر سکتے تھے۔" بن رائد بولا۔

"اور تم جو یہاں موجود تھے۔تم نے کیوں انہیں فرحانہ کا پتا بتایا؟" شاہ میر نے چوٹ کی۔بن رائد کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اچانک گرانٹ نے کہا۔"ہوشیار! مجھے اُوپر کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔میں دیکھ کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گن اُٹھا کر سیلن زدہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

گرانٹ نے ہمیں بتایا تھا کہ کچھ مسلح لوگوں کی نقل و حرکت دیکھی گئی تھی۔وہ شاید بن رائد کی تلاش میں نکلے تھے، ممکن ہے یہ وہی ہوں۔

ذرا دیر بعد میں کالیا کو تہہ خانے میں ہی چھوڑ کر خود بھی پستول سنبھالے اُوپر آگیا۔وہاں گرانٹ مکان کے دروازے کی جھری سے باہر مدھم تاریکی میں باہر دیکھنے کی...کوشش کر رہا تھا۔اپنے عقب میں میری آہٹ پا کر مڑا تو مجھے مدھم سی روشنی میں بالکل قریب سے اس کے چہرے پر تشویش اور ایک جوش کی سی کیفیت کے آثار دکھائی دیئے۔

"کیا ہوا؟ خیریت؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وہ لوگ کافی تعداد میں باہر موجود ہیں۔" گرانٹ

نے سرگوشی میں بتایا۔ ''سب کے سب مسلح ہیں اور ہر گھر کی تلاشی...'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک بہت سے لوگوں کے زور زور سے بولنے اور متعدد قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔

ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس مکان کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

''واپس مڑو...... جلدی۔'' میں نے صورتِ حال کی سنگینی کو فوری بھانپتے ہوئے گرانٹ سے کہا اور ہم دونوں واپس اس کمرے کی طرف لپکے جدھر تہہ خانہ تھا۔

ابھی ہم اس کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک باہر سے دھڑ، کی زوردار آواز سے دروازہ ٹوٹ کر گرا۔

میں اور گرانٹ لپک کر تہہ خانے کے زینے میں اتر گئے اور اس نے نہایت چابک دستی کے ساتھ وہ راستہ برابر کر دیا جس سے ہم نیچے اس خفیہ تہہ خانے میں اُترے تھے۔ تاہم ابھی ہمارے قدموں نے تہہ خانے کے فرش کو نہیں چھوا تھا۔ ہم ان کی سن گن لینا چاہتے تھے کیونکہ میرا خیال یہی تھا کہ وہ مکان کی تلاشی لے کر واپس چلے جائیں گے، لیکن گرانٹ کا خیال مختلف تھا۔

''مسٹر ٹومی! یہ لوگ مقامی باشندے ہیں اور انہیں پتا ہوتا ہے کہ یہاں اکثر گھروں میں خفیہ تہہ خانے بھی ہوتے ہیں۔''

''اوہ!'' میرے ہونٹ تشویش زدہ انداز میں دائرے کی صورت سکڑ گئے۔

''کیا ہوا جگری؟ خیریت تو ہے؟ تم دونوں اُوپر!'' یہ کالیا کی آواز تھی۔ وہ نیچے تہہ خانے کے فرش سے بول رہا تھا۔

''شی ی ی......'' میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر گرانٹ سے مخاطب ہو کے سرگوشی میں بولا۔

''گرانٹ! تمہارا کیا خیال ہے، یہ اس تہہ خانے کو ڈھونڈ لیں گے؟''

اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنے کان اُوپر ہونے والی کھڑبڑ پر لگائے رکھے۔ کالیا نیچے کھڑا سر اُٹھائے اُوپر میری طرف ہی دیکھ رہا تھا، پھر وہ بھی تہہ خانے کے زینے چڑھ آیا۔ اس کے ہاتھ میں بن رائد کا ریوالور دبا ہوا تھا۔ میں نے اسے نیچی آواز میں موجودہ صورتِ حال کی سنگینی کے بارے میں بتا دیا۔

اُدھر اوبرائے گرانٹ ان کی سن گن لینے میں مصروف تھا کہ اچانک تہہ خانے کی ''چھت'' پر زور زور سے دھما دھم بج گئی۔

''نیچے اُترو جلدی۔'' گرانٹ نے فوراً کہا اور ہم نیچے فرش پر آ گئے۔ گرانٹ اُوپر چھت کی سمت دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں کو یہاں تہہ خانے کی بھنک پڑ چکی ہے، اب ان سے جنگ کرنا پڑے گی۔''

''ہم اس قبر نما تہہ خانے میں صرف تین افراد اتنے سارے لشکر سے جنگ نہیں کر سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''بن رائد ہماری قید میں ہے اور ہم اسے چارا بنا کے یہاں سے نکلنے کی بات کر سکتے ہیں۔''

''نہیں جگری! اب حالات اور ہیں۔ ہم بار بار بن رائد کو چارا نہیں بنا سکتے ہیں، ہمیں لڑنا پڑے گا۔'' کالیا بھی انگریزی میں بات کر رہا تھا کیونکہ گرانٹ ساتھ تھا۔ ''تمہارا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے، ٹومی!'' گرانٹ نے بھی اس کی تائید میں کہا۔

اچانک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور تہہ خانے کی چھت والا سوراخ اپنے خفیہ تختے سمیت نیچے آ رہا۔ اندر دھول مٹی اور گرد و غبار کا طوفان سا بچ گیا۔ ہماری حالت بھی خراب ہو گئی۔ کوئی کھانسنے لگا تو کسی کی آنکھیں جلنا شروع ہو گئیں۔

گھٹن کا احساس بھی سوا ہونے لگا۔ بہ مشکل میں نے خود کو سنبھالا تھا اور لپک کر کونے میں جا کھڑا ہوا۔ کالیا اور گرانٹ بھی لپک کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔

''ہم یہاں موجود ہیں۔'' موقع پاتے ہی بن رائد زور سے چلا کر بولا اور اسی وقت اُوپر سے کسی نے تیز روشنی نیچے پھینکی۔

میرا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا اور ...... رواں رواں جوش سے مرتعش تھا۔ اسی وقت گرانٹ کی گن نے برسٹ اگلا۔ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ ہی تیز چھناکے کی آواز بھی اُبھری تھی۔ اندھیرا ہوتے ہی کسی کے دھم سے تہہ خانے کے فرش پر گرنے کی آواز اُبھری۔

اوپر والے دشمن بھی ہوشیار تھے۔ وہ اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ کر دبک گئے اور پھر انہوں نے ایک اور چال چلی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اندر انہوں نے دو تین ٹیئر بم پھینک دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تہہ خانہ دھوئیں سے بھر گیا اور مجھے

یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں کسی نے مرچیں بھر دی ہوں۔ غشی بھی طاری ہونے لگی ہم سب بری طرح کھانسنے لگے اور پھر اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆......☆

پتا نہیں بے ہوشی سے ہوش آنے تک کتنا طویل وقفہ گزرا ہوگا، تاہم آنکھ کھلی تو میں نے خود کو رسن بستہ حالت میں کسی اندھیری جگہ پر پایا۔ میرے حواس بحال ہونے تک مجھے سب یاد آتا چلا گیا تھا۔ ٹیئر گیس کی وجہ سے میری آنکھوں میں ابھی تک جلن مچی ہوئی تھی اور آنسو نکلے جا رہے تھے، طرفہ تماشا تو یہ تھا کہ میں اپنی آنکھیں مسل بھی نہیں سکتا تھا کہ کچھ اسی طرح ہی میرے دونوں ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے کہ میں انہیں ہلا جلانے سے بھی قاصر تھا۔ یوں تکلیف کی شدت مزید بڑھتی محسوس ہونے لگی۔

''آہ......آ......آہ!'' مارے اذیت کے میرے حلق سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔

''ج......جگری! تت......یہ تو ہی ہے؟'' اچانک کہیں قریب بالکل قریب سے مجھے کالیا کی آواز سنائی دی۔ اس کا لہجہ اور آواز بھی ڈولتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ کالیا کی آواز سن کر میری ہمت ذرا سوا ہوئی۔ میں اپنی تکلیف بھلا کر بولا۔

''کک......کالیا! میرے یار! یہ میں ہی ہوں، تو کس طرف ہے؟ کیا تو بھی بندھا ہوا ہے؟''

''ہاں! جگری، میں تیری طرف گھسٹ کر آرہا ہوں۔'' کالیا بولا۔ ''پر تو ٹھیک تو ہے ناں؟ ابھی کراہ رہا تھا تو؟''

''میں ٹھیک ہوں، بس ذرا یہ آنکھیں آنسو گیس کی وجہ سے جل رہی تھیں۔ میں انہیں مسل نہیں پا رہا۔'' میں نے جواب میں کہا۔ مجھے اپنے دائیں جانب سے اس کی کچھ کھڑبڑاہٹ سی سنائی دی، پھر وہ مجھ سے آن لگا۔

''گرانٹ؟ مسٹر اوبرائے گرانٹ؟'' میں نے پکارا۔

''وہ بھی شاید ادھر ہی کہیں کونے میں پڑا ہوگا، بے ہوش ہوگا۔'' کالیا قدرے ہانپتے ہوئے بولا۔

''بہت اندھیرا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا۔'' میں بولا۔

''بہت برے پھنسے ہیں جگری! اللہ اب خیر ہی کرے۔ دونوں ہی ہمارے ایک سے بڑھ کر ایک دشمن ہیں۔''

''اور خار کھائے ہوئے بھی۔'' میں نے بھی کچھ ایسی ہی بے بسی سے کہا۔

''یہ گرانٹ کیوں ابھی تک چپ ہے؟ کیا اسے ہوش نہیں آیا ابھی تک؟ لگتا تو سخت جان کا آدمی ہے۔'' کالیا بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ میں مستغرق تھا۔ مجھے دبئی میں اب اپنے بھائی فہیم کی فکر ہو رہی تھی کیونکہ اب بساط الٹی ہوگئی تھی۔ شاہ میر ہی نہیں اس کے ساتھ بن رائد بھی ہماری گرفت سے آزاد ہو چکے تھے اور دونوں ہی ہم پر سخت ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

''کیا سوچ رہا ہے جگری؟'' مجھے ایک دم خاموش پا کر کالیا بولا۔

''سوچ رہا ہوں، دیکھتے ہی دیکھتے بازی پلٹ گئی۔ کہاں دشمن ہماری قید میں تھے اور اب ہم......''

''یہی دستور جنگ ہے جگری!'' کالیا بولا ''کبھی جیت تو کبھی مات۔''

''لیکن کالیا! اس بار کی مات معمولی نہیں لگتی۔'' میرے لہجے میں تشویش تھی۔

''مجھے بھی اس کا اندازہ ہے۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں ان آنسو گیس بموں سے بے ہوش ہو رہا تھا تو میں نے کلمہ پڑھ ڈالا تھا۔ کیا خبر یہ ہمیں بے ہوشی میں ہی دوسری دنیا سدھا دیتے۔''

اس کی بات پر لحہ بھر کے لیے میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ میں بھی عام سا گوشت پوست کا انسان تھا۔ ڈر اور خوف کے جذبات میرے دل و دماغ کو بھی جکڑ سکتے تھے۔ اپنی بقا کی جنگ کے جذبات اپنی جگہ لیکن اپنی متوقع موت کو اس قدر قریب سے گزرتے اور اب عین سر پر منڈلاتے پا کر میرا بھی تشویش میں مبتلا ہونا فطری بات تھی۔

''یار! یہ گرانٹ کو تو ہوش میں لاؤ۔ کک......کہیں خدا نا خواستہ!'' میں نے اچانک کہا اور اپنے ہی آخری جملے کو مکمل کرنے کی ہمت نہ کر پایا۔

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے کہ اس بے چارے کو کہیں بے ہوشی میں ہی......''

''یار! تم اسے پکارو ذرا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''گرانٹ......مسٹر اوبرائے گرانٹ!'' کالیا اسے آوازیں دینے لگا مگر کوئی جواب نہ ملا۔

''وہ یہاں نہیں ہے جگری! اسے اوپر پہنچا دیا گیا

ہے۔" بالآخر جواب نہ پاکر کالیا نے ایک سفاکانہ اعلان کر دیا۔

"کیوں اس غریب کے لیے ایسے بدفعال منہ سے نکالتے ہو، کالیا؟" میں نے جھلا کر اس سے کہا۔ "تو بھی کبھی بہت سنگ دل ہو جاتا ہے۔"

"جگری! انسان کو ہر وقت ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ اس طرح بعد میں دکھ زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔" وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔

"اسے مرنا نہیں چاہیے کالیا!" میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ "وہ ہمارے بہت کام کا آدمی ہے۔" پھر لمحہ بھر توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ "ایک کام کرتے ہیں۔ ہم چل پھر تو نہیں سکتے مگر بندھے ہونے کے باوجود گھسٹ گھسٹ کر مخالف سمتوں میں اس کی یہاں موجودگی کا تو احساس کر سکتے ہیں نا؟"

"چلو پھر شروع ہو جاؤ۔" کالیا ایک دم بولا۔

ہم دونوں نے ایسا ہی کیا۔ میری آنکھوں کی جلن اور سر کا بھاری پن باتوں کے دوران کم ہو گیا تھا۔ ہم دونوں اپنی مقدور بھر کوشش سے فرش پر پڑے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر گھسٹتے رہے، کئی بار دیواروں سے اور دو ایک بار میں اور کالیا ایک دوسرے سے ٹکرائے تو جلد ہی ہم پر یہ لرزا دینے والا انکشاف ہوا کہ اوبرائے گرانٹ ہمارے بیچ نہیں تھا۔

"وہ گیا...... خرچ ہو گیا بے چارہ، ان ظالموں کے ہاتھوں......" کالیا بولا۔ وہ گھسٹنے کی وجہ سے ہانپنے لگا تھا، میری بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔

"یار! تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے؟" مجھے غصہ آ گیا۔

"اوہ! جگری! تو تو ناراض ہو گیا یار!" کالیا خفیف سا ہو کے بولا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے کسی مقصد کے تحت کہیں اور رکھا گیا ہو؟" میں نے فوراً خیال ظاہر کیا۔

"ہو تو یہ بھی سکتا ہے...... کہ......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ بولا۔ "چھوڑ! تو ناراض ہو جائے گا۔"

کالیا کی اس حرکت پر مجھے ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ بولا۔ "ایک بات اور بھی میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"ان دونوں باتوں کے علاوہ تو میرا خیال تھا کہ کسی تیسری بات کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی، بہرحال بول؟" کالیا کی فطری زندہ دلی ان حالات میں بھی عروج پر تھی۔ میرے

نزدیک یہ اس کی ایک بڑی خوبی تھی، جو کم از کم مایوس نہیں ہونے دیتی تھی۔

"کیوں نہیں ہے گنجائش تیسری بات کی؟" میں نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ ان کی قید سے فرار بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آرہی تھی مگر میں نے اسے صرف پانچ فیصد نمبر دے کر رد کر دی تھی۔" وہ بولا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ایک تو ہم سب ہی ان آنسو گیس بموں کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے، پھر وہاں چند افراد نہیں بہت سارے مسلح لوگ تھے۔ بھلا گرانٹ کو کب ہوش آیا اور کب وہ بھاگ سکا ہوگا؟ کیا ان کی گرفت اتنی ہی کمزور ہوگی؟ ہرگز نہیں۔"

"کمال کالیا! تیرے جیسا آدمی بھی ایسی باتیں کر رہا ہے۔" میں نے اسے کھدیڑا۔ "یہ سب موقع اور قسمت کی بھی تو بات ہوتی ہے۔ خود ہم دونوں نے کتنے کٹھن حالات میں ایک ذرا سا موقع بھانپ کر اپنی جانیں بچائی ہیں اور دشمنوں کو خاک چٹائی ہے۔"

اچانک ہم باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ اچانک ہلکی سی کھڑبڑ کی آواز ابھری تھی پھر روشنی کی ایک لکیر نمودار ہوئی جو چوڑی ہوتے ہوتے پورے کمرے میں پھیل گئی۔ ہماری نیم باز سی نظروں نے تین چار نیم مسلح افراد کو کھڑے پایا۔

انہوں نے لمبے لمبے عربی چغے پہن رکھے تھے۔ ان کے تیور بڑے ہی خطرناک اور جارحانہ تھے۔ وہ چاروں اندر آگئے اور ایک نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ بورڈ پر لگے بٹن کو پش کیا تو کمرے میں مزید روشنی پھیل گئی۔

میں اور کالیا آڑے ترچھے ایک ایسے چھوٹے سے کمرے کے ننگی اینٹوں والے فرش پر پڑے تھے۔ کمرے کی چھت کافی نیچی تھی اور اس میں فقط ایک ہی چھوٹا سا گول روشندان تھا جو اندر سے لکڑی کے ایک تختے سے بند نظر آرہا تھا۔ کھلا بھی ہوتا تو ہمارے کام کا نہیں تھا۔

ان میں سے دو ہماری طرف بڑھے اور باقی دو، گویا ہمارے سروں پر اپنی گنیں تانے مسلط رہے۔ ان کے چہرے غیظ آلودہ نظر آرہے تھے۔ ہمارے چہرے فرش سے لگے ہوئے تھے۔ دونوں ٹانگوں کو باندھا گیا تھا اور ہاتھ بھی دونوں پشت کی جانب کر کے جکڑ بند کیے گئے تھے۔

اول الذکر دو آدمیوں نے جھک کر ہمارے پیروں کی رسیاں کھول دیں اور ہمیں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول رہے تھے۔

اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کے لیے ہمیں انہی دونوں نے سہارا بھی دیا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دھکا دینا چاہتے ہوں۔ میں ذرا لڑکھڑایا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا سر چکرایا بھی تھا۔

"چلو آگے۔" ایک نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میں اور کالیا اسی طرح لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر کوریڈور میں آئے تو میں نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

یہ بن رائد کا محل تھا، جہاں چند روز پہلے ہی ہم ایک خوں ریز جنگ کے بعد زخمی گرانٹ کو لیے فرار ہوئے تھے اور اس وقت بن رائد ہمارے قبضے میں تھا اور اب ہم اس کے رحم و کرم پر تھے۔

ہمیں جس کمرے میں لایا گیا تھا، وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا یعنی فرنیچر سے عاری اور سیلن زدہ سانگی اینٹوں والا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ موجودہ کمرا ذرا بڑا تھا اور اس کی چھت بھی بلند تھی۔ وسط میں دو اسٹول نما تنگ سی کرسیاں رکھی تھیں۔ جن پر بس "ٹک" کر ہی بیٹھا جا سکتا تھا۔ ہمیں انہی دونوں کرسیوں پر بیٹھنے کا کہا گیا۔ ہم خاموشی سے ان پر بیٹھ گئے۔

اس کمرے میں خاصی روشنی تھی۔ وقت کا ابھی تک تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ دو افراد واپس مڑ گئے جبکہ باقی دو گن بردار وہیں موجود رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ آدمی دوبارہ نمودار ہوئے۔ انہوں نے دو آرام کرسیاں پکڑے رکھی تھیں۔ جو انہوں نے ہم سے قدرے فاصلے پر سامنے ساتھ ساتھ رکھ دیں۔

چند ثانیے اسی دھڑکتی خاموشی میں بیت چلے اس کے بعد مزید دو بھاری بھرکم سے افراد کمرے میں داخل ہوئے۔

انہیں دیکھ کر ہمیں چونکنے کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ شاہ میر اور بن رائد تھے، دونوں ہی ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ شاہ میر کے دائیں بازو کی حالت اب قدرے بہتر نظر آرہی تھی۔

بن رائد بھی ٹھیک ہی نظر آرہا تھا۔ البتہ وہ اب اپنی مخصوص سلطان والی پوشاک میں ملفوف تھا۔

وہ دونوں مجھے خوں ناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے

کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

مجھے حیرت تھی کہ راکا اور فرحانہ والے معاملے کی ''گڑبڑ'' کے باوجود یہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض دکھنے کی بجائے شیر وشکر نظر آرہے تھے۔ یوں جہنم واصل راکا سے متعلق ایک اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا کہ وہ بلیک ڈیول کا ہی مقرب یہ خاص کارپرداز تھا۔ وہ یہاں ان دونوں کے پاس ایک ''کارندے'' کی بجائے، خاص ''نمائندے'' کی حیثیت سے تھا۔

''نعمان! یقیناً تم نے اب تک تو اپنی اور اپنے دوست کالیا کی فاتحہ پڑھ ہی لی ہوگی۔'' شاہ میر نے میری جانب بدستور خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے اندر کا زہر غیظ کی صورت میں اگلا تو میں نے بھی بلادیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسی لہجے میں کہا۔

''شاہ میر! فاتحہ مرنے والوں پر پڑھی جاتی ہے، جب تو مرے گا تب ہی میں تیری قبر پر انسانیت کے ناتے ہی سہی، فاتحہ ضرور پڑھوں گا۔'' میرے تڑخے ہوئے جواب نے شاہ میر کے غضب کو ہوا دی۔

''بہت گھمنڈ ہے تجھے خود پر، رسی جل گئی بل نہیں گئے۔ ابھی دیکھنا حشر کیا ہوتا ہے۔'' اس کے لہجے کی تہدید نے جانے کیوں میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑا دی تھی۔

''خاموش کتے! تو خود جل کر خاک ہو چکا ہے۔'' میں نے اسی طرح اس کی طرف لہو رنگ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھ جنہیں اللہ پر اس کے مقرر کیے ہوئے آخری وقت پر کامل ایمان ہوتا ہے وہ موت سے نہیں ڈرا کرتے گیدڑ!''

اس کا خیال تھا کہ میں اس کے سامنے معافی تلافی اور زندگی کی بھیک مانگوں گا لیکن مجھے ان حالات میں بھی گرجتا برستا دیکھ کر اس کی مغرور انا کو زبردست دھچکا لگا کہ وہ شدت طیش تلے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پاس کھڑے آدمی سے گن جھپٹنے لگا۔

''شاہ میر!'' اچانک بن رائد نے اسے ٹوکا۔ ''آرام سے بیٹھ جاؤ، یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔''

ناچار وہ ''فوں...... فوں'' کرتا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ بن رائد اس دوران بڑے غور سے میرے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس کے ذہن میں کچھ اور ہی پل رہا تھا۔

شاہ میر کو ٹوکنے اور اسے دوبارہ کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر بن رائد براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بلیک ڈیول کے بارے میں تم اور کیا جانتے ہو اور اس کے کس کس منصوبے سے واقف ہو؟''

اُمید تو مجھے بن رائد سے یہی تھی کہ وہ کم از کم شاہ میر جیسی سطحی اور روایتی گفتگو کرنے کی بجائے کوئی سنجیدہ ہی موضوع چھیڑے گا اور ایک طرح سے چاہتا میں بھی یہی تھا۔ یوں میرا ذہن تیزی سے کام کرنا شروع ہو چکا تھا۔

باقی سنجیدہ نوعیت کے دشمنوں کو اپنی اٹکل اور دماغی جنگ سے زیر کرنے کا میں بہت پرانا تجربہ رکھتا تھا۔ بولا۔ ''فقط اتنا کہ وہ ہم جیسے بیروزگار اور زمانے کے دھتکارے ہوئے نوجوانوں کے لیے ایک بڑی آرام دہ اور سہانی منزل رکھتا ہے۔''

''بکواس بند کرو اپنی۔'' بن رائد غصے سے دھاڑا۔ ''میں جانتا ہوں اچھی طرح کہ اس کتیا گلنارا نے ہی تمہیں بلیک ڈیول کے بارے میں سب بتایا ہوگا۔''

''اسی نے ہی تو بتایا ہے، میں بھلا کب انکار کر رہا ہوں؟'' میں نے بھی فوراً کہا۔

''اور......'' بن رائد نے مجھے گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم مجھے ہی نہیں بلکہ شاہ میر کو بھی بلیک ڈیول کے حوالے سے دھمکی دے چکے ہو، یہی نہیں تم نے مجھ پر اشارتاً بھی ایک سپر پاور کے آلۂ کار کا الزام لگایا، جس کا صاف مطلب ہے کہ تمہیں بلیک ڈیول کی تلاش ہے۔''

''بالکل ہے تلاش۔'' میں اس کی توقع کے خلاف وہی بول رہا تھا جو وہ مجھ سے اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''گلنارا کے پاس میں اس کے شوہر بہرام خان کی وجہ سے گیا تھا۔ رانا بشیر اور اس کے درمیان معاہدے کی ایک کاپی لینے تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔ اس نے مجھے کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی۔ اسے ہر ایک کی شکل میں اپنے شوہر کے قاتل کی شبیہ نظر آتی تھی۔''

''لیکن تم نے وہاں اس کی کیمپ تھری والی رہائش گاہ میں نہ صرف خاصا وقت گزارا بلکہ وہاں کچھ لوگوں کو بھی زدوکوب کیا۔ یوں تم نے گلنارا کا دل جیت لیا۔'' بن رائد نے اپنی معلومات کا رعب جمایا۔ اپنے آدمیوں کا کہنے کی بجائے اس نے بڑی عیاری سے انہیں ''کچھ لوگ'' کہہ دیا تھا۔

''اس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کیونکہ مجھے اس بزنس ڈیل کی کاپی کے علاوہ بھی کچھ اور اہم

نوعیت کے کاغذات درکار تھے۔'' میں نے کہا اور دانستہ رکا۔

''بولتے رہیے۔'' حسبِ توقع بن رائد نے مجھے کھدیڑا۔ گویا تیر ابھی پورا نہیں تو کچھ کچھ نشانے پر اپنا رخ پھیر رہا تھا۔

''وہ میرے آگے بچھ گئی۔ اس نے اپنے دکھ سکھ سب مجھے بتا ڈالے۔ بلیک ڈیول کا ذکر کیا تو میں نے بیزاری دکھائی، ظاہر ہے مجھے بھلا اس سے کیا غرض تھی۔''

''سلطان رائد! یہ مسلسل ایک فضول بکواس کیے جا رہا ہے۔'' اچانک کافی دیر سے چپ بیٹھا شاہ میر پھٹ پڑا۔

''تم ذرا خاموش رہو۔'' بن رائد نے اسے ٹوک دیا اور میری طرف متوجہ ہو کے بولا۔ ''بلیک ڈیول کے سلسلے میں، گلنارا نے تمہیں کیا کہا؟''

''یہی کہ اس کے شوہر کے قاتلوں کا تعلق بلیک ڈیول سے ہے۔''

''ضرور پھر تم نے اس سے بلیک ڈیول کے بارے میں پوچھا ہی ہوگا؟''

''یقیناً پوچھا تھا۔''

''کیا؟''

''کہ وہ کون ہے؟''

''کیا بتایا گلنارا نے تمہیں اس کے بارے میں؟'' یہ پوچھتے ہوئے اس نے اپنی بھنویں سکیڑ لیں۔

''بلیک ڈیول کے بارے میں وہ یہی بتانے لگی کہ جب سے ماہرین کی ایک خفیہ ٹیم نے اپنی ایک جاری کردہ رپورٹ میں بتایا کہ صرائفہ کی ریتیلی اور خشک زمین کے نیچے کالے سونے (تیل) کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، تو حدی کے سلطان کو بلیک ڈیول نے صرائفہ پر قبضہ کرنے کے لیے اکسایا اور ساتھ ہی اس کی بھرپور سپورٹ کی بھی پیشکش کی۔'' میں نے آدھا سچ اور آدھا جھوٹ والی اسکیم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اسے وہی کچھ بتایا جو یہ سننا چاہتا تھا۔

''گلنارا نے پھر تم سے کیا کہا کہ بلیک ڈیول کا کھوج لگاؤ؟''

''بن رائد! تم اسے بہت ڈھیل دیے جا رہے ہو۔'' شاہ میر پھر تلملا کر بولا۔ ''یہ ہمارا مجرم ہے اور ناقابلِ معافی بھی۔ ان دونوں کو گولی مار کے ختم کر ڈالو۔''

''شاہ میر!'' بن رائد اس کی جانب دیکھ کر مخاطب ہوا۔ ''تم تسلی رکھو، یہ دونوں ہماری قید میں ہیں اور اس وقت کہیں بھی بھاگ کر نہیں جا سکتے۔''

''تم آخر ان لوگوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس کر رہے ہو؟'' شاہ میر کی اب تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ بن رائد نے اسے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے جواب میں کہا۔

''ہاتھ آئے دشمن یا شکار کے ساتھ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، اس بارے میں میرا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ میں جلد بازی کا قائل نہیں۔''

''تم بہرحال بے وقوفی کر رہے ہو۔'' شاہ میر نے بالآخر اپنے اندر کی بھڑاس نکالی۔

میری عقابی نظریں ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں، سماعتیں آپس کی تلخ کلامی پر غور کرنے میں مصروف تھیں جبکہ میرا ذہن بن رائد کے ان سوالوں سے تیزی کے ساتھ کچھ ''اخذ'' کرنے کی کوشش میں تھا۔

''شاہ میر!'' بن رائد نے اس ریمارکس پر اچانک اسے ناگواری سے پکارا۔ ''بہتر ہوگا اس وقت تم مجھ سے کوئی بحث نہ کرو۔ تم تھکے ہوئے لگ رہے ہو اور میرا خیال ہے تم تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں چلے جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ایک آدمی سے کچھ کہا۔ وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور دو قدم چل کر شاہ میر کے پاس آ کر مودبانہ انداز میں قدرے جھک کر اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

شاہ میر کا چہرہ مارے تلملاہٹ اور اندرونی ابلتی کیفیات تلے سرخ ہو گیا۔ ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے، میں اپنی رہائش گاہ میں جا کر ہی آرام کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔

میری نظریں بن رائد کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ شاہ میر کے یوں ناراض ہو کر چلے جانے پر اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ شاہ میر کے اس طرح وہاں سے چلے جانے پر خوش نہیں ہوا تھا۔ تب پھر اچانک ہی اس نے اپنے آدمی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہی آدمی تھا۔ وہ ایک اور قدم بڑھا کر بن رائد کے آگے جھک گیا۔

بن رائد نے اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب کر لیا اور چند سیکنڈوں تک اس سے کہتا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسے کچھ ''سمجھاتا'' رہا۔ پھر وہ آدمی سیدھا ہوا اور اپنے ساتھ دو مسلح افراد کو ساتھ آنے کا کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

شاہ میر کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی۔ وہ یہاں

بن رائد سے سخت ناراض ہو کر اپنی رہائش گاہ پر جا رہا تھا لیکن اس کھسر پھسر سے مجھے لگا تھا کہ اسے محل سے اب باہر بھی نکلنے نہیں دیا جائے گا۔ یہ سب محسوس کر کے مجھے ایکا ایکی نامعلوم سی بے چینی محسوس ہوئی۔ تاہم یہ بھی میرے لیے ایک عجیب ہی صورتِ حال تھی کہ میرے سلسلے میں بن رائد ایک دم یوں نرم رویہ رکھنے پر کیوں مجبور ہوا تھا؟ کیا وہ واقعی میری باتوں کے "دام" میں آ رہا تھا یا اس کے الٹ مجھ پر ہی جال پھینکنے کے پر تولے ہوئے تھا؟

"مسٹر نعمان!" بن رائد ایک بار پھر میری جانب متوجہ ہو کے گمبھیر لہجے میں بولا۔

میرا ذہن ابھی تک ان دونوں کے درمیان اچانک پیدا ہونے والی چپقلش پر لگا ہوا تھا۔ اس کے مخاطب کرنے پر میں بھی اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو میں جواباً بولا۔ "ہاں۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"بلیک ڈیول کے بارے میں اور اس سے ملنے کے لیے تو خود میں بھی بے چین تھا لیکن میں اپنی دلچسپی اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"تمہیں بلیک ڈیول کی بھنک کس نے دی؟"

"رانا بشیر نے۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "وہ اس سے کوئی خفیہ کاروباری رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ یہ شخص تیل کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے اور جن لوگوں نے بھی اس کے ساتھ خفیہ روابط رکھے وہ بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ رانا بشیر کا کاروبار ڈوب رہا ہے، مختلف بینکوں کا وہ مقروض بھی ہے۔ مجھے اس نے اپنی کمپنی میں نوکری ہی اسی لیے دی تھی کہ میں کسی طرح بحرین آ کے بلیک ڈیول کے ساتھ رابطے کا کوئی راستہ ڈھونڈ کر اسے بتاؤں۔"

"تو پھر اس نے ہماری آفر کیوں ٹھکرا دی تھی؟" بن رائد نے سوال کیا۔ "ہم نے بھی تو اسے ایک بڑی رقم کی آفر کی تھی؟"

میں اس کی بات سن کر دانستہ ہنسا۔ مجھے اس کے ساتھ گفتگو کے دوران ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی بات کی گہرائی یا دور تک سوچنے اور اس کے نتیجہ خیز قیافوں اور مفروضوں سے کچھ اخذ کرنے کی صلاحیت سے یکسر عاری تھا۔ اس کی ذہنی فراست کے پیمانے کا اندازہ کرتے ہی میں نے اپنا تیر چلنے پر چڑھا کر چھوڑ دیا تھا۔ آگے بولا۔ "تمہاری آفر رانا بشیر کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر بھی نہیں تھی۔ پھر اس میں بہت رسک بھی تھا۔ اس کی کمپنی جو پہلے ہی مقروض تھی، اس کی ساکھ متاثر ہونے کا خدشہ تھا، رانا بشیر کے مطابق اگر یہ بھی مصیبت ٹوٹ جاتی تو نوبت قرقی تک آ سکتی تھی۔"

بن رائد میری بات سن کر تھوڑی دیر کو خاموش ہوا۔ وہ کچھ سوچنے میں محو تھا۔ کالیا بالکل خاموش تھا، میں جب بھی کسی کے ساتھ دماغی گیم کھیلنے کے لیے گوٹیں پھیلانے لگتا تھا تو وہ اسے بھانپ کر بت بن جاتا تھا۔

"تمہاری ان ساری باتوں کا مطلب میں یہ لوں کہ رانا بشیر، بلیک ڈیول کے ساتھ اپنے خفیہ کاروباری روابط استوار کرنا چاہتا تھا۔ یوں اس نے تمہیں بحرین بھیجا لیکن پھر فرحانہ کی رہائی کا معاملہ یہاں فٹ ہوتا ہے؟"

"ایک پنتھ دو کاج۔" میں نے فوراً جواب میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے رانا بشیر نے دونوں معاملات نمٹانے کا ٹاسک سونپ رکھا تھا۔ دیکھو بن رائد!" بالآخر میں نے آخری چوٹ کی۔ "میں اب بھی اور اس سے پہلے بھی کہتا آ رہا ہوں کہ میری تمہارے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ہاں البتہ شاہ میر اور میرے بیچ ایسا ضرور ہے۔ شاہ میر نے تمہیں میرے لیے استعمال کرنے کی کوشش چاہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح رانا بشیر کو تم دونوں اپنے مقصد کے لیے جھکا دو گے مگر تم نے دیکھ لیا کہ یہ معاملہ بگڑتے بگڑتے کہاں تک جا پہنچا۔ ایسا صرف شاہ میر کی وجہ سے ہوا۔ وہ یہاں بیٹھا اسی لیے بار بار چیخ کر آپ کی اور میری گفتگو کے درمیان مداخلت کر رہا تھا کہ اصل حقائق سامنے نہ آ سکیں۔"

"صرائفہ والوں کی تم نے کیوں مدد کی؟" بن رائد نے اچانک موضوع بدلا۔

"محض اس لیے کہ......" میں نے فوراً جواب میں کہا۔ "مجھے ربع خالی میں رہنا تھا۔ جب تک میں بلیک ڈیول تک خاطر خواہ رسائی حاصل نہیں کر لیتا۔"

"لیکن شہزادی نیلم کے ساتھ تم بہترین دوستانہ تعلقات استوار کر چکے ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے۔" میں نے کہا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں اپنے جواب دینے میں کسی قسم کی تاخیر اور جھجک نہ آنے دوں، مدِ مقابل پر اس طرح بھی نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ "یہاں میرا دیرینہ دشمن شاہ میر تھا۔ را کا کو بھی اس نے میرے پیچھے لگا رکھا تھا، پھر تمہیں بھی اس نے خوامخواہ شامل کر لیا۔ آپ خود سوچیں، میں کوئی جنگ کرنے تو نہیں آیا تھا

یہاں؟ اکیلا ہی آیا تھا مگر یہ سب دیکھ کر مجبوراً مجھے کسی کی گود میں تو پناہ لینا ہی تھی۔"

"فرحانہ اور اوبرائے گرانٹ!" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ یکدم ہم سب چونک پڑے۔ بن رائند کے الفاظ بھی منہ میں ہی دبے رہ گئے۔ اچانک ایک شور کی آواز آئی تھی۔ جیسے کوئی غیظ ناک انداز میں بہ آواز بلند بڑبڑائے جا رہا ہو، ساتھ ہی دوڑتے قدموں کی آواز، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا پھر ہم سب ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک شاہ میر کمرے میں داخل ہوا۔

میری پھٹی پھٹی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ دل میرا جیسے سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔ اس کی صورت آتشِ انتقام اور جوشِ غیظ تلے مسخ ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر تان لیا۔ اس کے پیچھے دو آدمی دروازے کے باہر سے ہی اسے سنبھالنے یا پکڑنے کو لپک رہے تھے۔

میری طرف پستول کی نال کرتے ہی اس نے لبلبی دبا دی۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا تھا۔

موت...... یقینی موت کو اچانک یوں سامنے دیکھتے ہی اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ یکایک موت سامنے آن کھڑی ہو تو ایک لمحہ کو انسان ہق دق سا رہ جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے ایک دم کھڑی ہو جانے والی موت کی کچھ ایسی ہی دہشت ہوتی ہے۔

یوں میں بھی گم صم سا ہو گیا تھا لیکن شاہ میر کے پستول سے ہونے والے دھماکے سے پہلے ہی میرے برابر میں ٹکے بیٹھے کالیا نے مجھے زور سے...... اپنا کندھا رسید کیا تھا۔ مجھ پر چلائی ہوئی گولی اسے چاٹ سکتی تھی، اسے اس کا بھی ادراک تھا، اسی سبب اس نے ایک پنتھ دو کاج کے تحت خود کو بھی گرا لیا تھا۔

شاہ میر کا اتنے قریب سے بھی نشانہ خطا گیا، ادھر کالیا نے گرتے ہی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک خاص ٹریک سے اپنی ٹانگوں میں اسٹول کو پھنسا کر شاہ میر کی طرف اچھال دیا۔

شاہ میر جو دوسرے فائر کے پر تولے ہوئے تھا، اسٹول اُڑتا ہوا اس سے ٹکرایا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، تب تک بن رائند کے آدمیوں نے اسے دبوچ لیا۔

"چھ چھ...... چھچھ...... چھوڑ دو مجھے...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا، اس نے میرے اکلوتے بیٹے ثمیر کو...... آہ......" وہ دیوانوں کی طرح چلّانے لگا اور خود کو بن رائند کے آدمیوں کی گرفت سے چھڑانے کی بھی کوشش کرنے لگا مگر ایک آدمی نے اپنی گن کا دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کر کے اسے دنیا و ما فیہا سے بے نیاز کر دیا۔ وہ کراہ کے فرش پر گرا اور ڈھیر ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہم دونوں کو دوبارہ اسی تنگ سے کمرے میں لا کر پھینک دیا گیا۔

"تمہارا شکریہ یار! تم نے خود کو ہلاکت میں ڈال کر مجھے شاہ میر کی گولی سے بچایا ورنہ تو آج گیا تھا میں!" میں نے مسکراتے ہوئے کالیا سے کہا۔

"چھوڑ اس بات کو۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "تم بن رائند کو صحیح ٹھوک رہے تھے مگر اس کم بخت شاہ میر نے مداخلت کر کے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔"

"اب بھی کچھ نہیں ہوا کالیا!" میں نے کہا۔ "لگتا ایسا ہی ہے کہ وہ میری باتوں میں آ گیا ہے۔"

"تم نے اوبرائے گرانٹ کے متعلق کیوں نہیں پوچھا بن رائند سے؟"

"میں مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "پھر وہ خود ہی فرحانہ اور اوبرائے گرانٹ کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا کہ شاہ میر آن دھمکا۔"

"ابھی موقع ملے تو گرانٹ کے بارے میں پوچھو؟ آخر وہ زندہ بھی ہے یا انہوں نے مار ڈالا اس غریب کو۔"

"پوچھوں گا، تم بتاؤ کیا کہتے ہو اس بارے میں کہ کیا واقعی بن رائند میری باتوں میں آ رہا ہے؟"

"بہ ظاہر تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے جگری! لیکن ہم اس پر زیادہ انحصار نہیں کر سکتے۔ یہ اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر ہے اور ہم دونوں موت کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ہمیں خود بھی کچھ کرنا ہوگا۔"

"میں نے فوری موت سے بچنے کے لیے ہی ایسا کیا تھا کہ کچھ مہلت مل جائے۔" میں نے کہا۔

"ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "ورنہ اوبرائے گرانٹ جیسا حشر ہوتا ہمارا۔"

"کیا مطلب؟ کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ اوبرائے گرانٹ کو بن رائند نے ہلاک کر دیا ہوگا؟" میں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ہمارے بیچ گرانٹ کا موضوع ایک بار پھر چھڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہ

تھا کہ ان حالات میں گرانٹ ہمارے لیے کافی مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔

''پتا نہیں یار!'' وہ بیزاری سے بولا۔

ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش ہوگئے۔ شکر تھا کہ اس بار ہماری ٹانگیں رسن بستہ نہیں تھیں۔ ہاتھ دونوں ہنوز پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہم تھوڑی دیر تک اپنی اس نئی ''چال'' پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ اس چال پر انحصار کرتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا غیر دانش مندی ہوگی۔ ہوسکتا ہے بلیک ڈیول، بن رائد کو ہمیں گولی مار دینے کا حکم جاری کردے۔ وہ تیل کی دنیا کا بے تاج بادشاہ اور ایک عالمی گینگسٹر تھا، جو بہ ظاہر شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس نے دنیا کی کمزور رگ کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ یہ اس کا ایسا ہتھیار تھا جو سمجھنے والوں کے لیے ایک ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔

بن رائد کی بات اور تھی مگر کالا شیطان کے سامنے رانا بشیر جیسے جانے کتنے امپورٹر ایکسپورٹر اپنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہوں گے۔ تاہم ایک اُمید یہ بھی کہ معاملہ یہاں کا تھا۔ بن رائد ایک لالچی آدمی تھا۔ اس کی فطرت تھی کہ پیسا جہاں سے بھی ملے کھسوٹ سکو لوٹ لو۔ اسی لالچ اور زیادہ سے زیادہ کمیشن ہتھیانے کی وجہ سے وہ رانا بشیر سے ذاتی طور پر بھی اپنے پرانے والے معاہدے کو آگے بڑھانے کا خواہش مند تھا لہٰذا یہ ممکن تھا کہ وہ کالے شیطان سے اپنی بات منوا سکتا تھا۔ بن رائد، بلیک ڈیول کا خاص نمائندہ تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ ہمیں پیاس اور بھوک لگی ہوئی تھی۔ کافی دیر سے ہمیں کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔

لیکن ذرا دیر بعد ہی دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹریے تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں اب پہلے جیسی کرختگی نظر نہیں آتی تھی۔

ہم ٹرے کی طرف دیکھ کر حیران رہ گئے، کھانا پُرتکلف تھا۔ بھنے ہوئے گوشت کے پارچے، مشروب، فروٹ سب ہی کچھ تھا۔

''معزز سلطان کی خواہش یہی تھی کہ وہ تم دونوں کو اپنے ساتھ کھانے کی ٹیبل پر دعوت دیتے۔'' ان میں سے ایک نے ہم سے کہا۔ اس کا رویہ دوستانہ تھا۔ ''لیکن تمہیں کافی دیر سے کچھ نہیں دیا گیا تھا اسی لیے تم ابھی اپنا پیٹ بھرلو۔''

اس کے بعد ان دونوں نے ہمارے ہاتھوں کے جکڑ بند بھی کھول دیے۔ ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے ہی میں نے کن انکھیوں سے کالیا کی طرف دیکھا تھا، اس کے چہرے پر بھی کچھ ایسے ہی تاثرات ہلکورے لیتے محسوس ہوئے تھے کہ وہ اب بس ان دونوں پر ہلہ بولنے کو تیار ہی تھا مگر اس نے میری جانب ''اجازت'' طلب کرنے کے انداز سے دیکھا تھا اور میں نے اسے آنکھ کے خفیف سے اشارے سے کسی بھی جارحانہ حرکت سے منع رکھا۔

''کیا معزز سلطان کی بات ہوگئی؟'' میں نے ان سے پوچھا۔ میں نے دانستہ اس بار ''بلیک ڈیول'' کا نام نہیں لیا تھا۔

''کس سے؟'' ایک نے مسکراتے ہوئے سوالیہ کہا، یوں جیسے اسے معلوم ہو کہ میں کس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ لہٰذا میں نے بھی یہ بات محسوس کرتے ہوئے خفیف سی دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''میں اس بڑی شخصیت کا اصل نام لینا چاہتا ہوں جو مجھے نہیں معلوم۔''

''اس کا نام کونزے اسٹاکر ہے۔'' پہلے والے نے بتایا۔ میرا دل دبی دبی مسرت تلے دھڑکا تھا۔ بلیک ڈیول کا اصل نام معلوم ہونے کا مطلب تھا کہ میرا تیر نشانے پر بیٹھ رہا تھا۔

تیل کی دنیا یعنی کالے سونے کی دنیا کا گاڈ فادر کونزے اسٹاکر جو بلیک ڈیول ایک کالے شیطان (بلیک ڈیول) کے نام سے بدنام زمانہ شہرت رکھے ہوئے تھا۔

''دوست! جب یہ بتا دیا ہے تو یہ بھی بتادو کہ کیا بلیک...... میرا مطلب مسٹر کونزے اسٹاکر کو معزز سلطان میرے لیے قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں؟'' میں نے کہتے ہوئے پُراُمید نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دوسرا والا مسکرا کر بولا:

''ابھی تھوڑی دیر بعد معلوم ہوجائے گا بلکہ کونزے اسٹاکر سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔ کھانا جلدی ختم کرلو۔'' یہ کہتے ہوئے دونوں کمرے سے نکل گئے۔

''ابے لے...... جگری! یہ کیا؟ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔'' ان دونوں کے جاتے ہی کالیا بے اختیار بولا۔ ''کالا شیطان تو ادھر ہی موجود ہے۔''

''یعنی ربع الخالی میں؟'' میں نے پُرسوچ انداز میں استفساریہ کہا۔

''یقیناً! اسے بلالیا گیا ہوگا۔''

"کالیا! میرا تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے۔ اب دیکھنا کیسے منزلیں آسان ہوتی ہیں ہماری لیکن یار! گرانٹ کا زندہ رہنا پھر بھی ضروری ہے۔"

"میں ان دونوں گماشتوں سے اوبرائے کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ نکل گئے کمرے سے۔" کالیا نے جواب دیا۔

"چلو کھانا ختم کرو۔" میں نے کہا۔

اپنی کامیابی اور کالے شیطان سے دوبدو ملاقات کا سنتے ہی ہماری بھوک ہی اڑ گئی تھی۔

کھانا ختم کیا تو اس کے نصف گھنٹے بعد ہمیں پھر لے جایا گیا۔ اس بار ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے۔ دوستانہ ماحول تھا اس لیے میں بھی جارحانہ موڈ میں نہیں تھا۔

کالے شیطان کے روبرو پیش ہونے کا مطلب ایک بڑی کامیابی تھی ۔ میرے دل و دماغ کی تو عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

ہمیں ایک شاندار کمرے میں لے جایا گیا۔ اسے ہال تو نہیں کہہ سکتے تھے، تاہم یہ ایک وسیع و عریض کمرا تھا اور آرام دہ بھی اس لیے کہ یہاں بچھا ہوا فرنیچر بیش قیمت اور نہایت جدید اور آرام دہ نظر آتا تھا۔ مزید صراحت کے ساتھ جائزہ لینے پر عقدہ کھلا کہ کمرا کسی مخصوص حالت میں استعمال میں لایا جاتا تھا کیونکہ یہ بیک وقت ایک کانفرنس روم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جس کی شمالی دیوار کی جانب ایک خاصا بڑا اور فرش سے تقریباً ڈھائی، تین فٹ اُونچا چبوترا بنا ہوا تھا مگر وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اس کے سامنے چند کرسیاں قطار اندر... بچھی ہوئی تھیں۔

ان میں سب سے آگے والی کرسی پر بن رائد بیٹھا تھا اور اس کے چند ساتھی، جو بظاہر غیر مسلح ہی نظر آ رہے تھے، اس کے بائیں ہاتھ کی کرسی پر براجمان تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی بن رائد نے اشارے سے ہمیں بلایا اور اپنے دائیں ہاتھ کی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے اور کالیا کے بیٹھتے ہی باقی دو ساتھی بھی پچھلی والی رو میں کرسیاں سنبھالے بیٹھ گئے۔ میں حیران تھا کہ بلیک ڈیول سے یہ کیسی ملاقات تھی؟ میں تو صوفوں اور سینٹرل ٹیبل کی توقع کیے بیٹھا تھا مگر ہمارے سامنے تو محض ایک چبوترا تھا اور بس!

بن رائد مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "مسٹر نعمان! کونزے اسٹاکر ابھی ہم سے مخاطب ہونے والے ہیں۔ تم تیار ہو ناں؟"

"بالکل تیار ہوں مگر......" میں نے کہا اور آخر میں استفساریہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو بن رائد میری ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے پُرغرور انداز میں ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"کونزے اسٹاکر دنیا میں کسی بھی خطے میں موجود اپنے نمائندوں سے کسی بھی وقت کہیں بھی ملاقات اور بات کر سکتا ہے۔"

میں اور کالیا حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ اچانک لائٹس آف ہو گئیں۔ یکا یک سینما ہال کا منظر پیش کیا جانے لگا لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی اسکرین یا پردہ نہ تھا بلکہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد مدھم روشنی ہوئی۔ اب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینے لگا تھا۔

اچانک ایک زبردست شور سنائی دیا۔ ٹھاٹھے مارتے سمندر کا منظر پیش ہوا اور اس کی ایک بہت بڑی موج کسی اہرام کی شبیہہ میں ابھری اور بلند ہوتے ہی ہماری جانب کو یوں لپکی کہ ہم جیسے ابھی اس کے نرغے میں جا پڑیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

"ابے لے جگری! یہ کیا جادوگری ہے؟" کالیا گھبرا کر میرا ایک ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"خاموش بیٹھے رہو کہ کسی تھری ڈی فلم کا چربہ لگ رہا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" بن رائد کی آواز ابھری۔ "یہ ہولوگرافی ہے۔ سیون ڈی ہولوگرافی، خاموشی سے دیکھتے رہو۔"

مجھے تھری ڈی، ہولوگرام ٹیکنالوجی کا پتا تھا، بلکہ مجھے کیا تقریباً ہر شخص کو ہی معلوم تھا، یوں فی زمانہ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ یہ ٹیکنک شعاعوں کے انعکاس کی رہین منت ہوتی ہے اور موبائل و کمپیوٹر کو ملا کر کہیں دور بیٹھے آدمی کو سامنے ایک ماحول پیدا کر کے یوں دکھایا جاتا تھا جیسے وہ ہمارے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔

"یہ ہولوگرافی کی ایک جدید ترین ٹیکنالوجی" اسکائی اینڈ اسپیس" ہولوگرام ہے۔" بن رائد کی دوبارہ آواز ابھری۔ "ابھی تھوڑی دیر میں مسٹر کونزے اسٹاکر ہم سے مخاطب ہونے والے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"یہ کن بلاؤں کے نام لے رہا ہے یار جگری؟" کالیا میرے کان میں ہلکے سے منمنایا۔

"خاموش رہو اور دیکھتے جاؤ، بعد میں تمہیں سب بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

''ابے لے!'' وہ ہولے سے بڑبڑائے بنا نہ رہ سکا۔
میری نظریں سامنے اسٹیج کے ماحول پر جمی ہوئی تھیں، جہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھایا جا رہا تھا، یہ سارا ماحول بالکل حقیقت میں نظر آ رہا تھا، یوں ...... ہم خود وہاں موجود ہوں۔ ہم دم بہ خود بیٹھے یہ سب دیکھ رہے تھے۔
منظر ڈھلتی شام اور رات کے ابتدائی پہر کا تھا۔ دفعتاً ایک دیوہیکل شارک مچھلی سمندر کی سطح پر ابھری اور اس کا بڑا غار سا منہ کھلا ہوا تھا اور نوکیلے دانت نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک زبردست اُچھال ماری اور ہمیں ہڑپ کرنے کے لیے لپکی، کالیا بے چارہ اس ''شعبدہ بازی'' سے نابلد تھا، یک دم کرسی سے اٹھنے لگا لیکن میں نے اسے پکڑے رکھا۔
شارک مچھلی ہمارے قدموں سے چند فٹ پرے دوبارہ غوطہ لگا کر غائب ہو گئی۔
''ابے لے!'' کالیا کے منہ سے ہولے سے برآمد ہوا تھا۔
میری نظریں سامنے ہی جمی ہوئی تھیں۔ سمندر اب پُرسکون نظر آ رہا تھا اور وہاں دن کا سماں تھا۔ دفعتاً ہی ایک اور جھماکا ہوا اور اب اسٹیج پر ایک بڑی سی اونچی پشت گاہ والی بھاری ریوالونگ چیئر نظر آ رہی تھی اور اس پر کوئی شخص بیٹھا تھا، کرسی کا رخ دوسری جانب تھا۔
پھر وہ آہستہ آہستہ گھومنے لگی اور اس پر براجمان شخص ہماری نظروں کے سامنے آنے لگا۔
اب وہ کرسی پر نہایت پُرتمکنت انداز میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اس طرح کہ اس کا چہرہ ایک سیاہ دھبے میں مخفی نظر آ رہا تھا۔ میں بدستور یک ٹک اپنی آنکھیں سکیڑے، بہ غور اسے تکے جا رہا تھا۔ وہ خاصا بھاری بھرکم، اچھی صحت کا حامل، بارعب نظر آتا تھا۔
''خوش آمدید دوستو!'' معاً اس کی آواز ابھری۔ ''میں جانتا ہوں کہ مجھے دیکھنے اور مجھ سے ملنے کی تمنا میرے دوست اور دشمنوں سبھی کو رہتی ہے، اسی لیے میں وقتاً فوقتاً ان کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔''
وہ اتنا کہہ کر رکا۔ اس کی آواز اور انداز تخاطب میں بلا کا غرور تھا۔
''ہم تو آپ کے دوستوں میں سے ہیں ناں مسٹر کونزے اسٹاکر!'' بن رائڈ نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں بھی مسرت ہوتی ہے آپ کا دیدار کرنے کی لیکن ایک آدمی یہاں موجود ہے جو آپ سے ملنے اور آپ سے باتیں کرنے کی تمنا رکھتا ہے۔''
''ہم دیکھ رہے ہیں اسے، بہت اچھی طرح دیکھ رہے ہیں۔'' کونزے اسٹاکر گمبھیر لہجے میں بولا۔ صاف لگتا تھا کہ بن رائڈ اسے میرے بارے میں غائبانہ طور پر بتا چکا تھا۔
''یہ مسٹر نعمان ہیں۔ رانا بشیر کے بزنس منیجر، رانا بشیر کو تو آپ جانتے ہیں ناں؟'' بن رائڈ بولا۔
''بہت اچھی طرح لیکن افسوس کہ وہ اپنی اوقات بھول رہا ہے، نہیں جانتا وہ کہ......'' کونزے بولا۔
''میرا خیال ہے درمیان میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ ایسا کچھ آپس کی ذاتی جھگڑوں میں پڑنے کی وجہ سے ہوا۔'' بن رائڈ بولا۔ اس کا انداز کونزے کے سامنے میری وکالت کا سا تھا۔
''شاہ میر نے ذاتی دشمنی چھیڑ کر ہمارے متوقع دوستوں کو دشمن بنا لیا اور نادانستگی میں ہم بھی اس کی مدد میں کود پڑے لیکن ہم نے دوستوں کا پھر بھی خیال رکھا مگر شاہ میر نے اپنی ذاتی دشمنی میں اندھا ہو کے آپ کے اہم ترین آدمی راکا کا بیدردی سے خون کر ڈالا۔''
''ہوم م......مم......'' یہ سن کر کونزے نے ایک سرسراتی سی ہنکاری لی۔ بن رائڈ نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''افسوس تو اس امر کا ہے کہ وہ اب ہمیں بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ہماری ہی چھت کے نیچے اس نے پستول نکالا اور نفرت و انتقام میں اس قدر مغلوب الغضب ہوا کہ......''
''تم ہمیں یہ بتا چکے ہو۔'' معاً کونزے نے اس کی بات کاٹ دی۔ شاہ میر اور راکا کے اس اہم تذکرے پر میرے کان ایک دم کھڑے ہو گئے تھے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب شاہ میر کی قسمت کا کیا فیصلہ ہونے والا تھا؟
''کونزے اسٹاکر کے ایکوریم کی ایک چھوٹی سی بھی پالتو گولڈ فش کو کوئی مار ڈالے تو سمجھو وہ خود سمیت اپنے پورے خاندان کی موت کے پروانے پر دستخط کر ڈالتا ہے، بن رائڈ! کیا تم نہیں جانتے؟''
اس کے لہجے کی سفاکی سے میرا دل جیسے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔ اس لیے نہیں کہ میں خوف زدہ ہو گیا تھا بلکہ شاہ میر کے حوالے سے کہ اس کی قسمت کا اب کیا فیصلہ ہونے والا تھا؟
''بہت اچھی طرح جانتا ہوں جناب!''
''بس پھر اشارہ کافی ہے۔ بات ختم!'' کونزے نے پُرقطعیت لہجے میں کہا۔

''اور جناب! اس آدمی کا کیا کرنا ہے؟ نعمان، رانا بشیر کا بزنس منیجر!'' بن رائد نے جلدی سے میرا موضوع چھیڑ دیا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

''رانا بشیر اپنی اوقات بھولا ہوا ہے۔ اب کیا چاہتا ہے؟''

''میں نے آپ کو فون پر بتایا تھا ناں جناب کہ شاہ میر کے ساتھ ان کی ذاتی دشمنی کے سبب مطلوبہ مشینری کی سپلائی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔'' بن رائد نے وضاحت کی۔

''آئی ڈونٹ کیئر۔'' کونزے غرور سے بولا۔ ''رانا بشیر جیسے کتنے ہی سپلائر میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔''

''تو پھر نعمان کو بھی شاہ میر کے ساتھ ہی ٹھکانے لگا دیا جائے؟'' بن رائد نے فوراً کہا اور میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ ہونے لگی۔

''یہ کیا کہتا ہے؟'' تھوڑے توقف سے کونزے نے سوال کیا۔

''یہی کہ رانا بشیر اور آپ کے لیے مستقل بنیادوں پر کام کرنا چاہتا ہے۔'' بن رائد نے جواب میں کہا۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''مسٹر نعمان!'' اچانک پہلی بار کونزے اسٹاکر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جی جناب!'' میں نے فوراً کہا۔ یوں لگا جیسے میری آواز حلق سے اٹکتے اٹکتے برآمد ہوئی ہو۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''آپ کی پناہ!'' میں نے دل ہی دل میں اس شیطان پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا۔ اس کی سرکوبی کے لیے مجھے مجبوراً ایسے الفاظ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

''ہاہا...... ہاہا...... میری پناہ کے تو بہت سے لوگ متمنی رہتے ہیں۔'' وہ فخر سے بولا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا جیسے اس کی ذات صرف اور صرف غرور کی مٹی سے گندھی ہو۔ میں دشمن کی کسی ایسی ہی فطری کمزوری کو بھانپ کر اس پر حملہ بولنے کا عادی تھا۔

''ہم انسانوں میں، چاہے کوئی مثبت کردار کا ہو یا منفی، اپنی ذات میں کوئی نہ کوئی ایسی فطرت ضرور رکھے ہوتے ہیں جو یا تو ہمیں بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے یا پھر پستیوں میں۔ بہرحال! تمہاری بات مجھے اچھی لگی۔'' کونزے اسٹاکر آگے بولا۔ ''بن رائد نے تمہیں ہمارے بارے میں بتا ہی دیا ہوگا کہ میں کیا چیز ہوں؟'' اس کے لہجے میں بدستور غرور بھرا ہوا تھا۔

''نہیں بتایا تو تفصیل سے سن لینا۔ میں کوئی کرمنل نہیں ہوں، کوئی عالمی گینگسٹر یا کسی بڑی طاقت کی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ بھی نہیں ہوں۔ میں بس...... میں ہوں۔ میری اپنی آزاد دنیا ہے۔ یہ ہتھیار، اسلحہ، گولہ بارود حتیٰ کہ ایٹم بم بھی میں انہیں بچوں کے کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور وہ وقت بھی آنے والا ہے جب دنیا کے تمام ممالک میری اس بات کو تسلیم کریں گے۔ یہ زمانہ انہی دونوں ہتھیاروں کا ہے۔ ایک تیل اور دوسرا پانی! تیل کمیاب ہو جائے تو بڑے بڑے ملکوں کی معیشت ڈھا دیتا ہے۔ پانی نایاب ہو جائے تو ملک بنجر اور خشک سالی کی لپیٹ میں آ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں ہتھیار مستقبل قریب میں میری پہنچ سے زیادہ دور نہیں رہے، بچے گا وہی جو میری آزاد اور طاقت ور دنیا کا باسی ہوگا۔ میرے خلاف تمہیں کوئی خون خرابے، عالمی بدمعاشی، قتل و غارت یا ڈکیتی اغوا کا کوئی کیس نہیں ملے گا اس لیے کہ مجھے یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ ہاں! اپنی حفاظت اور تحفظ کی بات اور ہے۔''

اگر کوئی اس مغرور انسان کی گفتگو سن رہا ہوتا تو اسے شیخی خورا اور لاف گزاف پر محمول کرتا لیکن میں نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ ہی تھا، وہ دنیا میں آنے والے ایسے بحران کی پیش گوئی کر رہا تھا تو کچھ غلط نہ تھا۔ وہ بلا کی دور اندیشانہ نگاہ رکھتا تھا اس لیے کہ میں اس کی حقیقت جان چکا تھا۔ دنیا آتشیں ہتھیاروں کی دوڑ میں غرق تھی اور یہ کالا شیطان دنیا کے اہم وسائل، جس پر زندگیوں کی بقا کا دارومدار تھا، ''تیل اور پانی'' کو اپنی لگام بنانا چاہتا تھا۔

مجھے یہ بھی تسلیم تھا کہ کالا شیطان کوئی گینگسٹر، کریمنل یا مافیائی باس نہیں تھا مگر دیکھا جاتا تو وہ ایک طرح سے ان کا بھی باپ تھا لیکن اس کی ایک بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا، یعنی پانی! یہ تو بہت ہی ارزاں اور سستی شے تھی۔ اس پر وہ کیسے اپنی اجارہ داری قائم کر سکتا تھا؟

''کیا سوچنے لگے مسٹر نعمان؟'' وہ شاید مجھے خاموش پا کر بولا۔

''آں ہاں! جی جناب! میں واقعی یہ بات سوچ رہا تھا کہ وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کون سی؟'' پوچھا گیا۔

”پانی۔“ میں نے مختصراً کہا۔

”ہاہا.... ہاہا.... دیکھا.... میں نہ کہتا تھا کہ میں کتنا بے ضرر انسان ہوں۔“ وہ ایک پُرغرور قہقہہ لگا کر بولا۔ ”پانی! کیا حیثیت ہے پانی کی.... کچھ بھی نہیں ناں! لیکن میرے لیے بڑی حیثیت رکھتا ہے یہ پانی۔ میں، سمندروں کا بادشاہ ہوں، انہیں اپنے تابع کرکے بدلتے موسموں پر دسترس حاصل کرلوں گا، پھر جہاں چاہے بارش کرا دوں، جہاں چاہے قحط سالی کا عذاب گرادوں۔ اشیا گراں ہو جائیں گی اور پیسا ارزاں اور بے قیمت ہو جائے گا۔ لوگ نوٹوں کی گڈیاں جھولی میں بھربھر کے بازاروں میں گھوم رہے ہوں گے۔ ذرا تصور کرو مسٹر نعمان! یہ پانی کتنی بڑی طاقت ہے۔ سمندروں کے اندر سے بہتی ہوئی ٹھنڈے اور گرم پانی کی قدرتی خلیجی رو جب میرے قابو اور قبضہ میں آجائے گی تو کتنے ہی ممالک میرے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے۔ وہ مجھ سے دولت نہیں مانگیں گے، وہ ہیرے اور سونا نہیں مانگیں گے مجھ سے بلکہ وہ ہاتھ جوڑ کر دوزانوں میرے سامنے جھک کر پانی اور تیل کی بھیک مانگیں گے، موسم مانگیں گے اور میں ان سے کیا مانگوں گا! دولت! بے انتہا دولت، طاقت حکومت اور کیا چاہیے۔“

”ابے لے جگری! یہ تو مجھے کوئی پاگل اور سنکی سائنسدان لگ رہا ہے۔“ کالیا کونزے اسٹاکر کی بکواس سن کر چپ نہ رہ سکا۔ اس نے مجھ سے اردو میں کہا تھا۔ جدید سائنسی آلات کے سبب یہ بھی لاسلکی شعاعوں کا ہی کمال تھا کہ کالیا کی نیچی آواز بھی اس تک پہنچ گئی تھی۔ اسی سبب کونزے نے اچانک پوچھا۔

”تمہارے ساتھی نے کچھ کہا؟“

”جی ہاں!“ میں نے قدرے مؤدبانہ کہا۔ ”یہ آپ سے بہت زیادہ متاثر نظر آرہا ہے۔“

”ہاہا.... دیکھتے جانا، پوری دنیا کو میں متاثر کروں گا۔“

”مسٹر نعمان کے لیے کیا حکم ہے جناب؟“ بن رائد نے سوال کیا۔

”اسے پرکھ لو۔ آزمائش میں پورا اترے تو سمجھو یہ ہماری دنیا کا باسی بن گیا۔“

”اوکے باس!“

”باقی اس سے مقامی مسائل پر بات چیت بھی کرلو پہلے اس میں کوئی خامی یا کسی بھی قسم کے دھوکے کا شبہ نہیں ہوتا تو پھر اس سے معاملات طے کرلو۔“ کونزے بولا۔ ”آج سے نعمان اور رانا بشیر کے معاملے میں تم فری ہینڈ ہو مگر نتیجہ جلد نکلنا چاہیے بہ صورت دیگر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا بہتر ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جناب!“ بن رائد نے کہا اور اسی وقت اسٹیج پر ایک جھماکا ہوا۔ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا منظر حقیقی انداز میں نمودار ہوا اور ایک سیاہ دیوہیکل شارک نے سطح آب سے زبردست اچھال ماری، یوں جیسے پانی کی سطح پر جوار بھاٹا طاری ہوگیا ہو۔ اس کے بعد سب کچھ چشم زدن میں غائب ہوگیا۔

”مبارک ہو مسٹر نعمان!“ معاً ہی بن رائد نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی بھی پھیل گئی تھی۔

”میں کچھ الجھ سا گیا ہوں بن رائد!“ میں نے دانستہ پریشان اور فکرمند ہونے کی اداکاری دکھائی۔

”تمہارا پریشان ہونا ایک فطری بات ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”لیکن ہمارا تو خیال تھا کہ تمہیں کونزے اسٹاکر کی گفتگو سن کر بے حد خوشی ہوئی ہوگی۔“

”خوشی اپنی جگہ تو ہے مجھے مگر میں اس بات سے تھوڑا فکرمند بھی ہو رہا ہوں کہ اگر میں مسٹر کونزے کی کسی آزمائش پر پورا نہیں اترا تو کیا مجھے مار دیا جائے گا؟“

”مسٹر کونزے اسٹاکر سے گفتگو کرنے کے بعد بھی تمہیں اس کے بارے میں اندازہ نہ ہو پایا کہ وہ کیسا انسان ہے؟“

اس لعنتی شیطان کے گھناؤنے اور ناپاک عزائم جان کر تو مجھے پورا ہی اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ کیا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا لیکن میں بن رائد سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا، خاموشی سے اس کی سنتا رہا۔

”کونزے بلاوجہ خون خرابے کا قائل نہیں ہے۔ وہ خود کو ایسا انسان ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں جس آزمائش میں ڈالا جائے گا، اس میں تم پورا اترے تو ٹھیک، ناکام بھی ہوئے تو اس کوشش کو تمہاری محنت اور وفاداری کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا کہ آیا تم نے حقیقت میں یہ سب کرنا چاہا تھا یا نہیں۔“

”وہ آزمائش کیا ہوگی؟“ میں نے سوال کیا۔

”آؤ، اب ذرا دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ بن رائد مسکرا کر بولا۔ ہم وہاں سے دروازے کی

طرف بڑھے۔ اس کے آدمی بھی ہمارے پیچھے چلے آرہے تھے۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں بن رائد سمیت اس کے گرو گھنٹال کالے شیطان یعنی کونزے اسٹائکر کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن پھر اس کی کچھ وجوہات بھی سمجھ آنے لگیں۔ پہلی تو یہ کہ رانا بشیر کے پاس ان دونوں (بن رائد اور کونزے) کی ''گوٹ'' پھنسی ہوئی تھی، دوسری یہ کہ میری شاہ میر کے ساتھ ذاتی دشمنی نے بھی شاید ان دونوں پر یہ باور کرادیا ہو کہ میرا ان کے ''معاملات'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تیسری اور آخری وجہ وہ آزمائش تھی جس کی چکی میں مجھے یہ پھنسانے والے تھے مگر شاہ میر کو مار ڈالنے کے احکامات نے مجھے متفکر سا ضرور کردیا تھا۔

جب ہم دوستانہ ماحول میں ایک کمرے میں بیٹھے تو میں نے بن رائد سے گزارش کرڈالی کہ وہ شاہ میر کو ابھی ہلاک نہ کرے۔ میری بات سن کر وہ حیران ہوا۔ بولا۔ ''لیکن کیوں؟ وہ تو تمہارا ازلی دشمن ہے۔''

''بالکل ہے اور رہے گا بھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن پہلے میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے ملک پاکستان کی عدالت میں پیش کروں۔ آپ کو تو علم ہی ہوگا کہ میری شاہ میر کے ساتھ جنگ کی نوعیت کیا تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے مختصر ترین الفاظ میں اسے اپنی دشمنی کی اصل وجوہات سے آگاہ کردیا۔

''ہم......'' اس نے ایک ہنکارہ بھرا۔ ''ہم سمجھ رہے ہیں۔'' بن رائد پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''لیکن مسٹر کونزے اسٹائکر کے حکم کو اب رد نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے دیکھا وہ اسے معاف کرنے کے حق میں بھی نہیں ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا ایک پرانا دشمن اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔''

''ٹھیک کہا تم نے اب معاملات کی بات کرلی جائے؟ میرا مطلب ہے اس آزمائش کے سلسلے میں......جو......'' میں نے موضوع بدل دیا۔

بن رائد نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ابھی نہیں کل آرام سے باتیں ہوں گی۔ تم آرام کرو۔'' یہ کہتے ہوئے بن رائد نے اپنے دو آدمیوں سے کہا کہ مجھے اور کالیا کو ہمارا کمرا دکھا دیا جائے۔

''ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے بن رائد سے کہا۔

''ضرور!''

''کیا او برائے نگرانٹ مارا گیا؟'' بالآخر میں نے دھڑکتے دل سے پوچھ ہی لیا۔

''وہ بڑے کام کا آدمی ہے اسے بھلا ہم کیوں ماریں گے؟'' بن رائد نے جواب دیا۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی، بولا۔

''تو پھر کدھر گیا وہ؟ تہہ خانے میں وہ ہمارے ساتھ ہی تو تھا؟ میں دراصل یہی بتانا چاہتا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔'' میں نے آخری جملہ اسی لیے کہا تھا کہ وہ میرے متعلق کوئی ایسی ویسی بات اپنے دل میں لاسکے۔

''ہاں! وہ بھی وہیں تھا مگر ہمیں دھوکا دے کر بھاگ نکلا۔''

''مگر کیسے؟ کیا اس پر آنسو گیس نے اثر نہیں کیا تھا؟'' میں حیران ہوا۔

''وہ ایک پروفیشنل آدمی ہے۔ تیل کے کنوؤں میں لگی آگ بجھانے کا مایہ ناز ایکسپرٹ۔ ایسے پروفیشنل لوگ حبسِ دم کے پرانے کھلاڑی ہوتے ہیں، یہ بات ہمارے ذہن سے ہی نکل گئی۔ وہ بے ہوشی کی اداکاری کرتا رہا اور پھر موقع پاتے ہی بھاگ نکلا۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے بظاہر متاسفانہ برآمد ہوا۔

اس کے بعد میں اور کالیا ان کے ساتھ چل پڑے۔ ایک کوریڈور سے گزرتے ہوئے مجھے سیدھے ہاتھ کے ایک کمرے سے شاہ میر کے بڑبڑانے اور چیخنے کی آوازیں آئیں۔ وہ سخت مشتعل تھا۔ وہ اس وقت دوہرے اور تہرے عذاب سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف میرے ہاتھوں چت ہوگیا تھا، دوسرا اسے اپنے بیٹے کی موت کا بھی غم تھا تیسرا یہ کہ میں اپنی ''پوزیشن'' محفوظ کرنے کے بعد اسے پھنسا چکا تھا۔

لیکن نہیں، اب دریا کا رخ اور ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی اُلٹی گنگا بھی بہنے لگتی ہے، اکثر اٹل فیصلوں کو نظرثانی کرکے اس میں ترمیم کی گنجائش بھی رہتی ہے۔ یوں شاہ میر کے معاملے میں اب میرے خیالات کی رو کسی اور سمت پر بہنے لگی تھی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میری اس سے دشمنی ختم ہونے لگی تھی، ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔

شاہ میر کے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر راہداری کے بائیں موڑ پر ہمیں کمرا دیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں خیالات کی ایک عجیب و غریب کھچڑی پکنا شروع ہوگئی تھی۔

''ابے لے جگری یہ تو کیا کرنے چلا ہے؟'' کمرے

میں آتے ہی کالیا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''شی ی ی...'' میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی اور ساتھ آرام کرنے کی بھی۔ میری طرح تھکا ہوا وہ بھی تھا۔ کمرا پُرسکون اور آرام دہ تھا۔

کالیا تو گرتے ہی ڈھیر ہوگیا اور لگا خراٹے لینے۔ نیند مجھے بھی ستانے لگی تھی مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں بستر پر بہ ظاہر آنکھیں موندھے لیٹا تھا اور وقت گزاری کررہا تھا۔ نیند مجھے بھی ستا رہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری بھی آنکھ ہی نہ لگ جائے۔ نیند بھگانے کے لیے میں مسلسل اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا رہا تھا۔

شاہ میر کی بڑبڑاہٹوں کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ کمرے کی لائٹ آف تھی۔ میں بہت آہستگی سے بیڈ سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر جھری بنائی تو ٹھٹکا۔

راہداری میں مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے دھڑکتے دل سے اسی طرف دیکھا، آواز اسی سمت سے آتی محسوس ہوئی تھی جس رخ پر شاہ میر کو کمرے میں قید کررکھا تھا۔ وہاں سے میں نے بن رائد کے دو آدمیوں کو نکلتے اور آگے بڑھتے دیکھا۔ اس خیال سے میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا کہ کہیں یہ دونوں بن رائد کے کسی سفاکانہ ''حکم'' کی تعمیل کرنے کے لیے تو شاہ میر کے کمرے میں نہیں گھسے تھے؟

میرا دل بے چین ہوگیا۔ شاہ میر کا ابھی زندہ رہنا ازبس ضروری تھا، اس کی اب موت سے زیادہ زندگی ایک دم اہم ہوگئی تھی۔

میں نے جب تسلی کرلی کہ وہ دونوں مذکورہ افراد جاچکے ہیں تو میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور شاہ میر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ میں بن رائد کے محل میں رہتے ہوئے ایک بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔

پکڑے جانے کی صورت میں میری ساری دماغی محنت محض چند لمحات میں ضائع چلی جاتیں لیکن نیک مقصد کے لیے آگے بڑھتے رہنا ضروری ہوتا ہے، ایسے تو نہیں کہا گیا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ ایک راہ بند ہوتی ہے تو اللہ اور راہیں کھول دیتا ہے۔ یہ سب اسی کی کرم نوازی ہے۔

شاہ میر کے کمرے کے دروازے کے نزدیک پہنچا تو میں چونک پڑا۔ اندر سے مجھے گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگیں۔

میرا دل جو پہلے ہی تیزی سے دھڑک رہا تھا ایک دم جیسے رک گیا ہو۔

کچھ گھٹی گھٹی آوازیں تھیں۔ شکر تھا کہ دروازے پر تالا نہیں تھا، محض کنڈی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ راہداری میں مدھم روشنی تھی۔ میں نے بے آواز کنڈی کھولی اور دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔

کمرے میں روشنی ہورہی تھی۔ سامنے ہی مجھے شاہ میر اپنا سینہ تھامے فرش پر اینٹھتا ہوا ملا، وہ بے حال سا ہورہا تھا اور اس کے منہ سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھا لیکن آخری سانسوں میں ہی نظر آرہا تھا۔ میں فوراً اس کی جانب لپکا اور فرش پر اکڑوں بیٹھ کر اسے تھام لیا۔

''شش......شاہ میر! کیا ہوا تمہیں؟'' میں نے ہلکی مگر قدرے مضطربانہ سی آواز میں دریافت کیا۔ اس کا وجود جان کنی کے عالم میں کپکپا رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس کی بجھتی آنکھوں کے چراغوں میں روشنی کی مدھم لو ٹمٹمائی۔ حیرانی کا ہلکا تاثر بھی ابھرا۔

''مم...... مجھے زز...... زہر دے دیا گیا ہے۔ نن...... نمان......!'' میرا نام بھی اس سے صحیح طرح نہیں لیا گیا۔

''ہاں...... ہاں! بولو......'' میں نے کہا۔

''ہو ہو...... سکے تو مم...... مجھے معاف کردینا۔ ایک پتا نوٹ کرو جلدی۔'' اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

''شش...... شیخ خلیفہ ایونیو......بارہ، تین، دس، رافع...... وہاں جاؤ...... میری پرسنل کیبنٹ کا نمبر 45743001 ہے۔''

''رافع سے تمہاری مراد الرفع تو نہیں؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا تھا۔

وہ ختم ہوچکا تھا۔ میں چند ثانیے اسی طرح اس کا مردہ وجود سنبھالے فرش پر اکڑوں بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے جو کچھ حفظ کرایا تھا وہ میں دہرا رہا تھا اور جب اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا تو میں نے آہستگی سے مردہ شاہ میر کا سر فرش پر ٹکایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز تھا۔ میرے ہاتھ سینے پر دھرے تھے اور نیند آنکھوں سے اب کوسوں دور ہوچکی تھی۔ ایک ہلچل سی مچ گئی تھی میرے اندر۔

شاہ میر میرا ازلی دشمن جس کی دشمنی نے میرے جیسے امن پسند، صلح جو اور سادہ لوح انسان کی زندگی کی نہج ہی بدل ڈالی تھی۔ یقین نہیں آرہا تھا مجھے کہ اس کا انجام میرے

ہاتھوں ہونے کی بجائے کسی دوسرے کے ہاتھوں ہوگا لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے میرا دل اس کی موت پر دکھی تھا، کوئی ایسی پھانس تھی جو مجھے اندر سے بے چین کیے دے رہی تھی۔

اس کے ذاتی سیف (پرسنل کیبنٹ) میں ایسا کیا تھا جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا؟ خلیفہ ایونیو میں اس کی بارہ تین دس رافع والی کوٹھی میں کیا ہوسکتا تھا؟ یہ اور کئی سوالات ایسے تھے جو ایک مضبوط مفروضے کی صورت میں ہی سہی خود ہی جوابات بھی دیتے محسوس ہوتے تھے۔ مثلاً کیا وہ مجھے بن رائد سمیت کالے شیطان کو نیز ے اسٹاکر کا کچا چٹھا دکھانا چاہتا تھا؟ ضرور ایسی ہی کوئی بات تھی۔

اگلا دن ایک اور چونکا دینے والی خبر کے ساتھ طلوع ہوا۔ بن رائد کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ اسے پہلے آوالی لے جایا گیا تھا اس کے بعد اسے مزید تفتیش کے لیے مناوا پولیس چیف ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔

اس کے ایک لمبے تڑنگے نائب ابو جیرال نامی آدمی نے ہم پر یہ انکشاف کیا تھا، وہ ایک کمر درے اور لمبوترے چہرے والا جھلسی ہوئی رنگت اور کرخت رو آدمی تھا، اسے میں نے سب سے زیادہ بن رائد کے قریب دیکھا تھا۔

وہ بجائے پریشان ہونے کے مطمئن ہی نظر آرہا تھا۔ رواروی میں مجھ سے ایک بھیانک غلطی ہونے لگی تھی۔

میرے دل میں اچانک اس سے یہ سوال پوچھنے کا خیال ابھرا تھا کہ ''کیا شاہ میر کی ہلاکت کا راز راتوں رات افشاں ہوگیا تھا؟''

یقیناً میرے اس سوال سے ابو جیرال چونک جاتا... کیونکہ وہ مجھ سے پوچھ سکتا تھا کہ مجھے بھلا شاہ میر کی موت کا کیسے علم ہوا؟ ظاہر ہے میں اسے یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے آدھی رات کو جاسوسی کرکے اس بے رحمانہ عمل کا پتا چلایا تھا۔ لامحالہ میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ شاید شاہ میر کے سلسلے میں ہی ایسا ہوا ہوگا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اندر ایک زبردست جھماکا ہوا اور بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک نام میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

''فرحانہ۔''

''کس جرم میں پولیس معزز سلطان کو اپنے ساتھ لے گئی ہے؟'' میں نے بالآخر پوچھ لیا۔ میرے سوال پر ابو جیرال میری طرف عجیب اور چبھتی ہوئی سی نظروں سے گھورتے ہوئے تھوڑا مسکرایا پھر بولا۔ ''فرحانہ کو اغوا اور حبسِ

حضرت سید جلال الدین حیدر سرخ بخاریؒ نے ملتان و سندھ میں تبلیغ اسلام کا حق ادا کردیا۔ سید سرخ بخاریؒ علی نقیؒ کی اولاد میں سے تھے اور بخارا سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کے اثر سے ہزاروں لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اصلاح و تبلیغ کا یہ سرچشمہ مدتوں آبیاری کرنے کے بعد 95 سال کی عمر میں 19 جمادی الاول 690ھ مطابق 20 مئی 1291ء کو داعی اجل کو لبیک کہتا ہوا افق ہستی سے غائب ہوگیا۔ آپ کا مزار اوچ شریف بہاول پور میں مرجع خلائق ہے۔

مرسلہ: سید زاہد حسین، ملتان

1739ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا، 1753ء میں سورج مل جاٹ نے دہلی پر یلغار کی اور اس کے بعد مسلسل 1757ء تک کبھی عماد الملک نے دہلی پر ظلم و ستم کیا اور کبھی ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا اور کبھی مرہٹوں نے دہلی کو تاراج کیا۔ ایسے حالات میں دہلی کے باکمال شاعروں نے دہلی کو خیر باد کہا اور مرشد آباد، عظیم آباد (بہار) اور دکن تک پہنچے اکثریت فیض آباد اور لکھنو کی طرف روانہ ہوگئی۔ دہلی کے مہاجرین شعراء نے اردو شاعری کی ترقی اور ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اصناف سخن کو پروان چڑھایا۔ اس عہد کے شاعروں میں میر حسن، غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خاں انشا، جرأت، سعادت یار خاں رنگین، مرزا سلیمان شکوہ، مرزا محمد اسماعیل طپش، میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، مشہور و معروف شعراء ہیں۔

مرسلہ: عباس ترمذی، ملتان

سعادت یار خاں رنگین 1170ھ /1756ء میں سرہند میں پیدا ہوئے بچپن اور جوانی کا زمانہ دہلی میں گزارا۔ فارسی اور اردو کے علاوہ پندرہ زبانیں اور بھی جانتے تھے اور ان میں شاعری بھی کی ہے۔ دہلی سے نکلے اور لکھنو پہنچے۔ وہاں مرزا سلیمان شکوہ کے خزانے کے مہتم مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد لکھنو سے نکلے اور مرشد آباد، ڈھاکا، گوالیار، کلکتہ، باندہ کی سیاحت کرتے رہے۔ باندے میں ہی 1251ھ / 1835ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: نسرین قزلباش، کراچی

بیجا میں رکھنے کے جرم میں۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ مجھے ایک بار پھر ماحول میں کچھ کھنچاؤ کا احساس ہوا۔

''فرحانہ تمہاری ساتھی ہے نا؟'' ابوجیرال نے سوال کیا۔ انداز تخاطب چبھنے والا ہی تھا۔ مجھے بھی محتاط ہونا پڑا۔ بولا۔ ''ساتھی تو نہیں کہہ سکتے، البتہ وہ میرے باس رانا بشیر کی بیٹی ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ جلدی سے کہا۔ ''ویسے میں تو اس سلسلے میں معزز سلطان سے تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولا۔ ''ناشتا کرو۔''

ابوجیرال ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ میں اور کالیا ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ جانے کیوں اس نئی صورتِ حال سے نامعلوم سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد ہمیں اپنے کمرے میں جانے کا کہا گیا۔ میں اور کالیا کمرے میں آئے تو میں نے رات والی بات اسے بتا دی۔ کالیا کا منہ حیرت اور تشویش کے ملے جلے احساس تلے عجیب سا نظر آنے لگا۔

''ابے لے جگری! یہ کوئی لمبی گیم پڑنے والی ہے۔'' وہ متفکر لہجے میں بولا۔ ''ہمیں بھی اب زیادہ خوش فہمی میں پڑے بغیر یہاں سے جلد از جلد نکلنے کی راہ کرنی چاہیے۔''

''تم ایک بات بتاؤ ذرا کالیا؟'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''کون سی؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ بن رائد واقعی میری باتوں کے جھانسے میں آ رہا ہے یا پھر شاہ میر کی طرح میرے ساتھ بھی کوئی گیم کھیل رہا ہے؟''

میری بات سن کر کالیا معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''ابے لے جگری! میں آج پہلی بار تجھے اپنی چال میں بداعتمادی محسوس کرتے دیکھ رہا ہوں۔ کیا تجھے خود پر اعتماد نہیں رہا؟''

''حالات ہی ایسے غیر یقینی سے ہیں کالیا!'' میں نے کہا۔ ''سامنے نظر آنے والی شے بھی پرت در پرت پوشیدہ رہنے لگی ہے اور اچانک کسی اور ہی شکل میں سامنے آ کر بازی کا پانسا پلٹ دے رہی ہے۔ فرحانہ کے معاملے نے بازی پلٹی، پھر شاہ میر بھی گیا۔ بن رائد کا ایک دم رویہ میرے ساتھ محض چند سوالات کے بعد اس قدر نرم اور دوستانہ ہو گیا کہ

اس نے مجھ پر بھروسے کرتے ہوئے اپنے گرو گھنٹال بلیک ڈیول کو نزے اسٹاکر سے ہماری دوبدو گفتگو کروا دی اور نہ صرف یہ کہ ہماری وکالت بھی کرتا رہا اس کے سامنے؟ کیا چکر ہے یار یہ؟ تو ہی بتا تیرے قیافے اور اندازے کیا کہتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟''

''مجھے یہ سانپ اور سیڑھی کا کھیل لگ رہا ہے جگری!'' کالیا بولا۔ ''اپنے اپنے مفادات کی راہ میں دوستوں کے پیٹھ میں خنجر گھونپا جا رہا ہے اور دشمنوں کو گلے لگایا جا رہا ہے۔ ویسے بلیک ڈیول سے دوبدو ملانا کوئی زیادہ خاص بات نہیں ہے۔''

''لیکن اب آگے کی سوچنا چاہیے۔'' تھوڑے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''فرحانہ کا معاملہ بہت گھمبیر ہے۔ بن رائد اتنی آسانی سے پولیس کی گرفت سے آزاد ہونے والا نہیں۔''

''تو کیا تب ہمیں بھی یہیں رہنا ہوگا؟''

''تم نے جو اس کے ساتھ راہ و رسم بڑھا دی ہے تو! رہنا ہی پڑے گا۔ چلو ہمیں کون سا تکلیف ہے، یا قیدی ہیں، ہم یہاں، مہمان ہیں، ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ انواع و اقسام کے کھانے اعلیٰ درجے کی شراب میں تو گرویدہ ہو گیا ہوں یار نوی! ان کی مہمان نوازی کا۔'' وہ آخر میں شرارت بھرے انداز میں مجھے آنکھ مار کے مسکرایا تھا میں نے اس کا مصنوعی غصے سے اسے گھورتے ہوئے اس کا کان پکڑ لیا۔

''جب ہمارا بھی اچانک شاہ میر والا حشر کریں گے ناں یہ لمبے ٹھنگے عربی پھر تیرے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

''ابے لے جگری! میرا کان تو چھوڑ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرتے ہیں۔ شاہ میر سے تو جان چھوٹ ہی گئی، قصہ ختم اب کیا مسئلہ ہے؟''

میں نے اس کا کان چھوڑ دیا اور سنجیدگی سے بولا۔ ''نہیں کالیا! شاہ میر کے مرنے کے بعد قصہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ مجھے تو یہ ابھی شروع ہوتا ہوا لگ رہا ہے۔''

''چل پھر جو جی چاہے کرتا چل، میں تیرے ساتھ ہوں لیکن ابھی کا کیا سوچا ہے؟''

''انتظار۔''

''زہر ملنے کا؟''

میں کچھ نہ بولا۔

کافی دیر بیت گئی۔ ابوجیرال بہ نفسِ نفیس خود ہمارے کمرے میں آیا۔ میں اور کالیا اس کے چہرے کی طرف تکنے لگے۔ وہ بیٹھا نہیں تھا، ہم بھی کھڑے تھے۔ میں اس کا چہرہ

پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ پہلے سے زیادہ مطمئن اور مسرور بھی نظر آرہا تھا۔
''میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے سلطان کو کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی ضمانت کا بندوبست کردیا گیا ہے۔ وہ آج شام تک اپنے محل میں ہوں گے۔''
''ویری گڈ! بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔'' میں نے بھی فوراً اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
شام کو واقعی بن رائد اپنے محل میں تھا۔ میں نے اور کالیا نے خیر سگالی کا سلام پیش کیا۔
چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا کھانے پینے کا دور چلا۔ اس کے بعد میں نے بن رائد سے دوبارہ ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اجازت لی۔
''اب تم دونوں کہاں جاؤ گے؟ تمہارا ٹھکانا کہاں ہے؟'' وہ بولا۔
میں نے اوالی روڈ پر واقع اپنے سرائے نما ہوٹل کا پتا بتایا۔
''کیا ضرورت ہے وہاں رہنے کی اب؟'' وہ بولا۔
میری بھانپتی نظریں اس کے چہرے پر کچھ اور ہی قسم کے تاثرات کو تاڑ رہی تھیں، جیسے وہ مجھ سے کوئی اور اہم بات کہنا چاہ رہا ہو۔
''یہاں ہمارے پاس بھی تو رہ سکتے ہو؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ اس کا نائب ابوجیرال بھی لبے سے چغے میں ملفوف اس کے ساتھ والی نشست پر براجمان تھا۔ اس کی چبھتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
''یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی۔ ہم یہاں رہیں۔ آپ کی مہمان نوازی کا تو میں یوں بھی دل سے قائل ہوگیا، لیکن......''
''صرائفہ کب قیام کروگے؟'' بن رائد نے اچانک میری بات کاٹتے ہوئے سوال کیا اور مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ حقیقت یہی تھی کہ میرا یہاں سے نکلتے ہی صرائفہ ہی جانے کا ارادہ تھا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا کہ وہ اب شاید صرائفہ اور شہزادی نیلم کا موضوع چھیڑے گا۔ صاف بتا دیا۔
''اپنے کارواں سرائے سے کچھ ضروری سامان اُٹھا کر میرا ارادہ صرائفہ ہی جانے کا تھا۔''
''تم نے ان کی بہت مدد کی ہے اور ہمارا نقصان بھی کرڈالا۔'' بن رائد بولا۔
بہرکیف گفتگو کی نہج پھر حساس اور نازک ہونے لگی۔
''یہ بھی میری ان سابقہ مجبوریوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہی تھی، جن کے بارے میں آپ کو قائل کرنے کی شاید کامیاب کوشش کرچکا ہوں۔''
''ٹھیک کہا تم نے مسٹر نعمان!'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اب ہمارے بیچ نئے معاملات اور دوستی کے نئے رشتے استوار ہو ہی چکے ہیں تو پرانی باتیں کرنے کیا فائدہ لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم اب صرائفہ والوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔''
میں اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔
''اور یہ فریضہ تم نے ہی انجام دینا ہوگا، ہماری نئی دوستی کے نام پر تاکہ آگے چل کر یہ اور مضبوط ہو۔''
''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ یہ ایک پرانا قضیہ تھا اگر اس طرح حل ہوجاتا ہے تو میں اسی وقت اور بلا دیر صرائفہ پہنچ کر شہزادی نیلم کو آپ کا پیغام پہنچائے دیتا ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی اس بات کا بڑی فراغ دلی سے خیرمقدم کریں گی۔ یہ تو آپ نے بہت اچھی بات کہہ دی۔ میرے سر کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔'' میں نے فوراً ہی جواب میں بے پناہ خوشی کا اظہار کرڈالا۔
''ہاں! ہمیں اندازہ ہے کہ صرائفہ والے اور بالخصوص شہزادی نیلم تم پر کس قدر اندھا اعتماد کرنے لگی ہیں۔ وہ تمہاری کوئی بات رد نہیں کرسکتی۔ یہ صلح والی بات تو یوں بھی وہ قبول کرہی لیتی لیکن......'' اتنا کہتے ہوئے وہ ذرا خاموش ہوا پھر ایک نظر قریب بیٹھے ہوئے اپنے نائب ابوجیرال کی طرف دیکھا۔
میں اب ہونق سا اس کے چہرے کی طرف تکتا رہ گیا۔ اس کے بولتے بولتے ''لیکن'' پر اٹک جانے اور قطع کلامی پر میں بھی چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔
''تمہاری آزمائش کا ایک چھوٹا سا امتحان ہم لینا چاہیں گے۔'' بالآخر اس نے ''لیکن......'' کے بعد والے الفاظ ادا کیے۔ ''تم کسی طرح ہماری شادی شہزادی نیلم سے کرواسکتے ہو؟''
کالیا کو زبردست ٹھسکا لگا، ساتھ ہی حسب عادت اس کے منہ سے ہولے سے ''ابے لے'' بھی برآمد ہوا تھا۔ خود میں بھی پیسٹری منہ میں ڈالتے ہوئے آدھی ہاتھ اور منہ سے چھوٹ کر گر پڑی۔
''کیا ہوگیا؟ تم دونوں تو ایسے بدک گئے جیسے میں

نے شہزادی نیلم کو ہلاک کرنے کا کہہ دیا ہو۔'' بن رائد تھوڑا سا خفا ہوتے ہوئے بولا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' کالیا باز نہیں آیا۔ ہولے سے اردو میں بولا۔

''ایسی بات نہیں معزز سلطان!''میں نے بات رکھنے کی کوشش چاہی۔ ''دراصل یہ ہمارے لیے غیر متوقع تھا۔''

تھوڑے توقف کے بعد میں نے بات رکھنے کی غرض سے کہا۔ ''ویسے میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی ایسی برائی ہے، یہ آپ کا بلاشبہ ایک نیک عمل ہی کہلائے گا اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے مرحوم والد صاحب بھی آپ کے لیے صرائفہ کی شہزادی نیلم کو رشتہ بھیج چکے تھے مگر اس نے انکار کردیا تھا۔''میں نے جلدی سے گفتگو کا رخ سنجیدگی کی طرف موڑ دیا۔

''ہاں!'' بن رائد ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا خیال تھا کہ شہزادی نیلم کسی اور شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے، ہم نے اس نوجوان کو بہت تلاشنے کی کوشش کی تھی مگر اب تک شہزادی نیلم کا غیر شادی شدہ رہنا ازخود ہی ظاہر کرتا ہے کہ ان کی کوئی پسند نہیں ہے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں اور میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کا یہ پیغام صلح نامے کے ساتھ ہی شہزادی نیلم تک پہنچا دوں گا۔'' میں نے کہا، بن رائد نے مسرت بھرے انداز میں اٹھ کر مجھے گلے سے لگالیا۔

''ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم واحد آدمی ہو جس کا کہا صرائفہ کی شہزادی کبھی بھی نہیں ٹالے گی۔ ہم تمہیں سونے میں تول دیں گے۔''

چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے بیٹھا میں کھاتا پیتا رہا جبکہ میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ امرِ واقع یہی تھا کہ مجھے ہنوز بن رائد کی نیت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ آیا وہ میرے ساتھ کوئی چال چل رہا تھا یا وہ میری چال میں آرہا تھا۔

تھوڑا غور کرنے پر یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ اگر وہ چال چل رہا تھا تو بلیک ڈیول سے ہماری ''لاسکی'' ملاقات کیوں کرواتا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کچھ ''دو اور لو'' کے تحت مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہو جیسا کہ اس نے کہا کہ یہ بھی میری ایک آزمائش کا ہی حصہ ہے کہ میں صرائفہ کی شہزادی کو بن رائد سے شادی پر آمادہ کرلوں؟

اس دوران میں وہ نوجوان ارشد میری نگاہوں میں گھوم گیا جسے میں نے شہزادی نیلم کے ساتھ دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم نے اجازت مانگی۔ بن رائد سے میں نے یہی کہا کہ میں اب سب سے پہلے صرائفہ جانا چاہتا ہوں تاکہ فوری طور پر اس کے ''رشتے'' کے لیے شہزادی نیلم سے بات کرسکوں۔ وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

ہم گرانٹ کی کار میں جانا چاہتے تھے مگر بن رائد نے بتایا کہ اس کی کار وہیں تہہ خانے والے مکان میں چھوڑ آئے تھے۔

اس نے اپنی فور وہیل ڈرائیو جیپ ہمیں دے دی اور کہا کہ وہ رشتے اور صلح نامے کے لیے خیر سگالی کے طور پر شہزادی نیلم کے لیے کچھ قیمتی تحائف بھی دینا چاہتا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔

ایک لمبی سی جیپ ہمیں دے دی گئی۔ اس کے پچھلے حصے میں خشک میوے، پھل فروٹ بھیڑوں اور اونٹ کے گوشت کے نمک لگے خشک پارچے لدوا دیے گئے۔ الگ سے مجھے ایک بریف کیس بھی بن رائد نے تھما دیا۔ اسے کھول کر جب اس نے مجھے دکھایا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے اندر سونے، ہیرے اور قیمتی پتھروں کی نہایت دیدہ زیب جیولری نفاست سے رکھی ہوئی تھیں۔

''یہ تو آپ بہت بڑی ذمے داری سونپ رہے ہیں مجھے معزز سلطان!'' میں نے تھوڑا سا گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''ہمیں معلوم ہے تم کیوں گھبرا رہے ہو؟'' وہ بولا۔ ''ہمیں تم پر پورا بھروسا ہے۔ ہماری طرف سے یہ سب شہزادی نیلم کو تحفتاً دے دینا۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں چاہ رہا تھا کہ شہزادی نیلم کا دل جیتنے کے لیے آپ کو ایک قدم اور بھی بڑھانا پڑے گا۔''

''میں تیار ہوں، بتاؤ مجھے جلدی اور کیا کسر رہ گئی ہے؟''

''بہتر ہوگا کہ آپ کل صبح دن کے کسی وقت میں چند افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا وفد بھی صرائفہ روانہ کردیں، جو صرف شہزادی نیلم سے صلح کی بات چیت کرنے جائے گا۔''

''ہمیں تمہارا یہ مشورہ بہت پسند آیا۔'' وہ خوشی سے بولا۔ ''ہم کل صبح دن چڑھے ہی چار افراد صرائفہ کی جانب اس مقصد کے لیے روانہ کردیں گے، ہمارا نائب ابو جیرال ساتھ ہوگا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' کہتے ہوئے میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا لیکن پھر اچانک ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت میں چپ سا ہو رہا۔ بن رائد میری اچانک اور لحاتی خاموشی کو فوراً بھانپتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''اب کیا ہوا؟''

''معزز سلطان! کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ آپ خود بھی بہ نفسِ نفیس تشریف لے آتے تو......'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

''ہم بھی ضرور آئیں گے، یہ پیغام شہزادی صاحبہ کو ہماری جانب سے دے سکتے ہو۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور پھر میں اور کالیا گہری ہوتی شام میں ربع الخالی کے ریگ زار کی جانب محو سفر ہو گئے۔

جیپ خاصی بڑی اور طاقت ور تھی۔ احتیاط کے پیشِ نظر ہمیں دو لیوگر پستولیں رکھنے کو دے دی گئی تھیں۔ جیپ میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کالیا میرے برابر کی سیٹ پر براجمان تھا اور خاموشی میں مستغرق تھا، یوں جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔

شام ڈھلنے لگی تھی اور اوپر کھلے آسمان پر تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ ہر سو ملگجی سی تاریکی چھانے لگی تھی۔ فضا خنک ہو رہی تھی۔ پورے ماحول پر ایک عجیب سی چپ مسلط تھی۔ جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔

''ارے یار! تجھے کیوں چپ لگ گئی ہے؟ کوئی تبصرہ نہیں کیا تُو نے؟''

''میں کیا بولوں جگری؟ تُو نے تو میری بولتی ہی بند کر دی ہے۔ پتا نہیں تو یہ کیا گل کھلاتا پھر رہا ہے؟ تجھے تو شادی دفتر کھول لینا چاہیے۔''

وہ برے برے منہ بنا کر کہہ رہا تھا اور اس کی بات پر بے اختیار میرے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ بولا۔ ''میں شادی دفتر نہیں بلکہ چال بازی کا دفتر کھول رہا ہوں۔ تم دیکھتے جاؤ۔''

''میں دیکھ تو رہا ہی ہوں مگر یار جگری! کہیں ہمیں ہی نہ دیکھنا پڑ جائے۔'' کالیا سنجیدگی سے بولا۔

''یار! اب ایسی بدفعالیں تو منہ سے مت نکالو۔''

''یہ بتاؤ، کیا واقعی تم بن رائد کا پیغام شہزادی نیلم تک پہنچاؤ گے؟''

''کون سا صلح والا پیغام؟''

''شادی والا۔''

''ضرور کیوں نہیں، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اچھی بات ہے ربع الخالی کے دونوں قبیلوں کی برسوں کی دشمنی اٹوٹ رشتے میں بدل جائے گی۔''

''ہُنہ......اٹوٹ رشتہ......دوستی سب ڈھکوسلے بازی ہے یہ......صرائفہ کی سونا اگلنے والی زمین پر قبضے کا ایک نیا منصوبہ ہے۔'' کالیا نے استہزائیہ انداز میں تبصرہ کیا۔ ''یار جگری! یار تم بھولے بادشاہ بن رہے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمہاری اس بات پر شہزادی نیلم ناراض ہی نہ ہو جائے۔''

''میں بھولا بادشاہ نہیں ہوں کالیا! بھولا بن رہا ہوں۔'' میں نے اچانک ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ کالیا چونک کر اپنی گردن موڑے میری طرف تکنے لگا۔

ہم اس وقت خذی کی حدود سے باہر نکل رہے تھے اور ایک بیچ صحرا میں سانپ کی طرح بل کھاتے راستے پر ہو لیے تھے۔ ابھی نخلستان اور باغات کا سلسلہ جاری تھا۔ کھجوروں کے ایک وسیع و عریض باغ کی جنوبی طویل اور گارے مٹی والی دیوار پار کی تو دائیں جانب کے ختم ہوتے نخلستانی جھیل کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے تبھی اچانک ایک طرف کی جھاڑیوں سے کوئی سایہ نمودار ہوا اور ہماری جیپ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

میں نے فوراً بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ کے ٹائر جام ہو گئے اور گاڑی تھوڑا سا ایک طرف کو مڑ گئی۔ وہ آدمی لپک کر جیپ کی جانب بڑھا۔ کالیا اور میں نے اپنے لیوگر نکال لیے تھے۔

لیکن پھر اسے پہچان کر ہم دونوں کے منہ سے مسرت بھری چیخ سی خارج ہو گئی۔

''او برائے گرانٹ!'' میں نے پکارا۔

''دروازہ کھولو جلدی۔'' وہ بولا۔ بے چارے کی عجیب ہی حالت ہو رہی تھی، ریت اور مٹی سے اٹا ہوا وہ بادی النظر میں کوئی بھوت ہی دکھتا تھا۔

کالیا نے جلدی سے ہاتھ پیچھے بڑھا کر عقبی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور گرانٹ جلدی سے جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس کے سوار ہوتے ہی میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔

''شکر ہے تم زندہ ہو!'' میں نے کہا۔ تو کالیا بھی اس سے بولا:

حضرت سید عبداللہ شاہ غازی علیہ الرحمہ

حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ بھی اللہ کے خاص بندوں اور اولیائے کرام میں سے ایک ہیں کہ جنھوں نے اللہ رب العزت کے ہاں کمال مرتبہ پایا۔ سید عبداللہ شاہ غازی کی ولادت باسعادت 98ھ میں شہر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی مدینہ شریف میں ہوئی۔ یاد رہے کہ یہ پہلی صدی ہجری کا آخری دور تھا۔ پورا ملک افراتفری اور انتشار کا شکار تھا اور بنوامیہ کی حکومت کے آخری دن تھے۔ آپؒ کا اسم گرامی سید عبداللہ کنیت ابومحمد اور لقب الاشتر ہے۔ الاشتر لقب اس وجہ سے معروف ہوا کہ آپؒ کے پپوٹے آنکھوں پر جھکے ہوئے تھے، ایسے شخص کو الاشتر کہا جاتا ہے۔ آپؒ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں باب العلم امام الاولیا، حضرت علیؓ، سے جاملتا ہے۔ حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر اپنے والد محترم سے ہی حاصل کی۔ آپؒ کو بچپن ہی سے علم دین سیکھنے اور سکھانے کا بڑا شوق تھا اور خواہش تھی کہ دین اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے اللہ کریم کی طرف سے عطا کردہ زندگی کو بامقصد گزارا جائے اور اللہ کی رضا و خوشنودی کا گوہر نایاب اپنے دامن میں سمیٹا جائے کہ اس سے بڑھ کر بھلا زندگی کی کامیابی اور کیا ہوسکتی ہے۔ بہت ہی کم عرصہ میں علم حدیث میں اتنا کمال حاصل کرلیا کہ آپؒ کا شمار باقاعدہ محدثین میں ہونے لگا۔ دوسری طرف دوسری ہجری کے آغاز میں بنوامیہ کی حکومت انجام کو پہنچی اور عباسیوں نے اقتدار سنبھالا۔ اس کے بعد آپؒ کے والد محترم نے آپ کو بصرہ میں اپنے بھائی ابراہیم کے پاس بھیج دیا، آپ کچھ دن بصرہ میں رہے اور وہاں سے اپنے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ کر تبلیغ دین اسلام کے فروغ کے لیے برصغیر سندھ میں تشریف لائے، فروغ اسلام کے لیے سندھ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے اللہ کے نیک بندے اور بزرگ

''ہم نے ویسے تمہاری تسلی کرلی تھی کہ تم زندہ ہو اور انہیں دھوکا دے کر فرار ہوگئے تھے۔''

گرانٹ کوئی جواب دیے بنا، حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیپ کے پچھلے حصے میں رکھے نوادرات وغیرہ کو تکے جارہا تھا۔ زیورات کا بریف کیس بھی اس کے برابر میں ہی دھرا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔'' بالآخر وہ بولا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم فرار ہونے لگے ہو مگر یہاں تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہاری بن رائد سے کوئی سازباز ہوگئی ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔'' کالیا قہقہہ مار کے بولا۔

''کیا مطلب؟'' گرانٹ کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کالیا کو گھورتے ہوئے بولا تو میں نے گرانٹ کو دھیرے دھیرے ساری بات بتادی۔

''بن رائد ایک زہریلے سانپ کی مثال ہے دوستو!'' ساری رام کتھا سننے کے بعد گرانٹ بولا۔ ''جہاں اس کا اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتا ہے لیکن دشمنی نہیں فراموش کرتا۔''

''ہمیں اس کا اندازہ ہے، ہم خود اسے بلف کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''شاہ میر کی موت کے آفٹر ایفیکٹس کے بارے میں تم لوگوں نے غور کیا ہے؟'' گرانٹ نے اچانک کہا اور میں چونک گیا۔ کالیا نے بے اختیار کہا۔

''کیا مطلب؟''

''شاہ میر، بن رائد کی طرح کونزے اسٹائکر کا قریبی دست راست رہ چکا ہے۔ وہ اس کالے شیطان کے بہت سے رازوں سے نہ صرف واقف ہوگا بلکہ اس کے پاس ان سارے منصوبوں کی تفصیل بھی ہوگی۔''

''اس کا اندازہ تو ہمیں بھی ہے گرانٹ!'' میں نے جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار سامنے ہیڈلائٹس کی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارا شاہ میر کی موت کے بعد یعنی مابعد اثرات سے کیا مطلب تھا؟''

''کالا شیطان ہی نہیں بن رائد بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔'' گرانٹ بولا۔ ''وہ اس کے مذکورہ پتے والی رہائش گاہ پر خفیہ طور پر اپنے آدمی بھیج سکتے ہیں، اس تصدیق اور تلاشی کے لیے کہ ممکنہ طور پر شاہ میر کے پاس کوئی ایسی ویسی دستاویزات تو موجود نہیں ہیں، جوان

حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ ہی تھے۔ آپؒ گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے سندھ میں داخل ہوئے یہاں کے لوگوں نے آپؒ کی بہت تعظیم و تکریم کی اور مختصر عرصہ میں ہی آپؒ نے اپنے حسن اخلاق، تقویٰ، پرہیز گاری اور پاکیزہ زندگی کے باعث لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیا، بے شمار لوگوں نے آپؒ کے دستِ حق پر اسلام قبول کیا اور اپنے زنگ آلود دلوں کو دین اسلام کی بے مثل روشنی سے منور کیا، آپؒ مسلسل 12 سال تک دل جمعی اور خلوص و محبت کے ساتھ تبلیغ دین اسلام کا فریضہ احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے اور بے شمار سندھیوں کو آپؒ نے مشرف بہ اسلام کیا۔ خلیفہ منصور نے 151ھ میں گورنر حضرت عمر بن حفص ؒ کو معطل کرتے ہوئے افریقا بھیج دیا اور ان کی جگہ ہشام بن عمر تغلبی کو سندھ کا نیا گورنر مقرر کر دیا اور اس کو حکم نامہ لکھ بھیجا کہ حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کو گرفتار کر کے دربار خلافت میں پیش کیا جائے مگر ہشام بن عمر نے بھی حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کو گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسی دوران سندھ کے ایک علاقے میں حکومت کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی جس کو ختم کرنے کے لیے گورنر ہشام بن عمر نے اپنے بھائی کو بھیجا مگر راستے میں اس کی حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ سے ملاقات ہوگئی جو شکار کے لیے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لا رہے تھے۔ اس نے انہیں ہاشمی جان کر لڑائی شروع کر دی اور اس میں آپؒ شہید ہوگئے۔ حضرت سید عبداللہ شاہ غازیؒ کے مریدین نے آپؒ کو ساحل سمندر پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک پہاڑی پر سپرد خاک کر دیا۔ یہ وہ جگہ ہے جسے آج ہم کلفٹن کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ پورا سال زائرین کا آپؒ کے آستانہ عالیہ پر ہجوم رہتا ہے اور متلاشیان حق آج بھی آپؒ کے توسط سے فیض پا رہے ہیں۔

صاحبزادہ پیر مختار احمد جمال تونسوی

کے کسی منصوبے کو آشکارا کرنے کا سبب بنے۔''

''تب پھر یقیناً یہی بات رہی ہوگی۔'' کالیا ایک دم بولا۔''اسی لیے تو شاہ میر نے نومی کو مرتے وقت یہ پیغام دیا تھا۔ اس کے ذاتی سیف میں یقیناً کوئی ایسی اہم دستاویزات موجود ہوں گی جن کا علم کالے کوبزے سمیت بن رائد کو بھی ہوگا اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ جائیں، اس سے پہلے ہی وہ اسے اپنے ہاتھ میں کرنا چاہیں گے۔''

یہ سب سن کر میرا دل بے چین ہوگیا۔ شاہ میر کا پیغام کس قدر اہم نوعیت کا تھا اس کا اندازہ اب میرے اور کالیا کے علاوہ گرانٹ کو بھی ہو چلا تھا۔

''تو پھر صرائفہ جانے کا راستہ ترک کر کے ادھر سے ہی پہلے مناوا نکلا جائے؟'' بالآخر میں نے کہا۔

''نہیں ابھی صرائفہ ہی چلو یہ گنفس پہنچانے ضروری ہیں پھر کل صبح بن رائد کا وفد بھی صرائفہ پہنچنے والا ہے۔'' گرانٹ نے مشورہ دیا۔

''گرانٹ! پھر ایسا کرتے ہیں کہ کالیا کو صرائفہ چھوڑ دیں گے، تم اور میں صبح منہ اندھیرے مناوا نکل جائیں گے۔ کالیا، شہزادی نیلم اور ابو شاہ وغیرہ کے ساتھ ہماری طرف سے نمائندگی کر دے گا۔''

''یہ تجویز مناسب ہے۔'' کالیا بولا۔ گرانٹ نے بھی صاد کیا۔

''اس کی خلیفہ ایونیو والی رہائش گاہ میں اور کتنے افراد ہو سکتے ہیں؟ میرا مطلب ان کے فیملی ممبر سے واقف ہو تم؟'' گرانٹ نے اچانک ایک اور سوال اٹھایا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔''اس کی ایک بیوی اور ایک بیٹی ہے۔ بیوی کا نام لیلیٰ صمعاد ہے، جو ایک عربک خاتون ہیں اور بیٹی کاشفہ ہے جبکہ ثمیر کے متعلق ہم تمہیں بتا ہی چکے ہیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ یہاں ہیں یا پاکستان میں؟ کیونکہ وہاں بھی کراچی میں ان کی ایک عالیشان کوٹھی ہے۔ وہاں بھی یہ لوگ اور بھی ماں بیٹی آتی جاتی رہتی ہیں۔''

''ہم...... میرا مطلب یہ تھا کہ ہم شاہ میر کی رہائش گاہ میں کیسے داخل ہوں گے؟ نقب لگا کر یا پھر اجازت طلب کر کے؟ ایسی صورت میں تم اس کی بیوی یا بیٹی کو کیا بتاؤ گے کہ وہ شاہ میر کے ذاتی سیف کی تلاشی لینے آئے ہو؟ وہ فوراً پولیس کو فون کر دے گی اور اگر یہ بتاتے ہو کہ شاہ میر مر چکا

ہے تو مزید حالات خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔"
"ایک اندیشہ اور بھی ہے جگری!" کالیا نے بھی فوراً گرانٹ کی طرح گرہ لگائی۔
"ان کا بیٹا ثمیر ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔ وہ تو ہمیں دیکھتے ہی چیخ اٹھیں گی۔"
"یار تم دونوں اتنے سارے مسائل کا صرف تذکرہ کر کے مجھے مزید پریشان ہی کرتے رہو گے یا اس کا کوئی حل بھی بتاؤ گے۔" میں جھلا کر بولا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔
بالآخر طے یہی ہوا کہ پہلے صرائفہ پہنچا جائے اور پھر جب وہاں سے مناوا کے لیے نکلا جائے گا تب ہی کچھ سوچ لیں گے۔
یوں لگ بھگ گھنٹے بھر بعد ہم صرائفہ پہنچ گئے۔ صرائفہ میں تو جیسے ابھی تک جشن کا سماں تھا۔ خشک سالی ختم ہو چکی تھی۔ پانی کے سوتے پھوٹنے سے ہریالی نظر آنے لگی تھی، سوکھے نخلستانوں کے قدرتی چشمے بھر آئے تھے، تازہ نباتات کی بو جو ایک عرصے سے روٹھی ہوئی تھی اب دوبارہ صرائفہ کی فضا میں رچ بس گئی تھی۔
ہمارا بڑا والہانہ استقبال کیا گیا اور ہوائی فائرنگ کر کے ہماری آمد کی اطلاع دی گئی۔
شہزادی نیلم بہ نفسِ نفیس خود ہمارے استقبال کے لیے پہنچ گئی۔ حالانکہ وہ ہم سے مناوا میں منصور کی رہائش گاہ پر مل چکی تھی مگر قبیلے کے دیگر لوگوں کی طرح اس نے بھی میرا شایانِ شان استقبال کیا تھا۔ ارشد مجھے نظر نہیں آیا تھا البتہ بوڑھا ابوشاہ ساتھ تھا اس کے۔
شہزادی نیلم زرق برق لباس میں ملفوف تھی۔ رات کے آسمان پر پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کا ملکوتی حسن ہیرے کی مانند جگمگا رہا تھا۔ اس نے ایک دلنشین مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ میری جانب بڑھایا جسے میں نے نہایت احترام سے تھام کر بوسا دیا۔
ہم اس کی معیت میں محل کے اندر آنے لگے تو میں نے ابوشاہ کے کان میں کہہ دیا کہ جیپ میں کچھ سامان رکھا ہے وہ اتروا لے۔ وہ حیران تو ہوا اور مجھ سے کچھ استفسار کرنا چاہا تھا مگر میں آگے بڑھ گیا تھا۔
بیش قیمت جیولری والا بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔
ہمارے کھانے پینے کا شاندار بندوبست کیا گیا۔ ہم سب نے پہلے غسل کیا اس کے بعد شہزادی کے ساتھ کمرائے خاص میں جا بیٹھے۔ بھوک تو نہیں تھی تاہم دیگر ساتھیوں کی وجہ سے مجھے بھی کچھ نہ کچھ زہر مار کرنا پڑا۔
پھر قہوے کا دور چلا تو میں نے بریف کیس کھول کر شہزادی نیلم کے سامنے رکھ دیا۔
"یہ کیا ہے؟" وہ حیرانی سے کھلے پڑے بریف کیس میں جگمگاتے ہوئے قیمتی اور دیدہ زیب زیورات کو دیکھنے لگی۔ اس کے آدمیوں میں صرف ابوشاہ وہاں موجود تھا اور ہم تینوں تھے۔
میں نے دھیرے دھیرے شہزادی نیلم کے اب تک کے سارے واقعات وحالات سے آگاہ کر دیا۔
کمرے میں یکایک سناٹا طاری ہو گیا، چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اچانک شہزادی نیلم کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔ ہم سب اس کا نقرئی چہرہ تکنے لگے۔
"تم نے بن رائد کو خوب اُلو بنایا ہے مسٹر نعمان!" وہ بولی۔ اس کے پھولوں کی سی پنکھڑیوں جیسے نرم لب متحرک ہوتے بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کھلا دہن اور اس کے اندر سے جھانکتے موتیوں جیسے دانتوں کی ہموار قطار لڑی میں پروئے ہوئے دکھتے تھے۔ آنکھوں کی کمانیں کھینچ کر اور بھی دلکش نظر آنے لگی تھیں۔
"لیکن وہ ہمیں اُلو بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔"
"ہم اس کی چالاکی سمجھ چکے ہیں، شہزادی صاحبہ!" اس بار گرانٹ اس سے مخاطب ہو کر بولا۔
"تم مشورہ دو مجھے مسٹر نعمان! ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" شہزادی نیلم نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔ جس کا میرے پاس پہلے ہی سے ایک آسان جواب تیار تھا۔ بولا۔
"آپ ابھی ان کی ایک بات تو تسلیم کر لیں۔"
"کون سی؟" اس کا انداز معنی خیز تھا۔ میرے چہرے پر بھی اس کی نگاہوں میں سوال کرتا گہرا پن تھا۔
"یہی صلح والی بات یہ ایک اچھا عمل ہے۔ یقیناً اس کی تائید آپ کا قبیلہ بھی کرے گا۔" میں نے کہا۔
"اور...... دوسری والی بات؟" کہتے ہوئے شہزادی نیلم کے گداز ہونٹ بھیدوں انداز میں مرتعش ہوئے۔
"وہ......وہ...... میرا خیال ہے آپ کا ذاتی معاملہ ہوگا، میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔"
"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

''ایسی بات نہیں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''بن رائد ہم سب جانتے ہیں اور اس رشتے کے پیچھے اس کا ناپاک مقصد بھی، لیکن میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ابھی کیا ضرورت ہے اسے صاف انکاری جواب دینے کا۔ پہلے صلح والی بات پر پوری طرح عمل درآمد ہو جانے دیجیے اور بہانے سے رشتے والی بات ابھی ٹالے رکھیے تب تک میں اور میرے ساتھی اپنا کام نمٹاتے ہیں۔''

''بہت ذہین اور ہوشیار ہو تم!'' وہ اچانک دلنشین مسکراہٹ سے بولی۔

رات گئے تک باتیں ہوتی رہی تھیں، میں نے شہزادی نیلم کو تھوڑا بہت بریف بھی کیا کہ اس نے حدی سے آنے والے وفد سے کیا باتیں کرنا تھیں، یوں وہ خود بھی حالات کا ادراک رکھتی تھی۔

بہرکیف! اس دوران محمود الحسن سے بھی ٹیلی فونک رابطہ کیا گیا تھا، وہ مناوا میں ہی تھا اور الہدیٰ اسپتال میں اپنے دو آدمیوں کے ساتھ فرحانہ کی حفاظت پر معمور تھا۔

حالات کچھ بہتر تھے لیکن ابھی ہم اسے وہاں سے نہیں ہٹا سکتے تھے، تاہم اسے ہم ساری تفصیل تو نہیں بتا پائے البتہ یہ ضرور کہا کہ کل صبح میں بھی مناوا پہنچ رہا ہوں اور ممکن ہے کہ گلنارا کے گھر یا کسی اور جگہ ملاقات ہو جائے تو تفصیلی گفتگو ہو جائے گی، وغیرہ۔

اس کے بعد کالیا نے دبئی اسپتال فون کیا۔ ریسپشن سے پتا چلا کہ نہیم خیریت سے تھا اور ابھی کچھ روز ایسے اور دیگر مریضوں کو ''میڈیکو اینڈ فزیو آبزرویشن'' میں رکھا جائے گا۔

فوزیہ اور اس کے ہونے والے منگیتر یا شوہر مسعود کے بارے میں ابھی کچھ پتا نہیں چل سکا۔ اس مقصد کے لیے میرا دبئی جانے والا اہم پروگرام بھی التواء کا شکار تھا۔ اس کے لیے میں نے سوچا کہ میں جا سکا تو ٹھیک ورنہ کالیا کو ایک آدھ روز کے لیے روانہ کردوں گا، تاہم خواہش میری ہی شدید تھی کہ میں ایک بار جا کر کسی طرح اس کا حال پوچھ لوں اور اپنے چھوٹے بھائی کا بھی۔

یہاں میں آتے ہی کچھ ایسا الجھ گیا تھا کہ دبئی جانے تک کا وقت نہ مل سکا تھا اور اب مناوا جانا ازبس ضروری ٹھہرا تھا۔ دگرگوں حالات مجھے سانس لینے اور آرام سے چند گھڑی بیٹھنے ہی کب دے رہے تھے؟ فوزیہ کی یاد آتے ہی میرا دل بری طرح مسوس کرنے لگا تھا۔

تاہم ایک بات کی کچھ تسلی تو تھی کہ وہاں فوزیہ یا فہیم کو ایسا کوئی خاص جانی خطرہ نہ تھا۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی اس کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔

اگلے دن صبح تڑکے ہی پروگرام کے مطابق میں اور گرانٹ جیپ میں مناوا کی طرف روانہ ہو گئے۔

اوالی روڈ سے گزرتے ہوئے میں اپنے کارواں سرائے کے کمرے میں گیا اور اپنا تھوڑا بہت ضروری مگر مختصر سامان اٹھا کر اسے خیر آباد کہہ دیا۔

مناوا پہنچ کر ہم خلیفہ ایونیو روڈ پر پہنچے اور وہاں سے سیدھا مطلوبہ پتے والی رہائش گاہ کی طرف مڑ گئے۔

ہماری جیپ ابھی ذیلی شاہراہ پر تھی۔ میں اور گرانٹ اپنا لائحہ عمل تیار کر چکے تھے۔

جلد ہی ہم مطلوبہ پتے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک عالیشان رہائش گاہ تھی اس کے گیٹ کے سامنے میں نے جیپ روک دی تھی۔

دیکھا جاتا تو یہ میر کے لیے ایک بڑی مشکل اور نازک چویشن تھی۔ گویا میرے لیے ایک بہت بڑا اور کڑا امتحان تھا کہ مجھے نہ صرف شاہ میر کی بیوہ کیلی صماد اور اس کی بٹی کاشفہ کو پہلے قائل کرنا تھا، اس کے بعد انہیں اعتماد میں لینے کا مرحلہ آتا کہ وہ مجھے شاہ میر کے ذاتی سیف کو کھول کر اس کی تلاشی پر رضامند ہو کر بہ خوشی اجازت دیتی ہیں یا نہیں جبکہ ثمیر والے حساس اور نازک معاملے کی سنگینی اپنی جگہ تھی، اس پر مستزاد شاہ میر کی موت کا سن کر ان دونوں ماں بیٹوں کا مجھے دیکھ کر کیا ردِعمل سامنے آنے والا تھا۔

چنانچہ یہ اب پیش آیند حالات پر منحصر تھا کیونکہ بیٹے اور بھائی کے قاتل کو وہ اپنے شوہر اور باپ کا قاتل بھی سمجھ سکتی تھیں یا پھر ان دونوں کو ہی شاہ میر نے ہنوز کچھ بھی نہ بتایا ہو؟ اس مفروضے کی امید کم ہی تھی لیکن مجھے انہیں سمجھانا تھا کہ ان دونوں کی جانیں بھی خطرے سے دوچار ہیں اور اس کے لیے میرے پاس ٹھوس دلیلوں کا ہونا ضروری تھا۔

یہ سب پل کے پل سوچتے ہوئے میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہونے لگی تھیں۔

بہرعنوان...... میں اور اوبرائے گرانٹ نیچے اترے تو اسی وقت ایک لمبا تڑنگا گن مین گارڈ کیبن سے برآمد ہوا اور تیر کی طرح ہماری طرف لپکا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

اشرف علی خان..........کراچی

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ایمانے خان..........ہنگو

یہ کیسی سوچ ہے کیسا عمل ہے
خطا کر کے سزا سے لڑ رہا ہوں

افسر سلطانہ..........حیدرآباد

یہ ہم بھی جانتے ہیں زندگی ایک خواب ہے افسر
مگر اس خواب کی آخر کوئی تعبیر بھی ہو گی

نرجس خاتون..........شیخوپورہ

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ تلوار بھی نہیں

(الطاف علی مخمور بہاولپور کا جواب)

رضا احمد اعوان..........دریا خان

ریل گاڑی میں مسافر کی نظر سے جیسے
رات کے وقت کوئی شہر گزر جاتا ہے
اس طرح وقت کے دریائے رواں سے اک سال
جیسے گزری ہو کوئی لہر گزر جاتا ہے

زاہد خان..........پشاور

رات دن اس کو برسنے کے سوا کام نہیں
چشمِ پُرآب میں ساون کی گھٹا ہو جیسے

(آفتاب حسین حیدرآباد کا جواب)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل..........ملتان

رابطے حد سے بڑھ جائیں تو غم ملتے ہیں
ہم اس لیے ہر ایک شخص سے کم ملتے ہیں

(زنیرہ جبیں کا جواب)

ظاہر کریم..........خان گڑھ

اچھا بن کر کیا ملنا جو برا بنا تو کیا کھونا
دنیا کھیل تماشا ہے ہر شخص پہ تالی بجتی ہے

رؤف صدیقی..........لاہور

اپنے ہاتھوں کی لکیریں نہ بدلنے پائیں
خوش نصیبوں سے بہت ہاتھ ملائے میں نے

نازش علی خان..........کراچی

اپنی ہی بددعا لگی ہے مجھے
میں کسی کا ہوں اور نہ اپنا ہوں

اعجاز احمد..........خان پور

اس کو عرفان ذات کیسے ہو
طے نہ ہو جس سے آگہی کا سفر

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نزاہت افشاں..........فتح جنگ

اب کس کی تلاش میں ہیں یہ جھونکے
میں نے تو دیا بجھا دیا ہے

فلک بنت ندیم..........حیدرآباد

اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

نوشین خان..........کوئٹہ

اشک باری ہے آہ و زاری ہے
زندگی کیا ہے بے قراری ہے

زبیدہ سلطان..........بہاولپور

اظہارِ دردِ عشق سے قاصر زباں رہی
مرہونِ ضبط آہِ دلِ ناتواں رہی

تصور برلاس..........کراچی

اجڑا ہوا گلشن ہے خوب مناظر ہیں
ہر پیڑ کی شاخوں پر سہمے ہوئے طائر ہیں

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

عباس قلندری..........ملتان

یہ اور بات کہ تقدیر سو گئی قابل
وگرنہ دیدۂ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

ادب شناس 01

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

اس ماہ سے ایک نیا سلسلہ "ادب شناس" شروع کیا جارہا ہے۔ یہ نیا سلسلہ جو آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی دے گا۔ ہر ماہ کسی ایک مشہور مصنف کی تحریر کا اقتباس دیا جائے گا۔ آپ ذہن پر زور دیں، اندازہ لگائیں کہ یہ اقتباس کس معروف مصنف کے قلم کا شہکار ہے۔ اس اعادہ سے تحریر شناسی پر عبور حاصل ہوتا رہے گا۔ درست جواب بھیجنے والے قاری کو چھ ماہ تک "سرگزشت" اعزازی طور پر بھیجا جائے گا۔ درست جواب ہمیں 30 دسمبر 2018ء تک موصول ہو جائے۔ تاہم ایک سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس ماہ کا اقتباس

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا۔ حیدر آباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"یہ کیا بات ہے کہ عصمت چغتائی نے آپ سے شادی نہ کی؟......اور عصمت اگر یہ دو ہستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر افسوس کہ عصمت نے شاہد سے شادی کر لی اور......

انہی دنوں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی۔ میں اس مین شریک نہ تھا لیکن حیدر آباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا۔ "آپ نے...... سے شادی کیوں نہ کی؟"



میرے خیال میں یہ تراشہ مصنف............کی تحریر سے لیا گیا ہے۔

نام:..............................

پتا:..............................

کوپن کے ہمراہ جوابات مورخہ 30 دسمبر 2018ء تک موصول ہونا ضروری ہے

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

چسپاں

سرورق دیکھ کر کوئی ایسا شعر منتخب کریں جو پوری طرح چسپاں ہو جائے۔ فیصلہ قارئین کریں گے کہ یہ شعر سرورق پر "چسپاں" ہوتا ہے یا نہیں! شعر الگ کاغذ پر صاف صاف لکھا ہو۔ ساتھ شاعر کا نام بھی ہو۔

نام:..............................

پتا:..............................

..............................فون نمبر:..............................

فریبی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
انسان خود فریبی کی خاطر چہروں پر کس طرح ملمع چڑھا لیتا ہے اس کی زندہ مثال دیکھی ہے اور اسی واقعے کو میں نے کہانی کی شکل دی ہے۔ مختلف اداروں میں کام کرنے والی ورکنگ وومن اسے ضرور پڑھیں۔

تبسم
(کراچی)

چھٹی ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں اپنی میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اور فائلیں سمیٹ رہی تھی کہ چپراسی نے آکر کہا۔ ''میڈم! آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مجبوری تھی اس لیے جانا پڑ گیا۔ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش اخلاقی سے بولا۔ ''آیئے مس تبسم۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وقت آپ کو زحمت دی۔ آپ غالباً گھر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔''

''جی۔'' میں نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ مجھے ذیشان کہتے ہیں۔ ذیشان احمد میں نے آج ہی یہ دفتر جوائن کیا ہے۔ فاروقی صاحب کا تبادلہ ہیڈ آفس ہوگیا ہے۔ اب میں ان کی جگہ کام کروں گا۔''

''جی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی اور گھڑی دیکھنے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کو گھر جانے کی جلدی ہے۔''

''جی...... جی ہاں دراصل میں وین سے جاتی ہوں اگر وہ نکل گئی تو مجھے بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''اوہ اچھا، مجھے آپ سے یہ فائل ڈسکس کرنا تھی۔ خیر کوئی بات نہیں صبح کر لیں گے لیکن آپ ٹھیک نو بجے میرے پاس آجائیں۔ کل پہلا کام یہی کرنا ہے۔''

مجھے اس کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ جس فائل کی بات کر رہا تھا اس پر میں پہلے ہی ورکنگ کر کے فاروقی صاحب کو دے چکی تھی۔ اب وہ مزید کیا ڈسکس کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ پوچھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے خاموشی سے اٹھ کر چلی آئی۔

گھر پہنچی تو میرا بیٹا احمر لاؤنج میں بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ ابو اپنے کمرے میں تھے اور چھوٹا بھائی شبیر ابھی دفتر سے نہیں آیا تھا۔ احمر مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور چہکتے ہوئے بولا۔ ''مما! آج مجھے چار Good ملے ہیں۔''

''شاباش بیٹا۔'' میں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا فریش ہو جاؤں پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

میں شادی کے دو سال بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اس وقت احمر دس ماہ کا تھا۔ میرے شوہر امجد بہت ہی اچھے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے شادی کے بعد مجھے ہر وہ سکھ دیا جس کی کوئی عورت تمنا کر سکتی ہے۔ میری ہر خواہش پوری اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا۔ احمر کی پیدائش پر انہوں نے دل کھول کر خوشی منائی۔ وہ ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ انہوں نے اس کے مستقبل کے بارے میں آنکھوں میں کئی خواب سجا رکھے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ احمر کو خوب پڑھاؤں گا۔ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجوں گا۔ انہوں نے اس کے لیے ایک الگ بینک اکاؤنٹ کھولا تھا جس میں وہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ جمع کراتے رہتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے احمر کے نام سے ایجوکیشن پالیسی بھی لی تا کہ وقت پڑنے پر اس کے تعلیمی اخراجات پورے ہوسکیں۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ اپنے ارمان دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک بے رحم ٹرک ڈرائیور کی بے پروائی نے میرا سہاگ اجاڑ دیا اور میں بیوگی کا تمغہ سینے پر سجائے میکے واپس آگئی۔ اس وقت امی زندہ تھیں۔ انہوں نے میری ہر ممکن دل جوئی کی۔ ابو اور شبیر نے بھی میرا ہر ممکن خیال رکھا لیکن میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اسی لیے میں نے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرلی تاکہ احمر کی تعلیم کے لیے پیسے جمع کرسکوں۔ مجھے ہر حال میں اپنے شوہر کی خواہش کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

میرے شوہر کا انتقال ہوا تو اس وقت میں چھبیس سال کی تھی اور بہت سے لوگ مجھے کنواری ہی سمجھتے تھے۔ شکل و صورت کی اچھی تھی، پڑھی لکھی اور برسر روزگار اسی لیے میرے رشتے آنے لگے۔ امی ابو بھی یہی چاہتے تھے کہ میں عقد ثانی کرلوں لیکن میں نے انکار کردیا۔ مجھ سے شادی کے خواہش مندوں کی اکثریت ادھیڑ عمر، رنڈوے یا نکھٹو لوگوں کی تھی۔ میں جانتی تھی کہ دوسری شادی کے بعد اپنے بچے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ نہ دے سکوں گی اور میرے مرحوم شوہر کا خواب ادھورا رہ جائے گا اسی لیے میں نے سنگل پیرنٹ بننے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے فطری جذبات کا گلا گھونٹ کر پوری تندہی سے احمر کی پرورش کرنے لگی۔

میں نے احمر کی دیکھ بھال کے لیے آیا رکھ لی۔ امی گھر میں اکیلی تھیں۔ انہیں کھانا پکانے کے علاوہ دوسرے کام بھی کرنا ہوتے تھے اسی لیے وہ احمر کو زیادہ وقت نہیں دے سکتی تھیں۔ آیا کی وجہ سے مجھے بے فکری ہوگئی تھی۔ وہ صبح سے شام تک رہتی اور میرے آنے کے بعد چلی جاتی پھر ایک دن اچانک ہی امی کا انتقال ہوگیا۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی۔ وہ رات کو اچھی بھلی سوئیں اور صبح ان کی آنکھ نہ کھل سکی حالانکہ وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھ جاتی تھیں۔ ابو نے انہیں آواز دی جب کوئی جواب نہ ملا تو انہیں تشویش ہوئی۔ ہلا جلا کر دیکھا تو ان کا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

امی کے انتقال کے بعد ہمارے گھر کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ ابو شبیر کی شادی کرنا چاہ رہے تھے لیکن اس پر باہر جانے کی دھن سوار تھی اسی لیے وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ مجبوراً ..... میں نے آیا کو ہی کھانا پکانے کی ذمے داری سونپ دی۔ دوسرے کاموں کے لیے ماسی آتی تھی۔ یوں جیسے تیسے گزارہ ہونے لگا۔

احمر تین سال کا ہوا تو میں نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔ ابو بھی ریٹائر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اسے اسکول لانے اور لے جانے کی ذمے داری لے لی۔ احمر بہت ذہین تھا اور ہر سال اپنی کلاس میں اوّل آتا۔ اب وہ آٹھ سال کا ہو چکا تھا اور پڑھائی میں اس کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ دوپہر میں ہی اپنا ہوم ورک مکمل کرلیتا پھر شام کو میں اسے پڑھاتی۔ اس کی تعلیمی پروگریس اطمینان بخش تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بورڈ کے امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوجائے گا۔

☆......☆

دوسرے دن ٹھیک نو بجے میں دفتر پہنچی اور پھر سیدھے اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ وہی فائل کھولے بیٹھا ہوا تھا مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے دیوار گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''ویری گڈ! آپ تو وقت کی پابند نکلیں۔''

''جی ہاں مجھے غیر ضروری تاخیر پسند نہیں۔ ویسے بھی دفتر نو بجے شروع ہوتا ہے میں سیدھی آپ کے کمرے میں چلی آئی۔ آپ کچھ ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جہاں جہاں میں نے نشان لگایا ہے ان حصوں کی وضاحت کردیں۔''

میں نے فائل کھول کر دیکھی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی وضاحت کی جاتی۔ میں نے پہلے ہی سب کچھ تفصیل سے لکھ دیا تھا پھر بھی میں نے اس کی تسلی کے لیے ان حصوں کو دوبارہ پڑھنا شروع کردیا اور ساتھ ساتھ ان کی وضاحت بھی کرتی گئی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا لیکن اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی تپش محسوس کی تو بوکھلا گئی لیکن فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور فائل بند کرتے ہوئے بولی۔ ''امید ہے کہ اب آپ کی تسلی ہوگئی ہوگی۔''

''جی بالکل! آپ نے بہت اچھی طرح وضاحت کردی۔ میں اس فائل کو آج ہی بھیج دیتا ہوں۔''

''اب مجھے اجازت ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بیٹھیں۔ ایسی بھی کیا جلدی۔ میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔''

”جی نہیں شکریہ، مجھے بہت کام کرنا ہے اور میں ویسے بھی چائے نہیں پیتی۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ مجھے دن میں تین چار مرتبہ اس کے پاس جانا پڑتا تھا اس سے پہلے فاروقی صاحب کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں تھا۔ وہ فائل پڑھ کر خود ہی سمجھ جاتے اور مجھے کسی بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی لیکن یہ عجیب کوڑھ مغز شخص تھا کہ اسے ہر بات سمجھانا پڑتی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے سوال جواب چلتے رہتے۔ اس کے کمرے کے بار بار چکر لگانے سے میرا کام بھی متاثر ہو رہا تھا اور میری میز پر فائلوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کام سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ پانچ منٹ کا کام ہوتا لیکن وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میرا آدھا گھنٹا ضائع کر دیتا تھا۔ اس دفتر میں بہت اچھا وقت گزارا تھا اور کبھی ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی۔ دفتر کے سب لوگ میری عزت کرتے تھے اور ہمارے درمیان احترام کا رشتہ تھا لیکن ذیشان کے رویے نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

بظاہر اس نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی یا سختی نہیں کی تھی بلکہ وہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آتا تھا لیکن اس کے رویے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے زیادہ دیر تک اپنے پاس بٹھانا چاہتا ہے۔ اس دوران اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے اور جسم کا طواف کرتی رہتیں۔ پہلے میں سر پر دوپٹا نہیں لیتی تھی لیکن اس کی بے باک نظروں سے بچنے کے لیے میں نے سر اور سینے کو اچھی طرح ڈھانپنا شروع کر دیا۔

اب اس نے کام کے علاوہ غیر متعلقہ باتیں بھی شروع کر دی تھیں۔ نہ جانے اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ میں بیوہ اور آٹھ سالہ بچے کی ماں ہوں۔ ایک دن میں کسی کام سے اس کے کمرے میں گئی تو کہنے لگا۔ ”مس تبسم! آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور سوچنے لگی کہ اسے میرے ذاتی معاملات کا علم کیسے ہو گیا۔ شاید اس نے میری پرسنل فائل دیکھ لی ہو۔ میں نے سوچا کہ اسے یہیں روک دینا چاہیے ورنہ یہ مزید کرید میں لگ جائے گا اس لیے میں نے رکھائی سے کہا۔ ”سر! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کو اس

سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''
وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا، ہنس کر بولا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ واقعی یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن اس کا کچھ نہ کچھ تعلق دفتر کے معاملات سے بھی ہے۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس بات کا دفتر سے کیا تعلق؟''
''بالکل ہے۔ دیکھیں مس تبسم! اگر کوئی ملازم بیمار ہو جائے تو وہ چھٹی کر لیتا ہے یا اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے سکتا۔ جس سے دفتر کی مجموعی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو ذہنی آسودگی میسر نہ ہو یا اسے کسی قسم کا احساس محرومی ہو تو بھی اس کا اثر اس کے کام پر پڑتا ہے۔ امید ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔''
''معاف کیجیے، میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ میں اپنی زندگی سے پوری مطمئن ہوں اور مجھے کوئی احساس محرومی نہیں ہے۔''
''آپ اپنے دل کی تسلی کے لیے کچھ بھی کہہ سکتی ہیں لیکن حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔''
اس کی ڈھٹائی پر مجھے غصہ آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی سخت جواب دیتی اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''خیر چھوڑیں اس موضوع کو۔ اس پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔''
میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بات بڑھنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔ گھر آئی تو ایک نیا مسئلہ درپیش تھا۔ آپا کی بیٹی بیمار تھی اور اسے فوری طور پر گاؤں جانا تھا۔ مجھے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اس کی غیر موجودگی میں گھر کا کام کون کرے گا۔ سب سے بڑا مسئلہ کھانا پکانے کا تھا۔ ابو بلڈ پریشر کے مریض تھے اور بازار کا کھانا ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے یہ ذمے داری لینا پڑی۔ میں دفتر سے واپس آنے کے بعد دو وقت کا کھانا بنا کر فریج میں رکھ دیتی جو اگلے دن دوپہر تک چلتا۔
ایک دن میں نے شبیر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ جب بھی اس سے شادی کے لیے کہا جاتا تو وہ باہر جانے کا بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ اسی ٹال مٹول میں آٹھ سال گزر گئے۔ وہ نہ باہر گیا اور نہ ہی اس نے شادی کی۔ میں نے شبیر کو سمجھایا کہ اس کی شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ زیادہ دیر ہوگئی تو کوئی اسے لڑکی نہیں دے گا۔ شبیر کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ شادی کے لیے تیار ہوگیا لیکن اس نے یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ لڑکی کا نام پتا بتائے۔ میں کل ہی جا کر اس کا رشتہ طے کر دیتی ہوں۔ اس نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی اور کہا کہ وہ لڑکی سے فائنل بات کر کے مجھے بتائے گا۔
اس لڑکی کا نام شاہدہ تھا اور وہ شبیر کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ وہ لڑکی مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ معمولی شکل و صورت، گہرا سانولا رنگ، گول چہرہ اور چھوٹا قد۔ اسے نہ بات کرنے کا سلیقہ تھا اور نہ ہی پہننے اوڑھنے کا۔ اس کے مقابلے میں شبیر لاکھ درجے بہتر تھا۔ وہ لوگ نارتھ کراچی میں ایک سو بیس گز کے مکان میں رہتے تھے۔ شاہدہ سے چھوٹے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ باپ کا اپنا جنرل اسٹور تھا۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی لیکن سلیقہ نہیں تھا۔ شاہدہ کی ماں سیدھی سادی عورت تھی۔ اس نے اپنے معیار کے مطابق ہماری خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہم صرف رسمی کارروائی کے لیے گئے تھے۔ ان کے درمیان سب باتیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں پھر بھی انہوں نے لڑکی والا روایتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔
ایک ہفتہ بعد ہی انہوں نے فون پر رشتہ قبول کرنے کی اطلاع دے دی۔ شادی کی تاریخ تین مہینے بعد کی رکھی گئی۔ شبیر کی خواہش تھی کہ شادی سادگی سے ہو لیکن ابو نے کہا کہ وہ اخراجات کی فکر نہ کرے صرف بری کے جوڑے اور زیور کا بندوبست کرے۔ ولیمہ کا سارا خرچ وہ خود برداشت کریں گے۔ شادی کی ساری تیاری مجھے ہی کرنا تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد میں گھر کے کاموں سے لگ جاتی اور میرے پاس بازار جانے کا وقت ہی نہ ہوتا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ آپا ایک مہینا بعد واپس آگئی اور مجھے شادی کی تیاری کا موقع مل گیا۔
بھائی کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی اور شاہدہ اس کی دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی۔ ابو نے شبیر کے کمرے کو... ٹھیک کروا دیا تھا۔ قالین، پردے، اے سی سمیت تمام سہولتیں فراہم کر دیں۔ میں نے دفتر سے تین دن کی چھٹی لی۔ میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اس سے زیادہ چھٹی نہیں کر سکتی تھی۔ چوتھے روز دفتر جانے سے پہلے میں نے آپا کو سمجھا دیا کہ وہ دلہن کا خیال رکھے۔ اسے کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔

میں نے آپا کو پورے ہفتے کا مینو بنا کر دے رکھا تھا۔ وہ اسی کے مطابق کھانا بناتی اور ابو سے پیسے لے کر ضرورت کے مطابق گوشت سبزی لے آتی۔ گھر کا خرچ ابو کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار میرے ساتھ سپر اسٹور جاتے اور ایک ہی دفعہ میں سارا سامان آجاتا۔ گھر کے سب افراد اس نظام کے عادی ہو چکے تھے اور آپا کھانے میں جو کچھ بھی بناتی، ہم صبر شکر کر کے کھا لیتے۔

اس روز میں دفتر سے واپس آئی تو آپا نے بتایا کہ دلہن بیگم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔ اس روز مینو کے مطابق لوکی گوشت بنا تھا جو اسے پسند نہیں آیا، شبیر ان دنوں چھٹی پر تھا۔ وہ بازار سے کھانا لے کر آیا۔ میں نے آپا سے کہا کہ تم کھانا بنانے سے پہلے دلہن سے پوچھ لیا کرو وہ جس ڈش کی فرمائش کرے، وہی بنا دیا کرو۔

اس پر وہ بولی۔ ''بی بی جی بارہ بجے تک تو ان کے کمرے کا دروازہ بند رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ ناشتا کرنے باہر آتی ہیں۔ اگر ان کے انتظار میں بیٹھی رہی تو کھانا وقت پر نہیں بن سکتا ایک بجے احمر میاں بھی آجاتے ہیں، انہیں کیا کھلاؤں گی۔''

اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے آپا سے کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے جیسا چل رہا ہے چلنے دو، تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر تو اسے ہی گھر سنبھالنا ہے۔''

میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد وہ نوکری چھوڑ کر گھر داری میں لگ جائے گی لیکن اس نے بھی دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ کام پر جانا شروع کر دیا۔ میں ان کے کسی معاملے میں بولنا نہیں چاہتی تھی لیکن ابو کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ ایک دن شاہدہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی تو انہوں نے اس کی غیر موجودگی میں شبیر سے کہا۔ ''بیٹا! ہم نے تمہاری شادی اس لیے کی تھی کہ دلہن آکر گھر سنبھالے گی۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ آپا کی چھٹی کر جانے کے بعد کھانے پینے کی کتنی تکلیف ہوگئی تھی۔ ان نوکروں کا کوئی بھروسا نہیں۔ وہ کسی بھی وقت جا سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دلہن کو نوکری چھوڑ کر گھر سنبھال لینا چاہیے۔''

''فی الحال یہ ممکن نہیں۔'' شبیر نے جواب دیا۔ ''نوکری کرنا اس کی مجبوری ہے، میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں کہ اکیلا یہ بوجھ اٹھا سکوں۔ ہم دونوں کام کریں گے۔ تبھی یہ گھر چلے گا۔''

''میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ گھر تو اس کے آنے سے پہلے بھی چل رہا تھا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اسے گھر سے باہر رہنے کا بہانا چاہیے لیکن میں خاموش رہی۔ ابو بات کر رہے تھے اس لیے میرا بیچ میں بولنا مناسب نہیں تھا۔

ابو نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ یہ گھر ہمیشہ نوکروں کے رحم و کرم پر رہے گا۔''

''آپ دعا کریں کہ میں ملک سے باہر چلا جاؤں پھر ہماری تنگی کے دن ختم ہو جائیں گے۔'' شبیر نے پھر وہی پرانا راگ چھیڑ دیا۔

میں نے ابو کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ شبیر سے مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ پوری طرح اپنی بیوی کے زیر اثر تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ شاہدہ کو گھر کے معاملات سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ چائے پیتی اور ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتی یا دونوں میاں بیوی کہیں گھومنے چلے جاتے۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ میکے ضرور جاتی اس لیے آپا کے جانے کے بعد گھر کے سارے کام مجھے ہی دیکھنے ہوتے۔ شاہدہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ اتوار کا آدھا دن... سو کر گزار دیتی۔ اسے اتنی توفیق بھی نہیں تھی کہ چھٹی والے دن وہ مشین لگا کر اپنے اور شبیر کے کپڑے ہی دھو لے۔ یہ کام بھی اس نے ماسی کے سپرد کر دیا تھا۔

ابو کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ شبیر کو تو اپنی بیوی کے چونچلوں سے ہی فرصت نہ تھی کہ وہ انہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیتا۔ یہ ذمے داری بھی مجھے اٹھانا پڑی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے اور اب وہ بقیہ زندگی بیٹری کے سہارے گزاریں گے۔ اس نے کچھ دوائیں تجویز کیں اور تاکید کی کہ ان کی غذا کا خاص خیال رکھا جائے اور ان کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے انہیں صدمہ ہو۔

ڈاکٹر کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ابو زیادہ عرصہ نہیں جی سکیں گے۔ اس کے باوجود میں ان کا پورا خیال رکھ رہی تھی۔ شبیر نے تو ایک دفعہ نہیں پوچھا کہ ان کے علاج کا خرچ کیسے پورا ہو رہا ہے۔ دواؤں سے لے کر ان کے کھانے پینے کی پوری ذمے داری مجھ پر تھی۔ میں دفتر سے واپس آکر ان کے لیے پرہیزی کھانا بناتی اور میں نے آپا سے بھی کہہ دیا تھا کہ انہیں دوپہر میں بھی یہی کھانا دیا جائے۔

چھ مہینے تک میں ابو کی خدمت اور تیمار داری کرتی رہی لیکن میری ساری احتیاط اور کوششیں رایگاں گئیں اور ایک دن وہ چپکے سے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد میرے سر پر سے سائبان ہٹ گیا اور مجھے لگا کہ تپتی دھوپ میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہوں۔ ان کی زندگی میں تو پتا ہی نہ چلا کہ گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔ بس یہ معلوم تھا کہ انہوں نے ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم قومی بچت کی اسکیم میں لگا دی تھی جہاں سے انہیں ہر مہینے معقول منافع مل جاتا تھا۔ شبیر بھی گھر کے خرچ میں اپنا حصہ ڈالتا اور یوں یہ گاڑی چل رہی تھی۔ ابو نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں لیا لیکن میں دوسرے طریقوں سے ان کی مدد کرتی رہتی تھی۔ کبھی پھل لے آئی تو کبھی جام جیلی جوس وغیرہ۔ کراکری، چادریں تولیے لانا بھی میری ہی ذمے داری تھی۔ شبیر تو بس مٹھی بھر رقم دے کر بری الذمہ ہو جاتا تھا۔

ابو کے انتقال کے بعد شبیر نے گھر چلانے کی ذمے داری مجھے سونپ دی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ گھر کا خرچ اپنے پاس رکھے یا شاہدہ کے حوالے کر دے۔ میری حیثیت تو ایک مہمان کی سی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید زیادہ عرصہ یہاں نہ رہ سکوں۔ شاہدہ نے زبان سے تو کبھی کچھ نہیں کہا لیکن اس کے رویہ سے لگ رہا تھا کہ اسے میرا وجود گوارہ نہیں اسی لیے میں یہ ذمے داری لینے سے کترا رہی تھی۔ ویسے بھی ہر صورت اپنے آپ کو گھر کی ملکہ سمجھتی ہے وہ یہ کیونکر برداشت کرے گی کہ کوئی اور اس کے اقتدار میں شریک ہو لیکن شبیر نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا اور بولا۔ ”آپا! میرے پاس تو بالکل وقت نہیں اور شاہدہ کو بھی گھر داری کا کوئی تجربہ نہیں ہے اگر گھر کا خرچ اس کے ہاتھ میں دے دیا تو وہ ایک ہفتے میں ہی سارے پیسے خرچ کر دے گی۔“ اس کے بے حد اصرار پر میں نے یہ ذمے داری قبول کر لی لیکن چند ہی دنوں بعد اس کے اثرات سامنے آنے لگے۔

ہوا یوں کہ ایک روز رات کے کھانے پر سب لوگ موجود تھے۔ میں نے کچن میں جا کر کھانا گرم کیا اور میز پر لگا دیا۔ اس روز آپا نے بھنڈی گوشت بنایا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شاہدہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا مصیبت ہے۔ ہر روز الٹی سیدھی چیزیں پکتی رہتی ہیں۔ کبھی ڈھنگ کا کھانا نصیب نہیں ہوتا۔“

شبیر نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”تم چکھ کر تو دیکھو، بڑے مزے کا ہے۔“

”ہونہہ مزے کا ہے۔“ وہ نقل اتارتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو یہ بھنڈی گوشت، ٹنڈے گوشت اور لوکی گوشت بالکل اچھے نہیں لگتے۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”گوشت میں کوئی نہ کوئی سبزی تو ڈالنا ہی ہوگی۔ ہر روز تو قورمہ نہیں بن سکتا۔“

وہ بھی بحث پر اتر آئی تھی۔ تنک کر بولی۔ ”ضروری ہے کہ روزانہ گوشت ہی پکایا جائے اس کے علاوہ اور بھی ڈشز ہیں۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً کڑاہی گوشت، چکن کڑھائی، چائنیز رائس، بہاری کباب وغیرہ وغیرہ۔“ مجھے لگا جیسے وہ کسی ریستوران کا مینو سنا رہی ہے اگر اس کے پسندیدہ کھانے بنائے جاتے تو آدھے مہینے میں ہی بجٹ ختم ہو جاتا لیکن اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

”اس وقت تو تم کھانا کھاؤ۔ کوشش کروں گی کہ کبھی کبھی تمہاری کوئی پسندیدہ ڈش بنتی رہے۔“

لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اور کھانا کھائے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ میں بھی کھانا چھوڑ کر اٹھنے لگی تھی لیکن شبیر نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور بولا۔ ”آپا! آپ کھانا کھائیں میں اسے بازار سے کچھ لا دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں ہے۔ اس نے تو گھر کو بھی ریستوران سمجھ رکھا ہے تمہی بتاؤ کہ کیا روزانہ یہ ڈشیں بن سکتی ہیں۔“

”آپا آپ اپنے حساب سے چلیں۔ اسے کھانا ہوگا تو کھالے گی۔۔ ورنہ میں بازار سے لا دیا کروں گا۔“

”ایسا کب تک چلے گا۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تم گھر کا خرچ اس کے حوالے کر دو پھر چاہے وہ چکن کڑاہی بنائے یا چائنیز رائس۔ کم از کم اسے اپنی پسند کے کھانے تو ملتے رہیں گے۔“

”آپا! میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔“

میں جانتی تھی کہ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ ویسے بھی آپا کو اس طرح کی ڈشز بنانا نہیں آتی تھیں وہ عام کھانے پکا سکتی تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھی کہ چھٹی والے دن

شاہدہ کی پسند کی کوئی چیز بنا دوں لیکن اس پر بھی اس کا منہ سیدھا نہیں ہوا تو میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا لیکن یہ سوچ رکھا تھا کہ اگر اس نے آیندہ کھانے میں کوئی مین میخ نکالی تو صاف کہہ دوں گی کہ بی بی نوکری چھوڑ کر گھر داری سنبھالو پھر اپنی مرضی کے کھانے بناتی رہنا۔

ادھر دفتر میں ذیشان نے میری زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ وہ بری طرح ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ میں جب بھی کسی کام سے اس کے کمرے میں جاتی تو وہ مجھے اپنے پاس بٹھا کر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بکواس سننے پر مجبور تھی... کیونکہ وہ میرا باس تھا اور میں اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کمپنی کے مالک کا بھانجا ہے اور اگر میں نے اسے ناراض کیا تو اس کے ایک اشارے پر میری نوکری بھی جا سکتی ہے۔ دوسری ملازمت ملنے میں وقت لگتا جب کہ مجھے احمر کے تعلیمی اخراجات اور مستقبل کی بچت کے لیے مستقل آمدنی کی ضرورت تھی اس لیے اس کی بے تکی باتیں برداشت کرتی رہی۔

ویسے اس نے ابھی تک کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی۔ میرے ساتھ اس کا رویہ انتہائی شریفانہ اور ہمدردانہ تھا۔ جب اسے ابو کے انتقال کی خبر ملی تو اس نے میری میز پر آکر مجھ سے تعزیت کی اور اپنے کمرے میں لے جا کر کافی دیر تک میری دل جوئی کرتا رہا اس نے اشاروں اشاروں میں ایک بار پھر یہ کہنے کی کوشش کی کہ باپ کے انتقال کے بعد میں بے سہارا ہو گئی ہوں اس لیے مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

میں نے اس پہلو سے کبھی نہیں سوچا کیونکہ میں اپنے باپ کے گھر میں رہ رہی تھی جس میں میرا بھی حصہ تھا اس لیے مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے رہنے کے لیے چھت میسر تھی۔ اپنا کماتی اور اپنا خرچ کرتی تھی۔ مجھے کسی کی محتاجی نہیں تھی۔ بس میرا ایک ہی مشن تھا کہ اپنے مرحوم شوہر کی خواہش کے مطابق احمر کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کر کے معاشرے کا ایک کارآمد فرد بناؤں۔ میں نے اپنی زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

میں اس سے جتنا دور ہونے کی کوشش کرتی، وہ مجھے اتنا ہی اپنے قریب آنے پر مجبور کر دیتا۔ میں اس سے تنگ آچکی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کوئی دوسری ملازمت تلاش کر لوں۔ ایک دن میں احمر کو لے کر شاپنگ کے لیے گئی تو مجھے بازار میں ایک پرانی سہیلی افشاں مل گئی۔ وہ میری اسکول کے زمانے کی کلاس فیلو تھی لیکن میٹرک کے بعد میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکی۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ شادی کے بعد دبئی چلی گئی تھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملی اور اپنے ساتھ شاپنگ مال کے کیفے ٹیریا میں لے گئی۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اسے شادی کے ایک سال بعد ہی طلاق ہو گئی تھی۔ کراچی واپس آکر اس نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر لی۔ اس کا ڈیفنس میں ذاتی فلیٹ ہے جہاں وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے بھی اسے مختصراً اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا کہ میں جب بھی اس کی ضرورت محسوس کروں تو اسے بلا تکلف فون کر سکتی ہوں۔ اس نے میرے گھر آنے اور ملتے رہنے کا بھی وعدہ کیا۔

پھر ایک دن بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ ذیشان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اسے بار بار کھانسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے کہا۔ ''سر! آپ کی طبیعت تو بہت خراب ہے۔ دفتر کیوں آگئے۔ آپ کو تو گھر پر آرام کرنا چاہیے تھا۔''

ونسٹنٹ چرچل

دورانِ جنگ برطانیہ کے وزیراعظم چرچل امریکا کے صدر روز ویلٹ سے ملنے کے لیے امریکا گئے۔ ایک صبح چرچل نہا دھو کر اپنا جسم تولیہ سے خشک کر رہے تھے کہ روز ویلٹ ان کے کمرے میں پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر کہ چرچل کے بدن پر کپڑے نہیں ہیں وہ واپس جانے لگے۔ چرچل نے انہیں دیکھ کر کہا۔ روز ویلٹ صاحب واپس جانے کی ضرورت نہیں برطانیہ امریکا سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا۔

مرسلہ: محمد شکیل، ساہیوال

"ایک ضروری میٹنگ کی وجہ سے آنا پڑا۔" وہ کھانستے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی گھر میں کون ہے جو میری تیمارداری کرتا۔ اکیلے میں اور گھبراہٹ ہوتی۔"

"کیوں؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں۔"

"نہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "بدقسمتی سے میں تنہا ہوں۔"

"آپ نے شادی نہیں کی؟"

"کی تھی لیکن شادی کے ایک سال بعد ہی بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی۔"

"پھر آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟"

"نہیں، شاید میرے ہاتھ میں دوسری شادی کی لکیر ہی نہیں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ ابھی تک مجھے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی اور جسے میں پسند کرتا ہوں۔ وہ شادی کے لیے تیار نہیں۔"

اس کا اشارہ اتنا واضح تھا کہ مجھے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کھل کر کوئی بات کرتا، میں نے وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت جانی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ گھر جاکر آرام کریں۔ میں آج کی میٹنگ کینسل کروا دیتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ بس مجھے ایک چائے پلوا دیں۔"

میں نے چپراسی کو چائے بنانے کے لیے کہا اور اپنے کمرے میں آکر کام میں مصروف ہوگئی لیکن ذہن اسی میں اٹکا ہوا تھا۔ اس دن پہلی بار میں نے اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ میری جانب اس کا التفات بلاوجہ نہیں تھا۔ وہ تنہائی کا مارا ہوا تھا اور میں اسے پسند آگئی تھی۔ اسی لیے وہ مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں اسے موردالزام ٹھہراتی۔ کسی کو پسند کرنا جرم نہیں تھا اور نہ ہی اس نے ابھی تک اس سلسلے میں کھل کر کوئی بات کی تھی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے کیوں دوسری شادی کے لیے قائل کرنا چاہ رہا تھا اگر میں اس پر آمادہ ہوجاتی تو اس کے لیے راستہ ہموار ہوجاتا۔

اس کے بارے میں بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر اس نے کسی مرحلے پر مجھے پرپوز کیا تو صاف انکار کردوں گی۔ میں اپنے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے شادی کرنے کے بعد میں احمر کی تعلیم، تربیت اور پرورش پر پوری طرح توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ اس طرح میرے مرحوم شوہر کا خواب پورا نہ ہوتا۔ اس سے شادی کرنے کے بعد میری خودمختاری ختم ہو جاتی اور میں مکمل طور پر اس کے رحم وکرم پر ہوتی۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کردیتا پھر میں احمر کے تعلیمی اخراجات کیسے پورے کرتی۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بچت کس طرح ہوتی۔ مجھے تو وقتی طور پر سہارا مل جاتا لیکن احمر کا مستقبل تاریک ہوسکتا تھا۔ مجھے یہ گھاٹے کا سودا منظور نہیں تھا اور میں اپنے بیٹے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی تھی۔

دوسرے دن وہ دفتر آیا تو اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی اور وہ ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ اس نے حسب معمول صبح ہی صبح مجھے بلا بھیجا۔ اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "مس تبسم! آپ نے میری کل والی بات کا برا تو نہیں مانا؟"

"کون سی بات؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں سمجھ گئی تھی کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے۔

"لگتا ہے آپ نے میری بات غور سے نہیں سنی۔"

"شاید۔" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ جس لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں وہ شادی کے لیے تیار نہیں۔"

"اوہ اچھا۔" میں نے ایک بار پھر انجان بننے کی کوشش کی۔ "لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق جو میں برا مانوں گی۔"

"آپ سے ہی تو ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "وہ آپ ہی ہیں اگر آپ شادی کے لیے راضی ہوجائیں تو میں آپ کا سہارا بننے کے لیے تیار ہوں۔"

"سوری سر۔" میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ براہ کرم آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں ورنہ میں یہ جاب چھوڑنے پر مجبور ہوجاؤں گی۔"

"ارے...... ارے...... اتنا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں اگر تمہیں پسند نہیں تو آئندہ اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن گھر جاکر میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔ تمہیں واقعی ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ آخر کب تک بھائی کے ٹکڑوں پر پڑی رہوگی۔"

''معاف کیجیے سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی محتاج نہیں ہوں۔ اللہ کے فضل سے میری اتنی آمدنی ہے کہ اپنے اور بیٹے کے اخراجات باآسانی پورے کرسکتی ہوں۔''

''پھر بھی عورت کو قدم قدم پر مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں نے اس کی پوری بات نہیں سنی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت اپنا استعفیٰ اس کے منہ پر ماروں اور گھر چلی جاؤں لیکن دماغ نے سمجھایا کہ دوسری ملازمت کا بندوبست ہونے تک مجھے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

اچانک ہی مجھے افشاں کا خیال آیا۔ میں نے اپنے پرس سے اس کا کارڈ نکال کر اسے فون کیا تو وہ چہکتے ہوئے بولی۔ ''آج کیسے میری یاد آگئی۔''

''مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ کس وقت مل سکتی ہو۔''

''اگر ابھی آنا چاہو تو دفتر آجاؤ ورنہ چھ بجے کے بعد گھر پر ملوں گی۔''

''گھر پر ہی ٹھیک رہے گا۔ تم مجھے ایڈریس سمجھا دو۔''

میں نے گھر فون کر کے آیا سے کہہ دیا کہ مجھے کچھ دیر ہو جائے گی اس لیے وہ میرے آنے تک احمر کے پاس رہے۔ اس کے بعد میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ باقی دن خیریت سے گزرا۔ نہ تو ذیشان نے مجھے بلایا اور نہ میں اس کے پاس گئی۔

دفتر کا وقت ختم ہونے پر میں نے رکشا کیا اور افشاں کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئی۔ اس کا تین کمروں کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ وہ میرا ہی انتظار کررہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ پہلے کچھ کھا پی لیں پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

اس نے چائے کے ساتھ خاصا اہتمام کیا تھا۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ ایک اسمارٹ سی لڑکی فلیٹ میں داخل ہوئی اور ہائے کہتی ہوئی ایک کمرے میں چلی گئی۔ میں نے سوالیہ انداز میں افشاں کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''یہ فرزانہ ہے، میرے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔''

''کیا یہ بھی یہاں رہتی ہے؟''

''ہاں، یہ میری پے اِنگ گیسٹ ہے۔ اس کو ساتھ رکھنے میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا اور دوسرے ہر مہینے ایک معقول رقم کرائے اور کھانے پینے کی مد میں مل جاتی ہے۔''

چائے ختم کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''اب بتاؤ وہ کون سا ضروری کام ہے جس کے لیے تمہیں میرے پاس آنا پڑا؟''

میں نے اسے اعتماد میں لے کر ذیشان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ اس سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں یہ جاب چھوڑ دوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مجھے دوسری جگہ ملازمت مل جائے۔ اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو۔''

وہ پوری بات سننے کے بعد بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جاتا۔ وہ تمہیں آئندہ بھی تنگ کرتا رہے گا اس لیے تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ یہ جاب چھوڑ دو۔ تم مجھے سی وی دے دو۔ میں اپنی کمپنی میں تمہارے لیے کوشش کرتی ہوں۔''

افشاں کی بات سن کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے دوسرے دن ہی اپنی سی وی اسے بھیج دی۔ دو دن بعد اس نے مجھے فون کر کے بتایا کہ میری سی وی ایچ آر میں جمع ہو گئی ہے اور جیسے ہی کوئی جگہ نکلے گی مجھے انٹرویو کے لیے کال کرلیا جائے گا۔ وہ بہت بڑی کمپنی تھی اور وہاں آئے دن جگہ نکلتی رہتی تھی۔ افشاں کو یقین تھا کہ دو تین ہفتوں میں میرا کام ہو جائے گا۔

اس کے باوجود میں نے اپنے طور پر ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ میں باقاعدگی سے اتوار کا اخبار دیکھتی۔ میں نے دو تین جگہ درخواست بھی دی لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ دفتر میں اس واقعے کے بعد ایک دو دن سکون رہا پھر ذیشان اپنی حرکتوں پر اتر آیا۔ وہ دن میں چار پانچ مرتبہ اپنے پاس بلاتا اور غیر متعلقہ باتیں شروع کر دیتا۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس کی بکواس شروع ہوتے ہی اس کے کمرے سے چلی آتی۔ ایک دن جب اس نے چھٹی بار مجھے اپنے کمرے میں بلایا تو میرا ضبط جواب دے گیا اور میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ میں جاب چھوڑ کر چلی جاؤں۔''

''کیوں؟ میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟'' وہ معصوم بننے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''جب میں آپ سے صاف صاف کہہ چکی ہوں کہ

مجھے شادی نہیں کرنی، پھر آپ بار بار ایک ہی بات پر اصرار کیوں کررہے ہیں۔''

''مجھے اس کھیل میں مزہ آرہا ہے۔ تم انکار کرتی رہو۔ میرا اصرار جاری رہے گا۔ دیکھیں کس کی جیت ہوتی ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ حالات کا جبر تمہیں میری بات ماننے پر مجبور کردے گا۔''

''مجھ پر کسی کا جبر نہیں ہے۔ نہ حالات کا اور نہ کسی اور کا۔ میرا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔''

''پتھر پر اگر مسلسل پانی پڑتا رہے تو وہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دن تمہارا انکار بھی اقرار میں بدل جائے گا۔''

اس سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ چند دن کی بات ہے۔ اس کی بکواس برداشت کرلیتی ہوں۔ بولتا ہے تو بولتا رہے، میرا کیا بگاڑ لے گا۔

پندرہ دن بعد مجھے افشاں کی کمپنی سے انٹرویو کال آگئی۔ افشاں نے بتایا کہ ایک لڑکی جاب چھوڑ کر جارہی ہے۔ اس نے ایک ماہ کا نوٹس دیا ہے۔ تم انٹرویو دے دو۔ اس کے جانے سے ایک ہفتے پہلے تمہیں تقرری کا پروانہ مل جائے گا۔ یہی بات مجھے انٹرویو میں بھی بتائی گئی اور میں مطمئن ہوکر گھر آگئی۔

اس روز میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دو دن سے گردن میں شدید درد ہورہا تھا۔ گھر میں تو کسی کو پروا نہیں تھی۔ میں نے افشاں کو فون کیا۔ اس کی کمپنی کے پینل پر ایک مشہور کلینک تھا۔ وہاں کئی ماہر ڈاکٹر بیٹھتے تھے۔ افشاں نے آرتھوپیڈک سرجن سے وقت لیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر کلینک چلی گئی۔ استقبالیہ پر موجود لڑکی نے کہا۔ ''آپ تشریف رکھیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ باہر آجائے تو میں آپ کو اندر بھیجتی ہوں۔''

دس منٹ بعد ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ذیشان ایک عورت کے ساتھ باہر آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں افشاں سے کہا۔ ''یہی ہے ذیشان لیکن اس کے ساتھ یہ عورت کون ہے؟''

''ابھی معلوم ہوجائے گا، تم اندر تو چلو۔''

وہ ڈاکٹر افشاں کا جاننے والا تھا۔ غالباً وہ اس کے پاس علاج کے لیے آتی رہتی تھی۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے افشاں کی خیریت دریافت کی پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی بی بی! بتائیں کیا مسئلہ ہے؟''

میں نے اسے گردن کی تکلیف کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''میں کچھ دوائیں لکھ دیتا ہوں اگر ان سے آرام نہ آیا تو آپ کو چند روز فزیو تھراپی کرانا ہوگی۔ بلکہ آپ گھر پر بھی ایکسر سائز کرسکتی ہیں۔ میں آپ کو طریقہ بتا دیتا ہوں۔''

وہ خاصا باتونی شخص تھا۔ اس نے طریقہ بتانے کے بعد کہا۔ ''اگر آپ میری ہدایت پر عمل کریں گی تو یہ معاملہ یہیں رک جائے گا۔ ورنہ آگے چل کر بہت تکلیف ہو گی۔'' پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''دراصل ہمارے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ مریض ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے اور ان کا مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ابھی جو خاتون باہر گئی ہیں۔ ان کی کمر میں تکلیف ہے۔ یہ میرے پاس گزشتہ ایک سال سے آرہی ہیں لیکن انہیں کوئی افاقہ نہیں ہورہا۔ یہ نہ تو باقاعدگی سے فزیو تھراپی کرواتی ہیں، نہ ایکسر سائز کرتی ہیں اور نہ واک۔ شوہر کی جیب سے بھی کچھ نہیں جاتا کیونکہ علاج کمپنی کی طرف سے ہوتا ہے۔''

''یہ ان کے شوہر تھے؟'' میں نے بمشکل تمام کہا۔

''جی ہاں ذیشان صاحب کسی کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میں اس خاتون کی ہسٹری سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بے چاری شادی کے دس سال بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔''

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور گرتی پڑتی اس کے کمرے سے باہر آگئی۔ افشاں میری کیفیت کو محسوس کررہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور گھر تک چھوڑنے آئی۔ اسے جانے کی جلدی ہورہی تھی اس لیے اندر نہیں آئی اور کہنے لگی۔ ''شکر کرو کہ تم اس کی باتوں میں نہیں آئیں، ورنہ تمہاری زندگی عذاب بن جاتی۔ اب تم آرام کرو۔ میں کل ہی تمہارا لیٹر نکلوانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

دوسرے دن میں دفتر نہیں گئی بلکہ اپنے استعفیٰ ڈاک سے بھجوا دیا۔ میں اس جھوٹے مکار اور فریبی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اب مجھے صرف اپائنٹمنٹ لیٹر کا انتظار تھا جو مجھے چند روز بعد ہی مل گیا اور میں پُرسکون ہوکر اپنی دنیا میں مگن ہوگئی۔

محافظ

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
میں نہ تو لکھاری ہوں اور نہ کبھی افسانہ کہانیاں لکھیں۔ ایک کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ آپ کو ہو گا، اگر یہ واقعہ پسند آجائے تو اسے شاملِ اشاعت کرلیں تاکہ دوسروں کو بھی نصیحت ملے۔

ممتاز ملنگی
(فیصل آباد)



مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھ سکتا۔
جب میں دفتر سے گھر آیا تو وہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے خوب صورت بال کھلے ہوئے تھے اور سمندر جیسی گہری آنکھیں اداسی سے خلا میں دیکھ رہی تھیں۔

وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ ہماری شادی کو چار برس گزر چکے تھے اور ہر دن ایسا لگتا جیسے اس کے حسن میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے رخساروں کے پھول اور شگفتہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں کشش اور بڑھ گئی ہے۔ میں اس کو پا کر بہت خوش تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست تھا

کہ خود پر ناز کرتا تھا۔

عالیہ سے میری محبت کی شادی نہیں تھی۔ شادی سے پہلے تو میں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اماں نے اپنی مرضی سے میری شادی کی تھی۔ عالیہ ان کی کسی دوست کی بیٹی تھی۔

اماں نے جب پہلی بار عالیہ سے میری شادی کی بات کی تو میں ٹھٹک گیا۔ ''کیا ہے اماں! یہ آپ لوگوں کو لڑکوں کی شادیوں کی اتنی جلدی کیوں پڑی رہتی ہے۔''

''اس لیے کہ زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں۔'' اماں نے کہا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ میں آج کل بیمار رہنے لگی ہوں۔ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے۔''

''ایسا مت کہو اماں، خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو گیا۔ پھر میرا کیا ہوگا؟''

''اس لیے تو چاہتی ہوں کہ اس گھر میں کوئی اور آجائے جو میرے جانے کے بعد تمہیں سنبھال سکے۔''

میں اداس ہو کر رہ گیا۔ واقعی اس گھر میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ چار سال پہلے والد صاحب کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اماں بالکل خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔ ظاہر ہے گھر میں میرے علاوہ اور کون تھا۔

میں صبح دفتر چلا جاتا اور اماں سارا دن اکیلی رہتیں۔ پاس پڑوس کی عورتوں سے دوستی تو تھی۔ اماں ان کے یہاں چلی جایا کرتیں یا وہ اماں کے پاس آجاتیں لیکن ایسا کب تک اور کس حد تک ہو سکتا تھا اس لیے اماں یہ چاہتی تھیں کہ گھر میں کوئی آجائے اور وہ صرف بہو ہی ہو سکتی تھی۔

دو چار دنوں کے بعد اماں نے پھر یہ موضوع چھیڑ دیا۔ ''بیٹا عالیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''کون عالیہ؟''

''میں نے بتایا تھا ناں کہ میری ایک پرانی دوست ہے قدسیہ، ہم ساتھ پڑھتے تھے۔''

''ہاں یاد آیا، آپ نے بتایا تھا۔''

''عالیہ اس کی بیٹی ہے۔'' اماں نے بتایا۔ ''کالج میں پڑھ رہی ہے اور اتنی خوب صورت ہے کہ جو دیکھے وہ دیکھتا رہ جائے۔''

''اگر وہ اتنی ہی خوب صورت ہے، تو پھر مجھ جیسے معمولی شکل و صورت کے بندے سے کیوں شادی کرے گی۔'' میں نے جان بوجھ کر یہ بات کی کیونکہ یہ سن کر اماں کی ممتا پھڑکنے لگتی تھی۔

''ارے کیا پاگل ہو گئے ہو؟'' اماں کی ممتا پھڑک اٹھی۔ ''کون تم کو معمولی صورت شکل کا کہتا ہے۔''

میں مسکرا دیا۔ اس وقت مجھے۔ ایک قول یاد آ گیا کہ پوری دنیا میں صرف ایک ہی خوب صورت بچہ ہے اور وہ بچہ دنیا کی ہر ماں کے پاس ہے۔

''ٹھیک ہے اماں جیسی تمہاری مرضی۔ اب وہ چاہے موٹی ہو، بھدی ہو، کیسی بھی ہو، آپ کی خاطر مجھے منظور ہے۔''

''ارے وہ موٹی اور بھدی کیوں ہونے لگی تم ایک نظر اس کو دیکھ تو لو۔''

''نہیں اماں، اس کو دیکھ کر میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔'' میں نے کہا۔ ''بات کر لیں میں شادی کے لیے تیار ہوں۔''

شادی کے بعد پہلی بار جب عالیہ کو دیکھا تو میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ اماں نے اس کی بہت کم تعریف کی تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ تھی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ بہت ذہین اور سمجھدار بھی تھی۔ پُرخلوص اور محبت کرنے والی۔ اس نے اماں کی اتنی خدمت کی کہ وہ تو پہلے ہی سے اس کی گرویدہ تھیں۔ اب اس کی عاشق بھی ہو گئیں۔

جہاں تک میرا سوال تھا تو عالیہ میرے لیے خدا کے خوب صورت تحفے کی طرح تھی۔ اس پر فخر سا ہوا کرتا، پورے محلے اور خاندان میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی کہ ممتاز کی بیوی بلا کی خوبصورت، ذہین اور کام کاج ہے۔

ہم بہت خوش تھے۔

ہمارے چھوٹے سے گھر میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔ گھر میں تھا ہی کون، میں، اماں اور عالیہ۔ زندگی بس ہم تینوں کے گرد گردش کر رہی تھی۔

ہم ہر ہفتے کسی پارک یا ساحل کی طرف چلے جاتے۔ عالیہ ضد کر کے اماں کو بھی ساتھ لے لیتی تھی لیکن خوشیوں کے یہ لمحات اماں کی موت کے بعد ہمارے ہاتھوں اور ہماری زندگی سے نکل گئے۔

ان کی موت اچانک ہوئی تھی۔ میں نے ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن جینا پڑا۔ جتنا صدمہ مجھے تھا اتنا ہی عالیہ کو بھی تھا۔ وہ بھی گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

بہر حال یہ وقت بھی گزر گیا اور ہمیں اپنا پرانا محلہ بھی بدلنا پڑ گیا کیونکہ وہ مکان کرائے کا تھا۔ کرائے کا مکان تو

بدلنا ہی پڑتا ہے۔

گھر کی بات اور ہوتی ہے۔ گھر میں نسلیں تک پروان چڑھتی ہیں۔ میرے ابا بے چارے کو زندگی اور حالات نے اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی کہ وہ اپنا کوئی چھوٹا سا گھر بنا لیتے۔ کچھ بھی نہیں کر سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح اماں بھی چل بسیں اور میں عالیہ کو لے کر دوسرے محلے میں آ گیا۔

ہماری شادی کو اب تین برس ہو چکے تھے۔ ہمارے یہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی لیکن ہم نے اس کمی کا احساس کبھی زندگی میں داخل نہیں ہونے دیا۔

ہم خوش تھے ایک دوسرے کے ساتھ۔

عالیہ گھر میں رہا کرتی اور میں دفتر چلا جاتا۔ میری نوکری بھی معقول سی تھی لیکن پریشانیاں تو اس گھر میں آنے کے بعد سامنے آنا شروع ہوئی تھیں۔

ایک شام میں گھر واپس آیا تو عالیہ بہت اداس اور پریشان بیٹھی تھی۔ ''کیا ہوا میری جان۔'' میں نے پیار سے پوچھا۔ ''کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔''

''کچھ نہیں، بلکہ بہت پریشان ہوں۔'' اس نے کہا۔

''خیریت تو ہے۔'' میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''آپ نے کسی کالے خان کا نام سنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں وہ ایک خطرناک غنڈہ ہے۔ بہت بڑا بدمعاش ہے لیکن تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔''

''وہ آج مجھے ملا تھا۔''

''ملا تھا۔'' میں چونک پڑا۔ ''عالیہ کیا کہہ رہی ہو؟ وہ تم سے کیوں ملنے لگا۔''

''اس لیے کہ اس نے اس محلے کی کسی عورت سے میرے حسن کی تعریف سن رکھی تھی۔'' عالیہ نے بتایا۔ ''میں سودا لینے گئی تھی کہ وہ اچانک سامنے آ کر کہنے لگا۔ ''واقعی جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس محلے میں ایسا ہیرا آ کر آباد ہوا ہے ورنہ میں خود اس نئے محلے میں مکان لے لیتا۔''

''کمینہ انسان۔'' میں غصے سے بھنا اٹھا۔ ''تم نے کیا کہا۔''

''کیا میں اس قابل تھی کہ اس سے کچھ کہہ سکتی، میں تو اس کو دیکھ کر سہم گئی تھی۔ وہ اتنا ہی خوفناک ہے، میں جس دکان پر کھڑی تھی اس دکان والے نے بھی اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ وہ باقاعدہ لرزنے لگا تھا۔ میں کیا جانتی تھی کہ یہ کون ہے۔ وہ تو اتنا بول کر مسکراتا ہوا چلا گیا اور میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔''

میرا حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ ان میں چنگاریاں سی دوڑنے لگی تھیں۔ ایک غنڈے کی یہ مجال ہو گئی تھی کہ وہ میری عالیہ پر بری نظر ڈال سکے۔

''دکاندار نے کیا کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ دکاندار کا کیا پوچھے جا رہے ہیں۔'' عالیہ غصے سے بولی۔ ''میں نے بتایا نا کہ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ اس طرح انجان بن گیا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا اور سنا ہی نہیں۔ البتہ کالے خان کے جانے کے بعد کہنے لگا۔ ''بی بی! یہ بہت خطرناک بندہ ہے۔ کالے خان نام ہے اس کا۔ پورا علاقہ اس سے ڈرتا ہے۔ کئی خون کر چکا ہے۔ آئے دن جیل جاتا رہتا ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں بی بی کہ تم گھر سے باہر ہی نہ نکلو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کم بخت کوئی بدمعاشی کر بیٹھے۔''

میں نے دکاندار سے کہا: ''بھائی! میرے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ میرے شوہر صبح دفتر چلے جاتے ہیں۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے سودا سلف لانے کے لیے۔ مجھ ہی کو نکلنا پڑتا ہے۔''

''اپنے شوہر سے کہو کہ وہ کوئی اور بندوبست کر دیں بلکہ ایسا کرو۔ تم ذرا انہیں میرے پاس بھیج دو۔ میں انہیں کچھ سمجھاؤں گا۔''

''تو یہ ہوا ہے میرے ساتھ۔'' عالیہ نے بتایا۔ ''اس کے بعد میں گرتی پڑتی گھر آ گئی اور اب تک مجھے کوئی ہوش ہی نہیں ہے۔ پہلے بھی لوگ مجھے دیکھا کرتے تھے۔ ایک دو نے الٹی سیدھی باتیں کی تھیں لیکن ایسی دیدہ دلیری کے ساتھ کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔'' اتنا کہہ کر وہ رونے لگی تھی۔

''نہیں عالیہ نہیں، اس طرح نہیں روتے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم فکر مت کرو اس کو میں سیدھا کروا دوں گا۔ میرا دوست ہے نا سلیم، وہ میرے بہت کام آئے گا۔''

''کون سلیم، وہ جو اخبار میں کام کرتا ہے۔''

''ہاں وہی، وہ ایک کرائم رپورٹر ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ یہ کرائم رپورٹرز کیا چیز ہوتے ہیں۔ پولیس والے بھی ان سے ڈرتے ہیں۔ ان

بات مانتے ہیں۔"

"لیکن وہ کیا کرلے گا۔"

"ارے......وہ کسی پولیس آفیسر سے کہہ دے گا اور پولیس آفیسر اس بدمعاش کو سیدھا کردے گا۔"

"آپ کی مرضی لیکن آپ اس دکاندار سے بھی مل لیں، دیکھیں اس نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔"

"ہاں میں فریش ہوکر جاتا ہوں اس کے پاس جب تک تم میرے لیے ایک کپ چائے بنادو پلیز۔"

میں جب دکاندار کے پاس پہنچا تو ایسا لگا جیسے وہ میرا ہی انتظار کررہا ہو۔"آیئے ممتاز صاحب! میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ اسی وقت آجائیں گے۔"

"بھائی صاحب! نوکری کا مسئلہ ہے۔ آج کچھ کام زیادہ تھا اس لیے آنے میں دیر ہوئی۔ وحید صاحب میری بیگم بتارہی تھیں کہ آپ نے مجھے بلایا تھا۔"

"ہاں! اسی بارے میں بات کرنی تھی۔ کالے خان کے بارے میں آپ کی بیگم نے تو بتا ہی دیا ہوگا۔"

"ہاں! بتادیا ہے وحید صاحب کیسا کمینہ انسان ہے وہ۔"

"وہ ایسا ہی انسان ہے ممتاز صاحب بہت لمبی لسٹ ہے اس کے جرائم کی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے کم از کم چھ سات قتل کیے ہیں۔"

"کمال ہے اور اب تک آزاد گھوم رہا ہے۔"

"ایسے لوگوں کا یہی تو ہنر ہوتا ہے۔" دکاندار نے بتایا۔"صاف بچ نکلتے ہیں، اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑتے۔ پولیس بھی جھک مارتی رہ جاتی ہے۔ اس کا ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔"

دکاندار نے اس طرح اِدھر اُدھر دیکھا جیسے اسے یہ اندیشہ ہو کہ کوئی اس کی بات نہ سن لے، اس دوران ایک گاہک کچھ لینے کے لیے دکان پر آگیا۔ دکاندار نے مجھ سے کہا۔"ممتاز صاحب! آپ ذرا اکبر کے ہوٹل کی طرف چلیں۔ میں بھائی کو دکان میں بٹھا کر آتا ہوں۔ وہیں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

دکاندار کچھ دیر کے بعد میرے پاس آگیا تھا۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا تھا پھر اس نے اپنی گفتگو شروع کی۔

"ممتاز بھائی! کالے خان کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔"

"یہ تو خیر اندازہ ہوگیا ہے لیکن تم اس کے بارے میں کوئی خاص بات بتانے والے تھے۔"

"ہاں ممتاز بھائی! اس آدمی نے ایک ایسا قتل بھی کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اسے یہ کام کرتے ہوئے دیکھا لیکن کسی کی گواہی نہیں مانی گئی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ اس وقت وہ سرکاری طور پر جیل میں تھا۔" دکاندار نے بتایا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"یہی تو سارا گیم ہے ممتاز صاحب۔" دکاندار نے کہا۔"بہت لمبے ہاتھ ہیں اس آدمی کے اور بہت سازشی ذہن ہے اس کا۔ اس نے جان بوجھ کر کوئی چھوٹا موٹا جرم کیا اور جیل پہنچ گیا۔ تین مہینوں کی سزا ہوئی تھی اس کو۔ جیل کا سارا عملہ اس کا مرید ہے۔ کیونکہ وہ بہت کچھ لیتا دیتا رہتا ہے۔ جس رات کو اسے واردات کرنی تھی اس رات کو اسے خاموشی سے جیل سے نکال دیا گیا۔"

"یعنی فرار کروادیا گیا۔"

"ہاں وقتی فرار۔ کیونکہ اسے اپنا کام کرکے واپس تو وہیں آنا تھا پھر اس نے بہت اطمینان سے بہت سوں کے سامنے اس آدمی کو قتل کیا اور جیل پہنچ گیا۔ اب لوگ لاکھ گواہی دیتے رہیں کیونکہ ریکارڈ کے مطابق وہ اس رات جیل میں تھا۔"

"اوہ خدا!" میں نے ایک گہری سانس لی۔"میں سمجھ گیا۔"

"ممتاز بھائی آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔"

"ضرور کہو، تم تو ہمدرد انسان ہو، اچھا ہی مشورہ دو گے۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بھابی ماشاء اللہ بہت اچھی صورت شکل کی ہیں اور کالے خان جیسے کمینوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ وہ کسی وقت کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔"اب تمہارا کیا مشورہ ہے۔"

"مشورہ بس یہی ہے کہ بھابی کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔" اس نے کہا۔"یا پھر یہ کہ یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کالے خان سے آپ کو نجات مل جائے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ کیا میں اس کے خلاف پولیس میں

نہیں جاسکتا۔'' میں نے پوچھا۔
''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' دکاندار نے کہا۔
''ایک تو پولیس والے اس کے خلاف کچھ نہیں کریں گے دوسرے خطرناک بات یہ ہوگی کہ وہ آپ کا کٹر دشمن ہو جائے گا پھر تو وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔''
''یہ خطرہ ہے میں خوامخواہ کیس کے چکر میں پھنس گیا۔''
''بس کچھ دنوں تک بھابی کو گھر میں روک کر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔''
میں نے جب عالیہ کو یہ آکر بتایا تھا تو وہ اور بھی سہم گئی۔ ''اب بتائیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ ''اتنی مشکلوں سے تو یہ مکان ملا ہے۔ اب اتنی جلدی اس کو چھوڑ کر کہاں جاسکتے ہیں۔''
''ہمیں تو پریشانی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بس کچھ دنوں کے لیے احتیاط کرلو۔''
''میں سوچتی ہوں کہ خدا مجھے بدصورت بنا دیتا تو پھر کیا فرق پڑ جاتا۔''
''شاید پھر تم عالیہ نہیں بلکہ کچھ اور ہوتیں۔'' میں اس کا خوف دور کرنے کے لیے ہنس پڑا۔
عالیہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ مجھے بھی اس کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ہمارے معاشرے میں شریف لوگوں کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔
ان کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے اور ہم جیسے سفید پوش واویلا کرتے رہ جاتے ہیں یا پولیس کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں پھر چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو، یہ بعد کی کہانی ہے۔ وہ معاشرے میں دو کوڑی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح منہ چھپاتے پھرتے ہیں جیسے خود انہوں نے کوئی جرم کر دیا ہو۔
دفتر جاتے ہوئے بھی میں عالیہ کو تاکید کرتا ہوا گیا کہ وہ اندر سے تالا لگا کر رکھے اور کسی بھی حال میں تالا نہ کھولے۔ ایسی کیفیت چار پانچ دنوں تک رہی تھی۔
چار پانچ دنوں کے بعد عالیہ نے کہا۔ ''ممتاز! ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں یہ تو کوئی حل نہیں ہوا۔ آخر میں کب تک ایک قیدی کی طرح گھر میں پڑی رہوں اور آپ کا ذہن ہر وقت اس میں لگا رہے کہ خدا جانے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا۔''
''تم ٹھیک کہتی ہو عالیہ۔'' میں نے اعتراف کیا۔
''کئی دنوں سے میں دفتر میں ڈھنگ سے کام بھی نہیں کر سکا ہوں۔ ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے اور اس کم بخت کالے خان کی صورت سامنے رہتی ہے۔''
''کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟'' عالیہ نے پوچھا۔
''کئی بار، وہ تو دیکھنے ہی سے ایک خونخوار وحشی درندہ معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔
''آپ سوچ لیں کہ جب وہ درندہ مجھ سے ایسی باتیں کر رہا ہوگا تو میرا کیا حال ہوا ہوگا۔''
''ہاں عالیہ میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہا ہوں، لیکن تم فکر مت کرو۔ خدا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔ خدا ہم جیسوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔''
لیکن پھر کئی دنوں تک کچھ بھی نہیں ہوا۔
دکاندار نے بتایا کہ کالے خان کہیں چلا گیا ہے، کسی اور شہر میں یا کسی اور ملک میں۔ ماحول جب پُرسکون ہونے لگا تو عالیہ نے بھی سودا سلف کے لیے باہر نکلنا شروع کر دیا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا اور ایک دن اس بات کی انتہا ہوگئی۔
میں دفتر سے واپس آیا تو عالیہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ ذرا سی دیر میں اس نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔
''بتاؤ کیا ہوا؟ کیا وہ بدمعاش پھر مل گیا تھا؟''
''وہ ملا تو نہیں لیکن اس نے ایک ایسی بات کی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔''
''کیا کہہ دیا اس نے؟''
''آپ پہلے فریش ہو جائیں میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔''
''لیکن تم تو اس وقت اپ سیٹ ہو رہی ہو۔''
''سنبھال لوں گی خود کو۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''نہ جانے کیوں وہ اتنی نروس ہوگئی تھی۔''
کچھ دیر بعد اس نے بتانا شروع کیا۔ ''اس محلے میں ایک عورت رہتی ہے، نسرین نام ہے اس کا۔ وہ اس بدمعاش کالے خان کی خالہ ہوتی ہے۔''
''اوہ تو وہ بدمعاش اس سے ملنے کے لیے اس محلے میں آتا ہوگا۔''
''ہاں! اس نے اپنی خالہ کے ذریعے مجھے ایک پیغام بھجوایا ہے۔''
''کیا پیغام؟''
''آپ میں اس کا پیغام سننے کا حوصلہ ہے۔'' عالیہ

نے پوچھا۔

"تم بتاؤ تو سہی کیا کہا ہے اس کمینے نے۔"

"اس نے کہا ہے کہ تم اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کرلو۔" عالیہ نے بتایا۔

"کیا!" میں غصے اور حیرت سے بل کھا کر رہ گیا تھا۔ "یہ کہا ہے اس کمینے نے۔"

"ہاں اور وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ وہ مجھے اپنے سر پر بٹھا کر رکھے گا۔ مجھے الگ سے ایک مکان لے کر دے گا۔ حالانکہ اس کی ایک بیوی بھی ہے لیکن وہ میری خاطر اپنی بیوی کو چھوڑ دے گا۔"

"بس کرو عالیہ خدا کے لیے۔" میں نے کہا۔ "اس نے بے شرمی کی انتہا کردی۔ اتنی دلیری، اتنی زیادتی۔"

"آگے بھی تو سنیں، اس کی خالہ بتا رہی تھی کہ اس کا یہ بھی پیغام ہے کہ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو پھر وہ مجھے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا لیکن اس صورت میں میری حیثیت اس کی داشتہ جیسی ہوگی۔ سن رہے ہیں آپ، داشتہ کی طرح رکھے گا مجھے۔" عالیہ نے اتنا بتا کر رونا شروع کردیا۔

اب میں اسے چپ کرانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو ماؤف سمجھنے لگا تھا۔ بے پناہ توہین کا احساس ہورہا تھا۔ اس شخص نے اپنے اس گھناؤنے پیغام کے ذریعے میری عزت اور غیرت کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اس نے ایک شریف انسان کے سر بازار جیسے کپڑے اتار دیے تھے۔ کاش میں اس کا کچھ بگاڑ سکتا۔ اس کو رگڑ کر رکھ دیتا، کاش میں اس کی زبان کھینچ سکتا، کاش!!

اس وقت مجھے اپنے کرائم رپورٹر دوست سلیم کا خیال آگیا۔ وہ میرے لیے ضرور کوئی راستہ نکال دیتا۔ اس کی جان پہچان بہت سوں سے تھی۔

"عالیہ میں سلیم کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "اب اس شخص کو لگام دینا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ اس نے آج اپنی خالہ کو بھیجا ہے کل وہ خود بھی آسکتا ہے۔"

"ہاں! اسی لیے تو میں دن بھر خوف زدہ رہی ہوں۔" عالیہ نے بتایا۔ "لیکن آپ اس وقت کہیں نہ جائیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم برابر والی آنٹی کے ہاں جا کر بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ اچھی اور نیک عورت ہے۔ تمہارا خیال بھی رکھتی ہے۔ تم اسے کچھ مت بتانا۔ تم بس یہ کہنا کہ میں کسی کام سے چلا گیا ہوں۔ کچھ دیر میں آؤں گا جب تک تم اس کے ہاں بیٹھو۔"

"ہاں ہاں یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو خوش ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے آپ جائیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

میں عالیہ سے رخصت ہو کر سیدھے سلیم کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بھی کچھ دیر پہلے ہی گھر آیا تھا۔ میں نے سلیم کو ساری صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا۔ "سلیم اب تم مشورہ دو میں کیا کروں؟"

"کالے خان تو بہت کمینہ انسان ہے۔" سلیم نے کہا۔ "میں اس کے پچھلے ریکارڈ سے واقف ہوں۔"

"تم بتاؤ کیا میں پولیس کے پاس چلا جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پولیس اسے بلا کر تنبیہ کر کے چھوڑ دے گی۔ وہ وقتی طور پر خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا، اس کے بعد وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"تو پھر کیا کروں؟" میں جھلا اٹھا۔ "کوئی دوسرا مکان اتنی جلدی ملے گا نہیں۔ عالیہ کو گھر میں قید کر کے رکھ نہیں سکتا۔ اسے طلاق دے کر اس کالے خان کے حوالے کر نہیں سکتا۔ تو پھر کیا کروں؟ میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔"

"چلو، میں تم کو تیمور کے پاس لے چلتا ہوں۔" سلیم نے کہا۔

"یہ تیمور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس شہر کا سب سے بڑا غنڈہ۔" سلیم نے بتایا۔ "کالے خان جیسوں کے لیے اس کا نام اور اس کی دہشت ہی کافی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی، یعنی میں ایک غنڈے سے بچنے کے لیے دوسرے سے مدد لے لوں۔"

"تم اس کے پاس چلو تو سہی۔" سلیم نے کہا۔ "تم اس کو ایک مختلف انسان پاؤ گے۔ تم اسے دیکھ کر یہ کہہ نہیں سکتے کہ یہ شخص اتنا بڑا بدمعاش ہوسکتا ہے۔"

"کیا وہ کالے خان کو قابو کرسکے گا؟"

"میں نے کہا نا کہ کالے خان کے لیے اس کا نام ہی کافی ہوگا۔ بس اب چلو باقی باتیں اسی سے کرلینا۔"

تیمور واقعی ایک مختلف انسان ثابت ہوا تھا۔

سوائے اس کے کہ اس کا جسم بہت ٹھوس قسم کا تھا۔ اس میں اور کوئی بات بدمعاشوں والی نہیں تھی۔ اس کا گھر بھی شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے میں تھا۔ اس کے ملازم نے انتہائی تمیز کے ساتھ ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا تھا۔ یعنی ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ وہ کوئی غنڈہ یا بدمعاش ہے۔

پھر جب تیمور سامنے آیا تو اس کی شخصیت نے اور بھی حیران کر دیا تھا۔ انتہائی سلیقے کا کرتہ شلوار، عینک لگائی ہوئی اور لہجہ بھی بہت مہذب۔

''ہاں بھائی سلیم بہت دنوں کے بعد صورت دکھائی ہے تم نے۔'' اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کرنے کے بعد سلیم سے پوچھا۔

''تیمور بھائی تم تو میرے کام سے واقف ہی ہو۔'' سلیم نے کہا۔ ''اس قسم کی جاب وقت ہی کہاں دیتی ہے۔''

''یہ تو ہے، تو آج کیسے یاد آ گئی؟''

''تیمور بھائی یہ میرے بہت عزیز دوست ممتاز ہیں۔'' سلیم نے تعارف کروایا۔ ''ان کے ساتھ ایک پرابلم ہوگئی ہے۔''

''اوہ!'' تیمور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''بتاؤ بھائی کیا پرابلم ہوئی ہے۔ شاید میں تمہارے کام آسکوں۔''

میں نے اسے کالے خان کے حوالے سے سب کچھ بتا دیا۔

''اوہ...... ! تو اس میں اب اتنی ہمت ہوگئی ہے۔'' تیمور غصے سے بولا۔ ''شریفوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے لگا ہے۔''

''جی تیمور بھائی ہم اس لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔

''بھائی میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔'' تیمور نے میری طرف دیکھا۔ ''اور مدد بھی ایسی کہ زندگی بھر کوئی بھی کالے خان تمہاری عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔''

''تیمور صاحب میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''دو منٹ ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔'' تیمور اٹھ کر اندر چلا گیا۔

''دیکھا میں نے کیا کہا تھا۔'' سلیم خوش ہو کر بولا۔ ''تیمور تمہاری ضرور مدد کرے گا اور اب دیکھنا کالے خان کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

عہد محمد شاہ میں جب دہلی کی شاعری کا ارتقاء شروع ہوا اور اردو زبان نے ہاتھ پیر نکالنا شروع کیے تو دہلی کا دبستان شاعری نذر خزاں ہو گیا۔ میر تقی میر، سودا، میر حسن، میر سوز، قمرالدین منت، جعفر علی حسرت دہلوی، انشا، جرأت، مصحفی، لکھنو میں آ کر پناہ گزیں ہوئے۔ دہلی ارباب کمال سے خالی ہوگئی۔ دہلی کا یہ عالم تھا کہ امرا شکستہ حال تھے تو بادشاہ مجبور محض اور لکھنوی کی یہ کیفیت تھی کہ دہلی سے جو صاحب کمال آتا، رواق چشم میں جگہ پاتا، خانہ دل میں بٹھایا جاتا اور شاہان اودھ، سلاطین و امراء اس کی خاطر داری کو واجب جانتے۔ اس نتیجے میں آخر لکھنو اردو کا گہوارہ بن گیا، یہاں کی آب و ہوا دلی والوں کو بہت راس آئی اور یہیں ان کی شاعری پھلی پھولی، غرض وہی اردو شاعری جس کی کل کائنات دہلی میں غزل کے چند دواوین تک محدود تھی، درد و سوز کا مختصر سا سرمایہ تھا جسے لے کر اردو دہلی سے جلا وطن ہوئی، لکھنو والوں نے اس غریب الوطن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا، ادب کی دنیا میں مٹی ہوئی دہلی کی فرمانروائی پر قلم تنسیخ پھیر دیا گیا۔ ناسخ اور آتش نے دہلی والوں کی تقلید سے آزاد ہو کر اپنی استادی کے پرچم بلند کر دیے، میر اور سودا کے عہد کی زبان ناسخ کے ہاتھوں منسوخ ہوئی اور اردو کو ایک لباس نو عطا ہوا، غزل کے قنوطیت اور تصوف کے مایوس کن اور ہمت شکن ماحول کی جگہ لبوں پر زندگی اور زندہ دلی کے نغمے مچلنے لگے، ادب کی دنیا بدلی، تہذیب کے تیور بدلے، دہلی کی تہذیب پر ایرانی اثر غالب تھا، لکھنو میں اصناف شاعری کی بہتات ہوگئی، اسالیب بیان میں ندرت، انداز فکر میں جدت پیدا ہوئی، اردو زبان اپنے سرمایہ شعری کی کثرت کے نتیجے میں فارسی کا پہلو دبانے اور بھاشا سے آنکھیں ملانے لگی۔ دہلی کی چھوٹی سی ندی لکھنو آ کر ایک پرشور اور متلاطم سمندر میں تبدیلی ہوگئی۔ لکھنو کے زندہ دل اور جواں فکر شاعروں کے شہپر فکر نئے آسمانوں اور نئی فضاؤں کے متلاشی تھے جن میں وہ اپنی فکر کی بلند پروازیوں پر مضامین کی خلاقی کا مظاہرہ کرسکیں، اسی طرح لکھنو میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد پڑی، دبستان لکھنو کے نمائندہ شاعر ناسخ قرار پائے۔

مرسلہ: قائم مہدی، کراچی

تیمور کچھ دیر میں واپس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو اس میں گولیاں بھری ہوئی ہیں۔''

''جی!'' میں اور سلیم دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

''بھائی! یہ ریوالور لے جا کر گولیاں مار کر سیدھے میرے پاس آ جاؤ۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ تم پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔''

''تیمور صاحب میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''اس میں سمجھ نہ آنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خدا کے بندے جو شخص اپنے گھر کی عزت کی حفاظت خود نہیں کر سکے تو پھر کسی اور کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس کے گھر کا چوکیدار بن جائے۔ میں کالے خان کی گردن توڑ کر رکھ سکتا ہوں لیکن کیا ہوگا اس سے، تمہارے راستے سے ایک ہی آدمی کم ہوگا نا اور نہ جانے کتنے کالے خان تمہیں زندگی میں ملیں گے۔ تو کیا تم ہر موڑ پر کسی تیمور سے مدد مانگتے رہو گے۔''

میں سن ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''میرے بھائی، تم مجھ سے جو مدد لو گے وہ وقتی مدد ہو گی لیکن جب تم خود اپنی مدد کرو گے تو وہ ہمیشہ کے لیے ہو گی۔ اب یہ تمہاری مرضی کہ تمہیں وقتی مدد چاہیے یا مستقل۔''

میں اس وقت ایک شدید قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس شخص نے میرے وجود میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ اس نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور اٹھا لیا۔ سلیم بھی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا تھا۔

''شاباش۔'' تیمور کی آواز گونجی۔ ''ہو سکتا ہے کہ تمہیں ریوالور کے استعمال کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔ کالے خان ایک بزدل انسان ہے اور شریف آدمی ہمیشہ بہادر ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بدمعاش کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم ایک شریف آدمی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری شرافت کے طوفان کے آگے کالے خان کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ جاؤ اور اگر مار دینے کی نوبت آ جائے پھر بھی تمہارا کچھ نہیں ہوگا کیونکہ کالے خان کا ریکارڈ سامنے ہے، سب اس بات کی گواہی دیں گے کہ تم نے اپنی بیوی کی عزت بچانے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔''

''جی ہاں تیمور صاحب آپ کی باتوں نے میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے بلکہ حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔ میرے دل سے اب کالے خان کا خوف نکلتا جا رہا ہے۔''

''اگر کہو تو میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی بھی سنا دوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''بچوں کی اس کہانی میں نصیحت کے بہت پہلو ہیں۔''

''جی ہاں ضرور سنائیں۔''

''ایک کھیت میں پرندوں کی ایک فیملی نے اپنا گھر بنا رکھا تھا۔'' تیمور نے دھیمے لہجے میں کہانی شروع کر دی۔ ''ان پرندوں کے تین چار بچے بھی تھے جو دن بھر گھونسلے میں رہتے جب کہ ان کے ماں باپ دانے جمع کرنے کے لیے نکل جاتے۔ ایک شام جب وہ جوڑا واپس آیا تو بچوں نے کہا کہ اب ہمیں یہاں سے کہیں اور جانا ہوگا۔''

''وہ کیوں؟'' ان کے باپ نے پوچھا۔

''بابا! آج کسان آیا تھا اپنی بیوی کے ساتھ۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ کل میں اپنے خاندان والوں کو بلاؤں گا اور اس کھیت کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔ باپ نے کہا۔ ''تم لوگ بے فکر رہو۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' اور ہوا بھی یہی کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ کھیت اسی طرح رہا۔ اس میں کٹائی نہیں ہوئی۔ دو چار دنوں کے بعد بچوں نے پھر کہا۔ ''بابا! اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ یہاں سے جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔''

''آخر کیوں، اب کون سی آفت آ گئی۔''

''بابا وہ کسان اپنی بیوی کے ساتھ پھر آیا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے خاندان والے تو اس کی مدد کے لیے نہیں آئے لیکن کل وہ بچوں کو لے کر آئے گا۔ بابا! اب تو اس کے بچے آ جائیں گے اور سب مل کر کھیت کاٹ دیں گے۔ باپ نے پھر وہی بات کی۔ ''بے فکر رہو، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کوئی نہیں آنے والا۔ یہ کھیت اسی طرح رہے گا۔'' دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ کھیت اپنی جگہ قائم رہا۔ تیسری بار بچوں نے کہا۔ ''بابا! کسان پھر آیا تھا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس کا کسی نے تو ساتھ نہیں دیا لیکن کل صبح سے وہ خود ہی کٹائی کا کام شروع کر دے گا۔ چاہے جتنی بھی محنت لگ جائے۔''

یہ سنتے ہی بچوں کے باپ نے کہا۔ ''ہاں! اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا کیونکہ کسان نے اپنی مدد آپ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب یہ کھیت ضرور کٹ جائے گا۔''

میں خاموش بیٹھا اس آدمی کی دانش بھری باتیں سن رہا تھا جو بظاہر ایک بدمعاش تھا لیکن اس کی باتوں میں حکمت پوشیدہ تھی۔

''میں سمجھ گیا ہوں تیمور صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں نے بھی اس کسان کی طرح اپنی مدد آپ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''تو پھر اس ریوالور کو ساتھ لے جاؤ۔ حوصلے کا امتحان اس کو چلانا نہیں بلکہ اس کو دکھانا ہوتا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ آپ کا۔''

میں نے اس ریوالور کو اپنی جیب میں رکھا اور تیمور سے اجازت لے کر باہر آگیا۔ سلیم پریشان حال سا میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''ممتاز تم کیوں اس کے ہاتھ میں آگئے، واپس کرو یہ ریوالور میں تو اس کے پاس تمہیں اس لیے لایا تھا کہ شاید وہ تمہاری مدد کرے گا۔''

''میرے دوست! اس نے میری مدد کردی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے مجھے کالے خان اور ان جیسوں سے نمٹنے کا راستہ بتا دیا ہے۔''

''ممتاز! تم ایک شریف انسان ہو، تم کہاں ان چکروں میں پڑو گے۔ یہ سب تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''اب یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ میں اپنی عزت کو کالے خان جیسے بدمعاش کے حوالے تو نہیں کرسکتا۔ تم یہ کہہ چکے ہو کہ اس کے خلاف پولیس میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ شہر کا کوئی بدمعاش اس کے راستے میں آنے کے لیے تیار نہیں ہوگا تو پھر کیا راستہ رہ جاتا ہے، یہی نا کہ میں خود اس کے سامنے آجاؤں۔''

''دیکھو یار کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا۔'' سلیم میرے لیے پریشان ہوا جا رہا تھا۔

''ہاں ہاں تم اس کی فکر مت کرو، میں جو بھی کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا۔''

گھر واپس آیا تو عالیہ پریشان سی بیٹھی ہوئی تھی۔ ''کیا ہوا آپ کہاں چلے گئے تھے؟''

''تم کس وقت آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ابھی ابھی آئی ہوں۔ خالہ کو کہیں جانا تھا اور ویسے بھی میں ان کے گھر میں کب تک بیٹھی رہتی۔ آپ بتائیں۔ آپ جس کام سے گئے تھے وہ ہوگیا۔''

''ہاں ہوگیا۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ کے دوست نے کوئی مدد کی؟''

''ہاں بہت بڑی مدد کردی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

میں نے ریوالور عالیہ سے چھپا کر رکھ لیا تھا اگر وہ دیکھ لیتی تو ایک قیامت برپا کردیتی۔ کئی دن گزر گئے۔

ایک شام کالے خان مجھے محلے میں دکھائی دے گیا۔ شاید وہ اپنی اس خالہ کے پاس اپنا جواب لینے آیا ہوگا۔

میں اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں اس وقت اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا بلکہ میری پلاننگ اس وقت کچھ اور تھی۔

میں گھر واپس آگیا۔ عالیہ برتن دھو رہی تھی۔

''عالیہ! ذرا میرے ساتھ چلو۔'' میں نے کہا۔

''کہاں؟''

''بس قریب ہی جانا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''کچھ دیر میں واپس آجائیں گے۔ برتنوں کو ایسے ہی رہنے دو، واپس آکر دھو لینا۔''

عالیہ نے میرے کہنے پر اپنا حلیہ بھی درست کرلیا تھا۔ میں اسے پوری سج دھج کے ساتھ اس شخص کے سامنے لانا چاہتا تھا وہ اس بات پر حیران بھی ہو رہی تھی لیکن خاموش رہی تھی۔

میں نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکا بھی تھا۔ کئی طرح کے خدشات آنے لگے تھے لیکن جو کچھ میں کرنے جا رہا تھا وہ آئندہ کے خدشات سے نجات کے لیے تھا۔ مجھے اس وقت حوصلے سے کام لینا تھا۔ ویسے یہ بات تو تھی کہ ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کچھ عجیب سا حوصلہ آگیا تھا۔ ایک نامعلوم سی توانائی مل گئی تھی۔ شاید اس لیے ہتھیار رکھنے والے جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود دوسروں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے کوئی کچھ بول نہیں پاتا۔

میں عالیہ کو لے کر گھر سے باہر آگیا۔

میں نے کالے خان کو کچھ دیر پہلے یہاں کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ وہ اب وہاں نہیں تھا۔ میں عالیہ کو لیے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ وہ بے چاری بھی کچھ نہ سمجھنے کے باوجود میرے ساتھ چلتی رہی۔

بالآخر ایک جگہ کالے خان دکھائی دے گیا۔

وہ ایک ہوٹل کے پاس پان سگریٹ کی ایک کیبن کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے بھی ہم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ عالیہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''ممتاز!'' عالیہ نے خوفزدہ ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''وہ......وہ دیکھیں وہ وہی ہے کالے خان۔''

''ہاں ہاں میں اسی کو تو تلاش کر رہا تھا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تم یہیں کھڑی رہنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''خدا کے لیے آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔'' میرے ہاتھ پر اس نے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''یہیں کھڑی رہنا۔''

میں عالیہ سے ہاتھ چھڑا کر کالے خان کی طرف آ گیا۔ مجھے اس طرح بے دھڑک اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ حیران نظر آنے لگا تھا۔

''کالے خان۔'' میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہیں میری بیوی بہت پسند آ گئی ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں اسے طلاق دے کر تمہارے حوالے کر دوں۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''تو تم مجھ سے سودا کرنے آئے ہو۔''

''ہاں بہت لمبا سودا۔'' میں نے پھرتی سے ریوالور نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ ''اس سودے کے بدلے میں اتنی گولیاں تیرے سینے میں اتاروں گا کہ تو گنتی بھول جائے گا۔''

ایک سناٹا سا ہو گیا۔

کالے خان کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ خود کالے خان کا یہ حال تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ''یہ......یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''وہی کر رہا ہوں جو ایک غیرت مند شوہر کو کرنا چاہیے۔'' میں غرایا۔ ''لے اب میں تیرا کام ہی ختم کر رہا ہوں۔''

اس دوران عالیہ چیختی ہوئی ہمارے قریب آ گئی۔ ''خدا کے لیے چھوڑ دیں، کیا کر رہے ہیں آپ۔''

''میں گولیاں مار کر اس کی محبت کا امتحان لے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اور اچانک کالے خان نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار دیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا۔ کالے خان نے اسے اٹھانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی جب کہ میں ہکا بکا سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔ ''ہاں اب بتا غیرت مند شوہر میں تجھے کتنی گولیاں ماروں۔''

میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ ایسی سچویشن کہ میں نے توقع بھی نہیں کی تھی۔

''میری بات سنو، تم نے کالے خان پر ریوالور اٹھایا ہے، میں ایسے کھلونوں سے رات دن کھیلتا رہتا ہوں۔ میرے لیے یہ تماشے نئے نہیں ہیں لیکن میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ کالے خان بدمعاش سہی لیکن چھچھورا نہیں ہے۔ تم نے آج جس ہمت اور دلیری کا ثبوت دیا ہے نا کالے خان اس کی قدر کرتا ہے، شاباش! تم اپنی بیوی کی حفاظت کرنا جانتے ہو۔ مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی ہے۔ اگر تم اس طرح رہے نا تو آئندہ بھی کوئی تمہاری بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ لو اپنا ریوالور۔'' اس نے ریوالور میری طرف بڑھا دیا۔

میری حیرانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کالے خان جیسے آدمی سے ایسی توقع نہیں تھی۔ وہ تو اپنی شہرت کے برعکس ثابت ہوا تھا۔

''کالے خان......!'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''کچھ مت کہنا۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہم بدمعاش اس کی عزت کرتے ہیں جو اپنی عزت کی حفاظت کر سکتا ہو۔'' پھر اس نے عالیہ کی طرف دیکھا۔ ''معاف کرنا مجھے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے، اب کالے خان کبھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔''

آس پاس کھڑے لوگ اس بدلتی ہوئی سچویشن کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ کالے خان کا امیج ان کی نگاہوں میں اچانک بہتر ہو گیا۔

اور جہاں تک میرا سوال ہے تو اب میں ایک باحوصلہ انسان ہوں اور میں اس کے لیے تو سب سے پہلے تیمور کا پھر کالے خان کا شکر گزار ہوں۔ اب مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انسان کو اپنی عزت کا خود محافظ ہونا چاہیے۔



ایک خواب تھا

محترم مدیر

السلام علیکم!

ایک اور نئی روداد کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں۔ یہ روداد مریم کی ہے بلکہ ہر عورت کی ہے۔ عورت جو بہت کمزور ہوتی ہے، جس نے جیسے چاہا اس سے کھیل لیا۔ مریم کے ساتھ اس کی نند نے، نند کے سسرال والوں نے، خود اس کے سسر نے کیسا کھیل کھیلا یہ آپ اس روداد میں پڑھ لیں گے۔ قارئین کو بھی یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔

فضہ عادل

(ہری پور ہزارہ)

وہ ایک معروف دن تھا۔ اس دن ہماری شادی کی پانچویں سالگرہ تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد میں نے بریانی دم پر رکھی۔ میرے ہاتھ کی بنی بریانی امجد کو بہت پسند تھی۔ انہیں کسی ایمرجنسی کے لیے اسپتال جانا پڑ گیا تھا مگر وہ کہہ کر گئے تھے کھانا وہ گھر آ کر کھائیں گے۔ اس کے بعد ہم تینوں آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں سالگرہ کا کیک کاٹیں گے۔ اس خوبصورت رات کو کیسے سیلیبریٹ کرنا ہے۔ وہ صبح جانے سے پہلے بہت محبت سے مجھے اپنے ہر ارادے کے بارے میں آگاہ کر کے گئے تھے۔ وہ ایسے ہی تھے۔ زندگی کے ہر لمحے سے چھوٹی چھوٹی

خوشیاں ڈھونڈ کر..... جینے والے انسان اور آج تو ہماری زندگی کا بہت ہی خوبصورت دن تھا۔

بریانی دم پہ رکھنے کے بعد میں نے سوچا میں شاور لے لوں۔ بچی سو رہی تھی۔ وہ جاگ جاتی تھی تو مجھے پھر کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ میں نے جلدی جلدی الماری سے کپڑے نکالے۔ خوشی اتنی زیادہ تھی، سمجھ نہ آرہا تھا کون سا جوڑا پہنوں۔ یکے بعد دیگر میں نے تین جوڑے نکال کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا کہ کون سا بیسٹ رہے گا۔ بالآخر ایک منتخب کر لیا۔ اتنے میں ڈور بیل ہونے لگی۔ 3 بج کے 25 منٹ ہو رہے تھے۔ مجھے لگا اسجد واپس آگئے ہیں۔ میں نے ہاتھ سے جوڑا بیڈ کی پائنتی پر رکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایک بار پھر بیل بجی۔ میں نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

''اسجد بیل پر بیل نہیں بجاتے...... خدا جانے اس وقت کون آگیا۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''کون ہے؟'' دروازے کے قریب رک کر میں نے پوچھا۔

''میں ہوں سلطانہ...... دروازہ کھولو۔'' دوسری جانب سے سلطانہ آپا کے یوں اچانک آنے کا سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک بچہ گود میں اٹھائے، دوسرا انگلی سے لگائے وہ انتہائی بکھرے ہوئے حلیے میں دروازے میں کھڑی تھیں۔ میں انہیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھی پھر انہیں گلے لگایا۔

''ارے آپا...... آپ یوں اچانک اور یہ حالت کیا بنا رکھی ہے اپنی۔ خیریت تو ہے نا؟''

میں نے گلے ملتے ہی فوراً پوچھا۔ انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ واپس مڑ کر التجائیہ نظروں سے اکرم بھائی کو دیکھنے لگیں۔ وہ گاڑی کی ڈگی سے بیگ نکال رہے تھے۔

''یہ لو پکڑو سامان اپنا۔ گھر اسی وقت واپس آنا جب مسئلے کا کوئی حل نکال لو... ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے واپس آنے کی۔ میں طلاق کے کاغذات بھجوا دوں گا۔'' ڈگی سے بیگ نکال کے انہوں نے غصے سے گیٹ کی طرف پھینکا۔ ساری بات انتہائی سپاٹ لہجے میں بول کر وہ گاڑی میں بیٹھے اور یہ جا وہ جا۔

میں نے کچھ نہ سمجھی کی کیفیت میں آگے بڑھ کر ان کا بیگ اٹھایا، پھر ان کو بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر لے آئی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ معما کیا ہے۔ البتہ اکرم بھائی کے جملوں نے میرے پیروں تلے سے زمین سرکا دی تھی۔ اتنا سمجھ چکی تھی کہ بات بگڑ چکی ہے۔

غم کے بعد خوشیاں ضرور ملتی ہیں۔ میں نے سنا تھا مگر آج جب میں اتنی خوش تھی تو غم کا کوہ گراں آپڑا۔

میرا دل اس وقت کانپ رہا تھا۔ میں سلطانہ آپا کو لے کر اندر آگئی۔

☆......☆

ہمارا تعلق غریب طبقے سے تھا۔ والد ایک پرائیویٹ فیکٹری میں مزدوری کرتے تھے۔ والدہ دمے کی مریضہ تھیں۔ ابو کی تنخواہ کے چند ہزار میں سے بھی ہر ماہ آدھے امی کی دوائیوں پہ خرچ ہو جاتے تھے۔ ہم غریب ضرور تھے مگر میں نے زندگی میں کبھی بھی اپنے والدین کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے نہ دیکھا تھا۔ اکثر گھر میں فاقوں کا راج رہتا مگر امی ابو اللہ پہ توکل رکھ کے ہمیں بھوکا ہی سلا دیتے۔

ہم پانچ بہنیں تھیں البتہ بھائی کوئی نہیں تھا۔ بڑی آپا صغریٰ اور مبینہ کی شادی بہت مشکل سے ابو کے خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ جہیز دیا تھا ابو نے مگر برائے نام۔ وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں جہیز کی وجہ سے ہزاروں طعنے سنتی تھیں اس کے باوجود زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیل رہی تھیں۔

ہم ساری بہنیں خوبصورت تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ سلیقہ مند اور باکردار بھی۔ اکثر رشتے والوں کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا مگر جب ان کو امی کہتیں کہ ہم معقول جہیز بھی نہ دے پائیں گے تو وہ دوبارہ ہمارے گھر کا رخ نہ کرتے۔

یوں ہی وقت گزر رہا تھا۔ میں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد تعلیم کو خیرآباد کہہ کر آپیوں کے ساتھ سلائی کڑھائی سیکھنی شروع کر دی۔ آگے پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر کمرتوڑ غربت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میں اکثر اپنی غربت زدہ زندگی سے گھبرا کر خود کو خوابوں کے سنگ چھوڑ دیتی۔ کبھی خواب میں خود کو کسی محل کی ملکہ تصور کرتی تو کبھی کسی ملک کا شہزادہ آتا اور مجھے سینڈریلا کے شہزادے کی طرح اس غربت زدہ قید سے نکال کرلے جاتا۔ پھر اچانک حقیقت کی دنیا میں واپس آتی تو مایوسی ارد گرد منڈلا رہی ہوتی۔

اس روز بھی میں اپنے گھر کے برآمدے میں بچھی چٹائی پر لیٹی ایسا ہی کوئی خواب بن رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں اور سدرہ گھر پر نہیں تھیں۔ عائشہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ ابا کے آنے کا وقت تھا۔ میں نے سر پر دوپٹا لیا اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

سامنے ہمارے محلے کا لڑکا ماجد کھڑا تھا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔

''باجی...... باجی مشتاق چاچا اسپتال میں ہیں۔ ابا کا فون آیا ہے آپ کو بلا رہے ہیں۔ سرکاری اسپتال میں ہیں جلدی چلو۔'' ماجد نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔ میں نے سنتے ہی دل پہ ہاتھ رکھا۔

''ابا...... ابا میرے ابا؟ کیا ہوا میرے ابا کو؟''

''پتا نہیں باجی۔ جلدی چلو۔'' وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے وہیں سے عائشہ کو آواز لگائی۔ اس نے چولہا بند کردیا۔ ہم دونوں نے چادریں سر پر رکھیں اور اسپتال کے لیے نکل پڑیں۔ اسپتال پہنچیں تو ہمیں یہ معلوم نہ تھا ابا کس جگہ ہیں۔ میں نے روتے ہوئے ریسپشن پر کھڑے ایک بندے کو مخاطب کیا۔

''بات سنیں۔ پلیز۔ میرے ابا ہیں مشتاق نام ہے ان کا۔ کچھ دیر پہلے یہاں آئے ہیں۔ آپ بتا سکتے ہیں کہاں...... کہاں ہیں وہ؟'' میں نے اٹکتے اٹکتے اپنی بات مکمل کی۔ معلوم نہیں میرے چہرے پر کیا تھا۔ وہ شخص بنا کوئی جواب دیئے یک ٹک مجھے تکنے لگا۔ مجھے اس لمحے اس کی نظروں سے کوفت محسوس ہوئی۔ میں غصے سے اسے گھورتی وہاں سے ہٹ گئی۔ تبھی ایک نرس نے خود ہی بتایا کہ مشتاق نامی مریض ایمرجنسی میں ہے۔

ہم ادھر بڑھ گئے۔ ابا کو فیکٹری میں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ تشویش ناک حالت میں فیکٹری سے اسپتال لائے گئے تھے، مگر اب قدرے بہتر تھے۔ کچھ دیر میں امی بھی آگئیں۔ سرکاری اسپتال مردانہ وارڈ میں رکنا بہتر نہ تھا اس لیے ہم گھر واپس آگئے البتہ سکندر چاچا ان کے ساتھ ہی تھے۔

☆......☆

ابا کو گھر واپس آئے دو دن گزر گئے تھے۔ گھر میں عیادت کے لیے آنے والوں کا کافی رش تھا۔ اسی دن ہمارے گھر ایک خاتون کی آمد ہوئی۔ وہ خاتون حلیے اور چال ڈھال سے کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ کون ہیں۔ کیونکہ وہ نہ ہی ہمارے رشتہ داروں میں سے تھیں۔ نہ ہی کوئی جاننے والی تھیں۔ بظاہر وہ ابو کی عیادت کے لیے آئی تھیں مگر جب امی نے ان سے مفصل پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ تو انہوں نے بتا دیا کہ وہ ''ڈاکٹر اسجد حیات کی خالہ ہیں۔ ناظم آباد سے آئی ہیں۔ ڈاکٹر اسجد کی خواہش پہ۔ مریم کے رشتے کے سلسلے میں۔''

''امی کو ان کی بات سن کر پہلے حیرت کا زوردار جھٹکا لگا کہ کہاں ناظم آباد اور کہاں ہماری مانسہرہ گلی اور کہاں ایک قابل ڈاکٹر کا رشتہ...... مگر یہ کہاوت بھی مشہور ہے کہ جہاں ''بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ اس لیے امی نے ہمیشہ کی طرح ان خاتون کو بھی یہ بات پہلے ہی بتانا مناسب سمجھی کہ بہن میرے پاس بیٹی کے سوا دینے کو اور کچھ نہیں۔ جہیز برائے نام ہی دوں گی۔ اگر منظور ہے تو بات آگے بڑھا دیں گے ورنہ......''

امی تو کیا ہم سب کو یقین تھا یہ بات سنتے ہی وہ خاتون چلتی بنیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب انہوں نے کہا کہ انہیں جہیز نہیں چاہیے صرف مریم چاہیے، باقی سب کچھ ہے ان کے پاس تو امی کے ساتھ ساتھ سارا گھر ہی حیران ہوا تھا۔ پل بھر کو مجھے یقین نہ آیا۔ میرے خواب کیسے حقیقت ہو سکتے ہیں۔ اس روز میرے پاؤں زمین پر نہ تھے۔ میرے خوابوں کا وہ شہزادہ جسے میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہ دیکھا تھا وہ اب حقیقت بن کر میرے سامنے آ پہنچا تھا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا تھا جبکہ سارا خاندان میری قسمت پہ رشک کرنے لگا تھا۔

وہ ہی ڈاکٹر اسجد تھے جنہوں نے مجھے ریسپشن پہ دیکھا تھا۔ انہوں نے پہلی ہی نظر میں مجھ سے شادی کا ارادہ کیا۔ ابا اسپتال میں تھے تو انہوں نے اسی دوران ساری پرسنل معلومات نکلوائی تھیں۔ ابا کے صحت یاب ہوتے ہی انہوں نے اپنی خالہ کو رشتے کے لیے بھیج دیا۔

اسجد کے ماں باپ کا کچھ سال پہلے ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ ان کے گھر میں سوائے ان کے اور دوسرا کوئی نہ تھا۔ ایک بہن تھی جس کی تین سال پہلے شادی ہو چکی تھی۔ دور کے رشتوں میں ایک خالہ تھیں جنہوں نے ان کے والدین کی وفات کے بعد ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ اسجد کی بہن رومانہ کی شادی کی ساری تیاریاں بھی اپنی نگرانی میں کر کے انہیں رخصت کیا تھا۔ سلطانہ آپا کے شوہر اکرم بھائی کی ایک چھوٹی بہن اور بوڑھے ماں باپ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ آپا کی شادی کے ایک سال بعد ان کی نند آسیہ کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ اسجد اس بات پر بہت خوش اور مطمئن تھے کہ ان کی بہن اپنے گھر میں سکھی ہے۔ اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے بھی جلد نوازا تھا۔ میری جب شادی ہوئی تھی تو سلطانہ آپا کا ایک، دو سال کا پیارا سا بیٹا تھا۔ پھر اللہ نے ان کی گود میں رمشہ کی صورت ایک رحمت بھی ڈال دی تھی۔

اوپر تلے ہمیں رب نے بے تحاشہ خوشیوں سے نوازا تھا۔ میرا چھوٹا سا خوبصورت سا گھر تھا جس کو اسجد نے میرے

لیے دنیا جہاں کی آسائشوں سے بھر رکھا تھا۔ خواہش ابھی میرے من میں ہوتی، لبوں پر بعد میں آتی مگر اسجد پہلے ہی وہ پوری کر دیتے تھے۔ اکثر مجھے یہ سب خواب سا لگتا۔ بالکل وہی خواب جو میں اپنے گھر کے برآمدے میں بچھی بوسیدہ سی چٹائی پر بیٹھے، لیٹے دیکھا کرتی تھی۔ اکثر مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ آتا تھا۔ خوشیاں تھیں کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں۔

میں اُمید سے ہوئی تو اسجد نے دنیا جہاں کی نعمتوں میں تولہ مجھے۔ جب اللہ نے چاند سی بیٹی سے نوازا... تو گویا زندگی خوشیوں سے بھر گئی۔ اسجد کی جان تھی ارمش میں۔ اس کے بعد میں نے مزید بچے کی خواہش کی تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا مگر ان کے انکار میں بھی میرے لیے بے لوث پیار تھا۔ وہ مجھے بچے پیدا کرنے والی مشین نہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے اوپر تلے میری اولادیں ہوں اور میں اپنی صحت خراب کر بیٹھوں۔ وہ ہر وقت مجھے کھلے گلاب کی طرح ہشاش بشاش چاق و چوبند دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بھلا۔ جب وہ ہی یہ سب چاہتے تھے۔ لہٰذا میں نے ساری توجہ بس ارمش اور اسجد پر ہی مرکوز رکھی۔

اسجد کی ہر بات میں محبت، ہر نظر میں فکر اور ہر قدم پہ عزت مجھے سرشار کر دیتی تھی۔ وہ مجھے دیوانوں کی طرح چاہتے اور میں، میں تو تھی ہی ان کی جوگن...... ہم دونوں میں مثالی محبت تھی۔ بلکہ وہ محبت جو کہانیوں کے ہیرو ہیروئن میں ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ہی محبت جو میرے خوابوں کے نت نئے شہزادے مجھ سے کیا کرتے تھے۔ مگر یہ محبت شاید مجھے راس نہ آئی تھی۔ یہ محبت جو قسمت کی دیوی بن کر مجھ پر مہربان ہوئی تھی اسی محبت نے زہریلا سانپ بن کر مجھے ایسا ڈسا کہ اس کے بعد نہ مجھے موت آئی نہ زندگی کی کوئی لہر میرے وجود میں لہرائی۔

دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ ارمش بڑی ہونے لگی۔ اسی طرح پانچ سال بیت گئے۔ یہ پانچ سال خوشی کے تھے۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ، غم کی راتیں لمبی، خوشی کے دن تو بجلی جیسے۔ خوشیوں بھرے پانچ سال پر لگا کر اڑ گئے اور پتا بھی نہ چلا مگر غموں نے زندگی کی روشن راہوں میں کیسے سیاہ لکیر کھینچی اس کا بھی کچھ پتا نہ چلا۔

☆......☆

میں سلطانہ آپا کو بازو سے تھامے ٹی وی لاؤنج میں لے آئی۔ ان کو صوفے پر بٹھایا۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں انڈیلی اور گلاس ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے بمشکل دو گھونٹ حلق سے نیچے اتارے۔ وہ خاموش تھیں بالکل خاموش۔ میں نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ یک ٹک مجھے تکنے لگیں۔ میں سمجھ نہ پا رہی تھی ان کی نظروں میں ایسا کیا ہے جو وہ کہنا چاہتی ہیں کہہ نہیں پا رہی ہیں۔ میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے آپا۔ بتائیں مجھے؟'' میں نے محبت سے ان کا کندھا تھاما۔ وہ میرے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس وقت تک روتی رہیں جب تک وہ تھک نہ گئیں۔ پھر خود ہی مجھ سے الگ ہو کر دوبارہ سے مجھے تکنے لگیں۔

''بتائیں نا کیا بات ہے...... پلیز؟'' مجھے ان کی آنکھوں سے اس لمحے خوف آنے لگا۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

''آسیہ............'' وہ کہتے ہوئے رکیں۔ اپنے حلق سے تھوک نگلتے ہی وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''آسیہ کو تین ماہ پہلے طلاق ہو گئی تھی۔'' وہ اپنی نند کا بتانے لگیں۔

مجھے سن کر دکھ ہوا اور حیرت بھی کہ انہوں نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی تھی۔

''کیوں؟ اور آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''اس کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی، اس وجہ سے۔'' وہ مزید بتا کر نیچے دیکھنے لگیں۔

''مگر اس میں ان کا کیا قصور۔ یہ سب تو اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اور اس میں۔ اس میں آپ کا کیا قصور آپا...؟''

وہ کچھ لمحے خاموش رہیں۔ اپنی ہتھیلیوں کو تکتی رہیں۔ مجھے ان کی خاموشی ڈرانے لگی تھی۔

''میرا قصور یہ ہے کہ میں اس کی اکلوتی بھابی ہوں۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں اسجد کی بہن ہوں... اور میرا قصور یہ بھی ہے کہ میں...... میں تمہاری نند ہوں۔'' بلآخر وہ بول پڑیں۔ ان کا لہجہ مسلسل گھمبیر تھا۔

''کک...... کیا مطلب آپا...... آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ کھل کر بتائیں۔'' عورت کی چھٹی حس ایسے معاملات میں بہت تیز ہوتی ہے۔ میری بھی چھٹی حس مجھے مسلسل کچھ بہت غلط ہو جانے کا پتا دے رہی تھی۔

''مریم...... مریم مجھے معاف کر دو۔ میں تین ماہ سے مسلسل عذاب میں ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی میرے بھائی کا گھر خراب ہو۔ تم...... تم اس کی محبت ہو۔ اس کی چاہت ہو تم۔ تم مجھے بھی بہت عزیز ہو۔ میں ہرگز ایسا نہیں چاہتی تھی اس لیے چپ چاپ ہر بات برداشت کرتی رہی۔ یہ سوچ کر کہ شاید اکرم اور اس کے گھر والوں کا فیصلہ بدل جائے۔ شاید ان کو مجھ پر یا میرے بچوں پر رحم آ جائے... مگر ایسا کچھ بھی نہ

ہوا...... وہ لوگ شروع میں زبانی کلامی کہتے رہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اکرم نے مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا اور اب...... اب وہ کہتا ہے کہ میں مزید خاموش رہی اور میں نے ان کا مطالبہ نہ مانا تو وہ مجھے بھی طلاق دے دیں گے۔"

"کک...... کیسا...... کیسا مطالبہ......؟" میری ریڑھ کی ہڈی سے خوف کی اٹھتی لہر میرے پورے وجود کو دہلا گئی۔

"وہ چاہتے ہیں کہ......" وہ کہتے کہتے رکیں۔ ان کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ اب کی بار میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کا کندھا نہ تھاما تھا۔ کیا پتا تھا مجھے کہ اب کندھے کی ضرورت مجھے ہے۔ ان کی اگلی بات میرے جسم سے جان ہی نکال لے جائے گی۔ انہوں نے اپنی بات مکمل کی۔ جسے سن کر میں بے جان ضرور ہوئی مگر جان مستقل نہ نکلی تھی۔

"وہ کہتے ہیں کہ اسجد...... اسجد...... تمہیں...... طلاق دے کر آسیہ سے...... آسیہ سے شادی کر لے...... تب وہ مجھے...... رکھیں گے...... ورنہ مجھے اکرم چھوڑ دے گا۔ یہ لفظ بہت مشکل سے ان کی زبان سے ادا ہوئے تھے، مگر ان لفظوں نے میری روح کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ یہ لفظ...... لفظ تھے یا خنجر...... دل کی دھڑکنیں پہلے ہی بے ترتیب تھیں مگر جب انہوں نے لفظوں کی صورت یہ سیسہ میرے کانوں میں انڈیلا تو دل سینہ چیر کے باہر نکلنے کو اچھلنے لگا۔ میری آنکھیں پتھر کی بن گئی تھیں۔ میں یک ٹک بنا پلکیں جھپکے انہیں تکنے لگی۔

"مریم...... دیکھو...... دیکھو خدا کے لیے مجھے معاف کر دو...... خدا کے لیے میری بات سمجھو۔ میں بہت مجبور ہوں مریم...... میں اپنے بھائی کا گھر خراب نہیں کرنا چاہتی مگر میں کیا کروں؟ کیا کروں میں یہ سب...... یہ سب کیسے کہوں گی اس سے......؟ ایک طرف میرا بھائی ہے...... ایک طرف میرے بچے۔" وہ ابھی بھی میرا ہاتھ تھامے رو رہی تھیں۔ میں بغیر کچھ کہے سن رہی تھی۔ یا شاید سن ہو چکی تھی۔

"آپا......" اسجد کی آواز نے میرا سکتہ توڑا۔ میں نے چونکتے ہی ٹی وی لاؤنج کے دروازے میں کھڑے اسجد کو دیکھا۔

آپا میرا ہاتھ چھوڑ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسجد نہ جانے یہاں کتنی دیر سے کھڑے تھے۔ البتہ ان کے چہرے پر پھیلے کرب ناک آثار بتا رہے تھے کہ وہ سب سن چکے ہیں۔ سلطانہ آپا لپک کر ان کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ میں نے زندگی میں دوسری بار اسجد کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ پہلی بار تب جب ارمش کی پیدائش کے وقت مجھے لیبر روم میں لے جایا جا رہا تھا اور دوسری بار اب جب ان کی آپا کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

"آہ...... محبت اور خون کی جنگ۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا پھر کھڑے کھڑے سختی سے آنکھیں موند لیں۔ میرے مالک نے اسجد کو اس میدان جنگ میں لا کھڑا کیا تھا جہاں ایک طرف میں...... ان کی محبت کھڑی تھی جسے وہ معمولی سی تکلیف میں بھی نہ دیکھ سکتے تھے اور ایک طرف ان کی وہ آپا جن کے علاوہ دنیا میں کوئی بھی قریبی خونی رشتہ نہ تھا۔ میں سوچ میں پڑ گئی "اب محبت جیتے گی یا خون کا رشتہ؟"

"چپ ہو جائیں آپا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"مریم، ارمش رو رہی ہے جا کر اس کو دیکھو۔" وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔

"میں نے ارمش کے رونے کی آواز کیوں نہ سنی تھی؟ میرے مولا مجھے ہمت دے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا اور بھاری قدم لیے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

☆......☆

وہ فیصلے کی رات تھی۔ میری زندگی کی وہ اذیت ناک رات جسے میں لفظوں میں بیان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ مختصر یہ کہ میں اس رات سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔ جہاں نیچے...... بہت نیچے گہری کھائی میں آگ کا کنواں دہک رہا تھا۔ اس کنویں سے نکلتی تپش مجھے اپنا جسم جھلساتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں لحہ بہ لحہ جھلس رہی تھی۔ ایک کمزور سی رسی نے مجھے پیروں سے باندھ رکھا تھا۔ میرا منہ کنویں کی جانب تھا۔ البتہ وہ رسی ارمش تھی جس کا دوسرا سرا اسجد کے ہاتھ میں تھا۔ اسجد کا ایک فیصلہ مجھے اس آگ سے نجات دلا سکتا تھا یا پھر وہ سرا چھوڑ دینے پر مجھے اس دہکتے کنویں میں تاعمر جلنے کے لیے گرا سکتا تھا۔

ارمش کو سلانے کے بعد میں مسلسل چت لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ ماضی میں اسجد کے ساتھ بیتا ایک ایک لحہ کسی فلم کی مانند آنکھوں کے گرد لہراتا رہا۔ آج ہماری شادی کو پانچ سال مکمل ہو چکے تھے۔ آج ہم بہت خوش تھے اسی خوشی میں یہ لمحات ایسے گزارے تھے ایسے جیسے پانچ سال پہلے میں جب سہاگن بن کر اس کمرے میں آئی تھی تو منائی تھی۔

مگر آج یہ رات میرے گلے کا پھندا بن گئی تھی۔ زمین کیسے سرکتی ہے پیروں تلے سے یہ آج میں نے جانا تھا۔ پہاڑ کیسے ٹوٹتے ہیں سر پر اس کا اندازہ بھی آج ہی ہوا تھا۔ میں نے کروٹ بدلی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

آج کی رات میرا جی چاہ رہا تھا اسجد کا کوئی بھی فیصلہ

سننے سے پہلے جان سے گزر جاؤں۔ خود کشی کرلوں مگر جب بھی
ارمش کا خیال آجاتا تو ہر ارادہ کمزور پڑ جاتا۔
اگر یہ وصل کی رات ہوتی تو ہم دونوں ہی کے لیے
سکڑتی چلی جاتی مگر آج تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ہجر کی
آگ میں سلگ رہی ہوں اس لیے یہ رات قیامت کی رات
بن گئی۔ کبھی نہ گزرنے والی، سیاہ ناگن ایسی، پھنکارتے ہوئی
خوفناک اور بھیانک رات......
رات کیا کرتی، اس کو تو گزرنا ہی تھا، سو گزر جاتی ہے۔
یونہی کوئی اسے عذاب کی لمبی رات بنا دیتا ہے اور کوئی محبوب کی
کمر جتنی مختصر...... وہ آتی ہے اور سب کچھ دھیرے دھیرے
سمیٹتی گزرتی چلی جاتی ہے اور یہ رات بھی گزر گئی۔
فجر کی اذان قریب کی مسجد سے سنائی دی۔ میں فوراً اٹھ
کھڑی ہوئی۔ اسجد ابھی تک کمرے میں نہ آئے تھے۔ مجھے
انتظار تھا۔ وہ جیسے ہی اندر آئیں گے تو میں دوڑ کر ان کے سینے
سے لگ کر اس سے کہوں گی۔ "اسجد خدا کے لیے مجھے اس
دہکتے آگ کے کنویں میں مت دھکیلنا...... اس ڈور کو تھامے
رکھنا۔ میرا ساتھ مت چھوڑنا۔"
مگر اسجد نہ آئے۔ میں اپنی ہتھیلیوں سے خود ہی آنسو
پونچھتی واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ وضو کیا اور باہر نکل کر جا
نماز بچھاتے ہی اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی۔ اب وہ ہی
ایک سہارا بچا تھا۔ جس سے اُمید تھی ورنہ اسجد سے تو نہ مجھے
یہ امید تھی کہ وہ بہن کو چھوڑ دیں گے اور نہ ہی یہ کہ وہ مجھے چھوڑ
دیں گے۔ ہاں البتہ اللہ وہ واحد ہستی تھی۔ جس سے یہ اُمید
ضرور تھی کہ وہ میرا اس قیامت کی گھڑی میں ضرور ساتھ دے
گا کہ اس لیے میں نجانے کتنی دیر سجدے میں سر رکھے اس سے
اسجد کا ساتھ مانگتی رہی مگر قسمت جب ساتھ چھوڑ جائے تو
دعائیں بھی اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔
دروازے کی آواز پر میں نے سجدے سے سر اٹھایا۔
اسجد تھے۔ میں فوراً جا نماز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اسجد......" میرے حلق کے نجانے کس گوشے سے
یہ دبی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔
انہوں نے بغیر کوئی جواب دیئے ہاتھ کے اشارے
سے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔
"میرے مولا...... میرا ساتھ دے۔ میرے مالک۔"
میں نے نظریں اوپر اٹھا کر چھت کو تکتے ہوئے دل ہی دل میں
رب سے التجا کی۔ تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے روکا
تو وقت بھی تھم گیا۔ آنسوں آنکھوں سے چھاجوں بہنے لگے۔

"میرے قریب مت آنا...... کھڑی رہو وہاں ہی۔
میں...... میں نہیں چاہتا میں تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھوں تو
اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جاؤں۔ میں...... میں اپنے فیصلے
سے اب پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا۔"
فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ فیصلہ سنانے آئے تھے۔ میں جہاں
کھڑی تھی وہاں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پیروں تلے زمین نہ
تھی۔ مجھے اپنا جسم ہوا میں معلق محسوس ہوا۔
"میں سلطانہ آپا کو ان کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔
انہوں نے میرے لیے زندگی میں بہت قربانیاں دی ہیں۔
اب جب میرا وقت آیا ہے تو میں نہیں چاہتا ان کو خالی ہاتھ چھوڑ
دوں۔ میں...... میں نہیں چاہتا میری آپا کا گھر ٹوٹے۔" رسی کا
سرا چھوٹ چکا تھا۔ اسجد مجھ سے دور، بہت دور بادلوں کی
اوٹ میں چھپتے دکھائی دیے۔
"تم ارمش کو لے کر اپنے ابا کے گھر چلی جاؤ۔ میں
تمہیں...... دوبارہ یہاں دیکھ کر اپنا فیصلہ نہیں بدلنا
چاہتا...... کوشش کروں گا کوئی حل نکل آئے مگر نہ نکلا
تو...... مجھے...... مجھے معاف کر دینا۔" وہ بہت روانی میں یہ
سب کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ میرا وجود کٹی پتنگ کی
مانند ہوا میں لہرایا۔ پھر اس دہکتے کنویں میں جا گرا۔
ہاں!! میں اس دن اپنے خوابوں سمیت جل کر راکھ ہو
گئی مگر اس راکھ میں سانسیں ابھی بھی رواں ہیں۔ ان رواں
سانسوں میں اسجد کے ساتھ گزرا ہر لمحہ قید ہو کر رہ گیا ہے، مگر
میں نہ زندہ ہوں نہ موت میرے قریب بھٹکتی ہے۔ بلکہ
دور...... بہت دور کھڑی میرا تماشا تکتی ہے۔
اسجد نے مجھے طلاق نہ دی تھی۔ مگر آسیہ سے شادی کے
بعد مجھ سے کوئی رشتہ بھی رواں نہ رکھا تھا۔ ایک سال بعد اللہ
نے اسجد اور آسیہ کو بیٹے کی نعمت سے بھی نواز دیا تھا۔ معلوم نہیں
وہ خوش تھے۔ مگر وہ ہر ماہ باقاعدگی سے ارمش کا اور میرا خرچ
بھیج دیتے تھے۔ انہوں نے ارمش کا شہر کے سب سے اچھے
اسکول میں داخلہ کروا دیا تھا۔ ہر ہفتے وہ ارمش کو اسکول سے
پک کر لیتے۔ اس کے ساتھ وقت گزارتے اور گھر کے گیٹ پہ
اتار کر چلے جاتے۔
مگر میں! میں اب بھی اپنے ابا کے گھر کے برآمدے
میں بچھی اسی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے ہوئے اکثر یہ سوچنے پر مجبور
ہو جاتی ہوں کہ، اسجد کے ساتھ کل جو بیتا کیا واقعی۔ "وہ ایک
خواب تھا؟"



رحم

مکرمی جناب
سلام مسنون!
ایک اور روداد بھیج رہا ہوں، گو کہ یہ واقعہ ایک عام سا ہے لیکن غور کریں تو یوں محسوس ہوگا کہ یہ معمولی سا واقعہ احکامِ اسلام کی عملی تفسیر ہے۔ میری استدعا ہے کہ اسے ہر ایک کے علم میں لایا جائے۔ مذہب نے جن باتوں کی تعلیم دی ہے اسے ہم کیوں بھول رہے ہیں؟

غلام رضا جعفری
(کراچی)

جواد تو صبح سویرے ہی اپنے کام پر چلا گیا تھا۔ اس وقت بارش بھی ہلکی ہلکی تھی۔ ثمینہ نے پچھلے محلے کی ایک کلینک میں ڈاکٹر سے فواد کا معائنہ کرایا تھا۔ ڈاکٹر نے دوا دینے کے ساتھ ضروری ہدایات بھی گوش گزار کر دی تھیں لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت مزید خراب ہوتی گئی۔ گرج چمک کے ساتھ بارش میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ جواد شام کو دفتر سے گھر لوٹا تو وہ پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی بیٹے کی حالت دیکھی تو گھبرا گیا۔ بیٹے کی ہائے ہائے کی آواز گونج رہی تھی جو ان دونوں کے دل کو چیر رہی تھی۔



"بارش تھم جائے تو اسے ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔" ثمینہ نے جواد سے کہا۔

"بارش کے رکنے کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔" جواد نے آگے بڑھ کر دروازے سے باہر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے ابھی ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔" جواد نے واپس آکر کہا۔ سردی کی وجہ سے اس پر بھی کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اس کے بھی دانت بج رہے تھے۔ اس نے فواد کو اٹھالیا اور بارش سے بچنے کے لیے اپنے اوپر چادر اس طرح اوڑھ لی کہ فواد چادر کے اندر بالکل چھپ گیا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ گلی میں پانی بھرا ہوا تھا۔ برساتی نالے کے گندے پانی نے بدبو پھیلا رکھی تھی۔ جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر لگ گئے تھے جن کی وجہ سے اسے چلنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ بیٹے کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر وہ جلد از جلد کلینک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کچرے کے ڈھیر اور راستے کے گڑھے کو پھلانگتے ہوئے وہ کئی بار گرتے گرتے بچا تھا۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹا پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چادر ہٹا کر اپنے نیم مردہ لخت جگر کو دیکھ لیتا۔

"یا اللہ! میرے بچے کو ٹھیک کردے۔" ہر بار اس کے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوتے۔

بادلوں کی گرج ہوتی تو بارش میں بھی تیزی آجاتی۔ بجلی چمکتی تو ایک لمحے کے لیے اسے راستہ دکھائی دیتا۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو جواد بھائی اس وقت؟" راستے میں اس کی ملاقات جلال سے ہوگئی۔

"فواد بخار سے تپ رہا ہے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔" جواد نے بتایا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب کی کلینک تو بند ہے۔"

"کیا؟" جلال کی بات سن کر وہ چونک پڑا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہوگئی۔ اس کے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔

"یہ آ...... آپ کو کیسے پتا؟" جواد نے مری مری سی آواز میں پوچھا۔

"میں ابھی اسی طرف سے آرہا ہوں۔ کام کے دوران بلاک میرے پیر پر گر گیا تھا۔ درد کا انجکشن لگوانے کے لیے گیا تھا۔ کلینک بند دیکھ کر واپس لوٹ آیا ہوں۔"

"کب کھلے گا کلینک؟" جواد نے پوچھا۔

"مجھے تو پتا نہیں لیکن اس کا کمپاؤڈر بتا دے گا۔" جلال نے کہا۔

"کلینک بند ہے تو کمپاؤڈر کہاں آیا ہوگا؟" جواد نے کہا۔

"پچھلی گلی میں اس کا گھر ہے۔ کامران نام ہے اس کا، اچھا بھائی میں چلتا ہوں، شکر ہے بارش کچھ تھم گئی ہے، کہیں پھر تیز نہ ہوجائے۔" جلال نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اب جواد کا رخ پچھلی گلی کی طرف مڑ گیا۔ وہ کامران کے گھر کی تلاش میں چل پڑا۔

گلی میں داخل ہوتے ہی ایک صاحب سے اس کا سامنا ہوا۔

"بھائی کامران کا گھر کون سا ہے؟" جواد نے پوچھا مگر وہ شخص نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ وہ جواد کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی اس کی آواز کو نہ سن سکا۔ جواد حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ جواد بھی چند لمحوں بعد آگے بڑھ گیا۔ ایک جگہ وہ رک گیا اور سوچنے لگا کہ کس گھر کے دروازے پر دستک دے۔

تبھی سامنے والے گھر سے ایک نوجوان برآمد ہوا۔ وہ اسی طرف آرہا تھا۔

"بھائی بات سنو۔" جواد نے اسے روکا۔

"جی...... بولیں۔" نوجوان نے اس کے پاس آکر کہا۔

"کامران کا گھر کون سا ہے؟"

"میں کامران ہوں، کیا کام ہے آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"کلینک کس وقت کھولیں گے آپ؟ میرے بیٹے کی حالت بہت خراب ہے۔ بخار سے تپ رہا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب تو حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ وہ تو کل صبح ہی آئیں گے۔"

"اوہ......!" کامران کا جواب سن کر وہ اور بھی زیادہ افسردہ ہوگیا۔

"مگر میرا بیٹا۔" جواد اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کی آواز رندھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار بہہ نکلی۔

وہ بچے کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کا مشورہ دے کر آگے بڑھ گیا اور جواد آنکھوں میں آنسو لیے پریشان حال اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

جواد بیٹے کو لیے گھر پہنچا۔ ثمینہ بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ جواد کے پاس آپہنچی۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟ فواد ٹھیک تو ہوجائے گا نا؟" اس

نے ایک ہی سانس میں پوچھ لیا۔ جواد نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گیا اور فواد کو چار پائی پر لٹا دیا۔

"کیا ہوا......تم بولتے کیوں نہیں۔ ڈاکٹر نے کیا بتایا؟" ثمینہ نے پوچھا پھر اس نے چادر ہٹا کر دیکھا۔ فواد کسی بے جان شے کی طرح پڑا تھا۔ ثمینہ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور پھر دروازے کے پٹ پر رکھی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھ لی اور باہر کی طرف چل پڑی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں خود دیکھتی ہوں......کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور ہو گا۔"

"کیا ہوا خیریت تو ہے؟ رونے کی آواز آ رہی تھی۔" پڑوسن نے آکر پوچھا۔ وہ گھبرائی ہوئی آئی تھی۔ اس کی سانس اس طرح پھولی ہوئی تھی کہ جیسے میلوں دوڑ لگائی ہو۔

"میرا بچہ، میرا فواد ٹھیک نہیں ہو رہا۔" ثمینہ نے روتے ہوئے پڑوسن کو بتایا۔

"ڈاکٹر حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ کل واپسی ہو گی۔" جواد نے دہل دیا پھر۔ اس نے آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو ہاتھ سے صاف کیا۔

"نالے کے اس پار والی آبادی میں بھی ایک کلینک ہے۔ وہ ڈاکٹر تو رات دیر تک بیٹھتا ہے اور مریض کو دیکھنے گھر بھی آ جائے گا کیونکہ اس کے پاس گاڑی ہے۔" پڑوسن کی بات سن کر جواد باہر کی طرف بڑھا۔

"میں ابھی اس ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔" اس نے جاتے جاتے اتنا ہی کہا تھا۔

بارش تو تھم گئی تھی لیکن جگہ جگہ پانی کھڑا تھا اور کچرے کے ڈھیر جا بجا جمع تھے جو نالیوں سے پانی کے ساتھ ابل آئے تھے۔ نالے پر بنی ہوئی چھوٹی سی پلیا کو پار کرتے ہوئے جواد کے قدم رک گئے۔ وہ پلیا پر ہی کھڑے کھڑے نالے کے اطراف دیکھنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ کتے کے معصوم پلے کی کوں کوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف نظریں گھمانے لگا۔

"یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟ تمہارا بیٹا بخار میں تپ رہا ہے۔" اچانک ہی اس کے دل میں خیال آیا۔ وہ آگے بڑھا اور پلیا کراس کر لی مگر کتے کے پلے کی کوں کوں کی آواز بدستور اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

"کتے کا پلہ بھی تو جاندار ہے اگر تمہارا اپنا بچہ ہوتا تو پھر بھی چھوڑ جاتے؟" یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی۔

"مگر......میرا بیٹا تو بے سدھ پڑا ہے۔" اس کے دل نے کہا۔

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہے، نہ کہ تمہارے۔ بیماری بھی اللہ دیتا ہے اور شفا بھی۔" اس کے ضمیر نے کہا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ الٹے قدموں پلٹ آیا۔ وہ ایک بار پھر پلیا پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر نظریں گھمانے لگا۔ ایک جگہ کچرے کے ڈھیر میں کتے کا پلہ پھنسا ہوا۔ کوں کوں کرتا نکلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نکل نہیں پا رہا تھا۔ نالے میں کچرا اوپر تک بھر گیا تھا۔ اس نے کوشش کر کے بمشکل کتے کے پلے کو اٹھا لیا...... اسے نالے کے اندر اترنا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے بھی گندے ہو گئے تھے۔

جواد اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ کتے کے پلے کو اس نے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ گلی کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس کے سلیپر سے چپڑ چپڑ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی سے کسی کے گزرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے دھیان میں تھا، اس نے گزرنے والے پر کوئی توجہ بھی نہ دی۔

میر غلام حسین ضاحک اردو شاعروں کے اس عظیم خاندان کے جدِ امجد تھے جس میں شعر و سخن کا قدرتی ملکہ سات پشتوں تک قائم رہا اور جس نے ہماری زبان کو دو بے مثال شاعر دیئے یعنی اردو کے سب سے بڑے مثنوی نگار میر ضاحک کے فرزند میر حسن اور سب سے بڑے رزمی شاعر، میر حسن کے پوتے میر انیس، اس اضافی اہمیت کے علاوہ ذاتی حیثیت سے بھی میر ضاحک ایک عجیب اور ناقابلِ فراموش شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں اور مرزا سودا میں جو ہجو بازی ہوتی رہی تھی، اس کا ذکر تقریباً ہر تذکرہ نویس نے کیا ہے۔" (اسلافِ انیس) میر ضاحک دہلوی کا دیوان تقریباً دو سو برس تک ناپید رہا۔ 1961ھ میں یہ دیوان دریافت ہوا۔

مرسلہ: نسرین قزلباش، کراچی

''بچپن یاد آگیا ہے کیا؟ کتے کے پلے اٹھائے پھر رہے ہو۔'' راہ گیر نے از راہ مذاق کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے اِدھر اُدھر سے کچھ گیلے کچھ سوکھے کاغذ، گتے، پلاسٹک کی تھیلیاں، لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے جمع کر لیے تھے۔ وہ نالے سے کچھ فاصلے پر ایک دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور سب کچھ اپنے سامنے رکھ کر ڈھیری بنالی۔

''ماچس۔'' اس نے خود کلامی کی اور اپنی جیبوں کو ٹٹولنے لگا۔

''سگریٹ......موبائل......!'' اس نے حیرت سے کہا۔

اس کی جیب سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ جلدی جلدی میں وہ سب کچھ گھر بھول آیا تھا۔ تبھی پاس سے گزرتے ہوئے شخص سے اس نے ماچس مانگی۔

''چچ......چچ......چچ......'' اس موسم میں بھی موالیوں کو نشہ کی سوجھی ہوئی ہے۔'' دو راہ گیروں میں سے ایک نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''نشہ بھی ان کی مجبوری بن جاتی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔ اس نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں لیکن اس نے ان کی پروانہ کی۔

''بھائی ماچس ہے آپ کے پاس۔'' اس نے دوبارہ ان راہ گیروں کو مخاطب کیا لیکن وہ اتنی دیر میں کچھ دور تک پہنچ چکے تھے۔

''اوہ......ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اب کیا کروں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''تم یہاں رکو، میں ابھی ماچس لے کر آتا ہوں۔'' اس نے کتے کے پلے کو وہیں رکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر ایک طرف چل پڑا وہ ایک گھر کے پاس رک گیا۔ اندر سے مردوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے پر انگلی مار کر دستک دی۔

''کون ہے بھئی اس وقت ایسے موسم میں؟'' اندر سے تیز لہجے میں کہا گیا۔

''بھائی زحمت کی معذرت، مجھے ماچس چاہیے ابھی واپس کردوں گا۔'' اس نے التجا کی کہا۔ چند ہی لمحوں بعد کھڑکی کھلی اور کسی نے ہاتھ باہر نکال کر اس کی طرف ماچس بڑھائی۔

''بہت بہت شکریہ بھائی۔'' اس نے ماچس پکڑتے ہوئے کہا۔

''کون ہے؟'' اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

''ہوگا کوئی نشئی، نشے سے مجبور۔'' مرد نے جواب دیا۔

وہ ماچس لے کر واپس پلٹ آیا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لوگ بھی کیا کیا اندازے لگالیتے ہیں۔'' اس نے خود کلامی کی۔

آگ جلانے میں اسے اچھی خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کاغذ، پلاسٹک کی تھیلیاں، لکڑی کے ٹکڑے سب کچھ ہی اس قدر گیلے ہو چکے تھے کہ آگ پکڑنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ دھوئیں سے اس کی آنکھوں میں بھی شدید جلن ہونے لگی تھی۔ جوں جوں وہ نالے میں بھیگے ہوئے کتے کے پلے کو سردی سے کانپتے اور کوں کوں کرتے ہوئے دیکھتا تو آگ جلانے کی کوشش میں تیزی کرتا اور ماچس کی تیلیاں ضائع ہوتی جارہی تھیں۔

''میں کوشش کر رہا ہوں۔ آگے تمہارا نصیب۔'' اس نے کتے کے پلے سے مخاطب ہو کر کہا اور اٹھتے ہوئے دھوئیں میں پھونکنے لگا لیکن آنکھوں میں ہونے والی جلن نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔

موٹر سائیکل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھوں کو ملتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا اور جمع کیے ہوئے ڈھیر میں سے ایک شاپر اٹھا کر اس کی طرف دوڑا۔ اتنی دیر میں آنے والا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل کھڑی کر کے نجانے کس گھر میں گھس گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا کہ شاید کسی گھر سے کوئی نکل آئے تو اس سے اپنا مدعا بیان کرے۔ کسی کے آنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آرہی تھی۔ سرد ہوا سے اس پر کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ گو کہ بارش رک گئی تھی لیکن بادل چھائے ہوئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد گرج رہے تھے۔ کتے کے پلے کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ بار بار اس کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ بائیک والے کی آمد سے نااُمید ہو کر اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور موٹر بائیک کے پیٹرول کا پائپ کھولنے لگا تو اس کے دل میں خیال آیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ بغیر اجازت تو چوری کہلاتی ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور بائیک کے مالک کا انتظار کرنے لگا۔

''اس کے آنے تک کتے کا پلہ مر گیا تو؟'' جیسے کسی نے اس سے سوال کردیا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے پلٹ کر

کوہِ نور
ہیئر آئلز



کوہِ نور آملہ ہیئر آئل

کوہِ نور چنبیلی ہیئر آئل

... زندگی سے بھرپور صحت مند بال

KAHO/03/2K18

کتے کے پلے کی طرف دیکھا اور غور سے اس کی آواز سننے کی کوشش کی مگر سناٹے کے عالم میں بھی اس کی سماعت کچھ سننے سے محروم رہی۔ اس نے ایک انجانے جوش کے تحت لمحہ بھر میں بائیک کے پیٹرول کا پائپ کھولا اور رومال بھگو کر پائپ ویسے ہی لگا دیا۔

وہ تیز تیز چلتا ہوا آیا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ پلے کی کوں کوں کی آواز بند ہو گئی تھی اور اس کی سانس بمشکل چل رہی تھی یعنی وہ قریب المرگ ہو چکا تھا۔

''یا اللہ خیر کر۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ اس نے رومال کو کاغذ وغیرہ کے بنائے گئے ڈھیر کے ساتھ جما کر رکھا اور تیلی جلا کر آگ لگا دی۔

اس نے پلے کو ہاتھوں میں اٹھا لیا اور آگ کے قریب کر کے کافی دیر تک اس کی سکائی کرتا رہا۔

''یا اللہ میری محنت رائیگاں نہ جانے دینا۔'' اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی۔ اگرچہ بارش ابھی تک رکی ہوئی تھی لیکن بادل گرج رہے تھے۔ بجلی بھی چمک رہی تھی۔ آہستہ آہستہ کتے کے پلے کو ہوش آنے لگا اور پھر سے اس کی کوں کوں کی آواز نکلنے لگی۔

''شکریہ الحمدللہ۔'' اس نے کہا۔ تھوڑی دیر میں کتے کا پلہ اس قدر ہوش میں آ گیا کہ اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش میں زور لگانے لگا۔ جواد کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ ہلکی آواز میں ہنسنے لگا۔ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''ہوش آیا تو اکڑنے لگا ہے بدمعاش۔'' اس نے پلے سے کہا اور ہنسنے لگا۔

''اوہ......فواد......'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اسے اپنے بیٹے کا خیال آیا اور وہ مدہوشی کی حالت میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کتے کے پلے کو محفوظ جگہ پر رکھا اور ایک طرف تقریباً دوڑ پڑا۔ وہ تو گھر سے ڈاکٹر کو لینے نکلا تھا لیکن اس کتے کے پلے کو بچانے کی جدوجہد میں یہ بھول گیا تھا کہ اس کا بیٹا فواد بخار سے نیم جاں ہے۔ اسے بھی کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ گلیوں میں کھڑے ہوئے بارش کے پانی اور کچرے کے ڈھیر کو پھلانگتا ہوا کلینک تک پہنچا۔

''اوہ......'' کلینک کو بند دیکھ کر اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''یا اللہ! میرے فواد پر رحم کر۔ اسے صحت دے دے۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ پہلے ہی کچھ کم پریشان نہ تھا کہ کلینک کو بند دیکھ کر اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ وہ کلینک کی دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیمار بیٹے کا چہرہ آ گیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانس کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بھائی یہ کلینک نہیں کھلا؟''

''آپ بہت لیٹ ہو گئے ہیں، کلینک دس بجے بند ہو جاتا ہے اور اب گیارہ بج رہے ہیں۔'' راہ گیر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا اور بتا کر چلا گیا۔

''میں گھر سے سوا آٹھ بجے کے بعد نکلا تھا۔'' اس نے سوچا۔ وہ بوجھل بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

''میرا بچہ نہ جانے کس حال میں ہو گا؟ اب کیا ہو سکتا ہے؟ غلطی تو میری ہی ہے۔ اس کی حالت تو بگڑ گئی ہو گی۔ میں خود ہی اس کا ذمے دار ہوں۔'' وہ سارے راستے ان ہی سوچوں میں غرق رہا۔ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ وہ صحن میں ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''یہ لیں پانی۔'' ثمینہ نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ چونک پڑا۔ وہ حیرت سے ثمینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مطمئن اور خوش تھی۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ ثمینہ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ نہ دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ نہ ڈاکٹر کے آنے کا پوچھا اور نہ ہی اس نے فواد کی طبیعت کے بگڑنے کے بارے میں بتایا بلکہ وہ تو خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''آپ نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہ گئے تھے؟'' ثمینہ نے پوچھا۔

''فواد۔'' جواب میں اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا تھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔'' ثمینہ نے بتایا۔

''مگر وہ...... بخار سے نڈھال تھا۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ کے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد اس کا بخار اس طرح غائب ہو گیا کہ جیسے ہوا ہی نہ تھا۔ آپ پریشان نہ ہوں اب وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''شکر الحمدللہ۔'' ثمینہ کی بات سن کر اس نے خوشی سے کہا اور اپنے بیٹے کو دیکھنے کمرے کی طرف بڑھا اسے رسول کا فرمان یاد آ گیا تھا۔ ''تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''





غلط فہمی

محترم مدیر

السلام علیکم!

خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جبران کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ اسی کا بویا بیج ہے۔ انسان یہی سمجھتا ہے کہ کمزور کے ساتھ جو چاہو کرلو، کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن یہی اس کی بھول ہے۔ میزانِ عدل کبھی ڈگمگاتا نہیں ہے۔ ظالم کی دراز رسی ایک نہ ایک دن کھنچتی ضرور ہے۔ نمرہ کی یہ داستان ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

خلیل جبار

(کراچی)

رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ میں اور آصف ابھی ایک تقریب میں شرکت کر کے لوٹے تھے۔ میں نے چابی لگا کر لاک کھولا، آصف میرے پیچھے تھے۔ میں فلیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی کہ پیچھے پیچھے آصف بھی داخل ہوئے۔ وہ ابھی دروازہ بند ہی کر رہے تھے کہ انہیں کسی نے زور سے دھکا دیا۔ وہ اگر مجھے تھام نہ لیتے تو ان کا گرنا ...... میں گر جاتا یقینی تھا جب کہ میں نے پردے کو پکڑ کر خود کو سنبھالا تھا۔ دھکا دینے والے پر نظر ڈالی۔ اس کے ہاتھوں میں پستول تھا۔ اس نے دھمکی دی۔ ”خبردار، کوئی بھی حرکت نہ کرے ورنہ میں گولی چلانے میں تاخیر نہیں کرتا۔“

پستول والے کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ خود بھی خوفزدہ ہے جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو اور وہ تعاقب کرنے والے سے بچنے کے لیے ہمارے ہاں گھس آیا ہے۔

ہم دونوں ہی بری طرح سے خوفزدہ ہو گئے تھے مگر جیسے

ہی وہ روشنی میں آیا، اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس چہرے کو میں کبھی بھول نہیں سکی تھی، وہ کوئی اور نہیں جبران تھا، وہی جبران جسے میں کئی برسوں سے بھولنے کی کوشش کر رہی تھی پھر بھی بھول نہیں پائی تھی۔ میں خود کو اس کا قاتل سمجھ رہی تھی جبکہ وہ زندہ تھا مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ چھ منزلہ عمارت سے نیچے گرا تھا اور گرتے ہی دم توڑ گیا تھا جو انسان ایک بار مر جائے وہ کس طرح سے زندہ ہو سکتا ہے؟ یہ کوئی اور شخص ہے۔ یقیناً اس کی شکل جبران سے ملتی ہے کیونکہ یہ انداز و اطوار سے چور اچکا لگ رہا ہے۔ جبران اور اس کا کیا مقابلہ۔ یہ سوچ کر میرے دل کو ایک طرح سے اطمینان سا ہو گیا تھا مگر دوسرے لمحے پھر سے مجھے جھٹکا لگا۔ جبران کے بائیں کان کے پاس ایک ہلکا سا نشان تھا، یہ بچپن کی ایک چوٹ کا نشان تھا، اس کے بھی اس جگہ ویسا ہی نشان تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ دو افراد کی شکلیں مل سکتی ہیں لیکن یہ کس طرح ممکن تھا کہ دونوں افراد کے ایک ہی مقام پر ایک جیسا چوٹ کا نشان رہ جائے۔

میں خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ کھلی حقیقت تھی۔ جبران کا ڈپلیکیٹ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر مجھے شک ہوا کہ وہ جبران ہی ہے اور اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے اس سے قبل مجھے کہیں دیکھ لیا ہو اور میرا پیچھا کرتے ہوئے فلیٹ تک آیا ہے اگر یہ جبران ہی ہے تو ضرور یہ اپنا انتقام لینے آیا ہے۔ میں جبران کو قتل نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ محض ایک حادثہ تھا۔ وہ مجھے برباد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے پکڑنے کے چکر میں آگے بڑھا تھا کہ میں نے اسے پیچھے سے دھکا دے دیا تھا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زیر تعمیر پلازہ سے نیچے جا گرا تھا۔

مگر اس وقت وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔

"خوب صورت، بہت خوب صورت ہے تمہاری بیوی۔" وہ زور سے ہنسا۔ "لگتا ہے کسی خاص تقریب سے لوٹے ہو، تقریب میں ٹھونس ٹھونس کر کھانا کھایا ہو گا، ہے نا مگر...... میرا پیٹ خالی ہے اور مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کرو، ورنہ تم جانتے ہی ہو میرے پاس پستول ہے اس لیے میں جیسا تم سے کہوں ویسا ہی کرتے جاؤ چلو باورچی خانے کی طرف۔" وہ کرخت لہجے میں بولا۔

اس کی دھمکی پر ہم دونوں سہم گئے۔ اس کے عزائم بتا رہے تھے، وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ کچن میں اتنا کھانا موجود تھا کہ دو آدمی آسانی سے کھا سکیں۔ میں نے بے بسی سے آصف کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، میں جیسے ہی باورچی خانے کی طرف بڑھی وہ زور سے ہنسا۔ "تم دونوں بہت ہی سمجھدار ہو۔ میں تمہیں کھانے کی تکلیف نہ دیتا مگر کم بخت بھوک...... بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

میں نے پلٹ کر غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کچن میں داخل ہو گئی۔

"تمہاری بیوی کو غصہ بھی آتا ہے۔ یہ اندازہ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر ہو رہا ہے۔ لگتا ہے تم دونوں کو میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا ہے، اب آ گیا ہوں اس لیے برداشت کرو۔" وہ پھر زور سے ہنسا۔

وہی بات کرنے اور سننے کا انداز، اس میں کچھ بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تبدیلی آ بھی کیسے سکتی تھی وہ بڑے باپ کا بگڑا بیٹا تھا جس نے اپنی زندگی کا مقصد عیش و عشرت میں گزارنا سیکھا تھا جس چیز کی طلب ہوئی اسے جائز یا ناجائز طریقے سے حاصل کر لیا۔

وہ ہمارے پیچھے پیچھے کچن میں آ گیا۔

"تم دونوں کو کہانی سننے کا شوق ہے؟"

"کہانی!" آصف نے حیرانی سے جبران کے چہرے کی طرف دیکھا۔

ہم اس سے خوف کھائے ہوئے تھے اور وہ ہمیں کہانی سنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"کہانی سننے کا شوق ہے تو سمجھو کہ تم باذوق ہو اور اگر کہانی نہیں سننا چاہتے یا شوق نہیں ہے تو تم سے بڑا بدذوق کوئی نہیں ہے۔" جبران یہ کہتے ہوئے زور سے ہنسا پھر ہم دونوں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔

"کیوں تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے جو اس قدر حیران و پریشان صورت بنائے کھڑے ہو، ہنسو، زور سے ہنسو کیونکہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔"

اس کے اصرار پر ہمیں زبردستی مسکرانا پڑ گیا تھا۔ ہمیں مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔ "مجھے ہنستے مسکراتے چہرے بہت اچھے لگتے ہیں تمہیں بھی لگتے ہیں نا؟"

"ہاں لگتے ہیں مگر پستول کے سامنے کون کمبخت ایسا ہے جو ہنسے گا۔" آصف نے ہمت کر کے کہا۔

"بالکل درست کہا تم نے اگر میں چاہوں تو اس پستول کے

زور پر روتے ہوئے کو بھی ہنسا سکتا ہوں۔ زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے اس لیے سامنے والے کو ہنسنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ پستول بالکل بھی اچھا نہیں لگتا لیکن مجبور ہوں، اسے دکھانے سے ہر آدمی میری بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرے پاس پستول ہے اس لیے تمہاری بیوی میرے لیے کھانا گرم کر کے لے آئی۔ ورنہ تقریب سے تھکی ماندی عورت کسی صورت میں کسی غیر مرد کو کھانا نہیں دیتی۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔“

جبران ایک بار پھر زور سے ہنسا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، تمہارے لیے کھانا بھی گرم ہو گیا ہے اب یہ بتاؤ کہاں بیٹھ کر کھانا پسند کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”کھانا ہاں میں اسی جگہ بیٹھ کر کھانا پسند کروں گا۔ تمہارا کیا بھروسا، کمرے میں بٹھا کر دروازہ بند کر کے پولیس کو بلا لو۔“ جبران نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ہم واقعی اسے کمرے میں بند کر کے پولیس کو بلا لیں گے یہ بات غلط بھی نہیں تھی ایسے لوگوں کو سبق سکھانے کی غرض سے پولیس کو بھی بلانا پڑ جاتا ہے۔

”کھانا کھا لوں پھر تمہیں ایک زبردست کہانی سناؤں گا، دو پریمی جوڑوں کی کہانی۔“ جبران نے ایک نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ میری ہنستی بستی زندگی کو اجاڑ دینا چاہتا تھا اس لیے وہ میری تلاش میں تھا اور اب اس نے مجھے تلاش کر لینے پر یہ ڈراما رچایا تھا۔ لٹیرا بن کر میرے گھر میں آ گیا تھا اور کہانی سنانے کے بہانے وہی کچھ بیان کرے گا جو ایک گزری ہوئی کہانی تھی۔ یہ کہانی سن کر میرا شوہر میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس کا مجھے اندازہ ہے۔ ابھی تک میرے شوہر کو مجھ پر اور میری پاکیزگی پر بڑا مان تھا۔ اسے مجھ پر اتنا اعتماد تھا کہ مجھے خود بھی اپنے آپ پر نہ ہوگا۔ ہم دونوں کی یہ شادی پسند کی تھی۔ میری آصف سے ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ یہ تقریب آصف کی بہن شائلہ کی سالگرہ کی تھی۔ شائلہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ میں اس کی سالگرہ میں جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ جبران والا واقعہ گزرے ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ جبران کا قاتل تصور کر کے ہر وقت خوف زدہ رہتی تھی۔ ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ کبھی بھی پولیس آ کر مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی اور پولیس قتل کے ملزموں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ اس کا تصور کر کے ہی میں کانپ جاتی تھی۔ میرے رشتے دار اور گھر والے بھی میری اس حالت پر سخت تشویش میں مبتلا تھے کہ ایک ہنسنے اور بولنے والی لڑکی کے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ اسے چپ لگ گئی ہے۔ ہر وقت خوف کی حالت میں رہتی ہے۔

ابو اور امی نے مجھے مختلف ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کسی کو بھی میرا مرض سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اچانک کیا ہو گیا ہے۔ مجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے جو میں ہنسنا بھول گئی ہوں۔ نفسیات کے ڈاکٹرز کو دکھانے پر انہوں نے یہی بتایا کہ مجھے کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے جس کے سبب میری یہ کیفیت ہے۔ مجھے ذہنی سکون پہنچانے کو نیند کی گولیاں دی جانے لگیں جس سے میں رات میں سکون کی نیند سو جاتی تھی مگر بیدار ہونے پر وہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ میں ایک انسان کی قاتل تھی اور قاتل کس طرح سے سکون سے رہ سکتا ہے۔ میری بے سکونی کی ابتدا اس دن ہوئی جب میں ... جبران کا کہا مان کر اس زیر تعمیر عمارت میں پہنچی تھی۔

☆......☆

جبران کو میں نہیں جانتی تھی۔ اس دن میں گھر میں اکیلی بیٹھی بور ہو رہی تھی کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے موبائل کی اسکرین پر نمبر دیکھا وہ نمبر اجنبی تھا۔ میں اجنبی نمبر سے آئی کال اٹینڈ نہیں کرتی۔ میں نے جیسے ہی کال کو بند کرنے کا بٹن دبانا چاہا غلطی سے کال اوکے ہو گئی۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ہیلو کون؟“ میں نے پوچھا۔

”میں وہی ہوں جو آپ سے بات کر رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں کا کوئی نام بھی ہوگا۔“

”اس ناچیز کا مختصر سا نام ہے۔ میرا مطلب ہے، مجھ خادم کو جبران کہتے ہیں۔“

”اچھا خادم ہیں، کون سے مزار پر تشریف رکھتے ہیں۔“ میں نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

”مزار!“ وہ چونکا۔

”خادم مزار پر ہی بیٹھتے ہیں اور میں نے تمہارے مزار کا پوچھ لیا تو اتنا پریشان کیوں ہو گئے۔“

”میں پریشان اس لیے ہو رہا ہوں کہ میرا کسی مزار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور آپ مزار کا پوچھ رہی ہیں۔“

”آپ نے پھر خادم کیوں کہا۔“

”وہ میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔“

”اچھا خیر یہ بتاؤ تم نے مجھے کیوں فون کیا ہے۔“

"میں فارغ تھا، اس لیے سوچا کہ تم سے بات کرلی جائے۔"

"میں کیا تمہاری پھوپو لگتی ہوں، جو بات کرنے کو مجھے فون کرلیا۔"

"پھوپو...... لیکن تمہاری آواز سے لگتا نہیں ہے کہ تم کسی کی پھوپو ہو، آواز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نوخیز کلی ہو کسی باغ کی۔"

"اپنی غلط فہمی دور کرلو کہ میں ایک لڑکی ہوں۔"

"اچھا بھئی میں نے اپنی غلط فہمی دور کرلی۔" جبران نے معذرت کرلی۔

"اور آئندہ مجھے پھر کبھی فون مت کرنا۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں نہیں کروں؟"

"تم میرے کیا لگتے ہو جو فون کروگے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ارے بھئی تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں، تم سے تعلق بنانا چاہتا ہوں اس لیے فون کیا ہے۔"

"یو شٹ اپ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کال بند کردی۔ موبائل پر دوبارہ بیل بج اٹھی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ وہ نمبر جبران کا ہی تھا۔ میں نے موبائل دور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر موبائل بج کر بند ہوگیا۔ دوبارہ پھر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

میرا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا۔ پردے کی پابندی بھی سخت تھی۔ گھر میں آئے مرد رشتے دار بھی گھر کی خواتین کی ایک جھلک نہیں دیکھ پاتے تھے۔

یہ گھر سے ملنے والی تعلیم تھی کہ میں کسی غیر مرد کے سامنے آجانے پر اپنی نظریں نیچے جھکا لیتی تھی۔ گھر سے باہر نکلنے سے پہلے میں اچھی طرح اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتی تھی۔ میری سہیلیاں بھی مجھے اکثر ٹوک دیتی تھیں۔

"کلاس میں کون لڑکا یا غیر مرد آرہا ہے جو تم چہرے پر نقاب پہنے رہتی ہو۔" علینا نے طنز کیا۔

"بس مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ میرا تمہیں بھی مشورہ ہے کہ اپنے چہرے کو ڈھانپ کر آیا کرو۔"

"کیوں ہمیں نظر لگ جائے گی۔" علینا بولی۔

"نظر بڑی خطرناک ہوتی ہے خراب نظر پتھر کو بھی ریزہ ریزہ کردیتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کمال ہے ہم ایک عرصے سے اسکول اور کالج آرہے ہیں کسی ایسی نظر نے ہمیں نہیں دیکھا کہ ہم ریزہ، ریزہ ہو جائیں۔" علینا زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"علینا میری باتوں کو مذاق میں مت لیا کرو، یہ حقیقت ہے۔"

"اچھا بھئی حقیقت ہوگی تم کیوں پریشان ہورہی ہو۔" کشمالہ نے کہا۔ "میں علینا کو سمجھا دیتی ہوں۔"

"کیوں میں بے وقوف ہوں جو تم مجھے سمجھاؤ گی؟" علینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ نا سمجھی کی ہی بات ہے کہ تم مختلف لڑکوں سے چکر چلاتی رہتی ہو، اس سے کسی دن تمہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"نمرہ مجھے کیا نقصان پہنچے گا، میں بس ایسے ہی انجوائے کرنے کو لڑکوں سے چکر چلاتی ہوں۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"انجوائے کرنا اچھی بات نہیں ہے، ارے بھئی سب تمہاری طرح کی لڑکیاں نہیں ہوتی۔ ایمان سے مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جب میں بازار سے گزرتی ہوں اور لوگ مجھے پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ لڑکے مجھ پر جان دینے کے دعوے کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے برتری کا احساس ہوتا ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں جبھی لوگ مجھے دیکھتے ہیں۔"

"عورت کی خوب صورتی اس کے شوہر کے لیے ہوتی ہے، غیر مردوں کو خوش کرنے والی عورتیں کون ہوتی ہیں یہ تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔" مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی غصہ آگیا۔

"نمرہ تم سے بات کرتے ہوئے کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ تم سے نہیں بلکہ کسی مولوی صاحب سے بات کررہے ہیں۔" علینا جل بھنتے لہجے میں بولی۔

"کیا تم اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتیں۔ کیسے کیسے واقعات ہوتے ہیں۔"

"اخبارات میں مختلف نوعیت کے حادثات کا بھی لکھا ہوتا ہے کیا ہم گھر سے نکلنا چھوڑ دیں، گھر میں دبک کر بیٹھے رہیں کہ نہیں باہر نہیں جانا، ہمارے ساتھ حادثہ پیش آسکتا ہے۔" علینا نے کہا۔

"یہ ضروری نہیں ہے کہ جو دوسرے کے ساتھ ہو وہ ہمارے ساتھ بھی ہوجائے۔" کشمالہ نے کہا۔

"عقل ہوتے ہوئے بھی تم عقل سے بالکل کوری ہو، اگر کسی کے ساتھ کوئی واقعہ ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم گھر میں دبک کر بیٹھ جائیں بلکہ ہمیں وہ غلطی نہیں

کرنی چاہیے جو دوسرے نے کی تھی۔

''شاباش نمرہ جو بات ہم کہنا چاہ رہے تھے۔ وہ تم نے کہہ دی۔'' علینا نے کہا۔

''تم مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھی؟'' میں چونکی۔

''مختلف لڑکیوں کے ساتھ جو واقعات ہو جاتے ہیں وہ ہمارے لیے نصیحت کا سامان ہوتے ہیں ہم لڑکوں سے دوستی کرتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہیں اور بہت ہوشیاری سے چلتے ہیں تاکہ ہماری بچت رہے اور ہمارے ساتھ وہ نہ ہو جو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔'' علینا نے کہا۔

''کیا لڑکوں سے دوستی کے بغیر ہم زندگی نہیں گزار سکتے۔''

''کیسے گزرے گی بھئی، لڑکوں سے موبائل پر جس طرح کی پیار بھری گفتگو ہوتی ہے کسی لڑکی سے بات کر کے وہ لطف آ ہی نہیں سکتا۔'' کشمالہ نے کہا۔

''نہ جانے تم کیسی لڑکی ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اور یہی بات ہم تمہارے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔'' زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے علینا بولی۔

میں نے عافیت اسی میں جانی کہ فی الحال خاموش ہی رہا جائے وقت اچھے اچھوں کو سبق سکھا دیتا ہے جو بات بڑے بڑے دانشور انسانوں کو نہ سکھا سکیں انسان خود اپنے تجربے اور مشاہدے سے خود بخود سیکھ جاتا ہے۔

علینا کی دوستی لڑکوں سے بدلتی رہتی تھی۔ کبھی وہ کسی کے ساتھ تو کبھی کسی کے ساتھ۔ ان دنوں علینا کی دوستی احسن نامی نوجوان سے تھی۔ وہ شکل ہی سے اوباش قسم کا نوجوان لگتا تھا۔ اکثر وہ چھٹی کے وقت اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر جاتی تھی۔ احسن اسے مختلف سڑکوں پر سیر کرا کے گھر کے نزدیک ہی چھوڑ دیتا تھا کہ کسی کو شک نہ ہو۔

''علینا ان دنوں جس کے ساتھ تم گھوم پھر رہی ہو یہ نوجوان مجھے کردار کا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔

''تم احسن کو کیسے جانتی ہو؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''میں احسن کو جانتی نہیں بس اس کا حلیہ، شکل وصورت ایسی ہے کہ انسان شک میں مبتلا ہو جائے۔''

''کمال ہے تم اس کے بارے میں جانتی نہیں ہو اور تبصرہ ایسے کر رہی ہو کہ جیسے احسن سے تمہاری برسوں سے جان پہچان ہے۔'' علینا نے برا سا منہ بنایا۔

''میں تمہارے بھلے کو کہتی ہوں اور تم خوامخواہ برا مان جاتی ہو۔''

''انسان کو کسی کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیے پھر کچھ کہنا چاہیے۔ میری احسن کے ساتھ تین ماہ سے دوستی ہے۔ کبھی اس نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی، ہمیشہ ادب و احترام سے پیش آیا ہے، میں جس دن بھی احسن کی آنکھوں میں شیطانیت دیکھوں گی دوبارہ پھر اس سے رابطہ نہ کروں گی۔'' علینا نے کہا۔

''میرا کام تمہیں سمجھانا تھا اب تم نہیں سمجھتیں تو میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

یہ بات علینا کو سمجھانے کی غرض سے کہی تھی مگر اس نے احسن کو بھی یہ بات بتا دی۔ اسے میری بات ناگوار گزری اور وہ غصے میں بھر کر بولا۔ ''میں نے ایسی نیک و پارسا لڑکیوں کو اپنے ماں باپ کی عزت سرعام نیلام کرتے، گھر سے بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ وقت بتائے گا کون اچھا ہے اور کون برا۔''

یہ بات مجھے علینا کی زبانی پہنچ گئی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔

''علینا میں نے یہ بات تمہیں سمجھانے کو کہی تھی، تمہیں احسن تک یہ پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''جیسے تمہیں غصہ آ رہا ہے ایسا غصہ مجھے بھی آیا تھا۔ جب تم نے احسن کے بارے میں کہا تھا اور مجھ سے برداشت نہ ہوا اور یہ بات میں نے احسن سے کہہ دی۔''

''اچھی بات ہے مجھے بھی ایک نصیحت ہو گئی کہ کسی بے وقوف کو نصیحت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ تمہاری بات نہیں مانے گا اور عقلمند کو مشورہ مت دو وہ تو ہے ہی عقلمند۔''

''میں بے وقوف ہوں اور تم بہت عقلمند ہو۔'' علینا یہ کہتے ہوئے میرے پاس سے اٹھ گئی۔

اس دن سے علینا مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی اور وہ مجھے احسن کی باتیں بھی نہیں بتاتی تھی اس کے برعکس وہ احسن کے ساتھ گزرے لمحات لہک لہک کر ثمینہ کو بتانا نہیں بھولتی تھی۔ ثمینہ پیٹ کی ہلکی تھی اس لیے وہ پیٹ ہلکا کرنے کو مجھے بتا دیتی تھی۔ میں اللہ تعالیٰ سے علینا کے حق میں بہتری کی دعا کرتی رہتی تھی۔

''ایک دن ثمینہ نے مجھے بتایا کہ علینا کی احسن نے آج فردوس ہوٹل میں دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ وہ شاندار طریقے سے علینا کی سالگرہ منانا چاہتا ہے۔''

''اس سالگرہ پر علینا نے کتنی سہیلیوں کو مدعو کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

"یہ واحد سالگرہ ہے جس میں صرف علینا اور احسن شریک ہوں گے، کسی تیسرے کو سالگرہ میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی ہے۔" ثمینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
"کمال، ہے یہ کیسی سالگرہ ہے جو ایک ہفتے پہلے منائی جارہی ہے اور اس میں کسی کو مدعو بھی نہیں کیا جارہا ہے۔" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

☆......☆

میں کالج سے سیدھی گھر پہنچی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی۔ دروازہ بجنے پر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
"دروازہ کھلا ہے۔" میں نے کہا۔
دروازے کو کھول کر علینا کی والدہ نزہت آنٹی کمرے میں آگئیں۔
"نمرہ بیٹی کیا علینا تمہارے پاس نہیں آئی، وہ صبح تمہارے گھر آنے کا کہہ کر آئی تھی۔ شام کے پانچ بج گئے ہیں، وہ گھر نہیں لوٹی ہے۔ اس کا اور تمہارا موبائل بند جارہا تھا اس لیے میں گھبرا گئی کہ کہیں خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو، اس لیے میں دوڑی چلی آئی۔" آنٹی نزہت ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئیں۔
"آنٹی بات یہ ہے کہ علینا ان دنوں مجھ سے کم بات کرتی ہے۔"
"وہ کیوں؟" وہ چونکیں۔ "وہ کہتی ہے کہ نمرہ میری اچھی سہیلی ہے۔"
"میں اسے نصیحتیں کرتی ہوں اور اسے میرا نصیحت کرنا اچھا نہیں لگتا۔"
"نصیحت وہی کرتا ہے جو کسی کو اپنا سمجھتا ہے تم نے اسے اپنا سمجھ کر نصیحت کردی اس میں کون سی بری بات ہے۔" آنٹی نزہت نے کہا۔
"آنٹی میں جو بات کہنے جارہی ہوں اس کا برا نہیں ماننا۔ علینا کو لڑکوں سے دوستیاں کرنے کا شوق ہوگیا ہے۔ ان دنوں وہ احسن نامی نوجوان سے دوستی کیے ہوئے ہے۔ مجھے وہ نوجوان اچھا نہیں لگا۔ جب میں نے اسے ٹوکا تو وہ برا مان گئی اور مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔ کالج میں زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔" میں نے بتایا۔
"یہ علینا نے اچھا نہیں کیا۔" آنٹی نزہت نے کہا۔
"میں اس کا بھلا چاہتی ہوں۔"
"مجھے پتا ہے تم اس کے لیے اپنی جان بھی دینے کو تیار رہتی تھیں۔ تمہارے خیال میں علینا اس وقت کہاں ہوگی؟"
"مجھے کنفرم نہیں پتا لیکن میرا خیال ہے وہ فردوس ریسٹونٹ میں ہوگی۔ مجھے ثمینہ نے بتایا تھا کہ علینا کی آج سالگرہ ہے اور احسن اور وہ دونوں مل کر فردوس ریسٹورنٹ میں سالگرہ منائیں گے۔" میں نے بتایا۔
"سالگرہ منائیں گے۔" آنٹی نزہت چونکیں۔ "اس کی سالگرہ ایک ہفتے بعد ہے، اس نے ایک ہفتے پہلے گھر والوں کے بغیر کیسے سالگرہ منانے کا سوچ لیا۔"
"میری خود یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں بھی پریشان ہوگئی تھی کہ یہ سب کیا چکر ہے۔"
"نمرہ بیٹی میں فردوس ہوٹل جا کر دیکھتی ہوں یہ کیا چکر ہے، تم اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ لڑکی کا معاملہ ہے۔ ذرا سی اونچ نیچ ہونے سے بڑی بدنامی ہوجاتی ہے۔ علینا کے والد ویسے ہی ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ اخبار والوں کو اس معاملے کی ذرا سی بھی بھنک پڑ جانے پر وہ رائی کا پہاڑ بنا دینے میں دیر نہ لگائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔" آنٹی نزہت نے کہا۔
"میں سب سمجھ گئی ہوں، میں کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گی۔ ویسے بھی علینا کو اپنی بہن سمجھتی ہوں، کوئی بہن کیسے چاہے گی کہ اس کی بہن بدنام ہوجائے۔" میں نے انہیں یقین دہانی کرائی۔
آنٹی نزہت پولیس کی مدد لے کر فردوس ہوٹل پہنچ گئیں۔ یہ ہوٹل شہر کے بدنام ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ لوگ مینیجر کو زائد پیسے دے کر عیاشی کی غرض سے کمرے کرائے پر لے لیا کرتے تھے۔ اس ریسٹورنٹ پر پولیس بھی کبھار چھاپہ مار کر عیاشی کی غرض سے آئے جوڑوں کو پکڑ لیا کرتی تھی اور ان سے پیسے لے کر ان جوڑوں کو چھوڑ دیا جاتا۔ آنٹی نزہت فردوس ہوٹل کا نام سن کر ہی سمجھ گئی تھیں کہ وہاں کیا ہوسکتا ہے۔
احسن اور علینا کو انتہائی قابل اعتراض حالت میں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ علینا کے والد انکل کامران ایک اثر رسوخ والے آدمی تھے۔ انہوں نے بات کو دبانے کی غرض سے پیسے کا بھرپور استعمال کیا۔
"اوئے کاکے نذیر، لڑکی کو لاک اپ سے نکال کر ان معزز حضرات کے حوالے کردو۔" ایس ایچ او زور سے چیخا۔
"اس لڑکے کو چھوڑنا نہیں ہے۔" انکل کامران نے کہا۔
"او جی فکر نہ کرو، میں اس لڑکے کو منشیات کے مقدمے

میں ایسا پھنساؤں گا کہ وہ کئی سال تک جیل میں سڑتا رہے گا۔ عدالت سے بری بھی نہ ہو سکے گا اور ضمانت بھی نہ کرا سکے گا۔ اس نے عزت دار لوگوں کی پگڑی کو اچھالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے لوگوں کو چھوڑ دینا معاشرے کے لیے خطرناک بات ہے۔ وہ پھر کسی اور عزت دار کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کرے گا۔'' ایس ایچ او نے مسکراتے ہوئے کہا۔

علینا گھر آ گئی اور احسن منشیات رکھنے کے جرم میں جیل چلا گیا۔

امتحانی فارم بھرے جا چکے تھے اس لیے علینا نے کالج آنا چھوڑ دیا تھا اور گھر بیٹھ کر وہ امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ باتیں مجھے آنٹی نزہت نے اس شرط پر بتائی تھیں کہ ان باتوں کا کسی اور سے ذکر نہیں کروں گی۔ وہ میری بہت احسان مند تھیں کہ میں نے علینا کے بارے میں بتا کر ان کی اخلاقی مدد کی ہے اور وہ میرا یہ احسان زندگی بھر نہ اتار پائیں گی۔

پولیس کے جسمانی ریمانڈ حاصل کرنے پر دوران ریمانڈ احسن نے یہ بات اگل دی تھی کہ وہ علینا کے ساتھ چند دن عیاشی کرتا پھر نکاح کے بہانے اسے لاہور لے جاتا اور جسم فروشوں کے ایک گروہ کو فروخت کر دیتا۔

احسن حیران تھا کہ ان کی مخبری کیسے ہو گئی۔ اس نے اپنے ذرائع متحرک کیے تو اسے یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ مخبری میرے ذریعے ہوئی ہے میں نے ہی آنٹی نزہت کو بتایا تھا اور آنٹی نے پولیس سے مدد لی جس کی وجہ اس کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔ جیل میں رہتے ہوئے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے مجھ پر غصہ کر کے رہ گیا۔

رات کو میں سونے کو لیٹی ہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی بج گئی۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ جبران کی کال ہے۔ میں اس وقت بالکل فارغ تھی۔ صبح اتوار تھا اس لیے کالج سے چھٹی تھی میں نے یہ سوچ کر کہ اسے آج سبق سکھاؤں گی تا کہ وہ دوبارہ کال کرنا بھول جائے۔ کال اٹینڈ کر لی۔

''ہیلو۔''

''واہ کیا دلنشین آواز ہے، کانوں میں رس گھل گئی ہے۔'' جبران نے جواب دیا۔

''کیا مجھے کسی چینل پر گانا گانے کا موقع دینا چاہتے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کاش میرے اختیار میں یہ ہوتا، میں پوری دنیا میں تمہاری آواز کو پھیلا دیتا مگر کیا کروں میں ٹی وی پروڈیوسر نہیں ہوں۔''

''پروڈیوسر نہیں ہو تو بن جاؤ۔''

''میری بڑی خواہش ہے کہ خوب صورت دوشیزاؤں کو ٹی وی پر چانس دلاؤں مگر میں کیا کروں میرے والد کا اتنا بڑا بزنس ہے، جس نے مجھے الجھا لیا ہے۔ ان کے دباؤ کی وجہ سے مجھے ان کا ہاتھ بٹانا پڑا ہے۔''

''اتنی مصروفیات کے باوجود لڑکیوں سے بات چیت کرنے کو کیسے وقت نکال لیتے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔

''قسم دلا لو، میرے پاس دولت بہت ہے پر وقت نہیں ہے۔ اس دن اتفاق ہے کہ غلطی سے تمہارا نمبر مل گیا تھا۔ تمہاری آواز اتنی اچھی لگی کہ دل چاہنے لگا کہ میں خاموش بیٹھا رہوں اور تم بولتی رہو۔''

''مجھے مسکا نہ لگاؤ قسم کھانے والے زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم مجھے کچھ بھی کہہ لو میں تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گا۔'' جبران نے کہا۔

''میں کیا تمہاری پھوپھی لگتی ہوں جو میری بات کا برا نہ مانو گے۔'' میں نے تمسخر اڑایا۔

''میں تمہیں اپنے دل کا راز دار بنانا چاہتا ہوں۔''

''مسٹر جبران تم مر کر بھی پیدا ہو جاؤ پھر بھی تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو گی۔''

''وہ کیوں؟''

''میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔''

''بخدا میں بھی ایک شریف گھرانے کا فرد ہوں۔''

''دیکھو مسٹر مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو۔''

''ٹھیک ہے میں فری نہیں ہوتا تم مجھ سے فری ہو جاؤ۔''

وہ میری توقع سے زیادہ ہی ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے پاس میری ہر بات کا جواب تھا۔ میں نے غصے میں آ کر موبائل بند کر دیا۔

موبائل گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اسکرین پر جبران کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ میں نے کال کاٹ کر موبائل ہی بند کر دیا۔ وہ بار بار کال کر کے نا صرف مجھے سونے نہیں دیتا بلکہ گھر والے بھی شک میں مبتلا ہو جاتے کہ یہ سب کیا چکر ہے۔ کون اسے بار بار فون کر رہا ہے۔ اس کے کیا مقاصد ہیں وغیرہ وغیرہ۔

موبائل آف کر کے میں سکون کی نیند سو گئی۔

صبح اتوار تھا۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے دیر تک سوتی رہی۔ بیدار ہونے پر میں نے ناشتا کیا۔ ویسے تو میں نماز کے

وقت تھوڑی دیر کو اٹھی تھی مگر نماز پڑھتے ہی دوبارہ سو گئی تھی۔ چھٹی والے دن میں اپنی نیند بھرپور طریقے سے لے لیا کرتی تھی۔ ناشتا کر کے مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنا موبائل آف کیا ہوا ہے۔ کسی سہیلی کی کال نہ لگنے پر وہ کالج میں شکایت کرے گی کہ جب موبائل کو مسلسل بند رکھنا ہے تو پھر موبائل رکھنے کا کیا فائدہ، موبائل رابطہ کرنے کو ہوتا ہے۔ میں نے جیسے ہی موبائل آن کیا جبران کی کال آ گئی۔ ابو بھی چھٹی ہونے کے سبب گھر پر ہی تھے۔ اس کے بار بار کال کرنے پر وہ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کر لیں۔ اسے مزید کال کرنے سے باز رکھنے کی غرض سے کال اٹینڈ کر لی۔

"میں صبح سے کال کر رہا ہوں تمہارا موبائل بند جا رہا ہے۔" وہ بولا۔

"موبائل میرا ہے، میری مرضی میں اسے بند رکھوں یا آن رکھوں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں یہ میرا موبائل ہے، تمہارا ہی ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو اس سے اچھا موبائل تمہیں دلا سکتا ہوں۔ اس شرط پر کہ تم مجھ سے روز بات کرو گی۔" جبران نے کہا۔

"میرا موبائل جیسا بھی ہے میرا ہے ایسے مانگے موبائل سے بہتر ہے جس کی خاطر روزانہ تم جیسے لوگوں سے بات کرنا پڑے۔"

"موبائل کے لیے آفر محدود مدت کے لیے نہیں ہے اچھی طرح سوچ لو جب دل کرے میری آفر سے فائدہ اٹھا لینا۔"

"تم ایک کاروباری باپ کے بیٹے ہو مجھ سے بات کرنے کو اتنا فالتو وقت کہاں سے نکالو گے۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے بس تم اپنے ذہن کو اس بات کے لیے تیار کر لو کہ مجھ سے بات کرنی ہے۔"

"تم میرے کیا لگتے ہو جو میں تم سے بات کرنے کو تیار ہو جاؤں۔"

"ہائے تمہیں کسی کا دل رکھنا بھی نہیں آتا، فوراً دل توڑ دیتی ہو۔"

"مقصد کی بات کرو، مجھے کیوں فون کرتے ہو۔" میں اس کی طویل ہوتی گفتگو سے اکتانے لگی تھی۔

"فون کرتا ہوں کسی کا خون نہیں کرتا۔ مقصد کی بات یہ ہے کہ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جان نہ پہچان دوستی کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں تمہارا نام نمرہ ہے۔ کالج میں تمہاری خاص سہیلیوں میں زرینہ، علینا اور کشمالہ شامل ہیں تمہارے والد انکم ٹیکس میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ بڑے سخت اصول پرست قسم کے آدمی ہیں کیا اور بھی کچھ بتاؤں۔" وہ بولا۔

اس کے ان جملوں کو سن کر مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ جبران مجھے جانتا ہے۔

"تم نے میری صورت دیکھی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"صورت دیکھی نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت حسین ہو، اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ حسین۔" جبران نے کہا۔

میں نے یہ بات اس لیے پوچھی تھی کہ کہیں جبران کا تعلق میری سہیلیوں سے نہ ہو، اگر ان سے تعلق ہوا تو میں پھر اپنی سہیلیوں کو جھاڑ پلاؤں گی کہ تم نے جبران کو میرے پیچھے کیوں لگایا ہے۔ وہ بھی ہوشیار تھا اس لیے اپنی پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔

"تم نے کبھی میری کسی سہیلی سے بات کی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے تمہاری سہیلیوں سے ہی بات کرنا ہوتی تو پھر تمہیں کال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اچھا یہی بتا دو کہ تمہیں میرا نمبر کس نے دیا ہے۔"

"یہ سوال ایسا ہے کہ جیسے کسی صحافی سے خبر کے بارے میں پوچھا جائے کہ اس نے یہ خبر کس سے لی۔ سچا صحافی اپنی گردن کٹا لے گا مگر اپنے ذرائع نہیں بتائے گا۔ یہ اعتماد والی بات ہوتی ہے کہ اسے کس نے اس شرط پر یہ خبر بتائی ہے کہ وہ اس کا نام کسی کو نہیں بتائے گا۔"

"میں نے تم سے صرف یہ پوچھا ہے کہ تمہیں یہ نمبر کس نے دیا ہے اور تم نے تقریر شروع کر دی۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"یہ میری مجبوری ہے میں یہ بات نہیں بتا سکتا۔"

"میری بھی یہ مجبوری ہے کہ تم سے بات نہیں کر سکتی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے موبائل بند کر دیا۔

"میرا خیال تھا کہ وہ دوبارہ کال کرے گا مگر اس نے کال نہیں کی۔ رات ہو گئی مگر اس کی کال دوبارہ نہیں آئی۔"

دوسرے دن میری کزن دردانہ پنڈی سے ہمارے گھر

آئی ہوئی تھی۔ رات میں اسے میرے کمرے میں ہی سونا تھا۔ جب رات ہوئی، میں سونے کا سوچ رہی تھی کہ اچانک موبائل بج اٹھا۔ یہ کال جبران ہی کی تھی۔ میں نے فوراً کال کاٹ دی اور ساتھ ہی موبائل بند کر دیا۔

دردانہ نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

"کیا ہوا کس کی کال تھی؟"

"پتا نہیں کوئی نیا نمبر تھا۔"

"اگر نیا نمبر آ بھی گیا ہے تو اس میں موبائل کو آف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی جاننے والے کا ہو اور اسے تم سے کوئی خاص بات کرنی ہو۔" دردانہ نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے اور خاص بات ایسا کوئی بندہ نہیں ہے۔ میں بغیر جان پہچان کے کسی سے بات نہیں کرتی۔"

"جب تم بات کرو گی تو جان پہچان بھی ہو جائے گی۔" دردانہ ہنستے ہوئے بولی۔

"کیا تم موبائل پر بغیر جان پہچان کے بات کر لیتی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں کبھی کبھار کر لیتی ہوں۔" دردانہ مسکرائی۔

"یقین نہیں آ رہا ہے کہ کبھی کبھار بات کرتی ہو، ایسی کال کرنے والے گلے کا ہار بن جاتے ہیں۔"

"سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس ایسے فون آتے رہتے ہیں۔ میں انہیں بات کرنے کی حد تک مایوس نہیں کرتی، ہاں، جب وہ ملاقات کرنے کو کہتے ہیں تو میں انکار کر دیتی ہوں۔ میرے انکار پر وہ ایک دو دفعہ فون کرتے ہیں اور پھر ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" دردانہ ہنستے ہوئے بولی۔

"جو غائب ہوتے ہیں وہ گدھے ہوتے ہیں یا سینگ۔" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بس جو بھی سمجھ لو۔ میرا مشورہ ہے کہ کسی کو مایوس نہ کرو، ان کا دل رکھنے کو بات کر لیا کرو، ویسے ایک بات ہے فون پر بات کرنے والے جتنی ہماری تعریف کرتے ہیں اس سے شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم واقعی خوب صورت ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ انہیں خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ جن سے بات کر رہے ہیں وہ خوب صورت ہے۔"

"مجھے تمہاری بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کیوں کہ موبائل پر انہیں ہماری صورت نظر نہیں آ رہی ہوتی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس سے ہی وہ اندازہ لگاتے ہیں کہ جس سے وہ بات کر رہے ہیں وہ خوب صورت ہے۔" دردانہ نے کہا۔

"شکر ہے تم میری بات سے متفق ہو گئیں ورنہ تم آسانی سے کب کسی کی بات تسلیم کرتی ہو۔"

"یہ سمجھانے والے پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ سامنے والے کو کس طرح قائل کرتا ہے تمہاری بات میں دم ہے اس لیے میں نے تسلیم کر لیا۔"

دوسرے دن رات میں جبران کا پھر فون آ گیا۔ اتفاق سے دردانہ میرے چچا اسلم کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میں نے کال اوکے کر دی۔

"شکر ہے کہ تم نے میری کال اٹینڈ کر لی۔" اس نے کہا۔

"کل میری کزن دردانہ پنڈی سے آئی ہوئی تھی اس لیے کال اٹینڈ نہیں کی۔"

"کیا اس نے تمہیں کال اٹینڈ کرنے سے منع کیا تھا۔" جبران نے پوچھا۔

"نہیں مجھے اچھا نہیں لگا کہ نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے۔" میں نے بتایا۔

"آج کل لڑکیوں نے کئی کئی دوست بنا رکھے ہیں اور ہر لڑکے کے لیے الگ الگ وقت مقرر کیا ہوا ہے۔"

"ہاں یہ ایک فیشن چل نکلا ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے۔"

"ہر انسان کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے کہ تم عام لڑکیوں سے مختلف ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ تمہارا گھرانا مذہبی ہے۔ تمہاری تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔" جبران نے مسکا لگایا۔

یہ سچی بات ہے کہ انسان کو اپنی تعریف بہت اچھی لگتی ہے مجھے بھی، تعریف کرنا اچھا لگا تھا۔ اس رات میری جبران سے خاصی دیر تک باتیں ہوئیں۔ ایک طرح وہ مجھے لچھے دار باتیں کر کے اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس رات کے بعد مجھے ہر رات جبران کے فون کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اس کی سحر زدہ گفتگو سن کر میں بے خودی ہو جاتی تھی۔ جس دن جبران کا فون نہ آئے میں بے چین ہو جاتی تھی۔ دوسرے دن فون آنے پر اس سے فون نہ کرنے کا شکوہ کرتی تھی۔ وہ میرے شکوے پر ایسی معقول بات بتا دیتا تھا کہ جس سے میں مطمئن ہو جاتی تھی۔

ایک ماہ گزر جانے پر جبران نے دوسرے لڑکوں کی طرح مجھ سے ملاقات کرنے کو زور دینا شروع کر دیا تھا۔ میں

اسے ٹال رہی تھی مگر وہ ٹلنے کو تیار نہ تھا اور نہ ہی دوستی ختم کر رہا تھا۔ وہ مجھے قسمیں دینے پر اتر آیا تھا۔ اس کی قسمیں اور اس کے ملنے کی خواہش کے ہاتھوں میں مجبور ہو گئی کہ ایک ملاقات کر لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے جب ملاقات کا سگنل دیا تو وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

کالج سے واپسی پر میں نے جبران سے ملاقات کا پروگرام رکھ لیا تھا۔ کالج کے قریب ہی ایک ریسٹوران تھا اسی میں ہم نے اسے بلایا تھا۔ اس نے ریسٹوران میں خوب آؤ بھگت کی کہ میرا پیٹ بھر گیا۔ گھر آ کر کچھ کھانے کی ہمت نہ رہی تھی۔

ایک ملاقات ہونے پر دوسری تیسری اور پھر یہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ میں جبران کی شرافت سے بڑی متاثر ہوئی تھی۔

ایک دن جبران مجھے کار میں ریسٹوران کی بجائے ایک زیر تعمیر پلازہ میں لے گیا۔ میں پلازہ کو دیکھ کر بولی۔ ''یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟''

''بس پانچ منٹ کی بات ہے پھر ہم ریسٹوران چلتے ہیں۔'' جبران نے کہا۔

وہ کار سے نکل کر آگے بڑھا۔ میں کار میں ہی بیٹھی رہی مجھے کار میں بیٹھا دیکھ جبران پلٹا۔

''آؤ تم کیوں بیٹھی ہو۔''

''میں کیا کروں گی۔''

''میں نے اس پلازہ میں فلیٹ بک کرایا ہے مقصد تمہیں وہ دکھانا ہے۔'' جبران نے کہا۔

میں پلازہ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ جبران کے اصرار پر مجھے جانا پڑا۔ پلازہ میں سناٹا تھا۔

''یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔'' میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

''ان دنوں پلازہ میں کام نہیں چل رہا ہے اس لیے مزدور یہاں نہیں ہیں اوپر آفس ہے وہاں عملہ بیٹھا ہوتا ہے۔'' جبران نے کہا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پلازہ کی عمارت میں اوپر چلے گئے۔ پہلی دوسری تیسری اور چوتھی پر بھی ان کا آفس نظر نہ آیا۔

''آفس کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آفس۔'' جبران۔ کچھ سوچ میں پڑ گیا [illegible] ''ہاں وہ اوپر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اوپر بڑھ گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے چل دی۔ چھٹے فلور پر پہنچ کر اچانک جبران نے جیب سے پستول نکال لیا۔ اس کے پستول نکالنے پر میں چونکی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں انجان بن کر بولی۔

''نمرہ تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہو، تمہاری وجہ سے میرا دوست جیل چلا گیا۔''

''میری وجہ سے؟'' میں چونکی۔

''احسن میرا بہت اچھا دوست تھا، تم نے مخبری کر کے اسے پھنسا دیا اگر وہ اس دن گرفتار نہ ہوتا تو وہ تمہاری سہیلی کے ساتھ ملک کے دور افتادہ علاقے میں عیش کی زندگی گزار رہا ہوتا۔''

''پہلی بات یہ کہ تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے اس کی مخبری کر کے اسے پھنسایا ہے اور دوسری بات یہ کہ میں نے کچھ اور ہی سنا ہے کہ وہ چند دن علینا کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر لاہور میں بیچ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''یہ سب پولیس نے جھوٹا ڈراما بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں بیٹھے مستقبل کی پلاننگ کر رہے تھے کہ لاہور جا کر شادی کر کے کسی دوسرے شہر میں رہائش اختیار کی جائے۔ اگر ایسی بات نہ تھی تو پھر پولیس نے جو بات بتائی اس پر مقدمہ کیوں نہیں بنایا۔ منشیات کا مقدمہ بنا کر کیوں جیل بھیجا، اب کئی سال تک اس کی ضمانت نہ ہو سکے گی۔ احسن کو بری طرح سے پھنسایا گیا ہے۔''

''جو کچھ کیا ہے علینا کے والدین نے کیا مگر تم نے مجھ پر پستول کیوں تان لیا ہے۔''

''میں یہ بات تسلیم کر رہا ہوں کہ جو کچھ کیا اس کے والدین نے کیا مگر مخبری کس نے کی؟ وہ تم نے کی۔ نہ تم مخبری کرتی اور نہ میرا دوست مقدمے میں پھنستا، میں اپنے دوست کا انتقام لینے کو تمہیں یہاں لایا ہوں تاکہ اس کے دل کو اطمینان ہو جائے کہ میں نے اس کا انتقام لے لیا ہے۔''

''تم......تم......کیا ارادہ...... رکھتے ہو۔'' میں گھبرا گئی۔

''میں جو کہتا ہوں اسے خوشی سے مان لو ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ میں گولی چلانے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کروں گا۔'' جبران غصے سے چیخا۔

''میں چیخ کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔'' میں نے اسے

دھمکی دی۔
"یہاں دور دور تک تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔ تمہارے چیخنے چلانے پر ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے گولی چلادوں گا اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے میرا حکم مانتی رہو۔"
"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں سخت گھبرائی ہوئی تھی۔
"تم اتنی بھولی نہیں ہو کہ میرا مقصد نہ جان سکو کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔ میرے منہ سے سننا چاہتی ہو تو کہہ دیتا ہوں کہ میں تمہاری عزت کو داغ دار کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جبران کے چہرے پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔
"جبران تم ایک اچھے انسان ہو مجھے جانے دو۔" میں نے کہا۔
میں بظاہر جبران سے بات کررہی تھی مگر میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں اس سے بچنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔ "تم مجھ سے موبائل پر جو اچھی اچھی باتیں کرتے رہے ہو کیا وہ سب ڈراما تھا۔"
"تمہیں پھانسنے کو یہ جال بُنا تھا ورنہ تم کسی طرح میرے جال میں پھنس نہ پاتی۔ میرے دوست کی خواہش تھی کہ تمہیں سزا کے طور پر قتل کردوں لیکن میں نے سوچا قتل کرنے سے تم ایک بار اذیت کا شکار ہوگی جس لڑکی کی عزت داغ دار ہوجائے وہ زندہ لاش کی طرح ہوجاتی ہے۔ وہ روز مرتی ہے۔ تمہارے لیے میرا خیال ہے یہ سزا بہت اچھی رہے گی۔"
"روز مرنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"
"ظاہر سی بات ہے، میں اپنا دل خوش کرکے تمہیں کسی بھی جسم فروشی کا دھندا کرنے والے کو دوں گا تاکہ تمہیں روز مرنے کا موقع ملتا رہے۔ اس طرح میں تمہیں قتل کرنے سے بھی بچ جاؤں گا اور میرے دوست کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔" جبران نے زوردار قہقہہ لگایا۔
جبران کے دل میں میرے لیے خطرناک عزائم تھے اس لیے میں ہر حالت میں اس سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ میری جانب بڑھا۔ بے خیالی میں اس کا پاؤں کمرے میں پڑی کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس کے قدم ڈگمگائے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ایک لات پستول والے ہاتھ پر ماردی۔ پستول اس کے ہاتھ سے دور جاگری۔ اس سے قبل کہ وہ پستول کو اٹھاتا میں نے آگے بڑھ کر پستول کو ایک زوردار ٹھوکر ماردی۔ پستول عمارت سے نیچے گرا جبران غصے میں میری جانب بڑھا۔ میں تیزی سے کمرے سے باہر کی طرف بھاگی اس نے جیسے ہی مجھے بھاگ کر پکڑنا چاہا۔ میں جھکائی دے کر ایک بار پھر اس کی گرفت میں آنے سے بچ گئی۔ جبران اپنا توازن برقرار رکھ نہ پایا اور زیر تعمیر پلازہ کی عمارت سے نیچے جاگرا۔ زمین پر پڑی بجری پر جاگرا تھا۔ وہ ایک تیز چیخ مار کر خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ خون نکلتا دیکھ میں بوکھلا گئی اور تیزی سے پلازہ کی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آگئی۔ جبران بجری پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔ سڑک پر خاصی دور چل کر رکشا کیا اور اپنے گھر سے تھوڑی دور رکشا رکوا کر کئی گلیوں میں سے ہوتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔ یہ احتیاط میں نے اس لیے کی تھی کہ پولیس رکشا ڈرائیور کو بھی تفتیش میں لے سکتی ہے کہ اس نے عمارت کے پاس سے اگر کسی سواری کو بٹھایا ہے تو پھر اسے کس مقام پر چھوڑا۔ میں کسی قسم کا کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ بظاہر جبران کو میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتا تھا، اس چکر میں وہ پلازہ سے گر کر ہلاک ہوا تھا مگر پولیس پولیس ہوتی ہے۔ وہ جسے چاہتی ہے قاتل بنا کر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔
میں سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ امی جان نے مجھے اتنا بوکھلایا ہوا دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوگئیں۔ ان کا پریشان ہونا بجا تھا۔ میں کبھی اتنی بوکھلائی ہوئی گھر نہیں آئی تھی۔
"کیا ہوا میری بچی تم اتنا پریشان کیوں ہو، خیریت ہے نا؟"
"ہاں خیریت ہے۔" میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔
"کیا کسی نے راستے میں تنگ کیا ہے؟" امی جان نے پوچھا۔
"امی پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، راستے میں ایک کتا میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔" میں نے فرضی کہانی گڑھ لی۔
"اس نے تمہیں کاٹا تو نہیں۔"
"ایک شریف آدمی نے کتے کو بھگا کر میری جان چھڑائی ورنہ وہ کتا میری ٹانگ پر ضرور کاٹ لیتا۔" میں نے کہا۔
"کیا تمہاری سہیلیاں ساتھ نہیں تھیں۔"
"میری سہیلیاں آج جلدی چلی گئی تھیں اس لیے مجھے اکیلے ہی آنا پڑا۔"

"آیندہ خیال رکھنا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی آنا۔"
امی جان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔
دوسرے دن میں نے خاص طور پر اخبار دیکھا کہ جبران کے قتل کے بارے میں خبر آئی ہے یا نہیں۔ اخبار میں ایسی کوئی خبر نہ تھی۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شہر میں ہونے والے ہر قتل کی خبر کہاں آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس خاموشی سے قاتل کا سراغ لگانے میں مصروف ہو۔ کوریج کی جاتی ہے۔ اس خیال نے مجھے اور الجھا دیا تھا کہ پولیس نے سراغ لگا کر مجھے گرفتار کرلیا تو میرا کیا بنے گا۔ میری اور میرے گھر والوں کی رسوائی ہوگی۔ میں لاکھ انکار کروں کہ میں نے قتل نہیں کیا مگر پولیس میری بات نہیں مانے گی۔ میرا خوف زدہ ہونا بجا تھا۔ زیرِ تعمیر پلازہ میں چوکیدار کا نہ ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ جبران نے چوکیدار کو کچھ دے کر ادھر اُدھر کردیا ہوگا کہ وہ اس کے معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ کیا پتا اس نے چوکیدار یا پلازہ کے مالک کو بتادیا ہو کہ وہ مجھے وہاں لا کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس طرح پولیس مجھ تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ بات طے تھی کہ جبران کی پلازہ کے مالک یا چوکیدار سے دوستی یا واقفیت تھی جبھی وہ مجھے پلازہ میں لے گیا تھا۔

گرفتاری کے خوف سے میں ہر وقت پریشان رہنے لگی تھی۔ میرا ہنسنا بولنا بند ہوگیا تھا۔ دروازے پر تیز دستک ہونے پر میں بوکھلا جاتی کہ کہیں پولیس نہ آگئی ہو۔
میں شائلہ کی سالگرہ میں شرکت کو ضرور چلی گئی تھی مگر میں خاموش خاموش تھی۔ سالگرہ کا کیک کٹ جانے پر میں ایک طرف بیٹھ گئی۔ وہاں بیٹھنے پر کچھ ایسا لگا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرے دیکھنے پر اس شخص نے اپنی نظریں جھکالیں یہ عمل کئی بار ہوا۔ میں ابھی وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی کہ وہ شخص خود ہی میرے پاس چلا آیا۔
"آپ غالباً شائلہ کی سہیلی ہیں۔ میں اس کا بھائی آصف ہوں۔" اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
اس تقریب میں مرد حضرات نظر نہیں آرہے تھے۔ اس لیے میں نے پردہ نہیں کیا تھا۔ آصف اچانک ڈرائنگ روم میں آگیا تھا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔
"جی۔" میں نے صرف اتنا ہی کہا۔
آصف کی یہ بات مجھے پسند آئی تھی کہ وہ گفتگو کے درمیان سر جھکائے رہا تھا، اس نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔ "آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیں، یہ تقریبات ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ دوستوں سے ملاقاتیں کی جائیں۔ شائلہ کی اس سالگرہ کی تقریب میں ہم نے اسی لیے مرد حضرات کو دعوت نہیں دی ہے کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سالگرہ کی تقریب کو اچھی طرح سے انجوائے کرے۔"
"آصف بھائی میری سہیلی پردہ کرتی ہے۔" شائلہ کمرے میں آتے ہی آصف سے بولی۔
"سوری مجھے پتا نہیں تھا۔" یہ کہہ کر آصف روم سے باہر نکل گیا۔
"سوری میرے بھائی کو پتا نہیں تھا کہ تم پردہ کرتی ہو ورنہ وہ تم سے مخاطب نہ ہوتے۔ میری اس سالگرہ کی تقریب میں ہم نے باہر کے کسی مرد کو مدعو نہیں کیا ہے۔" شائلہ نے میرے پاس آکر کہا۔
"کوئی بات نہیں ایسا ہوجاتا ہے۔ میں نے اس بات کا کوئی برا نہیں منایا۔" میں خلوص سے بولی۔
آصف مجھے پسند آگیا تھا اس لیے مجھے اس کی یہ حرکت ناگوار نہ گزری تھی۔ سالگرہ کی تقریب ختم ہوجانے پر میں گھر چلی آئی۔ گھر آکر بھی میری آنکھوں کے سامنے آصف کی تصویر گھوم رہی تھی۔ دل میں خیال آیا کاش میری آصف سے شادی ہوجائے۔
آصف ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ تنخواہ بھی اچھی تھی۔ سالگرہ کی تقریب کو چند دن ہی گزرے تھے کہ آصف کے والدین میرے رشتے کے لیے گھر آگئے۔ میرے والدین میری طبیعت کی وجہ سے ویسے ہی پریشان تھے اس لیے سوچا کہ شاید شادی ہوجانے پر میری طبیعت بہتر ہوجائے اور میں پھر سے ویسی ہی ہوجاؤں جیسی پہلے تھی۔ مجھ سے پوچھنے پر میں نے رضامندی ظاہر کردی اور اس طرح میری ایک سال کے اندر اندر آصف سے شادی ہوگئی۔ شادی سے مجھ پر واقعی بہت فرق پڑا تھا۔ مجھ پر جو ایک خوف طاری تھا۔ وہ تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ میرے سسرال کا مکان بہت چھوٹا پڑتا تھا۔ فیملی کے افراد زیادہ تھے۔ آصف کی اتنی آمدنی تھی کہ وہ الگ رہنے کو کرائے پر فلیٹ لے سکیں اس لیے انہوں نے فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یہ فلیٹ میرے سسرال سے قریب تھا اس لیے میرے ساس سسر اور دیگر افراد ملاقات کو اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے۔ زندگی بڑی خوشگوار گزر رہی تھی۔ آصف ..... بہت اچھے اور خیال رکھنے والے انسان تھے۔ میری ذرا سی طبیعت خراب ہوجانے پر بے چین ہو

جاتے تھے اور فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تھے۔

☆......☆

جبران دستر خوان پر بیٹھ کر ایسے کھانا کھا رہا تھا جیسے وہ برسوں کا بھوکا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے کھانا منہ میں ٹھونس رہا تھا ہمیں اپنی طرف متوجہ پا کر فوراً... بولا۔ ''بھوک بہت تیز لگی ہے اس لیے جلد سے جلد پیٹ کو بھر لینا چاہتا ہوں۔''

ہم دونوں خاموش رہے۔ وہ چند منٹوں میں سارا کھانا چٹ کر گیا۔

''میں تھوڑی زحمت اور دوں گا، ایک کپ چائے بھی پلا دو میں پھر تمہیں ایک زبردست کہانی سناؤں گا جسے سن کر تم دونوں پھڑک اٹھو گے۔'' جبران نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس دن جبران مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ کوئی بھی شوہر یہ بات پسند نہیں کرتا کہ شادی سے قبل اس کی بیوی کا کسی اور سے چکر رہا ہو۔ بات طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ میں اُمید سے تھی۔ آصف کے مجھے طلاق دینے پر آنے والے بچے کا کیا مستقبل ہوگا اور وہ کیا سوچے گا کہ اس کی ماں ایک برے کردار کی عورت تھی جبھی اس کے باپ نے اس کی ماں کو طلاق دی تھی۔ اس رسوائی کے بعد مجھے کون قبول کرے گا؟

میں نے چائے کا کپ جبران کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے چائے کو غور سے دیکھا۔ ''چائے ابھی گرم ہے اتنی گرم چائے میں پی نہیں سکوں گا۔''

میں اور آصف غور سے جبران کو دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ بولا۔ ''دیکھو مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں گولی چلانے میں تاخیر نہیں کروں گا۔''

''تم سکون سے چائے پی لو ہم کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔'' آصف نے کہا۔

''تم بہت سمجھدار لگتے ہو، میری بات کو اتنی جلدی سمجھ گئے ہو، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم دونوں کو ایک رومانی کہانی سناؤں گا۔ ایک لڑکے کی ایک لڑکی کے ساتھ کسی طرح موبائل پر دوستی ہوگئی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

میرے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔ انکشاف ہوتے ہی میری بدبختی کا دور شروع ہو جاتا۔

''تم کیا ہمیں کہانی سنانے آئے ہو۔'' آصف نے پوچھا۔

''کہانی سنانے نہیں آیا تھا۔ بس یہاں آکر تمہاری خوب صورت بیوی کو دیکھ کر کہانی سنانے کو دل کر رہا ہے۔'' جبران نے کہا۔

''مجھے من گھڑت کہانیاں سننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ کہانی سنا کر اپنا وقت ضائع کرو گے۔''

''میں من گھڑت نہیں سچی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔''

''ہمیں کہانی سنانے کو کیوں ضد کر رہے ہو، جب کہ مجھے کہانی سننے کا شوق ہی نہیں ہے۔'' آصف نے کہا۔

میں سمجھ گئی تھی کہ آصف اسے برداشت نہیں کر رہا ہے اسے یہاں سے بھگا دینا چاہتا ہے۔ اگر وہ اسے بھگانے میں کامیاب ہوگیا تو میرا مستقبل تباہ ہونے سے بچ سکتا تھا۔

''ہمیں جھوٹی یا سچی کہانی سننے کا کوئی شوق نہیں تم کسی ڈائجسٹ میں لکھنے والے کو کہانی سنا دو، اس کے لکھ دینے سے لوگ اس کہانی کو پڑھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''کیسا زمانہ آگیا ہے میں کہانی سنانا چاہتا ہوں اور تم دونوں میری کہانی سننا پسند نہیں کر رہے ہو۔'' جبران نے ہم دونوں کو غصے سے گھورا۔

اس کے غصے سے گھورنے پر ہم دونوں سہم گئے۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ہم پر فائر کھول سکتا تھا۔ وہ کہانی سنانے کی آڑ میں مجھے برباد کر دینا چاہتا تھا۔

''تمہیں میری کہانی سننا پڑے گی ورنہ......'' وہ غصے سے دہاڑا۔

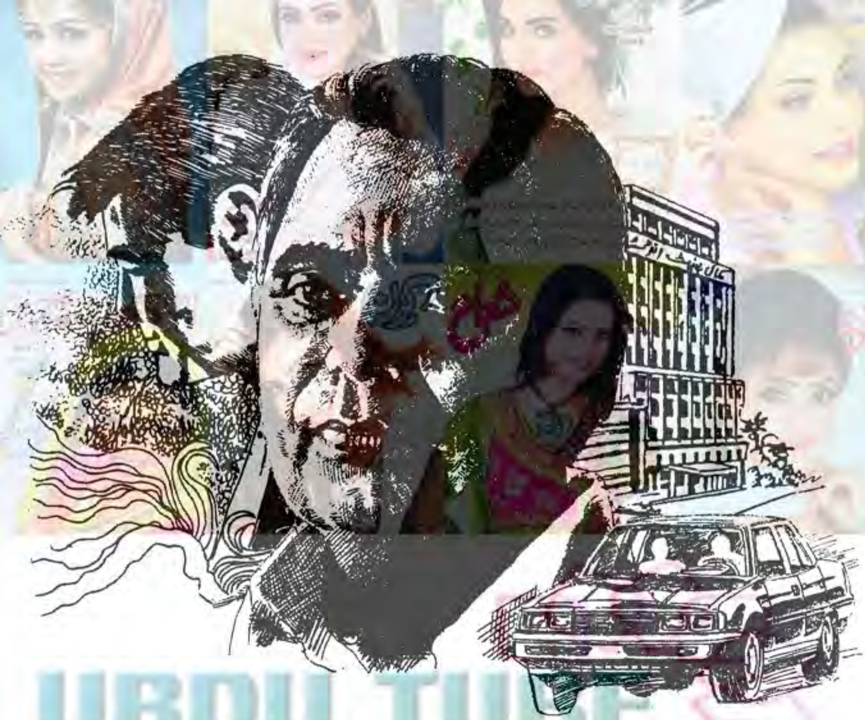
اس کے چیخنے پر ہم دونوں سہم گئے۔

''ٹھیک ہے تم کہانی سناؤ۔'' آصف نے بے بسی سے کہا۔

''ایک لڑکے نے ایک لڑکی کو موبائل پر کال کر، کر کے دوستی کرلی۔ وہ لڑکی بہت شریف زادی بنتی تھی مگر اس لڑکے کی لچھے دار باتوں میں ایسی آئی کہ اس پر اعتبار کرنے لگی تھی اور پھر......پھر اور......اور۔'' یہ کہتے ہوئے جبران کو غنودگی کا جھونکا آیا اور وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ زور زور سے خراٹے لینے لگا۔

آصف نے میری طرف دیکھا۔ اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے آگے کو بڑھے۔ ابھی ہم دونوں دروازے سے باہر قدم بھی نکال نہ پائے تھے کہ جبران زور سے چیخا ''خبردار بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر گولی چلا دوں گا، واپس آجاؤ۔''

ہم دونوں کو واپس پلٹنا پڑا۔
”تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میں سو گیا ہوں نہیں میں سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ تم کیا کرتے ہو، میں جو سمجھ رہا تھا تم نے وہی کیا۔“
”تم ہمیں کہانی سنا رہے تھے۔“ آصف نے اس کی توجہ بٹانے کو کہا۔
”ہاں میں تمہیں دو پیار کرنے والوں کی کہانی سنا رہا تھا۔ ان دونوں میں چند ملاقاتیں ہوئیں پھر پیار ہو گیا۔ لڑکا پیار کا ناٹک کھیل رہا تھا۔ لڑکی حقیقت میں محبت کر بیٹھی تھی۔ پھر...... پھر کیا...... ہوا آگے مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔ آگے کیا ہوا تھا؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”میں...... میں پلازہ سے گر رہا ہوں، کوئی مجھے بچائے۔ ارے میرے ہاتھ میں رسی آگئی ہے، میں بچ جاؤں گا۔ ہاں میں بچ جاؤں گا۔ آ...... آ میں پھر گر رہا ہوں۔“ وہ زور سے چیختے ہوئے کرسی سے نیچے گر پڑا اس نے اپنے سر کو ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔
اس کے اس طرح کرنے سے میں سمجھ گئی کہ اس دن جبران کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ چھ منزلہ پلازے سے گرنے پر اس کے ہاتھ میں کوئی رسی آگئی تھی اس طرح زمین کا اور فضا کا فاصلہ کم رہ گیا تھا اسی لیے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ پتھر پر سر لگنے سے وہ زخمی ہوا اور اس کے سر سے خون بہہ نکلا تھا اور میں سمجھ رہی تھی کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اس دن جبران کے ہاتھ میں رسی آگئی تھی لیکن رسی ٹوٹ گئی تھی یا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی تبھی جبران بجری پر گرا تھا۔ اس دن اگر جبران زخمی نہ ہوتا تو وہ ضرور مجھے پکڑ لینے میں کامیاب ہو جاتا پھر میرے ساتھ وہ کیا کرتا یہ سوچ کر ہی میں کانپ اٹھی تھی۔
ہمارے فلیٹ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا کہ باہر قدموں کی چاپ ابھری میں نے مڑ کر دیکھا تین آدمی کھڑے تھے، دروازے پر نمودار ہوئے۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہ پائے تھے کہ بے اختیار جبران کی نظر ان پر پڑی۔ انہیں دیکھ کر اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔ وہ اندر کمرے میں بھاگا۔
”اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم اندر آکر جبران کو پکڑ لیں۔“ ایک شخص نے کہا۔
آصف کے گردن ہلانے پر وہ تینوں اندر داخل ہوئے اور جبران کو ایسے پکڑ لیا جیسے کسی بچے کو پکڑ لیتے ہیں۔
”آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔“ دوسرا شخص بولا۔
”اس نے کیا جرم کیا ہے؟“ آصف نے پوچھا۔
”اس نے کوئی جرم نہیں کیا، بات دراصل یہ ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اسے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ جب دورہ پڑتا ہے تو یہ گھر سے بھاگ نکلتا ہے۔ آج بھی دورہ پڑنے پر یہ گھر سے نکل آیا۔ ہم اسے تلاش کرتے ہوئے اس علاقے میں پہنچے تو نیچے بیٹھے چوکیدار نے بتایا کہ اس شکل و صورت کا ایک نوجوان اوپر گیا ہے۔ ہم تمہارے فلیٹ کے پاس سے گزرے، دروازہ کھلا تھا اس لیے ہماری اس پر نظر پڑ گئی اور ہم نے اس کو پکڑ لیا۔“ والد نے بتایا۔
”اس کے پاس اسلحہ بھی ہے۔“ آصف نے کہا۔
”یہ بچوں کے کھیلنے والا پستول ہے۔“ جبران کے والد نے وہ پستول آصف کو دکھایا۔
واقعی وہ پلاسٹک کا پستول تھا مگر اصلی پستول لگ رہا تھا۔ اسے دور سے دیکھنے پر کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔
”اس کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟“ آصف نے پوچھا۔
”یہ اپنے دوست کے زیر تعمیر پلازہ میں اس سے ملاقات کرنے گیا تھا کہ اوپر سے نیچے گر گیا۔ زندگی باقی تھی۔ نیچے بجری کے ڈھیر پر گرا اتنی اونچائی سے گرا تھا اس کا اثر دماغ پر پڑا اور وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔“
جسمانی طور پر صحت یاب ہو چکا ہے مگر یہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے۔ آپ لوگوں کو جبران نے جو بھی تکلیف پہنچائی ہو اس کے لیے میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔“ جبران کے والد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
”اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بس ڈرا دیا تھا اور ہم واقعی اس سے بری طرح خوف زدہ ہو گئے تھے۔“ آصف نے ہنستے ہوئے کہا۔
وہ لوگ جبران کو لے کر چلے گئے۔ آصف نے دروازہ بند کر دیا۔
تھوڑی دیر قبل میں جتنی خوفزدہ تھی اب اتنی ہی پُرسکون ہو چکی تھی۔ مجھے ایسا گمان ہو رہا تھا کہ میں بہت طویل سفر کر کے لوٹی ہوں۔ میں ایک عرصے سے اذیت میں مبتلا تھی۔ میں نے جو نہیں کیا تھا اس کا خود کو قصوروار ٹھہرائے ہوئے تھی۔ جبران کو دیکھ کر مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ زندہ ہے، ایک زندہ لاش کی طرح۔ اس نے اور اس کے ساتھی احسن نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیاں خراب کی ہوں گی جس کی اب ان دونوں کو سزا مل رہی ہے۔ احسن جیل میں سزا بھگت رہا ہے اور جبران دماغی توازن کھو چکا ہے۔



ہنر مند

محترم معراج رسول

السلام علیکم!

یہ واقعہ آنکھوں دیکھا ہے جو بزبان خاموشی زندگی جینے کا ہنر سکھا رہا ہے۔ ہم آپ اپنی ناکامی کا قصور قسمت پر ڈال کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس میں خود ہماری کوتاہی بھی شامل ہے۔ ہم سے کون کون سی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اس کا اندازہ لگانے کو ہی میں نے اس واقعے کو کہانی کی شکل دی ہے۔

ڈاکٹر ظفر احمد خان
(کراچی)

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میری پرانے ماڈل کی شیراڈ سنسان روڈ پر محوِ سفر تھی۔ اِکا دُکا گاڑیاں ہی روڈ پر نظر آرہی تھیں۔ میں ایک تقریب اٹینڈ کر کے گھر جا رہا تھا۔ میں اکیلا ہی تھا۔ تقریب کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ مجھے اکیلے جانا پڑا تھا۔ میں اس وقت ناظم آباد کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ فلائی اوور سے پہلے اچانک مجھے کوئی سڑک کے کنارے لفٹ کا اشارہ کرتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کی اور دھیرے دھیرے سڑک کے کنارے کار لے گیا۔ دل میں ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی رہزن نہ ہو لیکن میں نے ڈر کو بالائے طاق رکھ کر گاڑی اس کے قریب لے جا کر روک

دی۔ جب وہ کھڑکی سے جھک کر مجھ سے مخاطب ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بوڑھا لیکن چاق و چوبند شخص تھا جس کے کپڑوں پر جابجا مختلف رنگوں کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ رنگ تو اس کے ہاتھ، پیروں اور چہرے پر بھی لگا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے پسینے میں شرابور، حلیے سے لگتا تھا کوئی رنگ کرنے والا مزدور ہے۔

''السلام علیکم سر! مجھے پی ای سی ایچ ایس جانا ہے۔ اس وقت بس اور رکشا ٹیکسی بھی نہیں مل رہی ہے۔ کیا آپ مجھے ڈراپ کر سکتے ہیں۔'' بوڑھے نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''جی میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ آپ بیٹھ جائیں۔'' میں نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لاک کھول دیا۔

وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک نظر اسے سرتاپا دیکھا پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

''اتنی رات کو کہاں سے آرہے ہو۔'' میں نے خاموشی کو توڑا۔

''جی رنگ بنانے کا کام کرتا ہوں۔ آج کام زیادہ تھا لہٰذا فیکٹری میں دیر ہوگئی۔'' اس نے نپے تلے انداز میں کہا۔

''اچھا!'' میں نے مختصراً کہا اور پھر ہمارا سفر خاموشی سے گزرنے لگا، نہ میں نے نہ اس نے کوئی بات کی اور یوں ہم پی ای سی ایچ پہنچ گئے پھر ایک جگہ اس نے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گاڑی آہستہ کرتے ہوئے سڑک کے کنارے جا روکی۔

''آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری مدد کی۔'' اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور پُرتپاک انداز میں مسکرایا۔

''جی کوئی بات نہیں۔ میں تو ادھر ہی آرہا تھا۔ ویسے یہ میرا کارڈ ہے۔ میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوں۔ یہاں نزدیک ہی میرا کلینک اور رہائش ہے۔ میرے لائق کوئی بھی کام ہو تو یاد رکھیے گا۔'' میں نے کہا اور جیب سے کارڈ نکال کر بوڑھے کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے لے لیا اور جیب میں رکھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور تیز تیز چلتا ہوا ایک گلی میں داخل ہوگیا۔

میں وہاں سے اپنے گھر آگیا۔ چند دن میں یہ واقعہ میرے ذہن سے مٹ گیا۔ یوں بھی یہ ایک عام سی بات تھی۔ اس میں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ میں اسے یاد رکھتا لیکن پھر ایک دن میں صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ فون بجنے لگا۔ میں نے اٹینڈ کر کے فون کان سے لگایا۔ ''ہیلو!''

''ہیلو! ڈاکٹر ظفر احمد خان بات کر رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے کچھ شناسا سی آواز سنائی دی۔

''جی بات کر رہا ہوں آپ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''سر آپ مجھے جانتے ہیں لیکن نام سے نہیں پہچانیں گے کیونکہ نام میں نے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں وہی ہوں جسے چند دن پہلے رات کے وقت آپ نے اپنی گاڑی میں لفٹ دی تھی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''اوہ ہاں...... بالکل پہچان گیا...... کیسے یاد کیا۔'' میں نے پہچانتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں چاہتا ہوں کہ کسی دن جب آپ کے پاس وقت ہو تو آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لیں۔ چونکہ آپ میرے محسن ہیں اور ایک معتبر پیشے سے وابستہ بھی ہیں، اگر آپ آئیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی بالکل...... ضرور...... اگر آپ اتنی محبت سے کہہ رہے ہیں تو ہمیں آپ کی پیشکش قبول کرنا ہی ہوگی۔'' میں نے خوشدلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ڈن...... کب آرہے ہیں آپ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی میں کلینک شام کو کرتا ہوں۔ صبح سے دوپہر تک عموماً میرے پاس وقت ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے میں آج ہی آپ سے مل لوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ میرا یہ نمبر سیو کرلیں۔ میرا نام کمال ہے۔ آپ وہیں آجایئے گا جہاں آپ نے مجھے لفٹ دی تھی۔ وہاں آکر مجھے کال کیجیے گا۔ وہاں سے چند قدم پر فیکٹری ہے۔'' کمال نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

☆......☆

میں دوپہر 2 بجے ناظم آباد کے اسی علاقے میں پہنچ گیا جہاں میں نے کمال کو لفٹ دی تھی۔ میں نے اسی مقام پر گاڑی روک دی پھر کمال کا نمبر پنچ کیا۔

''ہیلو...... میں ڈاکٹر ظفر۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسی جگہ پر کھڑا ہوں۔''

''جی جی سر آپ صرف چند منٹ انتظار کریں۔ ایک بندہ آپ کو لینے آرہا ہے۔'' کمال نے کہا اور لائن کاٹ دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کمال جیسا مزدور میرے اخلاق سے ا

متاثر ہوا اور آج چائے پلانے پر تلا ہوا ہے۔ ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے بھی سوچا چلو کسی غریب آدمی کا دل رکھ لوں، اسی وجہ سے میں نے اس کی چائے کی دعوت قبول کرلی تھی۔

چند منٹ انتظار کے بعد ایک شخص آیا۔ اس نے نام پوچھ کر میری شناخت کی پھر میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے فیکٹری کی لوکیشن بتانے لگا۔ چند ساعت میں میری کار ایک عمارت کے سامنے رکی۔ بلڈنگ کے مین گیٹ کے اوپر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا تھا ''کمال پینٹ انڈسٹری'' نام پڑھ کر میں مسکرایا۔ عجیب اتفاق ہے، کمال جس فیکٹری میں کام کرتا ہے اس کا نام بھی کمال ہے۔ بہرحال وہ شخص مجھے لے کر لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر پہنچا پھر ایک کوریڈور سے گزرتے ہوئے ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

''آپ اندر چلے جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ شخص وہاں سے واپس چلا گیا اور میں دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر موجود شخص پر میری نظر پڑی تو میں اچھل پڑا۔ وہ کمال ہی تھا لیکن ٹو پیس سوٹ میں ملبوس، بال سلیقے سے بنے ہوئے۔ کلین شیو، آنکھوں پر نازک سی عینک لگی ہوئی۔ پُرآرائش کمرا، درمیان میں ایک ٹیبل، ریوالونگ چیئر، سامنے کی دیوار پر پینٹنگ لگی ہوئی۔ پورے کمرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی۔ ہلکی ہلکی ایئرکنڈیشن کی ٹھنڈک۔ میں حیرانی سے کمال کو دیکھنے لگا۔

''آیئے آیئے ڈاکٹر صاحب۔'' کمال کی آواز نے میری حیرانی کو توڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ سب کیا ہے کمال صاحب!'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ میرے سوال پر کمال نے بلند قہقہہ لگایا۔

''آپ میری چند دن پہلے والی حالت اور آج کی حالت کا موازنہ کررہے ہوں گے۔'' کمال نے کہا۔

''جی ہاں میں اسی الجھن میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''دراصل یہ ایک لمبی کہانی ہے اور آپ کو بلانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ ایک ادیب ہیں۔ شاید میری کہانی آپ کے قلم کی زد میں آسکے۔ میں نے آپ کے وزیٹنگ کارڈ پر لکھا دیکھا تھا کہ آپ ایک ادیب بھی ہیں۔'' کمال

اشرف علی خان، فغاں دہلوی، ان اولین شاعروں میں ہیں جنھوں نے زبان اردو کی اصلاح کی کوشش کی اور اردو غزل کو فارسی کے ہم پلہ بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے کلام کو سودا بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فغاں، احمد شاہ بادشاہ دہلی کے رضاعی بھائی اور دربار کے اراکین میں سے تھے۔ 1141ھ/1729ء کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے۔ کمسنی سے طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ ذہن رسا اور شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ بہت جلد اچھے شعر کہنے لگے۔ فارسی میں قزلباش خاں امید کے اور اردو میں مرزا علی قلی خان ندیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ پنج ہزاری منصب پر فائز تھے، خان بہادر کا خطاب بھی پایا۔ دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد گئے پھر کچھ عرصے بعد دہلی واپس آگئے۔

دوسری بار دہلی سے نکلے تو نواب شجاع الدولہ کے پاس فیض آباد پہنچے، فیض آباد سے عظیم آباد (پٹنہ، بہار) کا سفر اختیار کیا اور وہیں 1186ھ / 1772ء میں وفات پائی۔ انہیں جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی، صاحب دیوان شاعر تھے۔

مرسلہ: سید زاہد حسین، ملتان

نے کہا۔

''جی ہاں ضرور سنوں گا آپ کی کہانی، اگر آپ کی کہانی میں اصلاحی پہلو اور قارئین کے لیے سبق ہو تو......'' میں نے دلچسپی سے کہا۔ اسی وقت کمال نے انٹرکام پر کسی کو چائے لانے کا کہا اور واپس آکر میرے قریب بیٹھ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں آپ میری کہانی لکھیں۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاؤں گا اور پھر ایک مقام پر آکر آپ کو ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔'' کمال نے کہا۔

''جی ضرور۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نوجوان تھا۔ میرے گھر میں غربت کا راج تھا۔ میں گھر کی دیواروں پر رنگ کرکے جو مزدوری ملتی اس پر گزارا کرتا تھا۔ مجھے تعلیم کا بھی بہت شوق تھا۔ میں دن بھر مزدوری کرتا اور رات کو پڑھتا تھا۔ میں نے پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور

یوں ہماری زندگی گزر رہی تھی۔ تعلیم کے علاوہ میں مختلف کتب کا مطالعہ بھی کرتا۔ میں نے رنگ کے متعلق معلومات جمع کیں اور خود رنگ بنانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے چھوٹے پیمانے پر رنگ بنا کر مختلف لوگوں کو استعمال کے لیے دیا۔ جلد ہی میرے بنائے ہوئے رنگ کی ڈیمانڈ بڑھنے لگی اور میں یہ کام کرتا رہا۔ اپنے کام کو بھی بڑھاتا رہا۔ میرے بنائے ہوئے رنگ کا معیار اور قیمت کے پیش نظر ڈیلر بھی مجھ سے رابطہ کرنے لگے۔ بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے رنگ کو برانڈ نام دیا اور رجسٹرڈ کرایا اور ایک چھوٹی سی فیکٹری کی بنیاد ڈالی۔ خوش بختی میرے قدم چومتی رہی۔ اسی دوران میری شادی ہوگئی۔ میرے اہل خانہ بھی میری ترقی سے بہت خوش تھے۔ میں اپنی محنت اور جستجو سے کام کرتا رہا پھر اللہ رب العزت نے مجھے دو بیٹوں سے نوازا۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔ میرے بچے پڑھتے رہے اور میری چھوٹی فیکٹری بڑی فیکٹری میں بدل گئی۔ ہمارا مال پورے ملک اور ملک سے باہر بھی جانے لگا۔'' کمال اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

اسی وقت ملازم چائے بسکٹ وغیرہ لے آیا۔ ملازم نے چائے سرو کی۔ ہم پھر چائے پینے لگے۔ میں چائے پینے کے دوران کمال کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ کمال کی جدوجہد بھری زندگی واقعی کمال کی تھی۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھا۔ چائے پی کر وہ پھر گویا ہوا۔

''میرے بچے تعلیم یافتہ ہوگئے۔ جوان ہوگئے۔ میں بوڑھا ہو گیا پھر میں نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کردیں۔ گھر میں دو بہوئیں آگئیں۔ چہار اطراف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ میں اور میری بیوی بھی بہت خوش تھی۔ میرے بیٹوں نے بھی فیکٹری کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کردی پھر یہ ہونے لگا کہ ہم تینوں باپ بیٹے فیکٹری کے کام سنبھالنے لگے۔ میں بھی خوش تھا کہ چلو بالآخر تو یہ سب میرے بیٹوں کا ہی ہے۔ میرے دونوں بیٹے صاحب اولاد بھی ہوگئے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ انہی دنوں میرے بیٹوں نے کہا کہ ابا جان آپ اب آرام کریں۔ فیکٹری ہم دونوں بھائی سنبھال لیں گے۔ میں ان کی بات سے بہت خوش ہوا کہ چلو میری زندگی بھر کی محنت کا ثمر مل گیا۔ میرے بیٹے اس قابل ہوگئے کہ اب پورا کاروبار سنبھال لیں گے۔ میں نے بھی رضامندی ظاہر کردی۔ فیکٹری اپنے بیٹوں کے حوالے کر کے گھر بیٹھ گیا۔ میں گھر میں ہی رہتا۔ مطالعہ وغیرہ کرلیتا۔ کبھی کسی دوست سے ملنے چلا جاتا۔ یہی میری روزانہ کی مصروفیت بن گئی۔

کچھ ہی عرصے بعد میرے بیٹوں نے فیکٹری خسارے کی شکایات شروع کردیں کہ کاروبار نقصان میں جارہا ہے۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب میں نے فیکٹری کو خیرباد کہا تو پھر میں پلٹ کر فیکٹری نہیں گیا۔ میرے دونوں بیٹے دن بدن خسارے کا رونا روتے رہے۔ میں یہ سن کر حیران تھا کہ اچھا خاصا کاروبار نقصان میں کیوں جارہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے اپنی جوانی جس کاروبار کو بنانے میں لگا دی۔ وہ اب نقصان میں جارہا ہے ایسا کیوں؟ بیٹوں کو فیکٹری کا چارج دیتے ہی فیکٹری نقصان میں جانے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا، ایک دن میں صبح گھر سے نکلا اور رکشا کر کے فیکٹری پہنچ گیا۔ وہاں جاکر میں نے خود فیکٹری کا جائزہ لیا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ فیکٹری کا پورا نظام درہم برہم تھا۔ ملازمین بے پروائی سے کام کررہے تھے۔ کوئی ڈسپلن نہیں تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ میرے دونوں بیٹے عیاشیوں میں پڑ گئے تھے۔ روپیا پیسا دوستوں میں لٹا رہے تھے۔ فیکٹری پر ان کی توجہ بالکل نہیں تھی۔ اکاؤنٹ میں ہیرا پھیری چل رہی تھی۔ کتنے ہی ڈیلرز نے مال لینا بند کردیا تھا کیونکہ مال کا معیار گر گیا تھا۔ کوالٹی ختم ہو گئی تھی۔ ملک سے باہر کے کنٹریکٹ ختم ہو گئے تھے۔ ملازمین بدحرامی کا شکار تھے۔ جب مالکان کو ہی فکر نہیں تھی تو انہیں کیا فکر ہوگی۔ میں نے جب تمام ڈیپارٹمنٹ چیک کیے، سب جگہ ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تمام ملازمین کو ہال میں جمع کیا اور اپنا دوبارہ تعارف کرایا۔ ان میں سے کچھ ملازمین پرانے تھے۔ باقی نئے تھے۔ پرانے ملازمین تو مجھے پہچان گئے لیکن نئے ملازمین حیران ہوئے کہ میں کمال پینٹ انڈسٹری کا مالک کمال ہوں۔ تب میں نے سب کو انتباہ کیا کہ میں نے فیکٹری کا چارج سنبھال لیا ہے۔ آج سے حرام خوری ختم۔

اس کے بعد تو پوری فیکٹری میں جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ سارے ملازمین نوکری چلی جانے کے خوف سے کام میں جت گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ کام میں لگ گیا اور جو کام وہ کررہے تھے وہی میں بھی کررہا تھا۔ میں نے اپنی پروا کیے بغیر کارکنوں کے ساتھ کام کیا جس سے میرے کپڑے اور حلیہ بھی خراب ہوگیا۔ میں نے سب کو متنبہ کیا کہ جب تک سارے کام سیدھے نہیں ہوں گے کوئی گھر نہیں جائے گا۔

دلچسپ اور متاثر کن تحریروں سے مرصع نومبر 2018ء کا شمارہ



ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

رفعت سراج، **شیریں حیدر** کے ناول...... **تیزی سے اختتام کی جانب گامزن**

حیا بخاری اور **دردانہ نوشین خان** کی سلسلے وار تحریریں......انوکھے موڑ پر

فرحین اظفر کی ایک اور شاندار تحریر...... **عورت کہانی** کی صورت

معروف رائٹر **سکینہ فرخ** سے دل پزیر ملاقات

عقیلہ حق کا خوب صورت مکمل ناول...... **عام سے خاص تک**

صبیحہ شاہ، **غزالہ رشید**، **اُمِ ایمان** کی دلفریب تحریریں

چولستان کے نخلستان سے ایک

مشّاق لکھاری...... **دُردانہ نوشین خان**

کی کراچی آمد کی دلکش تفصیل......

ایفائے عہد کے لازوال موضوع پر **اختر شجاعت** کی بصیرت افروز کاوش

اس کے علاوہ

ثمر کاظمی، **کنیز نور علی**، **افشین نعیم**،

عطیہ ہدایت اللہ و دیگر لکھاریوں کے لاجواب افسانے

اس کے ساتھ ساتھ معلومات و تفریح سے بھرپور مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

میں نے ہر کام اپنی نگرانی میں کروایا۔ اکاؤنٹ چیک کیا۔ جہاں جہاں گڑبڑ تھی اسے درست کروایا اور آئندہ کے لیے سب کو کہہ دیا گیا کہ ہر کام پوری محنت اور توجہ سے کیا جائے گا۔ فیکٹری کے ڈسپلن کا خیال رکھا جائے گا۔ تمام ملازمین کا خون خشک ہوگیا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوگیا۔ دوپہر کو میرے دونوں بیٹے فیکٹری میں وارد ہوئے اور مجھے وہاں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔"

"ارے ابا جان آپ؟" میرے بڑے بیٹے شرجیل نے کہا۔

"ہاں میں...... مجھے دیکھ کر حیران اور پریشان کیوں ہو گئے۔ کیا میرا فیکٹری میں آنا منع ہے۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"نن...... نہیں...... یہ تو آپ ہی کی فیکٹری ہے۔" شرجیل نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں آج اسی لیے آیا ہوں کہ میں بوڑھا ضرور ہوگیا ہوں لیکن ناکارہ نہیں ہوا ہوں۔ چونکہ بقول تمہارے یہ فیکٹری خسارے میں جارہی ہے اس لیے آج سے اس فیکٹری کا چارج میں نے لے لیا ہے اور تم دونوں کل سے فیکٹری نہیں آؤ گے۔ تم دونوں کو اپنا ذریعہ معاش کا بندوبست خود کرنا پڑے گا۔ کاروبار کرو گے یا ملازمت کرو گے یہ سوچنا تم دونوں کا کام ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"لیکن......!" شرجیل نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں...... اب تم دونوں جاسکتے ہو۔" میں نے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے پھر پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئے اور میں مزدوروں کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ اس دن کام بھی زیادہ تھا اور گاڑی بھی ٹیوننگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ میں رکشا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ آپ نے لفٹ دے دی۔" کمال کہتے ہوئے مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"اوہ...... ہو۔" میرا منہ سیٹی کے انداز میں کھلا رہ گیا۔

"اور ان چند دنوں میں، میں نے فیکٹری کے تمام بکھرے ہوئے معاملات سدھار لیے۔ فیکٹری خسارے میں نہیں جارہی تھی بلکہ میرے بیٹوں کی بے پروائی کا شکار تھی۔ اب معاملات پہلے کی طرح سدھر چکے ہیں۔ مجھے تمام کنٹریکٹ دوبارہ مل چکے ہیں۔ میرے مال کا معیار دوبارہ بن چکا ہے۔ میرے تمام ملازمین اسی تندہی سے کام کررہے ہیں جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔" کمال نے کہا۔

"اور آپ کے بیٹوں کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ بس اب انہیں حالات کے رحم وکرم پر چھوڑا ہے۔ جب اپنے طور پر گھر سے پیسا کمانے نکلیں گے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔ میں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوائی لیکن روپیا کمانے کا ہنر انہیں نہیں سکھایا جس کے سبب وہ اس کی قدر و قیمت سے نابلد تھے۔ یہ میری ہی ایک غلطی تھی جس کا احساس مجھے اب ہورہا ہے۔ دراصل میں نے بغیر سوچے سمجھے فیکٹری ان کے حوالے کردی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیکٹری خسارے میں چلی گئی۔ اب وہ دونوں ملازمت کریں گے۔ سارا دن کسی باس کی سرپرستی میں کام کریں گے، تب انہیں احساس ہوگا کہ کام کیسے کیا جاتا ہے اور کام کیسے لیا جاتا ہے۔

ابھی تک تو انہیں پکا پکایا مل گیا تھا۔ بنی بنائی فیکٹری مل گئی تھی لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس فیکٹری کے پس منظر میں میری عمر بھر کی جستجو، محنت، لگن خون پسینا شامل تھا اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اچھی تعلیم کے علاوہ ہنرمندی بھی بہت معنی رکھتی ہے۔ اب وہ یہ کام ملازمت کر کے سیکھیں گے۔ اس میں بھی کچھ وقت لگے گا اور اب جب وہ واپس آئیں گے تو پھر یہ فیکٹری کبھی خسارے میں نہیں جائے گی۔ وقتی طور پر لگتا ہے کہ اولاد کو فیکٹری سے نکال کر ظلم کیا لیکن درحقیقت میں نے انہیں ہنر کی یونیورسٹی بھیجا ہے۔ میری اس کہانی کا مقصد یہ ہے کہ میں سب والدین کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اچھی تعلیم کے ساتھ ہنر لازمی سکھائیں ورنہ تعلیم رائیگاں جائے گی۔" کمال یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"واہ کمال صاحب! آپ تو بہت عظیم انسان نکلے۔ جب میں نے آپ کو لفٹ دی تھی تب میں آپ کو ایک معمولی مزدور سمجھا تھا۔ آئی پراؤڈ آف یو۔" میں نے اٹھ کر کمال صاحب کو سینے سے لگالیا۔

"بس آپ کو چائے پر بلانے کا یہی مقصد تھا۔ دیکھیں میری چائے کے پس منظر میں بھی یہ کام پوشیدہ تھا کہ آپ کو بطور ادیب مدعو کیا۔ اب مجھے اُمید ہے کہ آپ میری زندگی کی کہانی کو اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر دنیا تک پہنچائیں گے تاکہ دوسرے لوگ بھی سبق حاصل کریں۔" کمال صاحب نے کہا۔





عقیدہ

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں نے پہلی بار کہانی لکھی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مکمل کہانی نہیں ہے، بس ایک واقعہ ہے لیکن اس واقعے میں جو سوال ہے اس کا جواب کس سے طلب کیا جائے؟ حکومت سے یا اپنے آپ سے؟ میری خواہش ہے کہ یہ واقعہ ہر ایک تک پہنچے تاکہ لوگ ایسی غلطیاں نہ کریں۔

شہزاد احمد
(لاہور)

بہت تلخ کہانی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں۔
اس وقت میں ایک گاؤں میں تھا لیکن مجھے کہیں اور جانا تھا۔ وہ گاؤں جہاں میرا عارضی قیام ہوا تھا۔ میری منزل نہیں تھی۔ میری منزل اس گاؤں سے بہت آگے تھی۔ الماس نگر۔ الماس نگر کے سب سے بڑے زمیندار بختاور صاحب کے گھر جانا تھا۔
ان کا بیٹا میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس کی شادی تھی۔ اس نے مجھے فون کیا تھا۔ ''یار شہزاد! تجھے میری شادی میں ہر حال میں آنا ہے۔''
''میری جان تو تو جانتا ہے کہ میں کتنا معروف آدی

ہوں۔'' میں نے بہانہ بنانا چاہا۔
''میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔ ''یاد رکھ اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے بندے بھیج کر تجھے اٹھوالوں گا۔''
''اچھا...... اچھا دھمکی مت دے، میں آجاؤں گا۔'' میں نے وعدہ کرلیا۔
ہم نے بہت دن ایک دوسرے کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ واقعی ایک اچھا دوست تھا۔ اس میں ذرا بھی زمیندارانہ خوبو نہیں تھی۔ اب اس کی شادی ہو رہی تھی تو اس نے بہت پیار سے بلایا تھا اور میرا فرض بنتا تھا کہ میں اس شادی میں شریک ہوں۔
ویسے میری زندگی بھی کیا تھی سوائے بھاگ دوڑ کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں کہانیاں لکھا کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ ہمارے یہاں کہانیاں لکھنے کا مطلب ہے کہ hand to mouth رہا جائے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوا کرتی۔
چونکہ بہت بھاگ دوڑ ہوا کرتی تھی اسی لیے ایک خستہ سی گاڑی لے لی تھی اور وہ بھی ادھار۔ ہر مہینا اس کے پیسے جایا کرتے تھے۔ بہر حال جب مختار نے شادی پر بلایا تو میں نے جانے کا ارادہ کرلیا۔
پہلے تو یہ سوچا تھا کہ ریل یا بس وغیرہ کے ذریعے نکل جاؤں گا پھر خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی گاڑی پر چلا جائے۔
اس گاڑی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ دھوکا نہیں دیتی تھی۔ یعنی اس کا انجن بہت زبردست تھا۔ ظاہری حالت خستہ سہی لیکن چلنے میں بہت اچھی تھی۔
مجھے کہانیاں جمع کرنے کا بہت اچھا چانس مل رہا تھا۔ گاؤں، گاؤں اور شہر شہر ہوتے ہوئے جانا، لوگوں سے ملنا، ان کی باتیں سننا، یہ بہت اچھا تھا۔ اس طرح کئی کہانیاں مل جاتیں جن کو بعد میں لکھا جاسکتا تھا۔
میں نے مختار کو اطلاع دے دی کہ میں آرہا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا تھا۔
پھر میرا سفر شروع ہوا۔ میں اس سفر کی زیادہ تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ قدرت کا تنوع دیکھتا ہوا جارہا تھا۔ طرح طرح کے لوگ، ان کی باتیں، یہ سب میرے ہی ملک کے لوگ تھے اور خوشی ہو رہی تھی کہ اپنا ملک بھی کیسا ہے جہاں اتنے کلچر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔
میں تقریباً سفر طے کرچکا تھا کہ گاڑی نے ہچکولے لینے شروع کردیے۔ خدا جانے کیا خرابی ہوگئی تھی۔
یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت میں ایک ایسی سڑک پر تھا جس کی دوسری طرف بستی دکھائی دے رہی تھی۔
گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ اب آگے کا سفر محال ہوگیا تھا۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کرکے میں ایک درخت کے سائے میں آگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔
کچھ دیر تک سوچتا رہا لیکن کوئی راستہ سامنے نہیں تھا اور وہ سڑک بھی ایسی تھی کہ کوئی گاڑی بھی گزرتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔
پھر کسی کی آواز آئی۔ اس کے جواب میں دوسری آواز۔ پہلی آواز کسی مرد کی تھی اور دوسری کسی عورت کی، نرم سی، خوب صورت۔ کون لوگ ہوسکتے تھے؟ سوچتے ہوئے مجھے داستانیں یاد آنے لگی تھیں۔ جن میں ایسا ہی ویرانہ ہوا کرتا اور کوئی مسافر کسی انہونی میں مبتلا ہوجاتا۔
پھر وہ دونوں دکھائی دے گئے۔ وہ سامنے والے ایک بڑے سے درخت کی آڑ میں تھے۔ میں پہلے ان کو دیکھ نہیں پایا تھا۔
ایک خوب صورت لڑکی اور ایک نوجوان۔ ان دونوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری گاڑی بھی ان کی نگاہوں میں آگئی تھی۔ وہ دونوں آپس میں کچھ مشورہ کرتے رہے پھر میری طرف آگئے۔
اب میں ان دونوں کو قریب سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں بہت معقول سے تھے۔
''السلام علیکم!'' اس نوجوان نے سلام کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ''میرا نام بابل ہے جی۔ کیا آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔''
''ہاں بھائی، یہ دیکھو گاڑی خراب ہوگئی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''کیا آس پاس کوئی مکینک وغیرہ ہوگا۔''
''اس روڈ پر تو کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے لیے آپ کو بستی میں چلنا ہوگا۔ وہاں ایک ہے۔ وہ بہت اچھا کاریگر ہے۔''
''بھائی! یہ گاڑی وہاں تک کیسے جائے گی؟'' میں نے پوچھا۔
''سر جی اس کی پروانہ کریں۔ بھروسا کریں ہم پر۔ ہم آپ کی گاڑی کو پہنچادیں گے۔ بلکہ ایسا کریں میں شہنو کو بھیج دیتا ہوں۔ یہ کاریگر کو اس طرف بھیج دے گی۔'' اس نے کہا۔

شہو اس لڑکی کا نام تھا۔ وہ سڑک سے اتر کر بستی کی طرف چلی گئی جب کہ وہ نوجوان میرے پاس ہی کھڑا رہا تھا۔ میری گاڑی میں ایک بڑے تھرماس میں چائے بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے چائے خود بھی پی اور اس نوجوان کو بھی دی۔ اس طرح اس سے اچھی خاصی دوستی سی ہوگئی تھی۔

وہ ایک سیدھا سادہ اور خیال کرنے والا نوجوان تھا۔ اس نے باتیں شروع کر دیں۔ اس نے بتایا کہ شہو اس کی منگیتر ہے۔ ان دونوں کو ملنے کا موقع نہیں ملتا اسی لیے وہ دونوں کبھی کبھی اس طرف آجاتے ہیں۔ اس سادہ دل نوجوان نے بہت سی باتیں بتا دیں۔ چونکہ اتنی دیر میں اس سے کچھ بے تکلفی ہوگئی تھی، میں نے پوچھا۔ ''یار بابل! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''میرا تو بہت دل چاہتا ہے صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ابھی میرے پاس کوئی کام نہیں ہے لیکن دو چار دنوں میں ہو جائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''بابا صاحب نے کہہ دیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بابا صاحب کی کہی ہوئی ہر بات پوری ہو جاتی ہے۔''

میں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

میں ان لوگوں کے توہمات سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ لوگ اس قسم کے باباؤں اور عاملوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے تھے۔ ایک طرح سے ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ وہ بہت باکمال لوگ ہوا کرتے تھے۔ اپنی باتوں سے سیدھے سادے لوگوں کی آنکھوں پر جیسے پٹیاں باندھ دیا کرتے۔

کسی کو نوکری نہیں ملتی ہے تو بابا کے پاس جاؤ۔ کسی کو اولاد نہیں ہو رہی ہے تو بابا، کسی عورت کا شوہر بھاگ گیا ہے تو بابا، قتل کا کیس چل رہا ہے تو بابا، گویا یہ بابا ہر قسم کے مسائل کا حل تھا اور وہ جی بھر کے انہیں لوٹ لیا کرتا تھا۔

ہمارے افسانہ نگاروں نے ایسے عاملوں کے خلاف افسانے لکھے ہیں۔ شاعروں نے شاعری کی ہے۔ اخبارات میں ان کے کارنامے آیا کرتے ہیں لیکن کون سنتا ہے؟ اسی لیے میں نے بھی بابل سے کچھ نہیں کہا اور ویسے بھی میرا اس بستی میں کام ہی کیا تھا۔ گاڑی کے ٹھیک ہوتے ہی روانہ ہو جانا تھا۔

کچھ دیر بعد کھیتوں کی طرف سے کچھ لوگ آتے دکھائی دیئے۔ بابل نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ لیں جی گاڑی لے جانے والے آگئے۔ اب کچھ دیر بعد گاڑی ٹھیک ہو جائے گی۔''

وہ لوگ قریب آئے۔ پانچ آدمی تھے۔ صحت مند قسم کے۔ انہوں نے سلام کیا، ہاتھ ملایا اور گاڑی کو دھکا لگانے لگے۔ انہوں نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا تھا۔ ''نہیں جی آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہم آپ کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔''

یہ دھکے والا سفر شروع ہو گیا۔ میں سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ بابل بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا۔ فاصلہ زیادہ تو نہیں تھا لیکن راستے بہت بے ڈھب سے تھے۔ بالآخر بستی میں داخل ہو ہی گئے۔ ان جوانوں کی ہمت پر شاباش تھی۔ ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی تھی۔

میں نے شہر میں ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ بیچ سڑک پر کسی کی گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ گاڑی میں عورتیں بھی بیٹھی ہیں اور اکیلا مرد گاڑی سے اتر کر دھکا دینے کی کوشش کر رہا ہے اور دوسری گاڑیاں تیز رفتاری سے گزرتی جا رہی ہیں اور ایک یہ لوگ تھے۔

بستی میں ایک ہی مکینک تھا۔ گاڑی اس کے حوالے کر دی گئی تھی۔

بابل نے کہا۔ ''صاحب! اب آپ کو میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہے۔ تھوڑا آرام کر لیں۔ دیر بھی ہو گئی ہے کھانا بھی کھالیں۔''

سچ یہ ہے کہ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس چکر میں شام کے چار بج گئے تھے اور یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ گاڑی کے ٹھیک ہونے میں کتنی دیر لگ سکتی ہے۔ بابل کا گھر قریب ہی تھا۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے مجھے باہر کے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ صاف ستھرا کمرا تھا۔ تھوڑا بہت فرنیچر بھی تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے ہاتھ منہ دھلوایا پھر اندر سے وہی لڑکی نمودار ہوئی جس کا نام بابل نے شہو بتایا تھا جس سے وہ کھیت میں مل رہا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ اپنے ساتھ ایک ٹرے لے کر آئی تھی۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

''بھائی بابل یہ بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ یہ تمہاری منگیتر ہے اور تم کھیتوں میں جا کر ملتے ہو۔''

دونوں ہنس پڑے۔ ''بات یہ ہے بھائی کہ اب تو آپ سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے اسی لیے بتا رہا ہوں۔ یہ میری منگیتر بھی ہے اور میرے تایا کی بیٹی بھی ہے۔

اس کا کوئی نہیں ہے۔ تایا اور تائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ابا نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور ہماری منگنی کر دی۔ بس یہ ہے کہانی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس گھر میں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے ہم باہر جا کر بات کر لیتے ہیں۔"

"تو یہ بات ہے؟" میں بھی ہنس پڑا۔ "تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے تاکہ یہ جھنجٹ ختم ہو۔"

"صاحب جی! بابل کے پاس کوئی نوکری نہیں ہے نا۔" اس بار شہو بول پڑی۔ وہ پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ "لیکن یہ بابا کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ میری بات ہی نہیں مانتا۔"

"وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جی۔" اس نے بتایا۔ "اللہ کے خاص بندے۔ یہاں ایک مزار ہے۔ وہ اس مزار کے متولی ہیں جی۔ بہت کچھ ہے ان کے پاس۔"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" شہو بول پڑی۔ "ایک نمبر کا ڈھونگی اور بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار میں نے بھی دیکھا تھا اس کو۔"

"دیکھو شہو تو ایسی ویسی بات مت کیا کر۔" بابل نے کہا۔ "ہمارے شاہ صاحب تو اتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ ذرا سی دیر میں انسان کے سارے گناہ جھاڑ دیتے ہیں۔"

"گناہ جھاڑ دیتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ارے صاحب وہ ان کے اپنے طریقے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "بندہ ان کے دربار سے واپس آ کر بالکل معصوم ہو جاتا ہے۔"

عقیدوں کی ایسی کہانیاں میں کئی بار سن چکا تھا اسی لیے میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔

اس نے بتایا۔ "صاحب! آج رات بھی ان کے دربار میں حاضری ہے۔ رات بھر وہاں رہنا ہوگا۔ میرے ساتھ گاؤں کا اکرم اور اللہ دینو بھی جائے گا۔"

"بابل، کیا میں بھی جا سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب اس کے لیے بابا صاحب سے اجازت لینی ہوگی۔" اس نے بتایا۔

رات کے گیارہ بجے تک گاڑی ٹھیک ہو گئی تھی۔ اب سفر ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اس مشکل کو بھی اس اللہ کے نیک بندے نے آسان کر دیا۔ "صاحب! اس وقت رات کا سفر ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کل چلے جائیں اور رکنے کی فکر نہ کریں۔ یہ کمرا خالی رہتا ہے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

میرے لیے بھی یہی مناسب تھا۔

بابل اور اس کی منگیتر شہو نے میرے لیے بستر کر دیا۔ ایک بڑے جگ میں پانی اور گلاس لا کر رکھ دیا۔ رات کا کھانا تو ہم کھا ہی چکے تھے۔ پھر بابل نے کہا۔ "صاحب جی اب مجھے اجازت دیں، کل ملاقات ہو گی۔"

"کیوں تم کہیں جا رہے ہو کیا؟"

"ہاں جی، آج بابا صاحب کے دربار میں حاضری دینی ہے۔" اس نے بتایا۔ "بستی کے اور بھی لوگ جا رہے ہیں۔ ہم کل صبح تک واپس آ جائیں گے۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر بستر پر لیٹ گیا۔ گھر سے اتنی دور ایک اجنبی جگہ پر رات گزارنے کا تجربہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ دل سے اس شخص کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں جو فرشتہ بن کر میرے کام آ رہا تھا۔

بہت دیر تک جاگتا رہا تھا پھر نیند آ گئی۔ صبح شہو کی آواز نے جگایا تھا۔ "اٹھ جائیں صاحب جی دس بج رہے ہیں۔"

میں اٹھ گیا۔ شہو لوٹے میں پانی لے کر کھڑی ہوئی تھی۔ "مکان کے پیچھے باتھ روم بنا ہوا ہے۔ یہ لوٹا لے جائیں۔ وہاں منہ دھونے کا سب انتظام ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ بابل واپس آ گئے۔"

"نہیں ابھی تک نہیں آیا ہے۔ نہ جانے کیوں اسے دیر ہو گئی ہے۔"

منہ ہاتھ دھو کر میں کمرے میں آیا تو شہو ناشتے کی ٹرے لے کر کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ "کیا ہوا ہے شہو خیریت تو ہے نا۔"

"بابل ابھی تک واپس نہیں آیا ہے جی۔ اسی کی فکر لگی ہوئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "آپ تو ناشتا کریں۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "شہو میرے پاس گاڑی ہے۔ بن کر آ گئی ہے۔ تم مجھے اس درگاہ کا پتا بتا دو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

"ہاں جی! میں بہت پریشان ہو گئی ہوں بلکہ ایسا کریں۔ برابر کے گھر والوں کا بیٹا بھی ساتھ گیا ہوا ہے۔

اس کا ابا بہت پریشان ہو رہا ہے۔ اس کو بھی ساتھ لے جائیں، وہ راستہ بتا دے گا۔"

"ہاں! یہ تو اور بھی اچھا ہوگا، تم بھیج دو اس کو۔"

میرے ساتھ چلنے والا ایک بوڑھا آدمی تھا۔ سیدھا سادہ جو اپنے بیٹے کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا۔ شہو بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ دونوں نے راستہ بتانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے راستے ویسے تو سیدھے سادھے ہی ہوتے ہیں۔ بس ایک دو سڑکیں ہوتی ہیں جو یا تو کھیتوں کی طرف جاتی ہیں یا مین روڈ کی طرف۔ جہاں سے انہیں کہیں اور جانے کی لاریاں مل جاتی ہیں۔

ہم سب خاموش تھے۔ شہو اور بوڑھا بابا آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں بہت پریشان ہیں۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ جب کوئی واقعہ رونما ہونے والا ہوتا ہے تو پورے ماحول پر ایک طرح کا بوجھل پن سوار ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی اس وقت بھی ہو رہا تھا۔ میرا بھی باتیں کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک سیدھی سڑک آگئی جو ٹوٹی ہوئی تو تھی لیکن اس پر سے گاڑی گزر سکتی تھی۔ اور اسی سڑک کے اختتام پر وہ درگاہ تھی۔ جہاں ہمیں جانا تھا۔

"اللہ خیر کرے صاحب۔" شہو چیخ اٹھی۔ "وہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے؟"

ایک عجیب صورت حال تھی۔ اس درگاہ کے گرد ایک مجمع جمع تھا۔ بہت سے پولیس والے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کئی گاڑیاں تھیں۔ ان میں ایمبولینس بھی تھیں اور بھی بہت کچھ تھا۔ عورتیں مرد جمع تھے سب رو رہے تھے، چیخ رہے تھے۔

میں نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ ہم سب نے گاڑی سے اتر کر درگاہ کی طرف تقریباً دوڑ لگا دی۔

وہاں پہنچ کر ہم نے جو بھی دکھایا جو کچھ معلوم ہوا اس نے دہلا کر رکھ دیا۔ اس عامل یا بابا یا جو بھی سمجھ لیں اس نے اپنے مریدوں کو مار دیا تھا۔ بیس انسانوں کا خون کر دیا تھا اور وہ بھی بہت بے رحمی کے ساتھ۔

(میرا خیال ہے کہ پاکستان میں رہنے والے ہر شخص نے یہ کہانی سن لی ہوگی۔ اخبارات میں پڑھ لی ہوگی یا ٹی وی چینلو پر دیکھ لیا ہوگا کہ ایک ظالم شخص نے جو اپنے آپ کو

اورنگ زیب کے بعد اور شاہ عالم ثانی آفتاب سے پہلے کے مغل بادشاہوں سے اردو کے شعر منسوب ہیں لیکن مغل بادشاہوں میں اردو کے پہلے باقاعدہ شاعر شاہ عالم ثانی آفتاب ہیں، وہ 17 ذیقعد 1140ھ / 14 جون 1728ء میں پیدا ہوئے۔ 4 جمادی الاول 1173ھ / 24 دسمبر 1759ء کو تخت نشین ہوئے۔ غلام قادر روہیلہ نے ان کی آنکھیں نکال کے زندگی بھر کے لیے نمونہ عبرت بنا دیا تھا۔ 48 برس حکومت کرتے رہے۔ بادشاہت کے باوجود ساری زندگی کوفت اور پریشانی میں گزری۔ 7 رمضان المبارک 1221ھ / 9 نومبر 1806ء کو انتقال کیا۔ شاہ عالم آفتاب کو شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ فارسی، اردو اور برج بھاشا تینوں ہی زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین کے اور اردو میں مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، مناقب، مرثیہ اور سلام بھی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ شاہ عالم آفتاب کی تصنیفات، نادرات شاہی، اور "عجائب القصص"، مشہور ہیں۔

مرسلہ: حمایت علی، سرگودھا

مرزا سلیمان شکوہ سلیمان دہلوی۔ بادشاہ دہلی شاہ عالم کے بیٹے تھے اور عالمگیر کے پوتے تھے۔ 1203ھ / 1788ء میں دہلی سے لکھنو گئے، رنگین، جرأت، انشا، میر سوز اور مصحفی جیسے بلند پایہ شعرا ان کی رفاقت میں رہتے تھے۔ آصف الدولہ نے سلیمان شکوہ کے لیے پانچ ہزار روپے ماہانہ کا وظیفہ اور رہنے کے لیے ایک محل دے دیا تھا۔ لکھنو میں اپنی جائے پناہ پر اکثر مشاعرے کرتے رہتے تھے جس میں تمام نمایاں شعراء شرکت کرتے تھے۔ سلیمان شکوہ دہلی اور لکھنو کے علاوہ کبھی کبھی آگرہ میں بھی رہتے تھے۔ دہلی میں شاہ حاتم دہلوی کے شاگرد تھے۔ لکھنو آکر مصحفی اور انشا کو بھی کلام دکھایا۔ 1225ھ / 1810ء میں ان کا دیوان مرتب ہوا۔ ان کے دیوان میں چالیس صفحات پر مرثیے اور بارہ صفحات پر حضرت علیؑ کی شان میں منقبتی قصیدے ہیں۔ بروز شنبہ 29 ذیقعد 1253ھ / 24 فروری 1838ء کو آگرہ میں انتقال کیا اور سکندرہ میں اکبر بادشاہ کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ قبر سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور اس پر یہ تاریخ درج ہے "اللہ محمدؐ علیؑ فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ"۔

مرسلہ: برجیس قدر، سرگودھا

روحانی مرشد کہا کرتا تھا۔ اس نے کس بے دردی کے ساتھ اپنے بیس عدد مریدوں کو نشہ آور کوئی چیز پلا کر پہلے بے ہوش کیا۔ اس کے بعد انہیں ڈنڈوں اور چھریوں کے وار کر کر کے مار ڈالا ہے۔ میں اس کہانی کے ذریعے کوئی رپورٹنگ نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کہانی یا اس المیے کا دوسرا رخ سامنے لانا چاہتا ہوں)

میں اس بستی میں دو دنوں تک رہا۔ اس دوران قانونی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ بابل کے گھر میں قیامت اتر آئی تھی۔ اس گاؤں کے اور بہت سے گھروں کا یہی حال تھا۔ ہر طرف سوگ کی فضا تھی۔

اس دوران میں نے واپس جانا چاہا لیکن بابل کے گھر والوں نے مجھے روک لیا۔ میں ان بے چاروں کے آگے مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے دوست مختار کو بھی موبائل سے ساری سچویشن بتا دی تھی۔ وہ بھی حیران ہو کر، افسوس کر کے رہ گیا تھا۔

دو دنوں کے بعد بابل کا سوئم تھا۔ میں نے سوئم میں شرکت کی۔ اس کے بعد جانا چاہا تو پتا چلا کہ بابل کا باپ سخت بیمار ہو گیا ہے اور علاج کے لیے ایک دوسری درگاہ پر جا رہا ہے جہاں جا کر وہ منت مانگے گا۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا تھا۔

میں نے اندر سے شہو کو بلا لیا۔ بس اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ سوگ کی تصویر بنی ہوئی میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

”آپ نے بلایا تھا جی؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھو شہو، مجھے تم لوگوں کے معاملات میں دخل دینے کا تو کوئی حق نہیں ہے لیکن پھر بھی دل چاہ رہا ہے کہ کچھ بول کر جاؤں۔“

”ضرور کہیں جی۔“

”میں نے سنا ہے کہ بابا اپنے علاج کے لیے کسی درگاہ کی طرف جا رہا ہے۔“

”ہاں جی تایا بیمار ہیں نا جی۔“

”حد ہو گئی۔“ میں نے کہا۔ ”ایک تو ابھی تازہ تازہ تم سب ایک بابا کے ظلم کا شکار ہو چکے ہو۔ اس کے باوجود تمہاری آنکھوں سے پٹی نہیں اتری۔ شاید تم لوگ اسی قابل ہو کہ اس قسم کے بابا تمہیں بے وقوف بناتے رہیں اور جب موقع ملے تو جان سے مار دیں۔ تم لوگوں کو سمجھانا بے کار ہے۔ یہ جہالت تم لوگوں سے کبھی نہیں جائے گی۔ معاف کرنا مجھے یہ سب کہنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن میرا دل جل رہا ہے اسی لیے میں اتنی باتیں کر گیا ہوں۔“

شہو خاموش رہی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب ہو رہے تھے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور پھٹ پڑی۔ ”جانتے ہیں صاحب! اس میں قصور کس کا ہے؟ آپ لوگوں کا؟ حکومت کا؟ پوری دنیا کا؟ ہمارا کیا قصور ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ ہم ایسے باباؤں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ مایوس ہو کر، کیا ہے ہمارے پاس؟ جب ہمارا کوئی بیمار پڑتا ہے اور ہمارے گاؤں سے اسپتال بہت دور ہے اور آس پاس کوئی ڈاکٹر بھی نہیں تو ہم کیا کریں۔ پھر ہم ایک امید لے کر ان باباؤں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ جب ہمارے گاؤں کے پڑھے لکھے بچوں کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، وہ نوکری کے لیے شہر جا کر سفارش نہیں لا سکتے، رشوت نہیں دے سکتے پھر یہی بابا لوگ ہمارے لیے اُمید کی کرن بن جاتے ہیں۔ جب گاؤں کا کوئی بندہ کسی مقدمے میں پھنس جاتا ہے اور اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ اس کے لیے مہنگے وکیل کیے جائیں تو ہمارے پاس کیا راستہ رہ جاتا ہے؟ یہی کہ کسی بابا کا دامن تھام لو۔ اس سے تعویذ لے آؤ۔ اس سے دم کرا لو۔ اس کے مزار پر دھمال ڈال دو۔ ہم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ جب آپ شہر کے لوگ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے، ہمیں عقل نہیں سکھائیں گے تو ہم اسی طرح برباد ہوتے رہیں گے صاحب جی۔ یہ ہماری جہالت تو ہے لیکن اس سے زیادہ ہماری مجبوری بھی ہے۔ آپ جا کر شہر والوں کو ہماری مجبوریاں بتائیں۔ پوچھیں حکومت سے کہ اس نے اسکول کیوں نہیں بنوائے، اسپتال کیوں نہیں بنوائے؟“

وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی اور میں سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ اس لڑکی نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔

اس وقت مجھے حضرت عمرؓ کا قول یاد آ رہا تھا کہ اگر دجلہ کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو اس کا ذمے دار عمرؓ ہوگا۔

میں تو وہاں سے واپس آ گیا لیکن کون اس لڑکی کے سوالوں کے جواب دے گا۔

کیا حکومت یا ہم سب؟

میری ان سے پہلی ملاقات سنہ 1980ء میں ہوئی تھی۔ پستہ قد، رنگ بہت ہی سانولا۔ خوش پوش اور خوش اخلاق۔ آواز میں بڑی نرمی تھی اور اگر کوئی غلطی بھی ہوجاتی تو اس طرح سرزنش کرتے جیسے ایک مشفق انسان کسی کی اصلاح کرنا چاہتا ہو جس کی وجہ سے کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس کو شرمندہ کیا جارہا ہو۔

جولائی 1979ء کو ایک آئل فیلڈ میں میرا اپائنٹمنٹ ہوا تھا ہم سے عہد لیا گیا تھا کہ جہاں بھی بھیجا جائے گا انکار نہیں کریں

من کا اجالا

جناب مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

انسان اگر چاہے تو وہ فرشتوں جیسا بن سکتا ہے، اس کے حلقۂ احباب میں بھی ایک ایسا ہی شخص تھا، بالکل فرشتوں جیسا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے کچھ بھی بچت نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے لازوال دولت حاصل کی ہے۔

حبیب الرحمن
(کراچی)



گے۔آئل فیلڈز اس وقت بہت دشوار ہوا کرتی تھیں۔ ماحول بھی اچھا نہیں تھا۔آئے دن ملازمین کی ہلاکتوں یا اغوا برائے تاوان کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ یہ فیلڈز زیادہ تر بلوچستان میں واقع تھیں۔ جب میرے تبادلے کے احکامات جاری ہوئے تو میرے سینئرز اور ساتھیوں نے کہا کہ کوشش کریں کہ جانا نہ ہو۔ کوئی راہ نکالیں۔

راہ نکال کر بھی دی گئی۔ ان علاقوں کے آس پاس کے ایک ساتھی میرے پاس آئے۔ میرے بیچ کے ہی تھے اور ان کو بھی ایک دو دن کے فرق سے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا۔ کہنے لگے کہ ہم دونوں مشترکہ طور پر درخواستیں دیتے ہیں۔

''کس بات کی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میوچول ٹرانسفر کی۔''

میں نے کہا۔''کیا یہ بدعہدی نہیں ہوگی؟''

میرے سینئر مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ کہنے لگے، اتنا سنہری موقع ہے، وہ خود ہی چل کر تمہارے پاس آیا ہے اور تم انکار کر رہے ہو۔ اپائنٹمنٹ کے فوراً بعد مجھے ویل کم کرنے والے یہی آفیسر تھے، مہربان بھی تھے۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا۔''سر ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔''

''وہ کیا؟'' انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا تبادلہ پھر کبھی کسی فیلڈ پر نہیں ہوگا۔''

''یہ تو نہیں ہوسکتا۔''

ان کا جواب سن کر میں نے کہا۔'' تو پھر مجھے جانے دیں۔ عہد کا پاس بھی ہو جائے گا اور میرا ریکارڈ خراب ہونے سے بھی بچ جائے گا۔'' اس طرح میں ''اٹک'' کی ایک آئل فیلڈ میں پہنچ گیا۔

حالات کے متعلق جو کہانیاں سنی تھیں ان کو ویسا ہی پایا لیکن اگر انسان خود یہ نہ بھ بیٹھے کہ وہ فیلڈ میں آ کر اللہ کی حدود سے بھی باہر نکل آیا ہے تو میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا۔ ترغیبات کی اور بات ہے، وہ تو دی ہی جاتی ہیں، رد و قبول ہر فرد اپنے ایمان و ضمیر کے مطابق کرتا ہے۔

سال ہی گزرا تھا کہ ایک صاحب فیلڈ میں بھیجے گئے۔ اس سے قبل جو آفیسر تھے میں ان کی گڈ بک میں اتفاقاً ہی آ گیا تھا اس لیے کہ کوئی ایک فرد بھی جوان کے تحت کام کرتا تھا، خوش نہیں تھا۔ ان صاحب نے ان کو ری پلیس کیا۔ باتونی تو نہیں لگتے تھے لیکن کوئی بیٹھ جایا کرتا تو ان کو ناگوار بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں بھی ان کی نیک طبیعت سے متاثر ہو گیا اس لیے کبھی کبھی ان کے پاس بیٹھ جایا کرتا تھا لیکن ایسا آفس ٹائم میں کبھی نہیں ہوا۔ شام کے اوقات میں ایسا ضرور ہو جایا کرتا تھا۔ مسجد جاتے ہوئے تو انھیں صرف جمعہ کے جمعہ ہی دیکھا لیکن جب جب کمرے میں جانا ہوا تو ان کے کمرے میں لپٹی ہوئی جاء نماز کی ہر مرتبہ بدلی ہوئی حالت سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔

ہر انسان میں نہ تو ساری خوبیاں ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ مجسم خامی ہوتا ہے۔ ہر قسم کے عیب سے پاک اللہ کی ذات ہی ہے لیکن مجھے یہ شخص کسی حد تک شریف لگا۔ نہ گالم گلوچ نہ دروغ گوئی اور نہ ہی اوچھی اور فضول گفتگو لیکن اس کے باوجود میں ان سے اتنا متاثر نہیں تھا کہ انہیں ماننا بھی شروع کر دیتا۔

فیلڈ میں وہ میرے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ فیلڈ ہی میں چار پوائنٹ ایسے تھے جہاں ڈپارٹمنٹ کے افراد اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں کو تنخواہیں اس لیے ملا کرتی تھیں کہ وہ کام کیا کرتے تھے لیکن فی زمانہ آرام کرنے کی تنخواہیں اور کام کرنے کے لیے رشوتیں ملتی ہیں۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ میں اس آفس میں تھا جس کو صاحب نے مرکز بنایا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ''بادشاہ کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی'' سے بچو لیکن میں نے ان میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔ میں ویسے بھی ہمیشہ محتاط ہی رہا ہوں اس لیے کہ اگاڑی ہو یا پچھاڑی، دونوں ہی بے بھروسا چیزیں ہیں اور اگر مہربان بھی ہوں تو محتاط رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

مجھے خبط ہے کہ میں جس سے بھی ملتا ہوں اس کی بری باتوں کی جانب کبھی اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا کہ ان کو شمار میں لاؤں۔ وہ کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں البتہ خوبیوں کو نہ صرف شمار کرتا ہوں بلکہ اگر ان میں میرے لئے کوئی اچھائی ہے تو اس کو اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر انسان کی کچھ مخصوص عادتیں ہوتی ہیں۔ ان میں بھی ایک عادت تھی جسے میں کئی ماہ سے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ زمانہ فاؤنٹین پین کا تھا۔ بال پوائنٹ آفس کے کچھ کاموں میں ضرور استعمال کیے جاتے تھے لیکن دستخط کے لیے فاؤنٹین قلم ہی استعمال ہوا کرتے تھے اور انہیں سے کیے ہوئے دستخط معتبر سمجھے جاتے تھے۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ ایک بال پوائنٹ اشو کیے جاتے اور ری فل کی ایک ختم ہونے کے بعد دوسرا بال پوائنٹ پین نہیں ملا کرتا تھا۔ اس کی ری فل ملا کرتی تھی۔ میں دیکھتا کہ صاحب

کے پاس عموماً دو بال پوائنٹ اور دو عدد فاؤنٹین پین ہی ہوا کرتے تھے۔ جن کو ادل بدل کر استعمال کیا کرتے تھے۔ کئی مرتبہ چاہا کہ اس کی وجہ دریافت کروں لیکن ہر مرتبہ ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ بادشاہ کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی والی بات یاد آجایا کرتی تھی۔ بعینہٖ یہی بات میں نے ان کے کمرے میں بھی نوٹ کی۔ اکثر کچھ سرکاری کاغذات پر دستخط لینے ان کے کمرے میں آنا جانا رہتا تھا۔ وہ اکثر ہاتھ والا قلم چھوڑ کر دوسرے قلم کا کیپ کھولتے دستخط کرتے دستخط کرنے کے بعد میں کاغذات سمیٹتا اور روانہ ہوتے ہوتے ہوئے کن انکھیوں سے انھیں دیکھتا ہوا کمرے سے باہر جاتے جاتے محسوس کرلیا کرتا تھا کہ وہ دستخط والے قلم پر کیپ چڑھاتے ہوئے میز پر پہلے سے کھلے قلم کو دوبارہ سنبھال رہے ہیں۔ میں دل ہی دل میں اسی سوچ میں گم ہوجایا کرتا تھا کہ یہ کیا معما ہے۔

ایک دن کچھ کاغذات زیادہ ہی تھے اور میں ان کو سنبھالے ان کے کمرے میں تھا۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوا، انھوں نے اپنے ہاتھ روکے، کاغذات پر نظر ڈالی، فاؤنٹین پین بند کرکے حسب عادت قمیص کی جیب میں رکھا۔ دوسرا قلم نکالا، اسے بے کیپ کیا اور دستخط کرنا شروع کر دیئے۔ میں طے کرکے آیا تھا کہ بادشاہ کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی کے محاورے صرف نظر کرتے ہوئے آج ان سے ایسا کرنے کا سبب ضرور دریافت کروں گا اور میں نے ہر قسم کے ادب واحترام، ڈر اور جھجک کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سبب پوچھ ہی لیا۔ انھوں نے مجھے دیکھا لیکن خاموش ہی رہے۔ جب میں نے اصرار کیا تو ایک لمبا سانس لے کر بولے کہ عیب سے پاک اللہ کی ذات ہے۔ میں ایک بہت ہی گناہ گار انسان ہوں لیکن چاہتا یہ ہوں کہ اگر کوئی ایک بھی اچھا عمل شروع کروں تو پھر اس پر قائم رہوں۔ میرے پاس عموماً دو قلم ہوتے ہیں۔ ایک میرا ذاتی اور ایک سرکاری۔ ذاتی سے میں سرکاری کام نہیں کرتا اور سرکاری قلم سے ذاتی کام نہیں کرتا۔

وہ تو اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے لیکن مجھے ایک دوست کے والد کے واقعات کے درمیان تنہا چھوڑ گئے۔ میرا دوست سناتا ہے کہ اس کے والد محکمہ جنگلات میں ملازم تھے۔ اکثر ہم اپنے بچپن میں ان کے ساتھ دور دراز کے جنگلوں میں گھومنے پھرنے جایا کرتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تو جنگلوں میں ہی گزرا کرتی تھیں۔ چھٹیاں اور وہ گھنے جنگلوں میں گزریں، درختوں پر جھولے پڑیں، اونچی شاخوں پر بندروں کی طرح جھولا جائے اور تالابوں میں نہایا جائے، اس سے بہتر چھٹیاں کس کی گزرتی ہوں گی۔ میں چار بہن بھائیوں میں بڑا تھا کوئی سات سال کا ہوں گا۔ ایک جنگل میں ایک کچا پکا مکان والد صاحب نے حاصل کیا۔ دور دور تک کوئی اور مکان بھی نہیں تھا۔ رات کے وقت اگر سرکاری چوکیدار موجود نہیں ہوتا تو شاید والدہ وہاں کسی بھی صورت رہنا گوارہ نہ کرتیں۔ چوکیدار قریبی گاؤں کا رہائشی تھا اس لیے دن چڑھنے پر وہ اپنے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کا بیٹا دوپہر کے وقت آیا اور بہت سارے گنے یہ کہہ کر چھوڑ گیا کہ یہ بابا نے بھیجے ہیں۔ بابا وہ اپنے والد کو کہا کرتا تھا۔ گنے چوسنے کا اور ہی مزہ ہوتا ہے۔ ہم گنے چوستے رہے مگر مجھے یوں لگا جیسے والدہ پریشان پریشان نظروں سے ہم سب کو دیکھتی رہی ہیں۔ شام کو والد صاحب آئے تو یہ ماجرہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے۔ والدہ سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے۔ والدہ نے ساری کہانی سنادی۔ والد صاحب نے کسی سے بھی کچھ نہ کہا بس خاموش ہوگئے۔ رات میں چوکیدار آیا تو اس سے دریافت کیا کہ یہ گنے آپ نے بھیجے تھے۔

”جی ہاں!“ اس نے جواب دیا۔

”خرید کر بھیجے تھے؟“ پھر سوال کیا۔

”نہیں کھیت سے توڑے تھے۔“ جواب ملا۔

”اپنے کھیت سے؟“

”نہیں راستے میں ایک کھیت پڑتا ہے وہاں سے۔“

یہ سن کر والد صاحب پریشان ہوگئے اور کہا کہ اس کے مالک کے پاس لے چلو۔ گئے اس سے معذرت کی، قیمت پوچھی تو اس نے کہا۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ سمجھیں میرے بچے ہیں۔ میں نے آپ کے چوکیدار کو معاف کیا۔“

والد صاحب پھر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ چوکیدار سے کہا کہ آئندہ کوئی بھی ایسی چیز گھر نہ پہنچانا جو چرائی ہوئی ہو۔

یہ تو سنی سنائی باتیں تھیں لیکن اب میرے سامنے ایک ”مسٹر“ کی ہستی تھی۔ جو کہیں سے بھی ”مولوی“ نہیں لگتا تھا لیکن مولوی ہی تھا۔ یہ واقعات چند سیکنڈوں میں تحت الشعور سے گزر کر اچانک شعور میں آکر دوبارہ تحت الشعور میں جاچکے تھے۔ کاغذات دستخط بھی ہوچکے تھے اور میں ان کو سمیٹ کر ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ دنیا شاید ان جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہے ورنہ ہمارے اعمال تو ایسے ہیں کہ پہاڑوں کو دھنی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں بکھر جانا چاہیے تھا، ستاروں کو ریزہ ریزہ ہوجانا چاہیے تھا اور آسمانوں کو لپٹ جانا چاہیے تھا۔

یہ صاحب کی قربت ایک سال سے کچھ سوا ہمارے

ساتھ رہے۔ ان کو ہیڈ آفس طلب کرلیا گیا اور یوں ایک اچھا انسان مجھ سے دور ہوگیا۔

میں ان سے متاثر تو ہوا لیکن بہت حد تک نہیں۔ اکثر ''کواکب'' ہوتے کچھ ہیں اور نظر ''کچھ اور'' آتے ہیں۔ وقت جیسے پر لگا کر اڑ گیا۔ عملاً ان سے دوری کو بیس برس کا عرصہ ہوگیا تھا۔ بیشک ان سے گاہ بگاہ ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ سینئر ہونے کے ناطے ٹیلیفونک ربط بھی رہا۔ میٹنگز کا آنا جانا بھی رہا لیکن کبھی ایسا موقع نہیں مل سکا جس میں ایک دوسرے سے ذاتی حوالے سے کوئی تبادلہ خیال ہو سکے۔ یہ ملاقاتیں اتفاقاً بھی ہوئیں اور سرکاری سطح پر بھی۔ بیس برس بعد میرا تبادلہ اسلام آباد ہوا۔ اسلام آباد ہماری کارپوریشن کا ہیڈ آفس تھا لیکن اسلام آباد ٹرانسفر ہو جانے کے باوجود بھی میں ہیڈ آفس سے دور ہی رہا۔ جہاں ہمارے ڈپارٹمنٹ کے مینیجرز کا سیٹ اپ تھا مجھے وہاں کی بجائے ایک اہم ویئر آفس میں پوسٹ کیا گیا۔ میں نے ایک آدھ بار اپنے مینیجر سے درخواست بھی کی کہ میں براہ راست آپ کے آفس میں کام کرنا چاہتا ہوں لیکن انکار یا اقرار کسی میں کوئی جواب نہ پا کر چپ بیٹھ گیا۔

اگر کوئی کسی منزل کو حاصل کرنے کی جوت دل میں جگا لے تو قدرت بھی اس پر مہربان ہو جایا کرتی ہے۔ جونہی میں اپنے آفس پہنچا، مینیجر نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ ایک لیٹر مجھے تھما کر کہا اب تو خوش ہو؟ کچھ نہ سمجھتے ہوئے لفافہ میں نے اجازت کے بعد چاک کیا اور کھولا تو میرے ٹرانسفر آرڈرز اس میں موجود تھے اور وہ اپنے ہی ڈپارٹمنٹ کے مینیجر کے آفس کے لیے تھے۔ جن صاحب کا میں کافی حد تک مرید ہو چکا تھا ان کو ایک خاص سلسلے میں ایک اہم فیلڈ میں بھیجا جا رہا تھا گویا میرے اور ان کے ٹرانسفر آرڈرز ایک ساتھ ہی جاری ہوئے تھے۔ مجھے ان ہی کا چارج سنبھالنا تھا۔ بات میرے لیے حیرت بھری خوشی کا باعث بھی تھی اور افسوس کا سبب بھی۔ حیرت اس بات پر کہ اپنے سے ایک نہایت سینئر اور تجربہ کار آفیسر سے ان کا آفس ٹیک اوور کرنا ایک اعزاز اور اپنی کارکردگی پر ڈپارٹمنٹ کا مجھ پر اعتماد کا اظہار خوشی کی بات تھی۔ افسوس اس بات کا کہ میں ایک بار پھر اپنے ایک اچھے آفیسر سے قریب نہیں ہوسکوں گا۔

ان کا شعبہ سنبھالنے کے بعد میری عقیدت ان سے اور سوا ہوگئی۔ میں نے ان کارکردگی میں کہیں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی جہاں مجھے اس بات کا شبہ بھی ہو سکے کہ ان کے کسی کام پر انگلی اٹھائی جا سکتی ہو۔ اس شعبے میں کتنے کام کرنے والے ایسے ویسے سے کیسے کیسے ہوتے دیکھے تھے۔

جس اہم کام کے سلسلے میں انھیں بھیجا گیا تھا اس کے متعلق عام خیال یہی تھا کہ وہ دو سال سے قبل مکمل نہیں ہو سکے گا لیکن ایک نہایت دیانتدار، محنتی، قابل اور تجربہ کار آفیسر نے اس کام کو سات ماہ کی قلیل مدت میں نمٹا دیا۔ کام کی تکمیل ہوتے ہی ان کو پھر ہیڈ آفس طلب کرلیا گیا۔ مجھے لگا کہ اب میرا کام ختم ہوا اور شاید اب پھر کوئی فیلڈ میرا مقدر بنے لیکن ایسا نہیں ہوا اور مجھے ان کے ماتحت ہی رہنے دیا اور یوں کوئی ایک سال مجھے ان کے ماتحت کام کرنے کا مزید موقع ملا۔ وہی انداز، وہی پہلے جیسی حالت، وہی دو قلم اور وہی سرکاری اور غیر سرکاری کاموں کی تفریق۔ وہی گیٹ اپ، مونچھوں اور داڑھی سے آزاد چہرہ، وہی دھیما انداز اور وہی فائلوں میں چھپے رہنے کی عادت۔ البتہ یہ فرق ضرور نظر آیا کہ نماز کے اوقات میں وہ سب کے ساتھ نماز ظہر کے لیے چلے جایا کرتے تھے جبکہ فیلڈ میں میں نے انھیں جمعہ کے علاوہ کبھی مسجد کی جانب جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

نوکری میں ہر کام آپ کی اپنی خواہش کے مطابق کبھی نہیں ہوا کرتا۔ خواہش تھی کہ ان کے ساتھ کچھ اور وقت گزرے۔ ان کے تجربے اور نیک سیرتی سے اور بہت کچھ حاصل ہو لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور مجھے بلوچستان کی ایک دور دراز اور کسی حد تک پُرخطر فیلڈ میں ٹرانسفر کردیا گیا۔ جس فیلڈ میں میرا ٹرانسفر کیا گیا تھا اس فیلڈ کا سروے اس سیسمک پارٹی نے کیا تھا جس میں، میں آج سے دس برس قبل پوسٹ تھا۔ دس برس قبل یہ علاقہ بہت ہی زیادہ مخدوش تھا۔ مخدوش تو اب بھی تھا لیکن اس کی شدت میں کسی حد تک کی واقع ہو چکی تھی۔ یہاں چند سال گزارنے کے بعد میں حیدرآباد کی ایک آئل فیلڈ میں بھیج دیا گیا۔ نیک سیرت آفیسر سے اسلام آباد میں قیام کے دوران کسی حد تک فیملی تعلقات ہو چکے تھے اس لیے گاہ بگاہ رابطے کا کوئی سلسلہ رہتا ہی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلیفون یا خط و کتابت ہی ''آدھی'' ملاقات کے ذرائع ہوا کرتے تھے۔

زیادہ عرصہ گزر جائے تو روابط آہستہ آہستہ کمزور سے کمزور ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ یہی کچھ ہوا بھی تھا اور اب کہیں مہینوں میں کوئی ایک دو بار رابطہ ہو جایا کرتا تھا۔

حیدرآباد اور آس پاس کے دیگر ملحقہ چھوٹے چھوٹے شہروں کے باغات آموں کے لیے پاکستان بھر میں مشہور ہیں۔ آموں کا موسم آجائے تو میری فیلڈ میں موجود چھوٹے بڑے سارے ملازمین اپنے فرائض میں آموں کی خرید و فروخت کو شامل کر لیتے ہیں۔ پیٹیاں ہی نہیں بوریوں کی بوریاں اپنے

اپنے متعلقہ ڈپارٹمنٹوں میں بھیجی جارہی ہوتی ہیں۔ گویا اپنے بڑوں کوخوش رکھنے کا موقع کوئی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اس فعل قبیح کو "فن" کا درجہ حاصل ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے کیا کچھ "حاصل" ہوتا ہے اس کا اندازہ پاکستان میں بسنے والا ہر چھوٹا بڑا ملازم خوب اچھی طرح واقف ہے۔

میں فیلڈ منیجر کے آفس میں بیٹھا تھا۔ وہ آفس میں نہیں تھے۔ آموں کے کریٹ کے کریٹ اسلام آباد بھجوانے جیسے اہم ترین کام کی خود نگرانی کررہے تھے۔ ایک بہت بڑا ہیوی ٹرک کھڑا ہوا تھا اور کریٹ اس میں لادے جارہے تھے۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود آموں کی خوشبو در و دیوار میں دراڑیں ڈال کر اندر داخل ہورہی تھی اور میں یہ شعر گنگنا رہا تھا

ہے فضا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

اسی دوران اچانک میری نظر ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک خط پر پڑی جو فیلڈ منیجر کی میز پر کھلا رکھا تھا۔ میں اس لیے چونک گیا کہ اس کے نیچے جو دستخط تھے وہ میں میلوں دور سے پہچان سکتا تھا۔ یہ انہی آفیسر کے تھے جن کی دیانت داری کا میں مرید تھا۔ لکھا تھا کہ میرے لیے بھی دس کریٹ بھجوادیجئے گا۔

اللہ اکبر، میرے منہ سے بیساختہ بلند آواز سے یہ الفاظ نکلے۔ شکر ہے کوئی اور کمرے میں موجود نہیں تھا۔ یہ کیا؟ سارا کمرا لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ میں جس کام سے آیا تھا اس کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلا تو فیلڈ منیجر جو غالباً اسی وقت اندر آرہے تھے انہوں نے مجھے پکڑلیا۔ "کیا ہوا حبیب صاحب؟"

"کچھ نہیں کچھ طبیعت خراب ہورہی ہے۔ میں اپنے آفس میں جارہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اپنے آفس پہنچا۔ شدید صدمے کے باعث کام میں جی نہ لگا تو اجازت لے کر کالونی آگیا۔ وہاں بھی رات بھر نیند نہیں آئی تو مجھے چند دن کی چھٹیاں لینا پڑیں۔

کوئی بھی غم ہو دور ہو ہی جاتا ہے اور زخم بھی بھر ہی جایا کرتے ہیں۔ بیشک کچھ زخم بھر تو جاتے ہیں لیکن اپنے نقوش زندگی بھر کے لیے چھوڑ جایا کرتے ہیں۔ چھٹیاں گزار کر میں واپس اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن شاید کسی ایسے فرق کے ساتھ کہ ہر کوئی چھوٹا بڑا ملازم مجھ سے اکثر یہ سوال کیا کرتا تھا کہ حبیب صاحب کیا غم لگا بیٹھے ہیں۔ میرے پاس کوئی جواب ہوتا تو میں دیتا۔ کسی کے دل و دماغ میں کسی کا خوش شکل بت بدشکل ہو جائے تو اس کا ہنسنا اور اس کا نہ ہنسنا کیا حیثیت رکھتا ہے۔

آموں کا موسم گزر چکا تھا اور اس پورے موسم میں، میں نے آم چکھے تک نہیں تھے۔ یہ آم مجھے زہر لگنے لگے تھے۔ آم اٹھاتا تو میرے سامنے ایک موہنی صورت ابھرتی جو دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ مورتی بن کر اپنے لمبے لمبے دانت باہر نکال لیا کرتی اور میں آم کو واپس رکھ دیا کرتا۔

ایک دن فیلڈ منیجر نے میرے پاس ڈاک بھیجی۔ ایک چھوٹی سی چٹ بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ "برائے مہربانی اسے چیک کرلیجیے، اس میں زیادہ لیٹرز آپ کے شعبے سے متعلق لگتے ہیں۔ میرے پاس کام زیادہ ہے اس لیے جو آپ سے متعلق ہوں، اجازت ہے آپ رکھ لیجیے گا باقی جس جس ڈپارٹمنٹ کے ہوں انھیں اپنے دستخطوں سے ان کو بھجوادیجئے گا۔"

یہ بھی ایک اعزاز ہی تھا۔ لیٹرز کچھ ملفوف تھے اور کچھ کھلے۔ سب سے پہلے جو خط میرے ہاتھ لگا وہ اسی "بت" کا تھا جو شکستہ بھی ہوچکا تھا اور سیاہ رو بھی۔ پہلے تو یہی جی چاہا کہ اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دوں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا تھا اس لیے کہ سرکاری لیٹرز کے ساتھ ایسا سلوک سنگین خلاف ورزی ہے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں اس کو چاک کیا تو اردو میں لکھی ہوئی ایک مختصری تحریر ہاتھ لگی جس پر فیلڈ منیجر کا آموں کے ارسال کیے جانے پر شکریہ ادا کیا گیا تھا اور ایک فوٹو کاپی لگی ہوئی تھی۔ یہ فوٹو کاپی ایک چیک کی تھی جو آموں کی ادائیگی کے سلسلے میں کوریئر سروس کے ذریعے روانہ کردیا گیا تھا۔ اس بار میرا آفس میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن یہ آنسو اس خوشی کے تھے جو میرے سامنے بکھر جانے والے بت کے ایک ایک ذرے کو واپس جڑتے دیکھ رہے تھے اور وہ چہرہ جو سیاہ ہوکر بھیانک روپ دھار چکا تھا، فرشتوں جیسا ہوتا چلا جارہا تھا۔

صاحب ریٹائرڈ ہوچکے تھے۔ مجھے ٹریننگ کے لیے اسلام آباد بھیجا گیا تھا۔ اسلام آباد پہنچتے ہی میں ان کے اس گھر میں حاضری کے لیے پہنچا جو نہایت کشادہ اور سرکاری طور پر ان کو حاصل تھا تو معلوم ہوا کہ وہ اسلام آباد کے اس سیکٹر میں جہاں سوگز کے مکانات بنے ہوئے ہیں وہاں شفٹ ہوچکے ہیں تاکہ وہ مکان کے کرائے کی ادائیگی اپنی پینشن سے ملنے والی رقم میں کرسکیں۔ میں تلاش کے بعد پہنچا تو وہ گھر سے باہر آئے۔ بیشک انھوں نے دنیا سے کچھ حاصل نہیں کیا لیکن جو رخت سفر دوسری دنیا کے لیے جمع کرچکے تھے اس کا اطمینان ان کے چہرے سے ٹپکنے والی طمانیت اور آنکھوں کی چمک میں صاف نظر آرہا تھا۔





مکافات

قابل احترام مدیراعلیٰ

سلامتی!

سرگزشت میں یہ میری پہلی کاوش ہے۔ بنیادی طور پر خواتین کے ڈائجسٹوں میں لکھتی ہوں۔ زیرِ نظر تحریر سچ پر مبنی ہے اس لیے سرگزشت کو بھیج رہی ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اس تحریر میں بیان کردہ اسباق پر غور ضرور کریں۔

کنیز زہرا
(لاہور)

زندگی کسی افسانے کسی کہانی سے کم نہیں ہوتی، اب ساقی کی سرگزشت ہی لے لیں، کیا اس پر جو کچھ گزری وہ کسی افسانے کہانی سے کم ہے؟ تو چلیں اس کی کہانی کی طرف چلتے ہیں مگر افسانوی انداز میں بیان ہو تو زیادہ مزہ آئے گا اس لیے وہی لب ولہجہ، وہی انداز بیان اپناتے ہیں۔

☆......☆

رات کی فسوں خیزی اپنے عروج پہ تھی۔ چاروں طرف چھایا اندھیرا جیسے سب کچھ نگلنے کی فکر میں تھا مگر چاند کے آگے اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ سو منہ چھپا کر کونے

کھدروں میں جا چھپا تھا۔ اماں جی اور بابا جان کو کھانا دے کے اس نے کچن سمیٹا اور اوپر چلی آئی۔ آج اس کا کھانا کھانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔ شام پانچ بجے سامنے گھر سے چنے والے چاول آئے تھے جو اس نے ہلکی بھوک محسوس ہونے پہ اسی وقت کھا لیے۔ شاید اسی وجہ سے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔

ہلکی ٹھنڈک لیے سبک ہوا اس کا پیلا آنچل دور تک اڑا رہی تھی۔ تاروں کے جھرمٹ میں سجا چاند اس قدر شفاف تھا جیسے سارا دن ہونے والی بارش میں نہاتا رہا ہو۔ اپنی بے تکی سی سوچ پہ وہ خود مسکرا دی۔ آخری سیڑھی پہ ابھی ابھی پہنچا ساقی ساکت ہو گیا۔ اس نے سنا تھا کہ جس سے محبت ہو اس کی ہر ادا اچھی لگتی ہے۔ مگر آج سے پہلے وہ جان ہی نہیں پایا تھا کہ حنا کی مسکراہٹ اتنی خوبصورت ہے۔ حالانکہ وہ اس کے نکاح میں تھی۔ چاندنی میں ڈوبے شفاف چہرے پہ سجے عنابی ہونٹ بس ایک پل کو پھیلے تھے پھر سمٹ گئے۔

''ہوں......! تو چاند کو دیکھ کے مسکرایا جا رہا ہے۔ بڑا خوش نصیب ہے بھئی چاند تو ورنہ مجھے دیکھ کے تو تم چھپ جاتی ہو۔ جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔'' اچانک سامنے آ کر آنکھیں ٹیڑھی کرتے ہوئے شکل کو کسی حد تک خوفناک بنا کے اس نے بھاری آواز میں کہا تو وہ دوپٹا سر پہ جماتے ہوئے سنبھل کر مسکرا دی۔

''چاند ہے ہی دیکھنے کے قابل۔ پورے فلک کا بلا شرکت غیرے بے تاج بادشاہ تب ہی تو ساری دنیا اسے بے خود ہو کے دیکھتی ہے۔ تارے بھی تو ہیں فلک پہ مگر انہیں کوئی نہیں دیکھتا۔'' چاند پہ نظر جمائے اس نے مسکرا کے کہا تو ساقی بھی ہنس دیا۔

''جیسے تم ثاقب شاہ کے دل کی بے تاج ملکہ ہو۔ ایسے ہی یہ آسمان بھی پورا اس چاند نے ہتھیایا ہوا ہے۔ بے چارے ستاروں کو کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ ہے نا۔'' منڈیر سے ٹیک لگائے ساقی نے آنکھوں میں شوق کا جہان آباد کیے اسے دیکھا تو وہ طنزیہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ پہ ساقی نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''ٹھیک کہا تم نے ساقی، بے تاج ملکہ ہی تو ہوں میں کیونکہ تاج تو کیا تم مجھے چھوٹی سی نوز پن بنا کے دینے کے بھی قابل نہیں ہو کیونکہ تمہارا یہ جذباتی پن ختم ہو تو تم کہیں سنجیدگی سے کام سیکھو نا۔ بڑا شوق چرایا تھا سنار بننے کا۔ اتنی جلدی اتر گیا؟ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ تمہاری وجہ سے تایا جی کتنے پریشان رہتے ہیں۔'' سنجیدگی سے اسے سمجھاتی اب وہ چھت پہ پڑی کین کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پہ بیٹھ گئی۔

''تمہیں کس نے بتایا، عنایہ بھابی نے؟ جذباتی ہونے میں اور غیرت مند ہونے میں فرق ہوتا ہے حنا! شیخ صاحب کا بیٹا مجھے ذرا ذرا سی غلطی پہ ٹوکتا تھا یہ بات میری برداشت سے باہر تھی۔ میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔'' اکھڑ لہجے میں کہتے ہوئے وہ کرسی گھسیٹ کے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔

''ساقی! تم وہاں سیکھنے جاتے ہو۔ ان کا فرض ہے کہ تمہاری غلطی پہ ٹوک کر تمہیں کام کا صحیح طریقہ سمجھائیں۔ اور ویسے بھی اتنے مہینوں کے بعد تمہیں یاد آیا کہ شیخ صاحب کا بیٹا تمہیں ذلیل کرتا ہے۔ جبکہ تم آدھے سے زیادہ کام سیکھ چکے ہو۔'' سنجیدہ لہجے میں سمجھاتے ہوئے وہ آخر میں تلخ ہو گئی۔

''میں جانتا تھا۔ تم بھی مجھے ہی غلط سمجھتی ہو۔ سمجھانے اور طنز کرنے میں فرق ہوتا ہے حنا! خیر ان کا بھی قصور نہیں ہمارے ابا جان نے ہی شیخ صاحب کے سامنے میرے جذباتی پن کی ایسی تصویر کھینچی تھی کہ پاس بیٹھا ان کا بیٹا مسکراتے ہوئے جو مجھے کام کے بارے میں غیر سنجیدہ سمجھا۔ تو میرے ٹھیک کام میں بھی کیڑے نکالتا رہا پھر اس کی طنزیہ مسکراہٹ...... بہرحال تم سب کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں سنار کا کام سیکھوں گا بھی اور کامیاب بھی ہوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ تم سب کے خدشات غلط ہیں۔'' غصے سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ ہاتھوں میں سر تھام کر رہ گئی۔

ظہیر شاہ اور عتیق شاہ دو ہی بھائی تھے۔ جدی پشتی سید تھے۔ آباؤ اجداد کی کافی جاگیریں تھیں جو رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں۔ ان کے سب کزن ادھر ادھر بکھر گئے، جاگیریں بھی بٹ گئیں۔ کچھ سب کچھ بیچ کے باہر چلے گئے۔ کچھ نے کاروبار سیٹ کر لیے۔ اب ان کے حصے میں اس حویلی کا ایک حصہ اور کافی زمینیں آئی تھیں۔ چونکہ اس حویلی سے دونوں بھائیوں کو انسیت تھی اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سید امداد حسین اور ان کے بھائی جو اس حویلی کے باقی حصوں کے مالک تھے۔ ان سے یہ حویلی خرید لی جائے۔ چنانچہ آدھی زمینیں بیچ کے پوری حویلی خرید لی گئی۔ باقی ماندہ زمینیں بیچ کر بڑی سی کپڑے کی دکان ڈالی گئی جس کی آمدن

بہت اچھی تھی دونوں گھروں کا خرچ باآسانی چلتا تھا بلکہ کچھ پیسا پس انداز بھی ہو رہا تھا اور یہ دونوں بھائی اتنے میں ہی خوش تھے۔ چونکہ دونوں بھائیوں کی بیویاں بھی آپس میں بہنیں تھیں اس لیے گھر میں روایتی کلیش نہ ہونے کے برابر تھا۔

ظہیر شاہ کی شادی پہلے فریدہ خاتون سے ہوئی تھی جو شادی کے دو سال بعد ہی ہیپاٹائٹس کے موذی مرض سے لڑتے لڑتے جان ہار گئیں تھیں۔ ظہیر شاہ جیسے ڈھے سے گئے۔ سمجھ ہی نہ پاتے تھے کہ اپنے آپ کو سنبھالیں یا ایک سال کے ننھے زبین کو سنبھالیں۔ بوڑھی ماں کو جب زبین شاہ کے کام کرتے دیکھتے تو کڑھ کے رہ جاتے۔

پھر تقدیر مہربان ہوئی تو عتیق کے لیے لڑکی دیکھنے گئی سیدہ خاتون کو اس گھر کی دونوں لڑکیاں پسند آ گئیں۔ گو ظہیر پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے والے تھے مگر پھر بھی ان کی شاندار رعب داب والی شخصیت اور خوبیوں سے مزین شخصیت نے لڑکی والوں کو اعتراض کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان کی شرافت اور نرم گفتاری کا ڈنکا پورے علاقے میں بجتا تھا۔ سونے پہ سہاگا ان کی ذات تھی۔ سید خاندان میں بیٹیاں بیاہنا انہیں اعزاز لگا۔ یوں جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے فارمولے پہ عمل کرتے ہوئے دو ماہ کے اندر دونوں بہویں بیاہ کے گھر آ گئیں۔ جہاں ظہیر شاہ کو رب نے ثاقب شاہ کی شکل میں ایک اور بیٹے سے نوازا وہیں عتیق شاہ کو بھی دو بیٹیوں سے نواز کر والد ہونے کا درجہ دیا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ وقت گزرنے کا احساس بچوں کے بڑھتے قد سے ہوتا تھا۔ دونوں گھروں کے بچے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ زندگی اگر خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔ زبین شاہ واجبی سی تعلیم حاصل کر کے باپ کے ساتھ دکان پہ بیٹھنے لگا تھا کہ ناہید جھولی پھیلائے کلثوم بیگم کے سامنے آ بیٹھیں اور عنایہ کو زبین کے لیے مانگ کے ہی اٹھیں۔ عنایہ میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ چکی تھی۔

ایک بار پھر حویلی کے درودیوار سجے تھے۔ عنایہ دلہن بن کے اپنے ہی آنگن کے دوسرے کمرے میں اتری تھی۔ حنا تب پڑھ رہی تھی۔ اسی شب حنا اور ثاقب عرف ساقی کا نکاح کر دیا گیا۔ رخصتی ساقی کے سیٹ ہونے اور حنا کے تعلیم مکمل کرنے کے بعد رکھی گئی۔ سب خوش تھے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

☆......☆

"سنو صاحبزادے کہاں کی تیاری ہے صبح صبح، دکان جانا تو تم چھوڑ چکے ہو۔ کیوں کہ بقول تمہارے وہاں سب تمہاری توہین کرتے ہیں۔ اور تم تو مل اونر کے بیٹے ہو۔ بھلا کسی کا ٹوکنا کیسے برداشت کر سکتے ہو۔" وہ تیار ہو کے تیزی سے باہر کی طرف جا رہا تھا جب لان میں بچھی کرسیوں پہ بیٹھے صبح کی چائے پیتے ابا نے نہایت طنزیہ لہجے میں پکارا۔ اس کے قدم جہاں کے تہاں تھم گئے۔ کبھی کبھی اسے ابا کا رویہ بہت دکھی کر دیتا تھا۔

"ابا ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں اس کو......" وہ ابھی اتنا ہی بول پایا تھا کہ ابا نے بات کاٹ دی۔

"چہ خوب دوستوں سے ملنے سے ہی فرصت نہیں، اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے جناب نے کیا یونہی اپنے جذباتی پن کے ہاتھوں برباد ہوتے رہو گے؟ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ میرا یعنی سید ظہیر شاہ کا بیٹا اتنا جلد باز اور جذباتی فیصلے کرنے والا ہو گا۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ شیخ صاحب نے مجھے کتنی باتیں سنائی ہیں آ کے؟ تمہاری یہ ہی حرکتیں رہیں تو مجھے تمہیں عاق کرنا پڑے گا۔" ناشتے کا پوچھنے آتی ناہید ظہیر شاہ کے آخری الفاظ سن کے دہل گئیں۔

"خدا نہ کرے سید صاحب! کیسی باتیں نکال رہے ہیں منہ سے، ساقی اپنی ذمہ داری سمجھنے والا سمجھدار بچہ ہے۔" ناراض لہجے میں کہتی ناہید نے بیٹے کا دفاع کیا تو ظہیر شاہ اور بھڑک اٹھے۔

"ساری شہہ تمہاری ہے ناہید بیگم! چھ فٹ کا گھوڑا ہو گیا ہے، ابھی بھی بچہ بنا رکھا ہے تم نے اسے۔ اس کی عمر میں زبین نے میرے ساتھ دکان جانا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ یہ ہے کہ نہ پڑھائی کے میدان میں کوئی جھنڈا گاڑا نہ ہی عملی زندگی میں کوئی فیصلہ سوچ سمجھ کے کیا۔ دکان پہ بیٹھنا اسے گوارا نہیں، ڈاکٹر صاحب کے پاس کمپوڈری کرنا اس کی شان کے خلاف ہے۔ اب سنار کا کام سیکھنے کا شوق چرایا ہے تو وہ بیچ میں چھوڑ دیا۔ آخر چاہتا کیا ہے یہ؟ کیا ضرورت تھی شیخ صاحب کے بیٹے سے الجھنے کی۔" جلال میں ان کی آواز بلند ہو گئی تو زبین شاہ بھی لان میں چلا آیا۔ ماں کو زیرعتاب دیکھ کے ساقی کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"ابا میں یہی تو آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے دوست سے بات کر لی ہے۔ اس کے ماموں کی مال روڈ پہ سنار کی دکان ہے۔ وہ ان سے کام سیکھ رہا ہے، میں بھی اس کے ساتھ ہی جایا کروں گا۔" رسان سے کہتے وہ دہلیز

عبور کر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ سامنے رہے گا ابا کا غصہ کم نہیں ہوگا۔ وہ حتیٰ الامکان کوشش کرتا تھا کہ وہ ابا کے سامنے اپنا ضبط نہ کھوئے اسی وجہ سے وہ ابا کے غصے کے سامنے نہیں رکتا تھا۔

''دیکھا ابا! شروع سے یہ لڑکا ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کی نظر میں آپ کی بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہر بار وہ آپ کی بات کو یونہی نظر انداز کر دیتا ہے۔'' پاس پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے زبین شاہ نے جلتی پہ تیل ڈالا۔ ظہیر شاہ نے ہنکارہ بھرتے ہوئے گھور کر کچن کی طرف جاتی ناہید بیگم کو دیکھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ اب وہ میری بات رک کے سننا بھی پسند نہیں کرتا اور یہ کس کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے یہ بھی جانتا ہوں۔'' بات مکمل کرتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو زبین شاہ کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے سب کچھ سنتی حنا تپ اٹھی۔ زبین شاہ نے کبھی بھی ناہید کو ماں نہیں مانا تھا۔ جب اس نے میٹرک کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہا تو ناہید نے اسے بہت سمجھایا، تعلیم کی اہمیت کے بارے میں بتایا مگر وہ سمجھ کے نہ دیا۔ وہ باپ کے سمجھانے پہ شاید تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر لیتا مگر اس نے ضد میں باپ کے ساتھ دکان جانا شروع کر دیا۔ ناہید بیگم چیختی ہی رہ گئیں۔ وہ زبین شاہ سے ثاقب شاہ جیسی ہی محبت کرتی تھیں مگر زبین شاہ کی ضد کے آگے ان کی ایک نہیں چلی۔ کچھ ہی عرصے میں زبین شاہ نے ظہیر صاحب سے کچھ پیسے لے کر اپنا ریڈی میڈ گارمنٹس کا بزنس شروع کیا تھا جو کہ معقول آمدنی دے رہا تھا۔ نئی نئی کمائی کا غرور گویا ان دنوں وہ فلک پہ اڑتا تھا۔ ساقی جیسے نکھے اور ہڈحرام تو اسے زمین کے کیڑے لگتے۔ ظہیر صاحب بھی جیسے سینہ تانے تفاخر سے بھرتے۔ لیکن ساقی کی حرکتیں انہیں اتنا ہی تپا دیتیں۔

☆......☆

زندگی انسان کو ایسے موڑ پر بھی لے آتی ہے جہاں کھلی آنکھوں سے بھی اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔ بے بسی کے ایسے ہی مقام پہ آج کل حنا اپنے آپ کو محسوس کر رہی تھی۔ تایا جان کی فکر اپنی جگہ مگر ثاقب بھی اسے غلط نہیں لگتا تھا۔

اس وقت بھی چائے بناتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الجھ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ چھوٹی سی بات کو اس قدر طول دیا جا رہا ہے۔ تایا جی ثاقب کے خلاف بدگمانی کیوں پالے بیٹھے ہیں؟ چائے بن چکی تھی۔ دو کپ چائے کپوں میں انڈیل کے کپ ٹرے میں سیٹ کرتی وہ اماں کے کمرے میں چلی آئی۔ بے دھیانی سے ٹیبل پہ ٹرے رکھتے ہوئے چائے چھلک گئی۔ کلثوم بیگم نے غور سے اس کے الجھنوں میں اٹے متفکر چہرے کو دیکھا۔

''حنا یہاں بیٹھو میرے پاس بیٹا! اب بتاؤ کیوں پریشان ہو؟ میں نے کہا تھا ساقی کو سمجھاؤ بات ہوئی تمہاری اس سے؟'' بیڈ پہ اپنے پاس بٹھاتے ہوئے وہ پوچھنے لگیں تو حنا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''اماں! تایا جی ایسا کیوں کرتے ہیں۔ مانا کہ ساقی تھوڑا جذباتی ہے۔ جلد باز ہے مگر برا انسان نہیں۔ وہ بھی تو تایا جی کا بیٹا ہے۔ وہ اس سے پیار کیوں نہیں کرتے۔ امی! یہ تایا جی کا رویہ ہی ہے جو ساقی کو ضد دلاتا ہے۔ جب ایک انسان کو بار بار غلط ثابت کیا جائے گا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غلط راستے پر چل دے گا کیوں کہ اس کی کسی کو فکر نہیں۔''

اس کو روتا دیکھ کے جہاں کلثوم پریشان ہو گئیں وہیں اندر داخل ہوتی عنایہ بھی ساکت ہو گئی۔ حنا میں ان ماں بیٹی کی جان تھی۔

''بعض دفعہ انسان اپنے فائدے اور نقصان کے چکر میں اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ اپنی سوچ کے برخلاف کچھ بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ تایا جی بھی یہ چاہتے ہیں کہ ساقی، زبین کی طرح ان کا بازو بنے، ان کا ہاتھ بٹائے۔ ساقی کے حوالے سے کی گئی ان کی تربیت پہ دنیا سے تعریف و توصیف سمیٹیں۔'' پاس پڑے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے عنایہ نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''عنایہ ٹھیک کہہ رہی ہے حنا نکاح کو دو سال ہونے والے ہیں۔ تمہارا گریجویشن بھی کمپلیٹ ہو گیا۔ ساقی اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدہ ہو کے کچھ سوچے تو تمہاری رخصتی کر کے میں بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔'' کلثوم بولیں تو ان کے لہجے میں ماؤں جیسی فکر تھی۔ حنا بے اختیار اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''آپی! وہ کر تو رہے ہیں کوشش۔ دیکھیں صبح بھی تایا ابا نے انہیں کتنا ڈانٹا جبکہ وہ کہہ بھی رہے تھے کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ جایا کریں گے۔ تایا جی آخر اس پہ اعتماد کیوں نہیں کرتے؟ اوپر سے زبین بھیا، تایا جی کو ساقی سے بدگمان کرتے ہیں۔ پتا نہیں انہیں ساقی سے کیا خار ہے۔'' تلخ لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڈ شیٹ کے ڈیزائن پہ شہادت کی انگلی پھیرنے لگی۔

”ایسے نہیں کہتے حنا! وہ تمہارا بہنوئی ہے۔ تمہیں زیب نہیں دیتا کہ تم اس کے بارے میں بدگمانی پالو۔ سوچ سمجھ کے بولنا سیکھو۔“ اماں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”اور جو وہ بدگمانیاں پھیلاتے پھرتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں ہے۔ ساقی اسی لیے تایا جی کے سامنے نہیں ٹھہرتے کہ غصے میں کچھ غلط نہ کہہ جائیں اور زبین بھیا نے کہہ دیا کہ وہ ان کی بات رک کے سننا پسند نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے تایا جی کو بدگمان نہیں کیا؟“ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ سیاہ سطح پہ جمی بالائی کی تہہ کیچڑ جیسی لگ رہی تھی۔ کلثوم نے کچھ کہنا چاہا مگر عنایہ نے اشارے سے منع کر دیا۔

”حنا! ٹھیک کہہ رہی ہے اماں! زبین نے کبھی بھی خالہ کو اپنی ماں کا درجہ نہیں دیا۔ شاید انسان کبھی کسی کو ماں کا درجہ دے ہی نہیں سکتا۔“

زبین غلطی پہ ہیں میں جانتی ہوں۔ تم سمجھتی ہو کہ میں انہیں سمجھاتی نہیں مگر یہ غلط ہے۔ میں ہزار کوشش کے باوجود بھی ان کے خیالات نہیں بدل پائی۔ شاید کبھی بدل بھی نہیں پاؤں گی۔ وہ خالہ کو ماں نہیں مانتے، ساقی کو بھائی کیا مانیں گے۔

وہ جب بولی تو نہایت تفصیل سے سب حالات بیان کر گئی۔ عنایہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ بھی اتنی ہی بے بس تھی جتنی حنا تھی۔

”میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اس گھر میں کبھی کوئی کلیش نہ ہو۔ اللہ زبین شاہ کو ہدایت دے اور ساقی کو کامیاب کرے۔“ تکیے کے پاس پڑی تسبیح اٹھاتے ہوئے اماں نے کہا تو بے اختیار آمین کہتے ہوئے حنا نے ٹھنڈی ہوتی چائے کی ٹرے اٹھالی۔

”ارے یہ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ میں اور بنا کے لاتی ہوں۔ آپی تم پیو گی؟“ عنایہ کے اثبات میں سر ہلانے پہ وہ کچن میں چلی گئی۔ عنایہ بھی اٹھ کے اس کے پیچھے ہو لی۔

☆......☆

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ وقت اپنے ساتھ سب ناراضگیاں ساری اداسیاں بہالے گیا۔ ساقی نے مکمل کام سیکھ لیا تھا۔ اب وہ چلتے ہوئے بازار میں کاروبار جمانے کے لیے دکان ڈھونڈ رہا تھا۔ وہیں اس کے بڑے اس کی شادی کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ ایک مہینے بعد کی تاریخ ٹھہرا دی گئی تھی...... ساون آگیا تھا۔ ان ہی دنوں عنایہ کے امید سے ہونے کی خبر نے ان کی خوشیاں دوبالا کر دی تھیں۔ دو سال بعد ملنے والی اس خوشخبری کے تقریباً سب ہی منتظر تھے۔ زبین شاہ بھی بظاہر ساری ناراضگی بھول کر ساقی اور حنا کی شادی کی تیاریوں میں شریک ہو گیا۔ ویسے بھی وہ ساقی کے ساتھ کبھی برا نہیں کرتا تھا مگر اس کی غلطی بھی کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ روز ہونے والی کن من اور کبھی بے حد تیز بارشوں نے دلوں کا موسم اور بھی خوشگوار کر دیا تھا۔ اس دن بھی بارش ٹوٹ کے برسی تھی۔ اس وقت بھی سب لان چیئرز پہ بیٹھے ٹھنڈی ہوا کا مزہ لے رہے تھے۔

”آپا کپڑے تو سب تقریباً تیار ہیں۔ فرنیچر کا بھی آرڈر دے دیا ہے۔ بس اب کسی دن بچیوں کو لے کے بازار کا چکر لگانا ہے۔“ دوپٹے پہ کروشیہ بیل بناتے ہوئے کلثوم نے کہا تو ناہید خاتون نے انہیں ڈانٹ دیا۔

”کتنی بار کہا ہے۔ گھر کی بات ہے۔ گھر کے بچے ہیں کسی تیاری کی فکر میں مت پڑو۔ حنا! میری بیٹی ہے۔ اور بیٹی کو ماں کے گھر آنے کے لیے کسی جہیز کی ضرورت نہیں ہوتی، سمجھی تم۔“ کلثوم مسکرا دیں۔

”پھر بھی بھابی! بیٹی والوں کو کچھ تو تیاری کرنی پڑتی ہے۔ عنایہ کو بھی تو کچھ نہ کچھ دیا تھا نا۔ اب حنا کو کیسے خالی ہاتھ رخصت کر دیں۔ دنیا کیا کہے گی۔“ عتیق صاحب نے توجیہہ بیان کی تو کلثوم نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”اے عتیق میاں! دنیا کی بھی کیا خوب کہتے ہو۔ دنیا نے تو کبھی نبیوں پیغمبروں کو بھی جینے نہیں دیا ہم تو پھر خام ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ تمہارا بوجھ بانٹنا چاہا۔ اب اللہ نے عزت بنائی ہوئی ہے ورنہ ہم کون سے رئیس ہیں......“ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی۔ اور یہ سچ بھی تھا تمام عمر دونوں گھروں نے مل کر ہمیشہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کیا تھا۔ شروع میں بہت تنگی کے دن بھی دیکھے مگر آہستہ آہستہ کاروبار نے پھلنا پھولنا شروع کر دیا تو حالات کچھ بہتر ہوئے۔

”فکر کیوں کرتی ہیں آپا ہمارا سب کچھ ہماری بیٹیوں کا ہی تو ہے۔“ ان کی بات کے جواب میں ناہید خاموش رہیں تو کلثوم بات کو سمیٹتے ہوئے اندر چلی گئیں۔

”حنا! بن گئی سبزی؟ مٹر میں قیمہ ڈال لینا ساقی کو بہت پسند ہے۔ اور سنو دال چاول بھی لازمی بنانا جانتی تو ہو زبین قیمہ نہیں کھاتا چڑ جائے گا قیمہ دیکھ کے۔“ اسے مٹر نکالتا دیکھ کے کلثوم نے کہا تو وہ جو اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی مٹر نکال رہی تھی چونک اٹھی۔

"بابا! چلے گئے دکان پہ؟ میں نے سودے کی لسٹ بنائی تھی۔ گھر کا سارا سودا ختم ہے۔ انہیں دے دیں لسٹ، واپسی پہ سامان لیتے آئیں یاد سے۔" یاد دلا کے وہ پیاز کاٹنے لگی۔

"نہیں ابھی تو بیٹھے ہیں۔ رات بھی ان کی شوگر اتنی ہائی تھی۔ دیر سے سوئے اس لیے میں نے صبح نہیں جگایا۔ اب ناشتا کر کے فارغ ہوئے ہیں بس نکلنے ہی والے ہیں اچھا کیا یاد دلا دیا۔" کلثوم لسٹ ہاتھ میں لیے پھر باہر کو چل دیں۔ عنایہ اُمید سے تھی اس لیے کچن میں اس کی انٹری بند تھی۔ کلثوم اور ناہید بیگم جہیز کے کپڑوں کے بعد بری کے کپڑوں کی تیاری میں مگن تھیں اس لیے کچن مکمل طور پر حنا کی ذمہ داری بن گیا تھا۔ سبزی بن گئی تھی۔ وہ پسینے سے تقریباً نہا رہی تھی۔ باہر موسم خوش گوار تھا مگر کمروں میں اور کچن میں بلا کی گھٹن تھی۔ اس نے سبزی دھو کر شیلف پہ رکھی پتیلی میں آئل اور پیاز ڈالا اور جیسے ہی فریج سے ادرک لہسن کا پیسٹ لے کر پلٹی سامنے ساقی آ گیا۔

"حنا......! تم نے دیکھا ہے کبھی پھول پہ جب شبنم گرتی ہے وہ کتنا خوبصورت لگتا ہے؟" وہ جو جلد از جلد کام نمٹا کر اندر جانے کا سوچ رہی تھی۔ اس اچانک در آنے والی رکاوٹ پہ جز بز ہو گئی۔ اس پہ مصداق ساقی کا بے تکا سوال۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے اوٹ پٹانگ سوالات کا جواب دینے کا، راستے سے ہٹیں۔ ابھی تو مجھے دیکھنے دیں پیاز نہ جل جائے۔" وہ اسے ہٹانے لگی تو اس نے پیچھے چھپایا آئینہ سامنے کر دیا۔ پسینے میں ڈوبا اس کا چہرہ سامنے تھا۔ سیاہ رنگ کے لان کے چرمرائے ہوئے سوٹ میں بھی وہ بہت خاص لگ رہی تھی۔

"دیکھو شبنم میں نہایا پھول کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ اتنا خوبصورت کہ دیکھنے والا بس دیکھتا رہ جائے اور پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔" آنکھیں موندے جذب سے کہتا وہ آئینہ تھامے کھڑا اسے بہت اپنا سا لگا۔

"ہٹیں راستے سے۔ الٹی سیدھی حرکتوں کے علاوہ کوئی کام آتا ہے؟" شرماتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔ تو وہ اور شوخ ہوا۔

"غالب نے کیا خوب کہا ہے کہ

"عشق نے کر دیا نکما غالب
ورنہ آدمی تھے ہم بھی کام کے"

لہک لہک کے شعر پڑھتے ہوئے فریج سے سیب نکال کے کھاتا وہ شیلف پہ بیٹھ گیا۔

"کوئی بات ہے تو کریں ورنہ مجھے کام کرنے دیں۔ جلدی سے کھانا بنا لوں بہت گرمی ہے آج کچن میں۔" سیاہ آنچل سے ماتھا صاف کرتے وہ پوری طرح سبزی کی طرف متوجہ تھی۔

"تم پہ سیاہ رنگ بہت جچتا ہے، پہنا کرو۔" وہ جانتا تھا اب وہ چڑ جائے گی۔ اور ہوا بھی یہ ہی۔

"اگر آپ کو ایسی ہی بے تکی ہانکتے رہنا ہے تو پلیز جائیں یہاں سے مجھے ابھی بہت کام ہے۔" کہتے ہی وہ اسے باہر دھکیلنے لگی تو ہڑبڑا گیا۔

"ارے رکو سنو تو ایک خوشخبری سنانی تھی تمہیں۔ مجھے دکان مل گئی ہے۔ بس میں جلد ہی احمد کے ساتھ مل کے اپنی دکان سیٹ کر لوں گا۔" سنجیدہ ہوتے ہوئے اس نے اپنی دانست میں حنا کو خوشخبری سنائی تھی مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں چنداں فرق نہ آیا۔

"تم اپنا بزنس سیٹ کر رہے ہو۔ جبکہ زبین بھیا اپنا بزنس سیٹ کر چکے ہیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ ابا اور تایا ابا دکان اکیلے کیسے سنبھالیں گے۔" وہ ایسی ہی تھی ہمیشہ ہر ایک کا خیال رکھنے والی، ساقی بے اختیار مسکرا دیا۔

"ہر ایک کا خیال ہوتا ہے تمہیں۔ کتنی اچھی ہو تم۔ پتا ہے میں رب کا کتنا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے تم جیسی احساس والی شریک حیات میرے نصیب میں لکھی۔ ابا اور چچا کے بارے میں ہلکان مت ہو، ایک تو زبین بھیا کی دکان بھی ان کے پاس ہی ہے دوسرا میں نے بھی اسی ایریے میں دکان ڈھونڈ لی ہے۔ نہیں مشکل ہو گی تمہارے ابا جی اور سسر جی کو۔" تفصیل سے جواب دیتا وہ شوخ ہوا تو سبزی کو پانی کا چھینٹا دے کے دم لگاتی حنا مسکرا دی۔

"نہیں جی وہ میرے تایا جی ہیں اور تایا جی کے لیے پریشان ہونا تو حق بنتا ہے میرا۔" تایا جی پہ زور دیتے ہوئے وہ دال اور چاول نکال کر لان میں چلی آئی۔ ساقی بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔ کلثوم اور ناہید لاؤنج میں سر جوڑے بیٹھی نہ جانے کس صلاح مشورے میں مصروف تھیں۔ سبک ہوا میں ٹھنڈک ابھی بھی موجود تھی۔ لان چیئر پہ بیٹھتے ہی سامنے بیٹھے ساقی کو دال کا تھال پکڑا دیا۔

"جانا تو کہیں ہے نہیں چلیں یہ دال چنیں" مزے سے چاول بینتے ہوئے اس نے ساقی کو چڑایا تو وہ برا سا منہ

بنا کر دال کے تھال پہ جھک گیا۔ کھڑکی سے انہیں دیکھتی ان کی مائیں اندر تک سرشار ہو گئیں۔ قسمت بھی کہیں آس پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☆......☆

کہتے ہیں نا کہ درد کی ایک رات خوشیوں کے ہزار دنوں سے لمبی ہوتی ہے۔ ان کی خوشیوں کے تو دن بھی ہزار سے کم تھے۔ وہ بھی پر لگا کے اڑ گئے۔ شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ ان دنوں سب خوشی کو بھرپور انداز میں محسوس کر رہے تھے۔

بس زبین شاہ کچھ الجھا الجھا سا تھا۔ رات کو لیٹ آنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اس لیے سب رات گئے سوتے تھے۔ عنایہ جب بھی پوچھتی اسے ڈانٹ کے بھگا دیتا۔ یہ بات سب نے محسوس کی، کئی بار پوچھا بھی مگر سیر حاصل جواب نہ ملا تو سب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ آج بھی رات کے بارہ بج رہے تھے جب اس نے گھر میں قدم رکھا۔ لاؤنج میں محفل جمی تھی۔ ناہید بیگم اور کلثوم بیگم قالین پہ بیٹھیں خوش گپیوں کے درمیان بری اور جہیز کے جوڑے ٹانک رہی تھیں۔ ساتھ ہی بیٹھیں حنا اور عنایہ ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں جب کہ ٹی وی آن تھا۔ ظہیر شاہ اور عتیق شاہ صوفے پہ بیٹھے خبریں سن کے ان پہ تبصرے کرنے پہ مصروف تھے۔ عنایہ فوراً اٹھی تھی، کچن میں جا کے کھانا گرم کرتی زبین کے عجیب و غریب رویے پہ الجھتی رہی۔ آج اس نے سوچ رکھا تھا۔ جو بھی ہو جائے زبین کے اس رویے کی وجہ جان کے رہے گی۔

بریانی مائکرو ویو میں رکھتے ہوئے اس نے کباب تلنے شروع کر دیئے۔ رائتے سلاد والی پلیٹیں ٹرے میں سیٹ کر کے وہ بریانی نکالتی، مزی کباب تلے جا چکے تھے۔ ٹرے میں سب سیٹ کرتی جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی ٹھٹک گئی۔ زبین جوتوں سمیت بیڈ پہ اوندھا لیٹا تھا۔

''یہ لیں زبین کھانا آ گیا۔ آپ نے ابھی تک ہاتھ نہیں دھوئے، چلیں جلدی سے ہاتھ دھو لیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' بیڈروم صوفے کے سامنے رکھے ٹیبل پہ کھانا رکھے وہ خوشگوار لہجے میں بولی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''زبین اٹھیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اس نے پکارتے ہوئے زبین شاہ کا کاندھا ہلایا تو وہ ایسے اٹھا جیسے اسے کرنٹ چھو گیا ہو۔

''کیا مصیبت ہے۔ نظر نہیں آ رہا تمہیں جاہل عورت، تھکا ہوا آیا ہوں میں۔ دو گھڑی لیٹنا بھی عذاب ہے اس گھر میں۔ کھانا کہیں بھاگا جا رہا ہے کیا۔'' شیر کی طرح دھاڑتا وہ اٹھ کے باتھ روم میں چلا گیا۔ زبین کبھی اتنی تلخی سے نہیں بولتا تھا۔ چند دن سے وہ بہت بیزار رہنے لگا تھا۔ روز ایسا ہی ہوتا تھا۔ عنایہ بھی آنسو چھپائے جلد لاؤنج میں بھاگ جاتی جہاں سب خوش گپیوں میں مصروف ہوتے۔ جب وہ کمرے میں آتی تو زبین سو چکا ہوتا اور علی الصبح گھر سے نکل جاتا۔ وہ ہاتھ دھو کے آیا تو عنایہ کو صوفے پہ جما دیکھ کے مسکرایا۔ کیوں کہ وہ عنایہ کو ڈانٹ کے خود بھی دکھی ہو جاتا تھا مگر اسے بات کرنے کا موقع اسی لیے نہیں دیتا تھا کہ وہ اسے دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''آخر وہ کیا بات ہے جو آپ کو اس قدر پریشان کر رہی ہے کہ آپ مجھ سے بھی خفا رہنے لگے ہیں؟'' اسے کھانا شروع کرتے دیکھ کے عنایہ نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''عورت کا کام ہوتا ہے گھر سنبھالنا اور تم اپنی دلچسپی گھر تک ہی محدود کرو تو اچھا ہو گا تمہارے لیے بھی تم۔'' پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ سخت لہجے میں بولا تو عنایہ زچ ہو گئی۔

''عورت کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی پریشانیاں بانٹے، اسے اپنی بساط کے مطابق درست مشورہ دے۔'' تحمل سے بات کا آغاز کرتے ہوئے وہ اس وقت زبین شاہ کو بہت بری لگی۔ وہ اپنی پریشانیاں شروع سے خود حل کرتا آیا تھا۔ اس کی کسی غلطی یا کمزوری کو بنیاد بنا کے کوئی اسے کچھ کہے اسے برداشت ہی نہیں تھا اسی لیے وہ اپنی پریشانیوں کو دل کی قبر میں دفنائے رکھتا تھا۔ اپنی غلطیاں چھپانا اس کی عادت بن چکا تھا۔ ابھی بھی وہ اسے کینہ توز نظروں سے گھورتا ہوا ڈانٹنے لگا۔

''گھر میں شادی ہے۔ سو کام ہیں۔ تم سب کام امی اور چاچی پہ چھوڑ کے میرا دماغ ہی چاٹنے کیوں بیٹھی ہو۔ جاؤ جا کے ان کا ہاتھ بٹاؤ۔'' عنایہ نے ایک بے بس نظر اس پہ ڈالی۔ وہ ہنوز رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ یوں جیسے سارے دن کا بھوکا ہو۔

''ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں، مگر صرف مجھے ایک بات بتا دیں۔ آپ اتنے دن سے پریشان ہیں۔ میرے پوچھنے پہ مجھے اتنا ڈانٹ دیتے ہیں۔ صرف اتنا بتا دیں کہ اتنے دن غصہ کرنے سے آپ کا مسئلہ حل ہوا؟ نہیں نا۔ مجھے بتا دیں شاید کوئی حل نکل آئے۔ باقی آپ بے فکر رہیں

جو بھی بات ہو گی آپ کے اور میرے درمیان رہے گی۔ آگے آپ کی مرضی۔'' گیند اس کے کورٹ میں پھینک کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''رکو! یہاں بیٹھو میری بات سنو۔'' ٹرے میں پڑے کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے پُرسوچ انداز میں عنایہ کو پکارا تو وہ مسکرا کر پلٹ آئی۔

''دیکھو گھر میں شادی کا ماحول ہے۔ میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا اس لیے جو بھی میں تم سے کہوں وعدہ کرو کسی کے سامنے نہیں کہو گی۔'' اسے بازو سے پکڑ کے بیڈ پہ بٹھاتا وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ عنایہ نے پُرسکون سانس لی۔ اب وہ چاہے اس کی پریشانی حل کر پائے یا نہیں زبین کے دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہو جائے گا۔

''عنایہ! جب میں نے اپنا بزنس شروع کیا تھا تب ابا جی نے مجھے جو رقم دی تھی وہ رقم بزنس کے لیے ناکافی تھی۔ میں نے ابا جی سے نہیں کہا۔ اپنے دوست عمیر سے پانچ لاکھ ادھار لے لیے۔ سوچا یہی تھا کہ بہت جلد کما کر یہ ادھار چکتا کر دوں گا مگر......'' وہ ایک پل کے لیے رکا تو عنایہ بے تابی سے بولی۔

''مگر کیا زبین؟'' نجانے کیوں، عنایہ کو اس پل لگا کہ کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔

''تم تو جانتی ہو عنایہ! عمیر جاب کرتا ہے۔ اسے گھر سے حصہ ملا وہ اس دن بینک میں رکھوانے والا تھا کیونکہ اس کی اچھی جاب تھی۔ فوری اسے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تب پریشان تھا۔ میں نے ذکر کیا تو اس نے فوراً پانچ لاکھ لاکے میرے ہاتھ پہ رکھ دیے۔ اب جب کہ میں پیسا بزنس میں انویسٹ کر چکا ہوں تو وہ پیسے واپس مانگ رہا ہے۔ میری دکان کے کئی چکر لگا چکا ہے۔ دھمکیاں دے رہا ہے کہ ابا اور چچا کو بتا دے گا اور یہ تو میں قیامت تک نہیں چاہوں گا کہ میں ابا اور چچا کی نظروں میں گروں۔'' شہادت کی انگلی سے پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔

''آپ نے اس سے رقم لی تھی تو سال دو سال کا وقت بھی تو مانگتے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ کسی کو قرض دے کے چند ماہ میں ہی واپسی کا تقاضا کر دیا جائے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ وہ غنڈا ٹائپ ہے اس سے دوستی چھوڑ دیں۔ ایسے لوگ کسی کے نہیں ہوتے مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔'' صورتِ حال واقعی سنگین تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شادی کے گھر میں کوئی بدمزگی ہو۔ ایک پل کے لیے اسے زبین پہ بے حد غصہ آیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ وہ یاروں کا یار ہے۔ میرے ایک ہی بار کہنے پہ اس نے مجھے رقم پکڑا دی۔ اصل میں اس کے بھائی چاہتے ہیں کہ اب جبکہ وہ اپنا حصہ لے چکا ہے تو اپنا الگ گھر لے کے اپنے بیوی بچے لے جائے۔ اس پہ طرہ یہ کہ اس کی جاب بھی چلی گئی ہے۔ اس کے بھائی اسے مہلت دینے پہ تیار نہیں اور وہ مجھے۔ میں جتنا اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہوں اتنا ہی الجھ رہا ہوں۔ وہ کل پھر آئے گا۔'' شکست خوردہ سا انداز آخر میں سرگوشی میں ڈھل گیا۔ جیسے آنے والا وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی پوری دہشت لیے کھڑا ہو۔

''اس کا ایک ہی حل ہے۔ آپ کل دکان ہی مت جائیں ویسے بھی سب کو پتا ہے گھر میں شادی ہے۔ کوئی پوچھے گا بھی تو آپ تھکن کا بہانہ بنا دینا۔ کل کے دن بات ٹل جائے گی تو کچھ حل سوچ لیں گے۔ میرے کچھ زیور پڑے ہیں۔ کچھ پیسے آپ دکان سے نکال لینا لیکن اس میں کچھ دن لگیں گے۔'' وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ زبین اب پچھتا رہا تھا کہ وہ یہ سب باتیں پہلے عنایہ سے شیئر کر لیتا تو اتنے دن پریشان نہ پھرتا۔ اس رات وہ بہت پُرسکون ہو کے سویا تھا۔

☆......☆

اگلی صبح بڑی عجیب سی تھی۔ موسم عجیب سی گھٹن لیے ہوئے تھا۔ آسمان نہ برس رہا تھا نہ صاف ہو رہا تھا۔ زرد زرد فضا جیسے ساکت تھی۔ ساقی آج کل دکان سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔ روز نکل جاتا مگر آج ناہید خاتون نے روک لیا۔

''لو دیکھو بھلا شادی کو چند دن رہ گئے ہیں اور ان صاحبزادے کی مصروفیات ہی ختم نہیں ہو رہیں۔ ارے میں پوچھتی ہوں شادی والے دن کیا پہن کے جاؤ گے دھوتی کرتہ؟''

لائٹ پنک شرٹ اور بلیک پینٹ میں نک سک سے تیار وہ لاؤنج میں ماں کی دعا لینے آیا تو وہ اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئیں، وہ مسکرا کے رہ گیا۔ تیار ہو کے گھر بیٹھنا اسے برا لگ رہا تھا۔

''ارے خالہ میرا بھائی اتنا پیارا ہے کہ دھوتی کرتے میں بھی کسی ریاست کا راجا ہی لگے گا۔'' پاس ہی ڈسٹنگ میں مصروف عنایہ نے محبت پاش نظروں سے ساقی کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دیا۔

"جیو بھابی! بہن ہو تو آپ کے جیسی۔" ناہید کے پاس صوفے پہ بیٹھتے ہوئے سرشار لہجے میں دعا دیتے اس نے سامنے پڑی ٹھنڈے میٹھے تربوز کی پلیٹ اٹھالی۔

"میں کہہ رہی تھی کہ آج زبین بھی گھر پہ ہے۔ دونوں بھائی جانا، جا کے اپنا شادی کا جوڑا لے آنا۔ کل میں حنا کے ساتھ تمہارا جوڑا بھی لینے گئی تھی۔ مجھے عنایہ نے روکا کہ تم اپنی پسند سے لوگے۔ تم ہو کہ تمہیں فرصت ہی نہیں۔" اسے ڈپٹ کر حکم سناتے ہوئے وہ کشن کور چینج کرنے لگیں تو وہ چہکا۔

"واہ جی واہ آج میں کیا سن رہا ہوں۔ زبین بھیا گھر پہ ہیں یہ سورج کہاں سے نکلا دیکھوں ذرا۔" صوفے کی پشت پہ موجود کھڑکی سے پردہ ہٹاتے ہوئے وہ اچک کے دیکھنے کی سعی کرنے لگا۔

"جناب! سورج ادھر نہیں ادھر سے نکلا ہے۔ دیکھ لو اصل میں کئی دن سے کام کا بہت بوجھ تھا۔ تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے سوچا آج چھٹی کر لی جائے۔" زبین کسلمندی سے جمائی لیتے ہوئے پاس پڑے صوفے پہ بیٹھ کے وضاحت دینے لگا تو اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"بہت اچھا کیا زبین بیٹا تم نے، کام کو اتنا بھی سر پہ سوار نہیں کرنا چاہئے کہ اعصاب ہی تھک جائیں۔ ویسے بھی شادی والا گھر ہے سو کام ہیں۔ ابھی تک اس نکمے نے شادی کا جوڑا تک نہیں لیا اپنا، آج اس کے ساتھ ذرا شاپنگ کر آنا۔ دو لوگ ہوں تو شاپنگ میں ایک دوسرے کو مشورہ دے لیتے ہیں۔" ناہید بیگم نے اسے شاپنگ پہ ساتھ جانے کا کہا تو زبین کے چہرے پہ سوچ کے سائے لہرائے۔ اس نے فوراً عنایہ کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ اب کیا کروں، عنایہ آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"جائیں گے کیوں نہیں، ویسے بھی ایک دو گھنٹے کا ہی تو کام ہے کون سا زیادہ چیزیں لینی ہیں۔" عنایہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ خاموش رہا۔

"بھابی! بھائی کو ناشتا تو کروا دیں۔ پھر جائیں گے شاپنگ پہ۔" وہیں صوفے پہ نیم دراز ہوتے ہوئے ساقی نے کہا تو عنایہ مسکراتے ہوئے کچن میں چل دی۔ زبین نے ٹی وی لگا لیا کوئی ٹاک شو چل رہا تھا۔ ناہید بیگم اٹھ کر کلثوم بیگم کے کمرے کی طرف چل دیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی جب وہ دونوں مارکیٹ پہنچے۔ بادل گرجنا شروع ہو چکے تھے۔ یکا یک آنے والے سیاہ بادلوں نے فضا کو اندھیرے میں ڈبو دیا تھا۔ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ بہت تلاش بسیار کے بعد ساقی کو کالے رنگ کی شیروانی پسند آئی۔ کالے رنگ کی شیروانی پہ لائٹ براؤن اور سنہری دھاگے سے ہوا نفیس کام شیروانی کو بہت ہی منفرد بنا رہا تھا۔ وہ شیروانی لے کے ٹرائل روم میں چلا گیا۔ زبین شاہ آس پاس سے گزرتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

"اور بھئی شہزادے بڑی شاپنگیں ہو رہی ہیں۔ ہم سمجھتے رہے ہمارے دوست کے پاس پیسا ہی کوئی نہیں۔ بھئی سچ کہتے ہیں میرے بھائی کہ پیسوں کے معاملے میں کسی کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے، کسی کی بھی نیت بدل سکتی ہے۔ چاہے وہ سید ہی کیوں نا ہو۔" اونچے لمبے عمیر نے زبین شاہ کے کاندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے گہرے طنز سے کہا تو وہ پیچ وتاب کھا کے رہ گیا۔

"عمیر! چل باہر چل کے بات کرتے ہیں، یہاں لوگ ہیں۔ ہماری علاقے میں کوئی عزت ہے۔ یہاں تماشا مت بناؤ۔" زبین شاہ بے حد تلخ لہجے میں بولا۔

"ابے عزت سے بات کر رہا ہوں تو تجھے راس ہی نہیں آ رہی۔ چل باہر چل تجھے بتاتا ہوں تماشہ ہوتا کیا ہے۔" عمیر بٹ کا دماغ گھوم گیا۔ زبین کو کالر سے پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے مال سے باہر لے گیا۔ باہر اب تیز بارش برس رہی تھی۔

"اب بول نام نہاد سید زادے، حرکتیں تیری کتوں سے بھی بدتر ہیں۔ کیوں کھا کے بیٹھا ہے میرا پیسا، اور تو نے سوچا بھی کیسے کہ تو عمیر بٹ کا پیسا کھا کے بیٹھ جائے گا اور عمیر بٹ چوڑیاں پہن لے گا۔" وہ پھنکار رہا تھا۔ تیز بارش میں کھڑے زبین شاہ کا تن من جل اٹھا۔ راستے میں چلتے اِکا دُکا لوگوں نے مڑ کے دیکھا تو زبین شاہ کا دل کیا سامنے کھڑے شخص کو زندہ گاڑ دے۔

"عمیر اپنی حد مت بھول میں جلد تیرا پیسا تیرے منہ پہ ماروں گا۔ تجھے بہت سمجھایا میرے گھر والوں نے کہ غنڈوں سے دوستی اچھی نہیں وہ کسی کے نہیں ہوتے۔ وقت آنے پہ بے غیرت بن جاتے ہیں۔" دھاڑتے ہوئے وہ اسے نفرت انگیز نگاہوں سے گھورنے لگا تو بے اختیار عمیر کے منہ سے گالی نکل گئی جو سن کے زبین آپے سے باہر ہو گیا۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ سڑک پہ کھڑے لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہی کسی نے پولیس کو کال کر دی کیونکہ عمیر بٹ نے اسے دھکا دے کر تیز دھار باریک پھل والا خنجر نکال لیا تھا۔ زبین سڑک پر گرا اور موت کو دیکھ

کے گھبرا گیا۔ مجمع کے لوگ سہم کر پیچھے ہٹے ایک پل گزرتا اور چاقو زبین کے آر پار ہو جاتا۔ دفعتاً شور سن کے ساقی باہر آیا تو عمیر کو زبین پہ چاقو تانے دیکھ کے ہوش کھو بیٹھا۔ دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا مال سے باہر آیا تھا۔ سیاہ شیروانی بارش کی تیز بوچھاڑ میں تربتر ہو گئی۔ وہ ایک ہی جست میں عمیر کے سر پہ جا پہنچا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ کے اسے دھکیلتے ہوئے زبین شاہ سے دور کرنے لگا۔ عمیر پہ خون سوار تھا۔ اپنا مکروہ ارادہ پورا نا ہوتا دیکھ کے اس کے منہ سے مغلظات کا ایک طوفان نکلا اب اس کا ارادہ خنجر کو ساقی کے آر پار کرنے کا تھا مگر اس سے خنجر چھینتے ساقی کے ایک ہی جھٹکے سے خنجر عمیر کے عین دل کے مقام میں پیوست ہو گیا۔ عمیر شہ رگ کٹے اونٹ کی طرح پچھاڑیں کھانے لگا۔ کچھ لمحوں میں ہی وہ ساکت ہو چکا تھا۔ آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھتا زبین جیسے اچانک ہوش میں آیا تھا پھر اس نے وہاں سے بھاگنے میں دیر نہیں لگائی۔ حیران کھڑا ساقی دم بخود رہ گیا۔ تازہ خون بارش کے پانی میں مدغم ہونے لگا۔ اسی وقت پولیس کی گاڑی آ کے رکی تھی۔ ساقی کو یوں لگا اس کی سانس رک گئی ہو۔ اس سے وہ ہو چکا تھا جس کا وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

جانے کیوں لیکن صبح سے اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ موسم بھی تو عجیب گھٹا گھٹا سا تھا۔ وہ جان بوجھ کے اپنے آپ کو کاموں میں الجھائے ہوئے تھی۔ جبکہ دل چاہ رہا تھا کہیں بھاگ جائے بے نام سی اداسی جیسے اس کی جان کو آ رہی تھی۔

''میرا من...... کیوں تجھے چاہے میرا من......''

''اوئے ہوئے کیا بات ہے، بڑا گنگنایا جا رہا ہے۔ لگتا ہے موڈ بہت اچھا ہے آج تمہارا۔'' کچن میں آتے ہی عنایہ خوشگوار لہجے میں بولی تو وہ بھی مسکرا دی۔

''آپ کیوں کچن میں آ گئیں۔ ڈاکٹر نے آپ کو بیڈ ریسٹ بتائی ہے، بھول گئیں آپ؟ چلیں میں بھی چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔'' کھانا بن چکا تھا۔ آج اس نے ساقی کا فیورٹ آلو کوفتے کا سالن اور کھیر بنائی تھی۔ ساتھ آلو کی بھجیا اور رائتہ سلاد بھی۔ عنایہ کو دھکیلتی لاؤنج میں لے آئی جہاں ہلدی پسی جا رہی تھی۔ کلثوم خاتون کا خیال تھا کہ ہلدی گھر میں پسی گئی ہو تو دلہن پہ کمال کا نکھار آتا ہے۔ زمین پہ پیڑھی رکھے ہلدی پیستی کلثوم اور صوفے پہ بیٹھ کے حنا کے مہندی کے سوٹ پہ گوٹا لگاتی ناہید کام کے ساتھ ساتھ باتوں میں بھی مصروف تھی۔ جب کہ ایک صوفے پہ لیٹے عتیق صاحب بھی کبھی کبھی ان کی باتوں میں لقمے دے رہے تھے۔ ان کی شوگر آج پھر ٹھکانے پہ نہیں تھی سو وہ گھر تھے۔ تب ہی بادل ٹوٹ کے برسنا شروع ہو گیا، راہداری سے گزرتی حنا کا دل جانے کیوں اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا جانے کیوں بارش میں ان سنے نوحے سنائی دے رہے تھے۔ اسے وسیع و عریض لان میں چھما چھم برستی بارش کو تکتے پا کے عنایہ کی تیوری پہ بل پڑ گئے قریب جا کے بازو کھینچا تو حنا ٹپٹا کر عنایہ کے ساتھ ہو لی۔

''لیں خالہ پکڑیں اپنی بہو کو جب دیکھو کچن میں گھسی ہوتی ہے۔ اسکن کتنی خراب کر لی ہے اپنی۔ لگ رہا ہے کہ چار دن بعد اس کی شادی ہے؟'' کاہی رنگ کے لباس میں اس کی دمکتی رنگت ماند پڑ رہی تھی۔ اس پہ اس کے بکھرے بال گویا اس کو ماسی ہی ثابت کرنے پہ تلے تھے۔ اسے صوفے پہ ناہید بیگم کے قریب پٹختے ہوئے وہ شرارت سے بولی تو سب مسکرا دیے۔

ارے میں تو کتنا کہتی ہوں۔ یہ مانتی ہی نہیں، کہتی ہے ''کھانا ملازمہ گندے انداز سے بناتی ہے سو میں خود بناؤں گی۔ بہر حال میں اب اس کی نہیں سننے والی میں نے بات بھی کر لی ہے کل سے کچھ عرصے تک آئے گی کام والی۔ کھانا بھی بنا جایا کرے گی، باقی کام بھی کر دے گی۔'' تفصیل سے جواب دیتی ناہید نے سبز گوٹے سے سجا پیلا آنچل حنا کے سر پہ رکھ دیا۔

''ماشاء اللہ میری بہو کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ کیوں عتیق میاں!'' بے اختیار تعریف کرتے انہوں نے اس کا چہرہ عتیق صاحب کی طرف موڑا تو وہ پیلے دوپٹے میں دمکتا معصوم چہرہ دیکھ کے مسکرا دیے۔ کلثوم بھی مسکرا دیں۔ جبکہ عنایہ نے زور سے چٹکی حنا کے بازو پہ کاٹی۔ حنا عنایہ کو گھورتی صبر کے گھونٹ پی گئی۔

''اللہ نظر بد سے بچائے۔'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا تو بلائیں لیتی ناہید دوپٹا تہہ کرنے لگیں۔

''ویسے آپا! کافی دیر نہیں ہو گئی زبین اور ساقی کو گئے ہوئے۔ عتیق صاحب پتا کریں لڑکے کہاں رہ گئے ہیں۔ موسم بھی بہت خراب ہے اللہ خیر کرے۔'' ہلدی پس چکی تھی۔ ہاتھ دھو کے آتیں کلثوم موسم کے تیور دیکھ کے دہل گئیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو کلثوم دل تو میرا بھی ہول رہا ہے۔ ارے عتیق میاں! فون تو کریں پتا تو چلے آخر یہ لڑکے رہ

کہاں گئے ہیں۔'' فکران کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

''اوہو بھابی جان! اتنی بارش ہے رک گئے ہوں گے کسی مال میں کہ بارش رکے تو جائیں یا راستے میں ہوں گے۔'' لیٹے لیٹے سستی سے کہتے عتیق صاحب نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا تو کلثوم بیگم آگ بگولہ ہو گئیں۔

''ارے کتنے بے فکر لیٹے ہیں۔ ماں کا دل نہیں ہے نا آپ تو ہر بات کو اتنی بے فکری سے ٹال دیتے ہیں۔ جاؤ حنا لے کے آؤ ان کا موبائل۔'' حنا موبائل اٹھا لائی جو پہلے ہی بج رہا تھا۔ اس نے جلدی سے عتیق صاحب کو موبائل دیا۔

''السلام علیکم! کہاں ہو بھئی تم؟ کب سے ہم انتظار کر رہے ہیں، موسم بھی دیکھو کتنا خراب ہے۔ ایسی بھی کیا شاپنگ جو عورتوں کو مات دے۔'' ریسیو کرتے ہی انہوں نے زبین شاہ کو بے نقط سنا ڈالی جواب میں زبین شاہ نے جو کہا وہ سن کر عتیق شاہ کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ عتیق شاہ فون سنتے ہی جیسے اٹھ کے بھاگے تھے۔ پاس موجود سب خواتین کے اوسان خطا ہو گئے مگر عتیق صاحب ایک بھی بات کا جواب دیے بنا ظہیر صاحب کو فون پہ دکان کو لاک کرنے کا کہہ کے گاڑی کی چابی لے کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

اسے تھانے میں پڑے۔ دو دن ہو گئے تھے۔ ابا اور چچا ایک بار کے بعد نہیں آئے اس کی بڑی وجہ زبین کا پولیس کو دیا ہوا بیان تھا جس میں زبین شاہ کا کہنا تھا کہ ثاقب نے ذاتی دشمنی کی بنا پہ عمیر بٹ کو قتل کیا۔

اور ساقی...... وہ تو خود سے لڑ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے عمیر کو پیچھے دھکیلا ہی کیوں؟ اس سے یہ قتل ہوا کیسے۔ کیوں اس نے اس شخص کے لیے دیوانہ وار اپنی زندگی داؤ پہ لگائی جو اسے بھائی مانتا ہی نہیں تھا اور دکھ تو اس کو ابا کے رویے پہ تھا جنہیں وہ چیخ چیخ کر بتا چکا تھا کہ وہ صرف زبین شاہ کو بچانا چاہتا تھا۔

بچپن سے اپنی ہر غلطی چھپاتا زبین شاہ بھلا اب کیسے بتا دیتا کہ عمیر اسے مارنے آیا تھا۔ وہ اس شخص کے لیے باپ اور چچا کی نظروں سے گرتا جسے اس نے کبھی بھائی تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ کبھی اکیلے میں ضمیر اسے کچوکے لگاتا بھی تو وہ اسے یہ کہہ کے سلا دیتا کہ ''میں نے کب کہا تھا کہ وہ عمیر کو قتل کر دے۔ ساقی جو بھی بھگت رہا ہے اپنے جذباتی پن کی وجہ سے بھگت رہا ہے۔'' وہ فطرتاً خود غرض تھا۔ اللہ کی طرف سے سب حالات اس کے فائدے میں تھے۔ عمیر بٹ جس کا خیال ہی اس کے لیے خطرے کا باعث تھا وہ مر چکا تھا اور ساقی کا کانٹا بھی نکل چکا تھا۔ اسے یہ سب حالات غیبی مدد معلوم ہوئے۔ دوران تفتیش وہاں موجود مجمع نے ساقی کے خلاف گواہی دی جھگڑے کی اصل وجہ سے سب لاعلم تھے جب کہ زبین کے ایک بیان نے سب باتیں واضح کر دیں۔

ساقی کی شادی کا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ نہ زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹ کے گرا۔ بس ایک گھروندہ بننے سے پہلے خواب ہو گیا۔ اس کا بس ایک کام تھا۔ گھٹنوں پہ سر رکھے جیسے وہ ساری دنیا سے منہ چھپا لینا چاہتا تھا۔ ابھی بھی وہ گھٹنوں کے گرد بازوں لپیٹے درد کے مرحلوں سے گزر رہا تھا جب شوقی بدمعاش نے بے حد کرخت لہجے میں کہا۔ ''اوئے کیا لڑکیوں کی طرح منہ چھپائے پڑا رہتا ہے۔ الزام میں تم قتل کے آئے ہو اور منہ چھپائے ایسے بیٹھے ہو جیسے بڑے معصوم ہو۔''

وہ حواسوں میں ہوتا تو مقابل کا گریبان دبوچ چکا ہوتا مگر وہ بے تاثر آنکھوں سے شوقی کو دیکھنے لگا۔ رتجگوں سے بجی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ عجیب سا تاثر تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''ٹھوکریں تو میرا نصیب ہیں۔''

شوقی نے بے اختیار اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔

''تو صحیح کہتا ہے استاد عجیب زنانیوں جیسی حرکتیں ہیں اس کی، پرسوں ساری رات روتا رہا ہے وہ بھی سسکیوں کے ساتھ۔ آپ تو خراٹے لے کے سو رہے تھے میری جب بھی آنکھ کھلی اس کو روتے پایا۔'' ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے فرو جے نے جیسے کوئی دلچسپ قصہ اسے سنایا۔

''دیکھ شہزادے تو نے بھی قتل کیا ہے قاتل ہم بھی ہیں، اس لیے لمبا ساتھ ہے اپنا، جو بھی تیرے دکھ ہیں ہم سے کہہ دے۔ ہم برے ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ کسی کا غم نہ سن سکیں۔'' اسے خاموش پا کر شوقی اپنی جگہ پہ بچھی ہوئی چٹائی پہ جا بیٹھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ دھوئیں کے مرغولے اڑانے لگا۔

''ہاں میں نے قتل کیا ہے...... جسے قتل کیا میں جانتا ہی نہیں تھا...... کس کے لیے لگائی تھی میں نے اپنی زندگی داؤ پہ جو مجھے بھائی ہی نہیں مانتا تھا...... پرسوں میری شادی تھی...... میں یہاں ہوں قتل کے جرم میں...... قاتل ہی تو ہوں۔ میں سید ثاقب شاہ قاتل ہی تو ہوں۔'' دھوئیں کے

مرغولوں کو تکتے بے ربط انداز میں بولتا وہ جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ شوقی نے افسوس سے سر ہلایا۔

''تو، تو بڑا دکھی ہے یار لگتا ہے بڑا ظلم کیا ہے زندگی نے تیرے ساتھ۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے فروجے کبھی بھی انسان کو خوش نہیں رہنے دیتی۔ کوئی گناہ کرے یا نہ کرے سزا سنا دیتی ہے۔'' کچھ اداس لہجے میں کہتا شوقی بدمعاش خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور نکل گیا۔ شوقی کی ٹانگیں دباتا فروجا بھی سر دھننے لگا جبکہ ساقی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے پھر سے بت بن چکا تھا۔

☆......☆

اماوس کی رات جیسے ان کے گھر پہ ٹھہر سی گئی تھی۔ ساون کی بارشوں نے اس گھر کی عورتوں کی آنکھوں کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ حنا نے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ عنایہ بے یقین تھی کہ کیسے اس کا بھائی کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ وہ تو بچپن سے بہت حساس، بہت جذباتی تھا۔ کلثوم حنا کے مستقبل کو لے کے پریشان تھی۔ جبکہ ناہید بیگم شدت غم سے بار بار بے ہوش ہو جاتیں۔ ناہید کی حالت دیکھ کے ظہیر صاحب کا دل کٹ جاتا۔ پولیس نے زبین کو بیان لینے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ سب ایک دوسرے سے منہ چھپائے پھر رہے تھے۔ ظہیر صاحب اور ناہید بیگم کئی بار عمیر کے گھر کا چکر لگا چکے تھے مگر وہ لوگ ساقی کو معاف کرنے پہ تیار نہیں تھے۔ اگر عمیر کے گھر میں صف ماتم بچھی تھی تو ان کا شادی والا گھر بھی کسی قبرستان سے زیادہ ویران لگتا تھا۔ وقت نے یہ کیسی کروٹ بدلی تھی کہ سب انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ اس دن بھی ناہید بیگم نے عمیر کے بھائی کے قدموں میں اپنی چادر ڈال دی کہ شاید وہ ان کے بیٹے کی زندگی بخش دیں مگر سامنے تو کوئی فرعون بیٹھا تھا۔

''بی بی اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے نے میرے بھائی کی جان لی ہے اسے حساب دینا ہی ہوگا۔'' رعونت سے کہتا سمیر بٹ جیسے خدا بن بیٹھا تھا۔

ظہیر صاحب نے فوراً آگے بڑھ کے چادر اٹھا کے ناہید کے سر پہ ڈالی اور کینہ توز نظروں سے سمیر کو گھورتے ہوئے بولے۔ ''بس کرو ناہید صبر کرو صبر اس میں بھی میرے رب کی کوئی بہتری ہی ہوگی۔ ہمارے بیٹے کے نصیب میں جو لکھا ہو گا وہ ہو کے رہے گا۔ چلو یہاں سے تم۔'' ناہید کا بازو پکڑے وہ جانے لگے تب ہی ایک آواز نے ان کو رکنے پہ مجبور کر دیا۔

''ٹھہریں......آپ لوگ بیٹھیں ہم ذرا آتے ہیں۔'' انہیں روکتے ہوئے مختصراً کہتی نازیہ سمیر کو اٹھا کے ساتھ لے گئی۔ آس و نراس کی کیفیت میں جھولتے ظہیر صاحب اور ناہید کو لگا وہ اس جہاں اور اس جہاں کے درمیان لٹکا دیئے گئے ہیں۔ اذیت کا احساس جیسے سانس روک رہا تھا صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ظہیر صاحب نے تسلی دینے کے انداز میں ناہید کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ مسکرا دیں شاید قدرت کو ان کی بے بسی پہ رحم آ گیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد وہ میاں بیوی اندر داخل ہوئے۔

''دیکھیں شاہ جی! آپ کے بیٹے نے ہمارے جوان بھائی کی جان لی ہے وہ کسی صورت بھی معاف کیے جانے کے قابل نہیں مگر......'' تمہید باندھتے ہوئے سمیر بٹ بلا کا سنجیدہ تھا۔

''مگر......؟'' آنکھوں میں آس کے دیپ جلائے بوڑھے ماں باپ جیسے کسی معجزے کے منتظر تھے۔ سمیر شاہ خاموش رہا۔

''دیکھیں چاچی جی! میں نے آپ سے سپارہ پڑھا ہے۔ آپ کو یوں روتے گڑگڑاتے نہیں دیکھ سکتی، مگر سچ تو یہ ہے کہ آپ کے بیٹے نے بڑا ظلم کمایا ہے۔ عمیر کے چھوٹے چھوٹے بچے بے آسرا ہو گئے ہیں مگر میں نے پھر بھی سمیر کو منا لیا ہے کہ وہ ساقی کو معاف کر دے۔ پھر بھی ہماری ایک شرط ہے۔'' مدعے پہ آتی نازیہ آخر میں جھجک سی گئی۔ ناہید پہ یہ خاموشی کا وقفہ جیسے جانکنی کا عذاب لایا تھا۔ ظہیر صاحب نے بھی پہلو بدلا۔

''ہمیں تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ بس ہمارے بیٹے کی جان بخش دو۔'' خدشات سے پُر لہجے میں وہ التجائیہ انداز میں بولیں تو ایک پل کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

''دیکھیں بی بی عمیر کی بیوہ اور اس کے دو بچوں کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے جو ہم احسن طریقے سے نبھا سکتے ہیں، مگر نازیہ کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ ثاقب کو سزا مل بھی جائے تو اب ہمارا بھائی واپس نہیں آ سکتا۔'' سمیر نے ہلکا سا ہنکارہ بھر کے بات کو جاری رکھا۔ ''ہم اپنے بھائی کے قاتل کو ایک ہی شرط پہ معاف کریں گے اگر آپ اپنی حویلی خون بہا میں عمیر کی بیوہ کے نام کر دیں۔'' بات ختم کرتے ہی چہرے پہ یوں سنجیدگی طاری کر لی جیسے اب کہنے سننے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔

''کیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ظہیر صاحب جو خاموشی

سے ان کی بات سن رہے تھے ایک دم بھتے سے اکھڑ گئے۔ "تو صاف کہو نا اپنے بھائی کا خون بیچنا چاہتے ہو۔ چلو ساتی کی ماں ان تلوں میں تیل نہیں یہ تو کسی کی بے بسی کی بھی قیمت لگاتے ہیں۔" شکست خوردہ لہجے میں درد ہی درد تھا۔ ضبط کی انتہا سے گزرتا سمیر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نازیہ نے اشارے سے منع کیا۔

"چاچی جی! جائیں گھر جا کے چاچا جی کو سمجھائیں یہ جذباتیت دکھانے کا موقع نہیں سمجھداری سے فیصلہ کرنے کا موقع ہے۔" ناہید کو سمجھاتے ہوئے نازیہ نے کہا تو بت بنی ناہید ست قدموں سے ظہیر صاحب کے پیچھے گھر سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆

زبین شاہ نے جب سے سمیر بٹ کی شرط کے بارے میں سنا تھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وسیع و عریض لان میں چکر لگاتے ہوئے وہ دائیں ہاتھ کی مٹھی بنائے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ مار رہا تھا۔ اسے ساری بازی ہاتھ سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ لان چیئر پہ بیٹھے ظہیر صاحب اس کی بے چینی پہ حیران تھے۔

"ان کی جرأت کیسے ہوئی حویلی کا نام لینے کی حویلی لاوارث تھوڑی ہے جو ایک قاتل کے خون بہا میں دے دی جائے۔" تند و تیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ ضبط کرتے بھی بہت کچھ کہہ گیا۔ ظہیر صاحب نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ چائے لے کے آتی عنایہ چپ نہ رہ سکی۔

"آپ بھول رہے ہیں زبین کہ وہ قاتل آپ کا بھائی، آپ کی بہنوں جیسی سالی کا سہاگ اور آپ کے بابا جان کا لخت جگر ہے۔" ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے ہوئے وہ ٹرے ٹیبل پہ رکھ کر چائے سرو کرنے لگی۔ زبین کے جیسے تلوؤں پہ لگی سر پہ بجھی۔

"مردوں کے معاملات مردوں کو ہی حل کرنے دو۔ تم عورتوں میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ تم مردوں کے معاملات میں مداخلت کرتی پھرو اس لیے اندر جاؤ اور کچن دیکھو۔ نظر نہ آنا اب مجھے باہر۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ عنایہ کو بہت بری طرح ڈانٹ گیا۔ وہ روتے ہوئے اندر کی طرف بھاگ گئی۔

"وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ تم اپنے رویے پہ غور کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم آج کل بہت تلخ ہوتے جا رہے ہو، بات بات پہ چڑ جاتے ہو۔" تنبیہی انداز اختیار کرتے وہ اسے سمجھا رہے تھے ویسے بھی فریدہ کے مرنے کے بعد وہ اسے کم ہی کچھ کہتے تھے۔

"معذرت خواہ ہوں بابا جان، میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا مگر آپ خود سوچیں ایک ساتی کی غلطی کی سزا ہم سب کیوں بھگتیں۔" وہ ذو معنی انداز میں بولا تو ظہیر شاہ نا سمجھی کے انداز میں سر ہلا گئے۔

"میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ مانا کہ ساتی نے تمام عمر غلطیاں کی ہیں۔ حد سے زیادہ جذباتی پن نے ہی اسے آج یہ دن دکھایا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس سے بے پروا ہو جائیں جو بھی ہے جیسا بھی ہے اولاد ہے وہ میری۔" دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے ایک ناراض نظر انہوں نے زبین پہ ڈالی۔

"بے شک وہ ہم سب کو عزیز ہے مگر بابا جان! اس کی نادانیوں کی سزا کب تک ہم سب بھگتتے رہیں گے۔ ایک ساتی کو بچانے کے لیے ہم سب کے سروں سے چھت چھین لی جائے یہ کہاں کا انصاف ہے پھر کیا گارنٹی ہے کہ وہ باہر آ کے پھر کوئی ناقابل تلافی نقصان نہیں کرے گا۔" ٹھوس لہجے میں کہتے ہوئے زبین نے ظہیر شاہ کے پرسوچ چہرے کو دیکھا اس کا تاک کے چلایا گیا تیر عین نشانے پہ لگا تھا۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو مگر تم نے اپنی ماں کی حالت دیکھی ہے وہ تب سے بیمار ہے جب سے ساتی کو سزا ہوئی ہے۔ خود مجھے بھی لگتا ہے جیسے میرا ایک بازو کٹ رہا ہو۔" دل گرفتگی سے کہتے ظہیر صاحب پہ جیسے زبین شاہ نے سوچ کے کئی راستے وا کر دیے۔

"ان عورتوں کی تو آپ بات ہی مت کریں بابا جان! معاملات کی نزاکت کو سمجھتی ہی نہیں صرف جذباتی انداز میں مردوں کے معاملات میں بولتی رہتی ہیں۔ ایک دن یہ سڑک پہ بنا چھت کے نہیں گزار سکتیں پھر ذرا سوچیں ساتی کو چھڑانے میں چھت چلی جائے گی۔ کاروبار پہلے ہی توجہ نہ دینے کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہے، ہم تو پائی پائی کے محتاج ہو جائیں گے۔ زمانے میں جو رسوائی ہونی تھی وہ تو ہو چکی مگر اب عقلمندی اسی میں ہے کہ جو بچا ہے اسے بچا لیں۔ آگے آپ کی مرضی۔" انہیں تفصیل سے سمجھاتا وہ اٹھ کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کو چل دیا۔ ظہیر صاحب پھر سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ان دنوں کاروبار سے وہ منافع نہیں ہو رہا تھا جو ہوتا آیا تھا۔ دور افق پہ ڈوبتا سورج جیسے اس گھر کے ایک بیٹے کی قسمت پہ افسردہ تھا۔

☆......☆

موسم آج پھر بہت اچھا تھا۔ ننھی ننھی بوندوں نے گھاس پہ جیسے موتی بکھیر دیئے تھے۔ سبک خرامی سے ننگے پاؤں چلتی جیسے وہ اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔ بہت دن کے بعد آج وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ سیاہ لباس میں بے ترتیب بالوں کی لٹیں چہرے کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ آنکھوں کے گرد پڑے گہرے سیاہ حلقے اس کے رتجگوں کے غماز تھے۔ سبز گھاس پہ رلتا سیاہ آنچل آدھا اس کے کاندھے پہ پڑا تھا۔ اتنی سی مسافت نے جیسے اسے آدھ موا کر دیا تھا۔ وہ چلتے چلتے تھک گئی تو موتیے کے پھولوں سے لدی کیاری کے پاس جیسے ڈھے سی گئی۔ کئی دنوں سے وہ برائے نام کھا رہی تھی۔ اک عنایہ ہی تھی جو ان سب کو سنبھالے ہوئے تھی ورنہ سب کا حال حنا سے مختلف نہیں تھا۔

''پہنتی رہا کرو سیاہ لباس تم پر بہت جچتا ہے۔'' جیسے کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ہو، اس نے بے تابی سے آس پاس دیکھا مگر وہ کہیں ہوتا تو نظر آتا وہ تو اس کے احساس میں بسا تھا۔ اک آنسو ٹوٹ کے اس کے صبیح گالوں پہ رینگا۔ بارش کی ننھی بوندیں اسے بھگو رہی تھیں۔

''دیکھو! شبنم میں بھیگا پھول کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ اتنا کہ جو دیکھے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جائے۔'' کسی نے سیاہ آنکھوں میں شرارت سجا کر اس کے سامنے آئینہ کیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچتی حنا بڑبڑائی۔

''جب وہ میرے نصیب میں ہی نہیں تھا تو کیوں اس کا عشق میرے دل میں بسایا مالک۔! اب میں کیا کروں، مجھے تو اسے مانگنے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں میں کیا کروں؟ کیوں ان کے نصیب میں خواہش لکھتے ہو جن کے نصیب میں نارسائی ہوتی ہے۔ اب اس خواہش سے کہو میرے دل کا لہو نا پیے، کسی خوش قسمت دل میں جا بسے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ طے ہو چکا ہے کہ حنا کے نصیب میں ثاقب شاہ تھا ہی نہیں۔ آسمان کی طرف منہ کیے زار و قطار روتی، جیسے وہ اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ مٹھی میں جکڑی گھاس زمین سے اکھڑ کر اس کی ہتھیلی میں آ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ گیلی مٹی سے لتھڑ سے گئے۔ عنایہ اسے ڈھونڈتی ہوئی لان میں آئی۔ بے بسی سے اس کے چہرے کو دیکھتی عنایہ کے لیے اس کے چہرے پہ موجود بارش کے قطروں اور آنسوؤں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ خود بھی رو دی۔

''بس میری بہن صبر کر دیکھ ہم سب بھی تو سنبھال رہے ہیں نا خود کو کسی نہ کسی طرح۔'' اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھتے ہوئے وہ اس کے بال کو انگلیوں سے سنوارنے لگی۔

''ساقی کہتا تھا۔ میرا چہرہ چاند جیسا ہے۔ دھلے گلاب کی مانند ہے۔ دیکھو آپی! قسمت نے کیسی سیاہی مل دی میرے چہرے پہ۔'' سیدھی ہوتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پہ ملنے شروع کر دیئے۔ سرخ و سفید چہرہ گیلی مٹی سے اٹ چکا تھا۔ عنایہ کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔

''شش بس چپ بارش تیز ہو گئی ہے چلو اندر چلیں، چل میری بہن اٹھ۔'' وہ سرگوشی میں اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر عنایہ نے اس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خاموش کروایا اور اٹھا کے اندر لے گئی۔

☆......☆

وقت کا پنچھی اپنے پروں میں درد کے لمحات سموئے ان کو روندھ کے گزر رہا تھا۔ کون کہتا ہے وقت سب سے بڑا مرہم ہے وقت ہی تو ہے جو ایسے زخم دیتا ہے جو ناسور بن جاتے ہیں۔ سکون کے لمحات چھین لیتا ہے۔ گھنٹوں سوچوں میں گم وہ ارد گرد سے بے نیاز رہتی تھی۔ کوئی بات بھی کرتا تو بے تاثر نگاہوں سے دیکھتی جیسے سب کی بات سمجھنے کی صلاحیت فراموش کر چکی ہو۔ عنایہ اور کلثوم کا دل کٹ کے رہ جاتا۔ عتیق صاحب اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے بے بس سے اٹھ آتے۔ ظہیر صاحب اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح حویلی دیے بنا ان کے نانہجار بیٹے کو معافی مل جائے۔ زبین شاہ اب سینہ تانے بنا کسی خوف کے دکان سنبھال رہا تھا۔ اس دن بھی حنا کو کلثوم کے حوالے کر کے ناہید بیگم حوالات تک آ گئی تھیں۔ گھر کے مردوں سے یہ بات پوشیدہ تھی بھلا وہ ماں کے دل کی مجبوری سمجھ بھی کیسے سکتے تھے۔

''ساقی پتر! گھبراتا کیوں ہے میں ہوں نا تیرے ساتھ، میں تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔'' لوہے کی سلاخوں کے باہر سے ناہید بیگم نے جیسے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ ساقی کو لگا جیسے مدت کے بعد کسی اپنے کا چہرہ دیکھا ہو۔

''اماں میں نے کچھ نہیں کیا میں تو اس سے چاقو چھین رہا تھا پتا نہیں کیسے۔ اسے لگ گیا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔'' سلاخوں سے سر ٹکائے وہ پھپک کر رو پڑا تو ناہید سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اس کا سیاہ نقاب بھی آنسوؤں سے تر تھا۔

''صبر کر و ساقی، وہ اور زبین کوشش کر رہے ہیں کہ سمیر معافی نامے پہ دستخط کر دیں۔ ہم بہت جلد تمہیں یہاں

سے نکال لیں گے۔'' ماں نے تسلی دیتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ طنزیہ مسکرا دیا۔

''طفل تسلی بھی کتنا سکون بخش مرہم ہے، انسان کو بہلائے رکھتا ہے۔ بہت سی باتیں پردے میں ہی رہیں تو ان کی تلخی سے انسان بچا رہتا ہے ورنہ آگہی کا عذاب بہت جان لیوا ہوتا ہے۔'' اماں کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہوئے وہ بولا تو اس کی آواز میں دنیا جہان کی ویرانیوں کی چاپ تھی۔ عنایہ نے افسوس سے اسے دیکھا جبکہ ناہید کا جیسے کلیجہ کٹ گیا۔

''کیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ تو کیوں اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ آزمائش بھی جلد کٹ جائے گی۔'' ساقی کے گالوں پہ بہتے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بڑی اُمید سے بولیں تب ہی پاس کھڑے کانسٹیبل نے بڑی کرخت آواز میں ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان کیا اور راؤنڈ لیتا دور چلا گیا۔

''کچھ چاہیے تو بتا دو میں اگلی دفعہ لیتی آؤں گی۔'' تھوڑا سا چھپا کے پین اور کاغذ ساقی کے حوالے کیا۔ جس پہ ساقی نے تین لائنیں گھسیٹ کے جلدی سے ان کی طرف بڑھا دیا۔ جسے انہوں نے جلدی سے پرس میں رکھا اور لرزتے ہاتھوں سے نقاب سیٹ کرنے لگیں کیونکہ کانسٹیبل اب اسی طرف آرہا تھا۔

''اچھا پتر اللہ کی امان میں دیا تجھے۔'' اماں، ساقی کا ہاتھ پکڑ کے اس میں ہزار کے کچھ نوٹ دباتے وہ نم آنکھوں سے رخصت ہوگئیں۔ دانستہ تاش کی طرف متوجہ شوقی اور فروجا بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کیا منگوایا ہے شہزادے ہمیں بھی تو بتا کہیں جیل توڑنے کے لیے اوزار تو نہیں منگوا لیے۔'' مذاق سے کہتا شوقی شرارت سے گویا ہوا تو فروجے نے بھی دبا دبا سا قہقہہ لگایا۔

''نہیں یار بس کچھ اور منگوایا ہے جو غیر قانونی بالکل بھی نہیں ہے بس تم لوگ کسی طرح اس کانسٹیبل کو سنبھال لینا۔'' اس نے ان کا وہم دور کرتے ہوئے مدد چاہی تو شوقی پھر سے ہنسا۔

''تم فکر ہی مت کرو تمہارے لیے جان بھی حاضر ہے اور یہ پلسیے (پولیس والے) تو ہوتے ہی چارے والے بکرے ہیں انہیں بس اپنے چارے سے مطلب ہوتا ہے وہ تو ہے نا تیرے پاس؟'' اسے تسلی دیتے ہوئے شوقی نے استفہامیہ انداز اختیار کیا تو اس نے مٹھی میں پکڑے سبز نوٹ اس کے حوالے کر دیئے۔ شوقی پُرسکون سا مونچھوں کو بل دینے لگا۔

☆......☆

دن بھر دھوپ کی دبیز چادر اوڑھے کائنات پہ اترنے لگے تھے۔ گرمی اور پیاس کی شدت سے جھلتے انسان اور جانور جیسے تھک سے گئے تھے۔ برسات جیسے ساون سے روٹھ سی گئی تھی۔ ننھی چڑیا منہ کھولے پتوں کی چھاؤں تلے درخت کی ٹہنی پہ چپ کے بیٹھی تھی۔ دفعتاً وہ اڑی اور دور کہیں سے تنکا منہ میں لیے درخت پہ آ بیٹھی، اپنے بنائے ہوئے ادھورے گھونسلے میں تنکا دھرتے ہوئے وہ سڑک سے گزرتی گاڑی کی آواز پہ ٹپٹا کے دوبارہ اڑی تھی۔ اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے کئی تنکے گھونسلے سے نکل کر سبز گھاس پر بکھر گئے۔ کھڑکی میں کھڑی حنا کا دل جیسے چڑیا کی بے بسی پہ کرلایا تھا۔ ویران آنکھوں کی ویرانی جیسے کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ گھبرا کے پلٹی اور بیڈ سے ٹیک لگا کے قالین پہ بیٹھ گئی۔ اسی وقت عنایہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی۔

''حنا! ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے چلو اٹھو کم از کم آج تو اپنا حلیہ درست کرلو۔'' عنایہ نے اس کے جھاڑ جھنکاڑ بال سنوارتے ہوئے اسے لیکچر دے کر اس کی وارڈروب کا رخ کیا۔

''کیوں آج کیا ہے؟'' گردن ایک طرف ڈھلکا کر آنکھیں موندھ کر پوچھا مگر عنایہ سن ہی کب رہی تھی وہ تو وارڈروب کا پٹ تھامے حیرت زدہ کھڑی تھی۔ سامنے سارے سیاہ لباس لٹک رہے تھے۔ ایک لباس بھی کسی اور رنگ کا نہیں تھا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے حنا! تمہارے سارے کپڑے کہاں گئے آج تمہاری سالگرہ ہے کیا پہنوگی یہ سیاہ رنگ یہ سوگ کی نشانی؟'' عنایہ جیسے نم آنکھوں سے اس کے نصیب پہ ماتم کررہی تھی۔

''وہ سب میں نے کام والی کو دے دیئے، رنگ تو سہاگنوں پہ جچتے ہیں نا آپی! مجھ پہ تو وہ ہی جچتا ہے جو ساقی کو پسند تھا۔'' بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتا دہشت زدہ لہجہ جیسے عنایہ کو سنگسار کر گیا۔ عنایہ نے بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا شاپر اس کی گود میں ڈالا۔

''یہ ساقی نے تمہارے لیے گفٹ بھیجا ہے اور ساتھ تاکید کی ہے کہ رات تین بجے سے پہلے کھول کے مت دیکھنا۔'' اس کے سر پہ ہاتھ رکھتی وہ کمرے سے چلی گئی تو

جیسے حنا کے لیے پہاڑ جیسا انتظار چھوڑ گئی۔ اس شام اس نے گنے چنے نوالے بھی گلے سے نہ اتارے، عنایہ جوں کی توں ٹرے واپس لے گئی۔ حنا کی آنکھیں جیسے وال کلاک پہ جم سی گئیں۔ وہ ایک ہی زاویے میں شاپر ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی جیسے وہ ہلے گی تو گود میں رکھی قیمتی متاع غائب ہو جائے گی۔ صدیوں جیسے انتظار کے بعد آئی۔ رات سبک رفتاری سے رینگ رہی تھی۔ تب ہی گھڑی نے رات کے تین بجائے۔ اس نے بے قراری سے شاپر اٹھایا تھا اسی پل اس کا فون بجا اس نے ناگواری سے اس دخل در معقولات والی چیز کی سمت دیکھا، سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔

''السلام علیکم......!'' اس نے دھیمے بے لچک لہجے میں سلام کیا تو جواب سرگوشی میں آیا۔ حنا کو لگا اس کے جسم کا ہر عضو سماعت بن گیا ہے۔

''ساقی......! یہ تم ہو نا؟'' بے یقینی سے موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے نم آنکھوں سے دیکھا اور احتیاط سے کان پہ لگا لیا۔ خواب کی سی کیفیت میں مرجھایا ہوا دل رک کے دھڑکا تھا۔ یونہی اسے لگا جیسے ساقی مسکرایا ہے۔

''سالگرہ مبارک ہو مسز ثاقب شاہ! گفٹ کھول کے دیکھا اپنا؟'' مختصر سوال جیسے حنا کو پھر سے زندہ کر گیا۔ وہ اپنے ہوش میں ہوتی تو اسے سالگرہ یاد رہتی۔

''نہیں میں کھولنے لگی تھی تو تمہاری کال آگئی بتاؤ کیا ہے گفٹ؟'' وہ ایسے پوچھ رہی تھی جیسے عام دنوں میں اس سے بات کرتی تھی۔ جیسے پچھلے دنوں کچھ ہوا ہی نہیں۔

''تمہیں پتا ہے حنا! میں نے سوچا تھا شادی کے بعد کی تمہاری سالگرہ بہت شاندار طریقے سے مناؤں گا۔ ہم کہیں باہر جائیں گے۔ ڈنر کریں گے، بہت ساری شاپنگ کریں گے مگر کیک گھر آ کے سب کے ساتھ کاٹیں گے۔'' ایک پل کے لیے سرگوشی میں ڈھلا لہجہ آنسوؤں کی نمی سے بھاری ہوا دوسرے ہی پل وہ سنبھل کر بولا۔ ''تمہارا گفٹ میں نے دکان سیٹ کرنے کے دوران ہی بنا کے رکھ لیا تھا۔ صبح اماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ میری نئی دکان پر رکھا شاپر منگوالیں، یہاں میرے ساتھ ایک بندہ ہے اس کے پاس پتا نہیں کیسے موبائل بھی ہے اس سے تھوڑی دیر کے لیے لیا ہے کہ کم سے کم میں تمہاری آواز تو سن سکوں۔ کھول کے دیکھو پھر بتاؤ کیسا لگا۔'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی پھر بھی وہ بہت چوکنا تھا۔ کانسٹیبل ہر آدھے گھنٹے بعد راؤنڈ لینے آتا تھا۔ یوں تو پاس ہی لیٹے بظاہر سوئے مگر حقیقت میں نگرانی کرتے شوقی اور فروجا بھی الرٹ تھے مگر وہ خود بھی بہت احتیاط برت رہا تھا۔ سلاخوں سے باہر بھی سناٹا تھا اندھیرے میں ڈوبی راہداری میں قدموں کی چاپ ندارد تھی۔ کانسٹیبل کچھ دیر پہلے ہی راؤنڈ لے کے گیا تھا۔ حنا نے شاپر کھولا تو اندر ایک خوبصورت ڈبہ تھا جس میں جگر جگر کرتی ہیرے کی نازک سی نفیس ڈیزائن والی نوز پن دیکھ کے حنا کو یوں لگا جیسے سارے جہان کی خوشی اس وقت اس کی دسترس میں ہے۔

''بہت خوبصورت ہے اتنی خوبصورت کہ اس کی چمک سے میری روح تک منور ہوگئی ہے۔ ساقی تم ہمیشہ کہتے تھے نا میں تم سے محبت نہیں کرتی تم صحیح کہتے تھے۔'' وہ ایک پل کو سانس لینے کے لیے رکی اور دوسری طرف ساقی کی جیسے سانس رک گئی۔

''میں تم سے محبت نہیں عشق کرتی ہوں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ عشق کیا ہوتا ہے۔ عشق میرے نزدیک ایک لفظ تھا۔ شاید میری تم سے شادی ہو جاتی تو میں تم سے تمام عمر محبت کرتی رہتی۔ عشق کو سمجھ ہی نہ پاتی، تمہاری جدائی نے سمجھا دیا عشق کا مطلب مجھے۔ جب تم گرفتار ہوئے تھے مجھے تو لگا خدا مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ دو گھڑی دور کھڑی خوشی جب صدیوں کے فاصلے پر محیط ہو جائے تو زندگی کتنی کٹھن لگتی ہے تمہیں کیا خبر۔ اس دن میں خود سے روٹھ گئی۔ مجھے لگا میں نے اپنی ہی کسی غلطی کی وجہ سے خدا کو ناراض کر دیا اور تمہیں کھو دیا ہے۔ جانتے ہو پھر کیا ہوا؟'' برستی آنکھوں کے ساتھ درد میں ڈوبے لہجے میں استفسار ہوا تو ساقی ''ہوں......!'' کر کے رہ گیا۔ کانسٹیبل کے قدموں کی بازگشت دور کہیں سنائی دے رہی تھی۔

''اب مجھے صبر آتا جا رہا ہے۔ میرے دل و روح تمہارے عشق میں پور پور ڈوب رہے ہیں۔ میری محبت عشق کے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ یوں جیسے مکمل ہو رہی ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو ٹوٹ کے پھر مکمل جڑنے کا عمل کس قدر سرشار کرنے والا ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو ہیجان کے بعد کا سکون انسان کو کس طرح سکون بخشتا ہے۔'' جذب سے کہتی وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ ساقی کچھ کہنے ہی والا تھا جب شوقی نے اس کو بڑے زور سے ہلا دیا اس نے گھبرا کے فون آف کر کے تکیے کے نیچے گھسایا اور سوتا بن گیا۔ شوقی بھی اطمینان سے کروٹ بدل کے سو گیا۔ صبح کے ساڑھے تین ہو رہے تھے حنا نے وضو کر کے جا نماز بچھالی۔ ساقی کا دیا پہلا تحفہ

اس کی ناک میں بج چکا تھا۔

☆......☆

زبین شاہ کا بچھایا سنہری جال ظہیر صاحب کو بہت اچھی طرح جکڑ چکا تھا۔ اب وہ حویلی کی بات بھی نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ سمیر شاہ حویلی کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں زبین شاہ نے ساقی کی معافی کو ایک ناممکن بات بنا دیا۔ گھر کی عورتوں نے بہت واویلا مچایا مگر ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ ان دنوں حنا کے سجدے طویل تر ہو گئے تھے۔ ناہید بیگم جیسے دل پہ پتھر لیے جی رہی تھیں۔ کلثوم جب حنا کو دیکھتیں تو ان کا دل کٹ کے رہ جاتا۔ ظہیر صاحب نے گھر دیر سے آنا شروع کر دیا یہی حال عتیق صاحب کا تھا۔ وہ حنا کی آنکھوں کے خالی پن سے ڈرتے تھے۔ اسے دیکھ کے یوں لگتا جیسے اس میں اب کوئی خواہش باقی نہیں رہی مگر وہ بے بس تھے خود کو بیچ کر بھی بیٹی کی خوشی نہیں خرید سکتے تھے۔ اطمینان سے تھا تو بس زبین شاہ جس کی رسی ان دنوں دراز تھی۔ خدا نے اسے چاند سے بیٹے سے نوازا تھا۔ گھر میں کئی ماہ کے سوگ کے بعد خوشی کی چھوٹی سی بہار اتری تھی۔ ننھا زیان حنا کی گود کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ ساری ساری رات اسے بہلاتی رہتی۔ ایسے میں ساقی کا فون آجاتا تو جیسے وہ کھل اٹھتی۔ حالانکہ وہ بہت مختصر بات کرتا تھا وہ بھی کئی کئی دن بعد۔

اس دن بھی وہ زیان کو نہلا کے عنایہ کے پاس چھوڑ کے آئی تھی کہ اچانک یوں لگا جیسے اس کی زندگی میں کوئی کام ہی نہیں بچا وہ کمرے میں آ کر بیڈ پہ بیٹھ گئی خالی خالی نظروں سے دیواروں کو دیکھتے ہوئے جانے دل میں کیا آیا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ باہر سے گزرتی کلثوم بیگم تڑپ کے اندر آ گئیں۔

''کیا ہوا حنا! کیوں رو رہی ہو ایسے؟ رونے سے مسائل حل نہیں ہوتے میری جان! دعا کیا کرو دعا سے نصیب بدلتے ہیں آنسوؤں سے نہیں۔'' اس کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کے تسلی دیتی وہ نم آنکھوں سے بولیں۔ اس نے انہیں بازو سے پکڑ کے سامنے بٹھایا۔

''امی کیا دعا سے گزرا ہوا وقت واپس آتا ہے؟ نہیں نا پھر مجھے صبر کیسے آئے؟ میں عام سی انسان ہوں اماں، کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ میرے سینے میں دل نہیں گوشت کا چھلا ہوا لوتھڑا ہے جس سے ہلکی سی ٹھیس لگنے سے خون رسنے لگتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس پہ یوں بکھر جاتی ہوں کہ دل چاہتا ہے زار زار روؤں اتنا کہ ہر غم، ہر درد، ہر حسرت مٹ جائے۔'' اس

پرندے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں

پینگوین دو پاؤں پر کھڑا ہو کر انسان کی طرح چلتا ہے۔ اس کے پر بھی ہوتے ہیں لیکن بہت چھوٹے۔ یہ پینگوین ہزاروں کی تعداد میں ساحل سمندر پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ بالعموم ان کا ایک ہی بچہ ہوتا ہے۔ ایک ہی رنگ و روپ، ایک ہی جسامت اور ایک ہی قد کاٹھ کے سینکڑوں پینگوین جب ساحل پر نکلتے ہیں تو ان کے بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ مادہ پینگوین ایک خاص موسم میں بچے دیتی ہے۔ نہ صرف پینگوین بلکہ دوسرے تمام ہوائی پرندوں کے انڈے دینے اور بچے نکالنے کا ایک موسم مقرر ہے جب کہ گھریلو پرندوں (مرغی اور بطخ وغیرہ) کا کوئی موسم مقرر نہیں۔ پینگوین کے بچے جب نکل آتے ہیں تو ہر ماں اپنے بچے کو کیسے پہچانتی ہے؟ اس کے بارے میں ابھی تک تحقیق ہو رہی ہے۔ نہ صرف سینکڑوں، ہزاروں پینگوین کے ہجوم میں ماں اپنے بچے کو پہچانتی ہے اور بچہ بھی ماں کو پہچان کر اس کے پاس آجاتا ہے۔

مرسلہ: محمد شکیل، ساہیوال

اردو کی تشکیل اور عشق علی ؑ

اردو زبان عربی، فارسی اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے امتزاج سے ظہور میں آئی۔ برصغیر میں علما، شعراء اور صوفیہ اسلامی تعلیمات و افکار اسلامی ثقافت و تمدن اور اسلامی علوم و فنون لے کر آئے۔ خصوصاً یہ حضرات ہر قسم کے دنیوی مفاد اور مادی منفعت سے بے نیاز تھے۔ برصغیر میں اسلام کی اشاعت میں سادات کرام نے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں ان کا جائزہ اب ناممکن ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد پہلے سندھ میں ہوئی۔ سندھ میں مسلمانوں کی آمد ایک طویل داستان ہے۔ مختصر یہ کہ سرزمین سندھ سے اسلام کا تعارف عہد خلافت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب ہی میں ہو چکا تھا کیونکہ اوائل 39ھ میں سندھ زیر اقتدار امارت حضرت علیؑ آ چکا تھا۔ اس کے علاوہ خاندان رسالت کو سندھ سے ایک سببی رشتہ بھی ہو جاتا ہے وہ یہ کہ امام زین العابدین حضرت علی ابن الحسینؑ کی ازواج میں ایک سندھی خاتون بھی تھیں جن کے بطن سے حضرت زید شہید پیدا ہوئے۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرا شی

نے بائیں ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے سرخ پڑتے گال رگڑ دیئے۔ ''اللہ کے فیصلوں کے آگے انسان بے بس ہے بیٹی! لیکن خالق کائنات کہتا ہے مجھ ہی سے مانگو، اور وہی تو سب کچھ دیتا ہے۔ جو کچھ نہیں دیتا اس میں ہماری بہتری ہوتی ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی رضا میں راضی ہو جائیں۔'' اس کا سر سہلاتے ہوئے انہوں نے سمجھایا تو کئی آنسو پھر پلکوں کی باڑ پھلانگ گئے۔

''اماں جان! آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ زمین پہ انسان کو خدا نے اپنا نائب بنا کے بھیجا۔ انسان اپنی عقل و سمجھ سے حالات کو اپنے لیے قابل قبول بنا سکتا ہے۔ ہم بھی اگر دل کی بجائے دماغ سے سوچیں تو حنا کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔''

دروازے پر کھڑا زبین شاہ جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ہلکی مسکراہٹ چھپاتے معنی خیز لہجے میں کہتا ہوا وہ اندر آ کے سامنے پڑے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ حنا دوپٹا سلیقے سے اوڑھتی سیدھی ہو بیٹھی جب کہ کلثوم نے سوالیہ نظروں سے زبین کو دیکھا۔

''وہ کیسے میں سمجھی نہیں کیا کہنا چاہتے ہو کھل کے کہو کوئی حل ہے تمہارے پاس تو۔'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا تو وہ پھر مسکرا دیا۔

''سادہ سا حل تو یہ ہے کہ حنا کو کسی اور کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔ اب ساقی کو تو چودہ سال کی سزا ہونی ہی ہے۔ کیا یہ چودہ سال اس کا انتظار کرتی رہے گی۔'' ٹانگ پہ ٹانگ جماتا ہوا وہ اپنا موقف کھل کے بیان کر گیا۔ کلثوم بیگم اور حنا نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے سر پہ سینگ اگ آئے ہوں یا ماتھے پہ تیسری آنکھ نمودار ہو گئی ہو۔

''زبین بھائی! مجھے آپ سے ایسی ہی بات کی اُمید تھی، مگر کیا آپ کو اس قدر گھٹیا بات کرنی چاہیے تھی؟ رشتے کوئی مذاق ہوتے ہیں کہ آج اس سے جوڑ لیے کل اس سے؟''

حنا نے تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کھری کھری سنائی۔ اس کا لہجہ بلند ہو چلا تھا۔ زبین شاہ کے چہرے کا رنگ بدلا توقع تو کلثوم بیگم کو بھی نہیں تھی کہ زبین شاہ اس طرح کی بات کر سکتا ہے۔

''حنا! اپنی آواز نیچی رکھو۔ بہنوئی ہے یہ تمہارا اسے جو مناسب لگا اس نے کہا۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اس سے اس انداز میں بات کرو۔'' کلثوم بیگم نے سمجھایا تو وہ بل کھا کر رہ گئی۔ جبکہ زبین ہلکا سا مسکرا کر پھر گویا ہوا۔

''میں نے تو بہن سمجھ کے سمجھایا تھا۔ اب تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ چودہ سال کم نہیں ہوتے بی بی، کیوں اپنی زندگی ایک جذباتی انسان کے لیے برباد کر رہی ہو جس نے قتل کرتے ہوئے ایک بار بھی تمہارا نہیں سوچا۔ خیر تم نہیں سمجھو گی یہ بات میں چچا کو سمجھاؤں گا۔'' مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حنا کا دل دھک سے رہ گیا۔

''بہن سمجھتے تو کبھی ایسی بات نہ کرتے۔ عورت کی پسند بس ایک بار ہوتی ہے جو میری ہو چکی ہے۔ ساقی سے جدائی کا مطلب میری موت ہے۔ میں اس جدائی سے بہتر مر جانا پسند کروں گی کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں مگر آپ کیا سمجھیں گے آپ نے کبھی خود کے سوا کسی سے محبت کی ہی نہیں۔ آئندہ کسی نے بھی مجھ سے اس طرح کی بات کی تو میں زہر کھا کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں گی۔'' اٹل لہجے میں بات کرتے ہی وہ اٹھ کے کمرے سے باہر جانے لگی تو دروازے پہ کھڑے عتیق صاحب کو دیکھ کے ایک پل کے لیے ٹھٹک گئی پھر مضبوط قدم بڑھاتی کمرے سے نکل گئی۔ پیچھے کھڑے تینوں نفوس ساکت رہ گئے۔

☆......☆

اس رات شوقی اور فروجے کی ہزار کوششوں اور اس کی ہزار احتیاط کے باوجود کانسٹیبل نے اسے بات کرتے پکڑ لیا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے آنے سے بھی پہلے موبائل تکیے میں گھسا چکا تھا مگر تلاشی لینے پہ موبائل برآمد کر لیا گیا تھا۔ اسی رات شوقی اور فروجے کو دوسری جیل منتقل کر دیا گیا، اور ان کی جگہ نئے لوگوں کو ڈال دیا گیا۔ وہ رات اس کی ٹارچر روم میں گزری۔ اس کی پنڈلیوں پہ ڈنڈے برسائے گئے۔ جسم کی تکلیف قابل برداشت تھی مگر بات نہ ہو سکنے کا درد روح تک کو گھائل کر رہا تھا۔ دو دن اس نے زخم سہلاتے گزارے۔ وہ تیسرے دن کی دوپہر تھی جب اس نے وضو کر کے اپنے بے چین وجود کو سجدے میں گرا دیا۔ نماز پڑھ کے دل کو سکون ملا۔ ابھی وہ فارغ ہی ہوا تھا جب کانسٹیبل نے سلاخوں پہ زور سے ڈنڈا بجایا۔

''تمہاری ملاقات آئی ہے۔'' حنا اس بار اس سے ملنے آنے والی تھی دھڑکتے دل کے ساتھ ملاقات والے کمرے میں قدم رکھا۔ سامنے احمد کو پا کے جیسے دل بجھ سا گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد احمد نے ایک خاکی لفافہ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔

"یہ کیا ہے احمد!" حیرت سے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ دریافت کرنے لگا تو احمد مسکرا دیا۔ اس نے لفافہ کھولا تو اس میں بیس ہزار تھے۔

"یہ تمہارا حق تمہاری امانت ہے۔ ہم نے مل کے جو کاروبار شروع کیا تھا۔ یہ اس کا آدھا منافع ہے۔ میں شرمندہ ہوں میں اتنے ماہ یہ حق ادا نہ کر پایا تم تو ہمارے حالات سے واقف ہی ہو۔ کچھ پیسے جوڑ کر میں نے ایک گھر گروی لیا ہے تاکہ میری بہنیں کرائے کے گھروں میں نہ رلیں۔ تم تو جانتے ہو دادا کی جائیداد سے جو حصہ ملا میں نے سب دکان میں لگا دیا۔" شرمندہ لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے وہ سر جھکا گیا تو ساقی نے تسلی دینے کے انداز میں اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"وہ میری بھی تو بہنیں ہیں ان کے تحفظ کی ذمہ داری میری بھی تو ہے، تم پریشان مت ہو تم نے بالکل سہی کیا۔ تم سے ہی تو مجھے ہمیشہ بھائیوں جیسا پیار ملا ورنہ زبین بھیا تو......" اس نے دانستہ بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"ارے ہاں زبین بھیا سے یاد آیا کل دکان پہ آئے تھے مجھ سے اس رقم کا مطالبہ کر رہے تھے جو تم نے میرے ساتھ دکان میں ڈالی تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ رقم ساقی کی امانت ہے جب بھی مانگے گا میں دوں گا مگر کسی اور کو نہیں دوں گا۔ تو وہ تن فن کرتے چلے گئے۔ تم برا مت ماننا مگر مجھے ان پہ بہت غصہ آیا تمہیں برباد کر کے بھی انہیں چین نہیں ملا۔ اماں! کل گئی تھیں تمہارے گھر ناہید آنٹی نے بتایا کہ زبین بھیا حنا پہ زور دے رہے ہیں کہ وہ کسی اور کے ساتھ گھر بسا لیں۔" تاسف سے سر ہلاتے ہوئے وہ اسے بتا رہا تھا۔

زبین شاہ کی اس قدر نفرت پہ وہ دم بخود رہ گیا۔

"چھوڑو تم وہ تو شروع سے ہی ایسے ہیں۔ بھلا سوتیلے بھائی سے بھی کسی کو محبت ہو سکتی ہے۔ ان کا قصور نہیں قصور اس رشتے کا ہے جو ہمارے درمیان ہے۔" لمحوں میں خود کو سنبھال کر اس نے بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ اتنے میں کانسٹیبل نے ملاقات ختم ہونے کا اعلان کیا۔

"میں ہر ماہ اتنی ہی رقم تمہیں ادا کروں گا۔ اگر کاروبار میں مزید برکت پڑی تو اس سے زیادہ بھی، اور تمہیں کچھ چاہیے تو بتاؤ۔" عجلت میں کہتے ہوئے وہ مڑا تو ساقی نے نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "یہ رقم یہاں رکھ نہیں سکتا۔ تم یہ رقم حنا کو دے دینا۔"

☆......☆

حوالات میں ساقی کا تیسرا دن تھا۔ اسے جیل کسٹڈی میں بھیجنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ایک معجزہ سا ہو گیا۔ صبح ہی صبح اس سے ملنے کے لیے کالے کوٹ میں ملبوس ایک شخص آ گیا۔ اس نے کاغذات پر دستخط لیے اور واپس چلا گیا پھر دو گھنٹے کے اندر اندر وہ واپس آیا۔ اس نے ایس ایچ او کے سامنے کچھ کاغذات رکھے پھر بولا۔ "میں نے مجسٹریٹ سے ضمانت کرا لی ہے۔"

اب اسے حوالات میں رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے تھانے سے باہر آیا تو برقعے میں ملبوس حنا کو

کھڑے پایا، اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ تایا ابو کسی وکیل سے ملنے کی بجائے اِدھر اُدھر کیوں بھاگ رہے ہیں تب میں نے اپنے طور پر کوشش شروع کردی کیونکہ زبین بھائی تایا اور ابو کو مسلسل بھٹکا رہے تھے۔ یہ وکیل صاحب میری سہیلی حمیدہ کے والد ہیں۔ ان سے میں خفیہ طور پر ملی۔ ساری کہانی سنتے ہی انہوں نے کہا کہ اس قتل کے پیچھے کوئی چکر ہے پھر جب عنایہ آپی کو کریدا تو بات کھلی کہ زبین بھائی عمیر بٹ کے مقروض تھے۔ حمیدہ کے ابو نے مزید چھان بین کرائی تو ساری باتیں کھل کر آگئیں۔ انہوں نے مجسٹریٹ صاحب کے سامنے ساری باتیں رکھیں اور کہا کہ سمیر پولیس آفیسر ہے اس نے کیس کو غلط رخ دیا ہے۔ میرے وکیل کا بیک گراؤنڈ ایسا ہے کہ اس نے کبھی چیونٹی تک نہیں ماری۔ اسے پھنسایا گیا ہے انہوں نے کئی گواہ بھی ڈھونڈ لیے۔ اس طرح کیس کمزور بن گیا اور تمہاری ضمانت ہوگئی۔ اب باقی کام عدالت کرے گی۔

وہ گھر پہنچے تو گھر خوشیوں سے بھر اٹھا، عنایہ نے حنا کو چٹکی کاٹ کر کہا۔ ”تم نے تو دیوار چین ڈھادی۔ جو کام کوئی نہ کرسکا وہ تم نے کردکھایا گھر میں کوئی رنجیدہ تھا تو صرف ایک آدمی وہ تھا زبین۔ اس نے ساقی کا باہر آنا اپنی شکست سمجھا اور نہایت خاموشی سے دکان بیچی پھر دبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ گھر کے ہر فرد نے اسے روکنا چاہا مگر وہ کسی کے سننے کا روادار نہ تھا۔ اس کا بس یہی کہنا تھا کہ دبئی میں رہ کر بھی زیادہ کماؤں گا تاکہ میرے بچے عیش سے گزارہ کرسکیں۔

زبین کو گئے ہوئے دو ماہ ہوچکے تھے۔ اس نے اب تک گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا آخری فون اس دن آیا تھا جس دن وہ دبئی ایئرپورٹ پر اترا تھا۔ اس کے بعد سے کوئی فون نہیں آیا تھا۔ عنایہ الگ پریشان تھی۔ دیگر افراد بھی فکر مند تھے۔ ساقی کے کیس کی تاریخ قریب آتی جارہی تھی۔ سمیر نے دوسرے ذرائع سے دھمکی دے رکھی تھی کہ میں ساقی کو پولیس مقابلے میں مروادوں گا۔ ان سب باتوں نے گھر بھر کو ذہنی خلجان میں مبتلا کردیا تھا۔ ساقی گھر سے بہت کم باہر جاتا تھا لیکن اس روز وہ خصوصی طور پر احمد کی دکان پر پہنچا تھا۔ اسے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ حنا کی ضد پر گھر والوں نے شادی کی تاریخ مقرر کردی تھی۔

جیسے ہی وہ دکان میں داخل ہوا احمد اٹھ کر اس کے گلے لگ گیا۔ اس نے اسے بھینچتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو۔“

”کس بات کی مبارک؟“

”تمہارے راستے کا ایک بڑا پہاڑ ہٹ گیا۔“

”کون سا پہاڑ؟“

”تم نے ٹی وی دیکھا نہیں؟ صبح سے نیوز چل رہی ہے۔ سمیر ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اس نے تمہیں دھمکی دی تھی ان کا ڈٹ کر کرنے کی اور خود موت کی نیند سوگیا۔“

ساقی الٹے پیروں گھر آگیا تاکہ سب کو یہ خبر سنا سکے کہ تھانے میں غیر قانونی طور پر رکھنے اور ظلم ڈھانے کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔

ابھی وہ یہ خبر سنا ہی رہا تھا کہ دروازے پر ٹیکسی آکر رکی۔ اس ٹیکسی سے اترنے والے کو دیکھ کر سب کے دل دھڑک اٹھے۔ عنایہ شیرخوار کو امی کی گود میں دے کر دروازے کی طرف دوڑی، ٹیکسی سے اترنے والا زبین تھا لیکن اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شیو بڑھی ہوئی، جسم پر سلوٹیں بھرے کپڑے۔ وہ بھی ایسے جیسے عرصے سے جسم پر ہوں۔

باپ نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ عنایہ نے ہاتھ پکڑ کر رونا شروع کردیا۔ وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا ساقی کی طرف بڑھا پھر اسے سینے سے لگا کر رو پڑا۔ ساقی کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ بہت پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جو اسے دبئی کا جھانسا دے کر لے گیا تھا اس نے دبئی میں اکیلا چھوڑ دیا۔ کاغذات وغیرہ بھی اسی کے پاس تھے اس لیے وہ مصیبت میں پھنس گیا۔ اس پر فارن ایکٹ کا کیس دائر ہوگیا اور وہ جیل بھیج دیا گیا۔ بڑی مشکلوں سے رہائی ملی ہے۔ یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے۔ دس لاکھ روپے بھی گئے اور جیل کی اذیت بھی سہی۔ واقعی اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔

شمارہ نومبر 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش.....آپ کا انتخاب

☆اول: کڑوا سچ.....فائزہ (فیصل آباد)

☆دوم: دچولن.....نورین (کراچی)

☆سوم: دو کوڑی کے لوگ.....رؤف اسلم آرائیں

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے